
معرفت
عجل الله تعالی فرجه
امام عصر

بسم اللہ الرحمن الرحیم وصل اللہ علیک یاولی العصر ادرکنا

مترجم کی وضاحت و گزارش

اس کتاب کا اردو ترجمہ **ChatGPT**، جو OpenAI کا تیار کردہ مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) پر مبنی ایک معاون ذریعہ ہے، کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ ترجمے کے دوران ChatGPT سے متن کے ترجمے، زبان کی روانی، عبارت کی اصلاح اور مطالب کو واضح اور قابلِ فہم انداز میں پیش کرنے کے لیے معاونت لی گئی ہے۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ اصل کتاب کے مفہوم، روح، علمی اصطلاحات، قرآنی آیات، احادیث و روایات اور حوالہ جات کو حتی الامکان صحیح اور امانت داری کے ساتھ محفوظ رکھا جائے۔

تاہم، اس ترجمے کو اصل کتاب کا **سرکاری یا مستقل طور پر مستند ترجمہ** نہ سمجھا جائے۔ چونکہ اس کام کی تیاری میں مصنوعی ذہانت سے مدد لی گئی ہے، اس لیے انسانی کوشش کی طرح اس میں بھی کسی غلطی، عدمِ دقت، ترجمے کی لغزش یا غیر ارادی کمی کا امکان مکمل طور پر خارج نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اہلِ علم اور محترم قارئین سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ جہاں علمی دقت ضروری ہو وہاں اصل متن کی طرف رجوع فرمائیں، اور اگر اس ترجمے میں کوئی غلطی یا کمی نظر آئے تو اس کی نشاندہی فرما کر اصلاح میں تعاون کریں۔

اس ترجمے کو انجام دینے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ **حضرت ولیِ عصر، امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی معرفت** سے متعلق اس گراں قدر کتاب کے معارف زیادہ سے زیادہ اردو خواں مؤمنین تک پہنچ سکیں۔

اس کوشش کے پسِ پشت **نہ کسی دنیوی شہرت کی خواہش ہے، نہ ذاتی نام و نمود مقصود ہے اور نہ کسی مادی منفعت کا حصول؛ بلکہ اس حقیر کوشش کی اصل نیت رضائے الٰہی کا حصول، حضرت ولیِ عصرؑ (عج) کا قرب حاصل کرنا اور زمانۂ غیبت میں اپنی استطاعت کے مطابق ان کی مقدس بارگاہ میں ایک معمولی سی خدمت پیش کرنا ہے۔**

اللہ تعالیٰ سے محمد وآلِ محمدؐ کے وسیلے سے دعا ہے کہ وہ اس ناچیز کوشش کو شرفِ قبول عطا فرمائے، اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے در گزر فرمائے، اور اسے ان اعمال میں شمار فرمائے جو ہمارے آقا و مولا حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے قلبِ مبارک کی خوشنودی کا باعث ہوں۔

اے اللہ! ہماری اس ناچیز کوشش کو قبول فرما، اسے خالص اپنی ذاتِ کریم کے لیے قرار دے، اور اسے اپنے ولی، حجت ابن الحسن عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا قرب حاصل کرنے کا وسیلہ بنا۔

اس ترجمے میں جو کچھ خیر، درستی اور افادیت ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے ہے، اور جہاں کہیں کوئی غلطی، لغزش یا کمی رہ گئی ہو، وہ اس ناچیز کوشش کی محدودیت کا نتیجہ ہے۔

—— مترجم

فہرستِ مضامین

انتساب 18

کتاب کے بارے میں 18

حصۂ اوّل 20

حصۂ دوم 20

حصۂ سوم 20

حصۂ چہارم 20

دوسرے ایڈیشن کا مقدمہ 22

حصۂ اوّل: بندگیِ خدا کی قدر و کیفیت 28

بابِ اوّل: معرفت کے ساتھ عبادت — تخلیقِ انسان کا مقصد 28

افعالِ الٰہی میں غرض مندی کا صحیح مفہوم 28

فاعل کی غرض اور فعل کی غرض 28

فعل کی غایت یا علتِ غائی 29

داعی زائد بر ذات یا عینِ ذات؟ 31

افعالِ الٰہی میں حکمت 32

خالق کی غرض یا مخلوق کی غرض؟ 33

اللہ کی اختیاری بندگی 35

ارادۂ تکوینی اور ارادۂ تشریعی 35

خلقت میں تفاوت — آزمائش کا ذریعہ 39

اللہ تعالیٰ انسان کو گناہ سے جبراً نہیں روکتا 41

بندگیِ خدا کی بنیاد اور اساس 44

معرفت پر قائم عبادت 44

معرفت کا حاصل ہونا اختیاری نہیں 45

معرفت کو قبول یا رد کرنے میں انسان کا کردار 46

انسان کے لیے سب سے ضروری معرفت 48
معرفتِ خدا—عبادت کی روح 49
عمل اور معرفت کا باہمی تعلق 50
انسان کی فضیلت کا معیار 51
تخلیقِ انسان کا مقصد 53
باب دوم: عبادتِ خدا میں بندگانِ الٰہی کی مختلف اقسام 54
معرفت اور ایمان 54
اعضاء و جوارح کے ذریعے ایمان کا اظہار 56
اعضاء و جوارح میں ایمان کی تقسیم 56
قلب کی معرفت 57
اسلام اور ایمان کے درمیان فرق 58
اسلام—ایمان کی شرط 60
ایمان کی جامع تعریف 61
ظاہری اسلام اور حقیقی اسلام 61
زبان سے اسلام کا اقرار 62
اسلام کی حقیقت 64
کفر کی حقیقت 66
کفر اور فسق کا فرق 69
معرفت میں شک 70
اختیاری اور غیر اختیاری شک 71
شک—انکار کا ایک درجہ 72
مستضعف—نہ مؤمن، نہ کافر 74
مستضعف کی تعریف 75
مستضعفین کا آخری انجام 76

قیامت سے پہلے مستضعفین کے آخری انجام کا معلوم نہ ہونا 80
مستضعفین کی شناخت کی دشواری 80
حصہ دوم: معرفتِ امامؑ — بندگیِ خدا کا واحد راستہ 82
باب اوّل: ائمہؑ کا بلند مقام اور ان کی معرفت 82
بندگی کا راستہ بتانے میں انبیاءؑ کا کردار 82
سفارتِ الٰہی اور اللہ کی جانب سے ترجمانی کا مقام 85
ہادیانِ الٰہی کی شناخت خود اللہ کی جانب سے 86
ہادیانِ الٰہی کا برگزیدہ ہونا 89
بندگیِ خدا میں مقامِ اخلاص 90
برگزیدگانِ الٰہی کے سامنے تسلیم کے ذریعے اللہ کی عبادت 94
معرفتِ رسولؐ کی ضرورت 95
حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے شیطان کا متکبرانہ انکار 96
شیطان کا اللہ پر قلبی ایمان نہ رکھنا 100
حاشیہ(2) 101
حجج الٰہی کا مقامِ خلافت 102
خلیفۂ خدا کی عصمت 103
خلفائے الٰہی کی معرفت — محض ذریعہ نہیں بلکہ خود ایک بنیادی تقاضا 105
معرفت اور اخذ — پہچاننا اور ان سے دین حاصل کرنا۔ 106
خلیفۂ خدا کے مقام میں شک 107
برگزیدگانِ الٰہی میں سب سے برگزیدہ 109
چودہ معصومینؑ کی انبیائے الٰہی پر فضیلت 111
چودہ معصومینؑ کی ملائکہ پر فضیلت 113
چودہ معصومینؑ کی فضیلت کا راز 116
چودہ معصومینؑ کی تمام مخلوقات پر فضیلت 117

چودہ معصومینؑ کے مقام کا ادراک سے بالاتر ہونا 119
معرفتِ اہلِ بیتؑ — ہر مقامِ الٰہی کی بنیاد 121
امامؑ — ''وجہ اللہ'' 122
اہلِ بیتؑ کے مقامات کے بارے میں ایک جامع روایت 126
''عین اللہ''، ''لسان اللہ'' اور ''ید اللہ'' 127
ائمہؑ — ''باب اللہ'' 129
معرفتِ امامؑ کے بحرِ بیکراں سے ایک قطرہ 132
امامؑ اپنے زمانے کی یکتا ہستی ہے 134
ائمہؑ کو تفویضِ اختیار — تفویض 139
پہلی روایت میں آنے والی تعبیر: 139
امام صادقؑ کی زبان سے امامؑ کا تعارف 144
باب دوم 148
ایمان اور معرفتِ امامؑ کا باہمی تعلق 148
معرفتِ امامؑ کی ذمہ داری 148
امامؑ کے سلسلے میں امت کی پانچ ذمہ داریاں 149
۱۔ مقامِ نبوت کے علاوہ رسولِ خداؐ کی دیگر صفات و کمالات امامؑ میں بھی موجود ہیں 149
۲۔ امامؑ کی اطاعت، حقیقت میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ہے 151
۳۔ ہر معاملے میں بلا استثنا امامؑ کے فیصلے کے سامنے تسلیم ہونا چاہیے 151
۴۔ ہر معاملے کو امامؑ کی طرف پلٹانا ضروری ہے 151
۵۔ امامؑ کی طرف رجوع کرنے کے بعد انہی کے موقف کو اختیار کرنا چاہیے 152
دوسرا حصہ: مخصوص ائمہؑ کی شناخت 152
زیارتِ جامعہ کبیرہ میں اہلِ بیتؑ کا تعارف 153
ائمہؑ کے خداداد کمالات 153
ذمہ داریِ الٰہی کی ادائیگی میں ائمہؑ کا طرزِ عمل 155

ائمہؑ — حق اور رضائے الٰہی کا معیار 157
باطل عقیدۂ تفویض کی نفی 160
ہمارے لیے اہلِ بیتؑ کی وجودی برکات کی ایک جھلک 162
گناہوں کی بخشش کے لیے رضائے امامؑ کی ضرورت 164
امامؑ — امت کے راعی اور سرپرست 165
امامؑ کو راعی سے تشبیہ دینے کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ 171
معرفتِ امامؑ — تمام خیر کا سرچشمہ 172
اتباعِ امامؑ کی ضرورت کی عقلی بنیاد 173
ائمہؑ — ابوابُ اللہ 174
اصول و فروعِ دین میں انسان کی امامؑ سے نیاز مندی 177
امامؑ — شفیق باپ اور مہربان ماں 179
امامؑ کی ہدایت کی دو صورتیں 181
معرفتِ امامؑ — معرفتِ خدا کی واحد بنیاد 183
صحیح معرفتِ خدا کی تعریف 183
معرفتِ امامؑ کے بغیر معرفتِ خدا ممکن نہیں۔ 183
امامؑ کو راعی سے تشبیہ دینے کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ 187
معرفتِ امامؑ — تمام خیر کا سرچشمہ 188
اتباعِ امامؑ کی ضرورت کی عقلی بنیاد 188
اصول و فروعِ دین میں انسان کی امامؑ سے نیاز مندی 193
امامؑ — شفیق باپ اور مہربان ماں 195
امامؑ کی ہدایت کی دو صورتیں 197
معرفتِ امامؑ — معرفتِ خدا کی واحد بنیاد 198
صحیح معرفتِ خدا کی تعریف 199
قرآن میں ''ہدایت'' اور ''ضلالت'' کا دقیق مفہوم 202

منکرِ ولایت کا شرک 204
انکارِ امامت کے مختلف درجات 206
منکرِ امامؑ — مسلمان ہوتے ہوئے کافر 208
ولایت — توحید کی لازمی شرط 211
امیر المؤمنین علیؑ کا اپنے کلام میں تعارف 213
باب سوم: دینداری میں تولّیٰ اور تبرّیٰ کا کردار 216
حقیقتِ ایمان — اہلِ بیتؑ کی خاطر محبت اور دشمنی 216
عبادت کی روح — اللہ کے حضور فروتنی اور تسلیم 216
مؤمن بندے پر ولایتِ الٰہی کا تصرف 219
اللہ کی خاطر محبت و نفرت — درجۂ ایمان کا معیار 221
ولیِ خدا سے محبت اور دشمنِ خدا سے دشمنی 222
اہلِ بیتؑ — بالذات محبوبانِ خدا 223
مودّت فی القربیٰ — بندگیِ خدا کی روح 225
دشمنانِ خدا سے تبرّیٰ — ایک عبادت 228
۱۔ تبرّیٰ — حقیقی دینداری کے تحقق کا وسیلہ 229
ائمۂ ضلالت کی پیروی 233
تمام جرائم میں ائمۂ کفر کی ذمہ داری 238
۲۔ تولّیٰ و تبرّیٰ — اعمال کی قبولیت اور ردّ کی شرط 239
عبادت کی ظاہری صورت اور ساخت کی اہمیت 242
ایمان اور عملِ صالح — سعادت کی دو لازمی شرطیں 243
تمام اعمال میں ولیِ خدا کی رہنمائی 245
مستضعفین کے نیک اعمال موجبِ استحقاقِ ثواب نہیں 246
ولایتِ اہلِ بیتؑ — دنیا اور اس سے پہلے مخلوقات کے امتحان کا ذریعہ 251
معرفتِ امامؑ — ہر عبادت کی ابتدا اور انتہا 252

تمام حالات میں ولایت کا واجب ہونا 254
معرفت اور انکارِ امامؑ — ایمان و کفر کا معیار 255
مستضعف یا گمراہ شخص 256
منکرِ امامؑ — کافر بھی اور مشرک بھی 257
ائمۂ کفر — اپنے پیروکاروں کے بت 258
مخلوق کی عبادت کرنے کا مفہوم 260
منکرینِ ولایت کا غیر شعوری شرک 261
حصہ دوم، باب سوم 263
دینداری میں تولّیٰ اور تبرّیٰ کا کردار 263
ولایت اور براءت کے آثار و لوازم 263
اہلِ بیتؑ پر صلوات بھیجنے کی اہمیت 264
دشمنانِ خدا پر اللہ کی لعنت 265
دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت 266
دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کے ذریعے اہلِ بیتؑ کی نصرت 270
رضا و سخطِ اہلِ بیتؑ — حق و باطل کا معیار 272
اللہ کی رضا اور سخط کا مفہوم 273
تکوین و تشریع کی بنیاد — محبتِ اہلِ بیتؑ 276
اہلِ بیتؑ سے محبت و بغض کے مطابق جنت و جہنم کے درجات 279
حصہ دوم، باب سوم 280
دینداری میں تولّیٰ اور تبرّیٰ کا کردار 280
ولایت اور براءت کے آثار و لوازم 280
اہلِ بیتؑ پر صلوات بھیجنے کی اہمیت 281
دشمنانِ خدا پر اللہ کی لعنت 282
دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت 283

دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کے ذریعے اہلِ بیتؑ کی نصرت 287
اہلِ بیتؑ کی رضا و سخط — حق و باطل کا معیار 289
رضا و سخطِ الٰہی کا مفہوم 290
تکوین و تشریع کی بنیاد — محبتِ اہلِ بیتؑ 292
اہلِ بیتؑ سے محبت و بغض کے مطابق جنت و جہنم کے درجات 295
حصہ دوم، باب چہارم 297
اہلِ ایمان کی ولایت کے ذریعے نجات 297
معرفتِ اہلِ بیتؑ — انسان کی قدر و قیمت کا معیار 297
دیندار شخص کے گناہ اور بے دین شخص کی نیکی کا تقابل 298
انسان کی دینی شخصیت اور اس کے اعمال میں فرق 300
ائمہؑ کی ولایت کی برکت سے اہلِ ایمان کی نجات 303
گناہوں کی تاریکی 303
اہلِ جنت کی پاکیزگی 305
اوّل: تمام گناہ سنگین ہیں 306
دوم: وہ گناہ جن پر گوشت اور خون پروان چڑھے 306
سوم: گناہوں کے آثار سے پاک ہونے کے دو راستے 307
چہارم: جنت صرف پاکیزہ لوگوں کے لیے ہے 307
مؤمن اور کافر کی موت کی مختلف صورتیں 308
عالمِ برزخ (قبر) میں تطہیر 310
عذابِ برزخ کی دو مثالیں 311
برزخ میں اپنے شیعوں کے بارے میں ائمہؑ کی تشویش 313
عالمِ برزخ میں اہلِ بیتؑ کی شفاعت 315
مؤمنین کے لیے فشارِ قبر 321
عالمِ برزخ میں آگ کے ذریعے عذاب 324

عالمِ برزخ میں انسانوں کی مختلف حالتیں 328
تطہیر اور شفاعت کی مختلف صورتیں 331
حقیقی شیعہ کون ہیں؟ 333
اہلِ ایمان کی نجات کا یقینی مرحلہ 334
رسولِ خداؐ کی رضا اور اہلِ ایمان کی نجاتِ نہائی 337
لایَبقیٰ — ''باقی نہ رہے'' 338
موت کے وقت ایمان 339
ایمانِ مستقر اور ایمانِ مستودع 339
ایمانِ مستقر کے حصول میں توفیقِ الٰہی 342
توفیق بھی اللہ کی طرف سے ہے اور **خذلان** بھی۔ 343
ایمانِ مستقر اور ایمانِ مستودع کی علامت 344
ایک ہی دن میں ایمان سلب ہو سکتا ہے 346
تمام مؤمنین اسی دنیا میں جنت میں ہیں 347
موت تک ایمان کی حفاظت کے لیے دعائیں 348
1۔ ''اے ہمارے پروردگار! ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو منحرف نہ فرما'' 348
2۔ ہر واجب نماز کے بعد ایک دعا 349
3۔ نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کے بعد ایک ذکر 350
4۔ ''مجھے عاریتی ایمان والوں میں قرار نہ دینا'' 351
بابِ پنجم: ایمان اور عمل کا باہمی تعلق 353
ورع کے ذریعے ایمان کی حفاظت 353
موت کے وقت ماں کی ناراضی کا اثر 357
ایمان کی گہرائی اور استحکام میں ورع کا اثر 359
حسنِ عاقبت کا راستہ 361
ورع پر ائمہؑ کی شدید تاکید 361

امام باقرؑ کا اپنے پیروکاروں کے نام پیغام 363
ولایت و محبتِ اہلِ بیتؑ کا اطاعت اور گناہ سے تعلق 365
ایمان اور عمل کا ناقابلِ جدائی تعلق 366
ولایتِ ائمہؑ — ہر خیر کا سرچشمہ 368
دھوکے میں نہ پڑو! 370
محبتِ اہلِ بیتؑ کا گناہ سے روکنے والا اثر 371
محبِّ اہلِ بیتؑ کی مختلف کیفیات 373
محبتِ ائمہؑ اور اعمالِ صالحہ کا باہمی اثر 375
باب دوم: زمانۂ غیبت میں دینداری 377
غضبِ الٰہی اور امامؑ کی غیبت 377
زمانۂ غیبت میں دیندار باقی رہنے کا سخت امتحان 380
زمانۂ غیبت میں یادِ امامؑ کا ماند پڑ جانا 381
بے خبری میں دین کا ہاتھ سے نکل جانا 382
غیبت میں مؤمنین کے امتحانات پر امام صادقؑ کے آنسو 383
زمانۂ غیبت میں دین کی حفاظت 384
غذائے روح کے بارے میں احتیاط 385
اپنے دین میں غریب بن کر زندگی گزارنا 388
باب سوم: معرفتِ امامؑ — زمانۂ غیبت میں حفظِ دین کا واحد راستہ 390
زمانۂ غیبت میں معرفت کے لیے اللہ سے دعا 390
ماثور دعاؤں کی اہمیت 393
زمانۂ غیبت میں دین کھو دینے کا خوف 395
زمانۂ غیبت کی دعاؤں کا بنیادی مضمون 397
زمانۂ غیبت میں ولایتِ امامؑ پر ثابت قدم رہنے کی فضیلت 398
زمانۂ غیبت کے مؤمنین — رسولِ خداؐ کے بھائی 399

زمانۂ غیبت میں حقیقی اہلِ ایمان کی کمی 401
معرفتِ امامؑ ایک قلبی امر ہے۔ 402
حصہ چہارم: معرفتِ امامِ عصرؑ کے آثار اور تقاضے 406
باب اول: معرفت کا صحیح ہونا 406
معرفت کے صحیح ہونے کا معیار 407
صحیح علم کے ذریعے ثبات واستقامت 411
صاحبانِ فہم کے لیے اللہ کی بشارت 413
باب دوم: امامؑ کے بارے میں حکمِ الٰہی کے سامنے تسلیم 416
تسلیم — معرفت کی شرط 416
عدمِ تسلیم کا نتیجہ — شرک اور کفر 418
ائمہؑ کے سامنے تسلیم حاصل کرنے کا راستہ 419
زمانۂ غیبت میں حدیث کے سامنے تسلیم 422
احادیثِ ائمہؑ کو برداشت کرنے کی دشواری 424
حدیث کو محض عدمِ تحمل کی بنا پر ردّ کرنا 426
جب حدیث کا مفہوم حکمِ عقل سے متعارض نظر آئے 428
عقل اور نقل کے درمیان تعارض کی مختلف صورتیں 430
متشابہ آیات وروایات کے بارے میں ہماری ذمہ داری 432
اہلِ بیتؑ کی احادیث کے ستر معانی 434
حدیث کے بارے میں ایک فقیہ کا طرزِ عمل 437
احادیثِ اہلِ بیتؑ کے تحمل کے لیے ائمہؑ کی خاص عنایت کی ضرورت 440
استعجال، تسلیم کے منافی ہے 442
تعجیلِ فرج کی دعا، تسلیم کے عین مطابق ہے 445
دعا، قضائے الٰہی پر رضا کے منافی نہیں 448
تعجیلِ فرج کی دعا کا ظہور کو قریب لانے میں اثر 450

باب سوم: اہلِ بیتؑ سے محبت 451
محبت — کمالِ ایمان کی علامت 451
تسلیم کے ذریعے محبت کا حصول 453
شدتِ محبت کے نتیجے میں امامؑ پر گریہ 454
دوستانِ امامؑ سے دوستی اور دشمنانِ امامؑ سے براءت 457
برادرانِ ایمانی کے حقوق ادا کرنے کی اہمیت 460
دوستانِ امامؑ کی مشکلات دور کرنا 461
باب چہارم — امامؑ کی دائمی یاد 465
یادِ امامؑ کے درجات 466
مجالسِ ذکرِ اہلِ بیتؑ میں شرکت 468
باب پنجم — علومِ ائمہؑ کو سیکھنا اور سکھانا 473
ظہور کو قریب سمجھنا 478
معرفتِ ظہور، علامات پر موقوف نہیں 481
منتظر کی امامؑ کی نصرت کی نیت 484
تجدیدِ بیعت کے ذریعے نصرت کے عزم کا اظہار 488
ایک عمر کے انتظار کا انجام 489
باب ہفتم 495
امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا 495
امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے ائمہؑ کی دعائیں 495
تعجیلِ فرج کی دعا — ہلاکت سے نجات کا ذریعہ 498
زمانۂ غیبت میں امامت سے روگردانی 500
باب ہشتم 501
امامِ عصرؑ کی نصرت 501
اللہ کی نصرت 501

زمانۂ غیبت میں امامؑ کی نصرت 503
زبان کے ذریعے امامؑ کی نصرت 504
باب نہم 508
امامِ عصرؑ کی موجودگی کا شعور 508
مؤمنین کی طرف امامِ عصرؑ کی توجہ 508
زمانۂ غیبت میں امامؑ کی موجودگی کا شعور 510
باب دہم 515
امامِ عصرؑ کے دوستوں کا ورع 515
زمانۂ غیبت میں ائمہؑ کے طریقوں کی پابندی 515
دینداری میں ورع کا کردار 518
ورع کے ذریعے اہلِ بیتؑ کی نصرت 520
زمانۂ غیبت میں شیعوں کی اہم ترین ذمہ داریوں کا خلاصہ 523
اختتامی دعا 524

معرفتِ امامِ عصرؑ

عَجَّلَ اللّٰہُ تَعَالٰی فَرَجَہُ الشَّرِیف

کتاب کا تعارف

مصنف : سید محمد بنی ہاشمی، متولد ۱۳۳۹ ہجری شمسی

نامِ کتاب : معرفتِ امامِ عصر، عَجَّلَ اللّٰہُ تَعَالٰی فَرَجَہُ

مصنف : محمد بنی ہاشمی

امیر المؤمنین امام علیؑ نے فرمایا:

إِنَّ قیمةَ کُلِّ امرِئٍ وَ قَدرَهُ مَعرِفَتُهُ

"بے شک ہر انسان کی قدر و منزلت اس کی معرفت کے مطابق ہے۔"

(بحار الانوار، ج ۲، ص ۱۸۴)

امام محمد باقرؑ نے فرمایا:

فَإِنَّ المَعرِفَةَ هِیَ الدِّرایَةُ لِلرِّوایَةِ، وَ بِالدِّرایَاتِ لِلرِّوایَاتِ یَعلُو المُؤمِنُ إِلی أَقصی دَرَجاتِ الإیمانِ.

"بے شک معرفت، روایت کو سمجھنے اور اس کی حقیقت تک پہنچنے کا نام ہے، اور روایات کی صحیح فہم و درایت ہی کے ذریعے مؤمن ایمان کے بلند ترین درجات تک پہنچتا ہے۔"

(بحار الانوار، ج ۲، ص ۱۸۴)

انتساب

میں اس کاوش کو اپنے عزیز والد اور والدہ کی جانب سے **علمدارِ کربلا، قمرِ بنی ہاشم، حضرت ابوالفضل العباسؑ** کی بارگاہِ اقدس میں پیش کرتا ہوں۔

کتاب کے بارے میں

معرفتِ امامِ عصرؑ ایک ایسی کتاب کا عنوان ہے جس کا بنیادی موضوع خود امامِ عصرؑ کی ذات نہیں، بلکہ **امامؑ کی معرفت** ہے۔

اگرچہ موضوع کی مناسبت سے اس محبوب امامؑ کے بعض اوصاف و کمالات کی معرفت کی جانب بھی کچھ دریچے کھولے گئے ہیں، لیکن اس کتاب کا اصل مقصد **دین میں معرفتِ امامِ عصرؑ کے منفرد مقام و مرتبے** کو واضح کرنا اور اس معرفت کے عملی آثار اور تقاضوں کو بیان کرنا ہے۔

لہٰذا قاری کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ صرف اس کتاب کے مطالعے سے وہ امامِ عصرؑ کی شان کے شایانِ شان معرفت حاصل کر لے گا۔ اس موضوع کے لیے بذاتِ خود ایک مستقل کتاب درکار ہے، جو موجودہ کتاب سے کئی گنا مفصل ہو، اور اہلِ علم و تحقیق کی جانب سے کہیں زیادہ توجہ اور غور و فکر کی مستحق ہے۔

اس مقام پر ہم اپنے محترم قارئین کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کتاب سے زیادہ مکمل اور جامع استفادے کے لیے کتاب **آفتاب در غربت** کے دوسرے حصے کے **پہلے اور دوسرے باب** کا ضرور مطالعہ کریں۔

وہاں بیان کیے گئے نکات، **معرفتِ امامِ عصرؑ** کے بنیادی مقصد کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ تاہم تکرار سے بچنے کی خاطر ان مباحث کو اس کتاب میں دوبارہ نقل نہیں کیا گیا۔

معرفتِ امامِ عصرؑ کی اشاعت کو آٹھ سال گزرنے کے بعد اب اس کا تیسرا ایڈیشن، درج ذیل اصلاحات اور اضافوں کے ساتھ، اس عظیم المرتبت امامؑ کے محبّوں کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ کتاب کے الفاظ و مطالب کی مکمل نظرِ ثانی اور تدوین کی گئی ہے اور ہر مقام پر ضروری اصطلاحات کو مناسب انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ کتاب کے تمام حصوں، خصوصاً دوسرے حصے میں، جہاں ضرورت محسوس ہوئی، نئے مطالب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۳۔ دوسرے ایڈیشن (۱۳۷۹ ہجری شمسی) میں **"ضمیمۂ حصۂ اوّل"** کے عنوان سے شامل کیے گئے مطالب کو اب دوسرے حصے میں ان کے مناسب مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے۔

۴۔ کتاب کے ابواب اور مباحث کو زیادہ منظم انداز میں **چار حصوں اور مجموعی طور پر بیس ابواب** میں مرتب کیا گیا ہے، اور ہر باب کے مباحث کو واضح ذیلی عنوانات کے تحت منظم کیا گیا ہے۔

حصہ اوّل

پہلے حصے میں کوشش کی گئی ہے کہ **"معرفتِ امامِ عصرؑ"** کا واضح مفہوم پیش کیا جائے اور اللہ کی بندگی کے پورے نظام میں اس معرفت کے مقام کو صحیح طور پر بیان کیا جائے؛ وہ بندگی جو انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد ہے۔

اسی طرح **اسلام، ایمان، کفر، شرک** اور اس نوع کے دوسرے مفاہیم کے صحیح معنی متعین کرنے میں **معرفتِ امامؑ** کے بنیادی کردار کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

حصہ دوم

دوسرے حصے میں **معرفتِ امامؑ** کے مفہوم کو مزید گہرائی سے سمجھنے اور مجموعۂ تعلیماتِ دین میں اس کے منفرد مقام و اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس ضمن میں **اہلِ بیتِ طہارت و عصمتؑ** کے بعض مخصوص کمالات اور فضائل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد دین داری میں **تولّیٰ اور تبرّیٰ** کے کردار کو بیان کیا گیا ہے، اور پھر معرفتِ امامؑ کا اللہ کی اطاعت اور معصیت سے تعلق واضح کیا گیا ہے۔

حصہ سوم

تیسرا حصہ **زمانۂ غیبت میں معرفتِ امامِ عصرؑ کی قدر و اہمیت** کے بیان سے مخصوص ہے۔

حصہ چہارم

آخر میں چوتھے حصے کے دس ابواب میں **اس معرفت کے آثار اور عملی تقاضوں** کو بیان کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ ناچیز کاوش **حضرت قمرِ بنی ہاشم، ابوالفضل العباسؑ** کی عنایت و تائید سے **حضرت بقیۃ اللہؑ — ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں** — کی بارگاہِ مقدس میں شرفِ قبولیت حاصل کرے، آپؑ کے محبّوں کے دلوں کو استحکام بخشے اور آپؑ کے دوستوں اور پیروکاروں کے لیے مفید ثابت ہو۔

سید محمد بنی ہاشمی

اردی بہشت ۱۳۸۳ ہجری شمسی — ربیع الاوّل ۱۴۲۵ ہجری قمری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بے حد حمد و شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے اس ناچیز بندے کو **"معرفتِ امامِ عصرؑ"** سے متعلق روایات کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد گزرنے والے چار برسوں کے دوران اس عظیم المرتبت امامؑ کے بہت سے محبّوں نے اس سے استفادہ کیا، اور وہ سب ان روایات پر ایمان رکھنے اور ان پر عمل کرنے کے زیادہ سزاوار ہیں۔

میں ان تمام عزیز بھائیوں اور بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کتاب کے مصنف کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور دعا کریں کہ اللہ اسے اس کتاب میں بیان شدہ تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اسے ان کی خالص دعاؤں سے محروم نہ رکھے۔

"معرفتِ امامِ عصرؑ" کے موضوع سے متعلق بحث کی بنیادی اساس میں سے ایک، خود **معرفت** کا موضوع اور اس کے احکام، خصوصیات اور بنیادی اوصاف ہیں۔

شاید ان میں سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ **معرفت ایک ایسی حقیقت ہے جو اللہ کی عطا اور اس کی تخلیق ہے۔**

اگرچہ کتاب کے مطالب کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ بحث نہایت ضروری اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ابتدا میں اس موضوع کی کافی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ اسی وجہ سے کتاب کے ابتدائی مباحث کے بارے میں بعض سوالات اور ابہامات پیدا ہوئے۔

چنانچہ مصنف نے اپنی محدود استطاعت کے مطابق **معرفت، اس کے اصول اور خصوصیات** کے متعلق ایک مستقل بحث مرتب کرنے کی کوشش کی۔

ابتدا میں ارادہ یہ تھا کہ اس بحث کو کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے مقدمے کے طور پر شائع کیا جائے، لیکن چونکہ یہ بحث طول پکڑ گئی اور معرفتِ امامؑ کے مخصوص موضوع سے آگے بڑھ کر ایک مستقل موضوع کی صورت اختیار کر گئی، اس لیے بالآخر اسے **گوہرِ قدسیِ معرفت** کے نام سے ایک علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ کتاب ۱۳۷۸ ہجری شمسی کے آغاز میں شائع ہوئی۔

اس بنا پر **گوہرِ قدسیِ معرفت** درحقیقت **معرفتِ امامِ عصرؑ** کی تکمیل کرنے والی کتاب اور اس کے بنیادی مقدمات میں سے ایک ہے۔

اس کے مطالعے کے بغیر **معرفتِ امامِ عصرؑ** سے متعلق مباحث کو مکمل طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

لہٰذا اس کتاب کے محترم قارئین سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ **گوہرِ قدسیِ معرفت** کے دقیق اور سنجیدہ مطالعے کو نظرانداز نہ کریں۔

اب جبکہ پروردگار کے فضل و کرم سے **معرفتِ امامِ عصرؑ** کا دوسرا ایڈیشن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، کتاب کی ایک اور کمی کو آخر میں ایک ضمیمہ شامل کر کے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس ضمیمے کا عنوان ہے:

"ائمۂ ہدایتؑ سے تولّیٰ کے ساتھ ائمۂ کفر سے تبرّیٰ"

اس میں **تبرّیٰ، یعنی ائمہؑ کے دشمنوں سے بیزاری** کے نہایت اہم موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

اگرچہ اصل کتاب میں معرفت اور ولایتِ امامؑ کے مباحث کے ضمن میں **براءت** کا موضوع متعدد مقامات پر زیرِ بحث آیا ہے، لیکن کتاب کی مجموعی ساخت میں ابتدا سے اس موضوع کے لیے کوئی مستقل بحث موجود نہیں تھی۔

اب امامِ عصرؑ کے فضل اور خصوصی عنایت سے اس کمی کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

امید ہے کہ محترم قارئین کی مفید آراء اور رہنمائی کے ذریعے آئندہ کتاب کی دیگر خامیوں کو بھی بتدریج دور کیا جا سکے گا۔

اے اللہ! ہمارے آقا، صاحبِ عصرؑ کے ظہور میں، خود ان کے وسیلے سے اور ان کے پاک و مطہر آباء و اجدادؑ کے وسیلے سے، تعجیل فرما۔

سید محمد بنی ہاشمی

شہریور ۱۳۷۹ ہجری شمسی

پہلے ایڈیشن کا مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم میں سے اکثر لوگوں نے کم از کم کسی حد تک یہ مشہور حدیث ضرور سنی ہے:

مَن ماتَ وَ لَم یَعرِف اِمامَ زَمانِهِ ماتَ میتَةً جاهِلِیَّةً

"جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اپنے زمانے کے امام کو نہ پہچانتا ہو، وہ جاہلیت کی موت مرا۔"

یہ روایت رسولِ اکرمؐ سے شیعہ اور اہلِ سنت دونوں کے مصادر میں نقل ہوئی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص **معرفتِ امامِ زمانہؑ** کے بارے میں اپنے تصور کے مطابق اس حدیث کا مفہوم سمجھتا ہے۔

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ یہ معرفت صرف امامؑ کے نام اور نسب کو جان لینے سے حاصل نہیں ہوتی؛ کیونکہ امامؑ کا انکار کرنے والے، بلکہ غیر مسلم افراد بھی ان کے نام اور نسب کے بارے میں معلومات رکھ سکتے ہیں۔

لہٰذا اس حدیثِ شریف میں **معرفت** سے مراد محض اس قسم کی معلومات سے کہیں بڑھ کر کوئی حقیقت ہے۔

ہر شخص اپنی فہم اور معرفت کی وسعت کے مطابق اس گہرے مفہوم کی تشریح کر سکتا ہے۔

اس کے باوجود ممکن ہے کہ اس مرحلے پر بھی اس موضوع کی حقیقی اہمیت ہمارے لیے پوری طرح واضح نہ ہوئی ہو۔

اس کی عظمت اس وقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب ہم ان روایات سے روبرو ہوتے ہیں جن میں ایک طرف امامؑ کی معرفت نہ رکھنے کے نتائج اور دوسری طرف آپؑ کی معرفت رکھنے کے آثار بیان کیے گئے ہیں۔

انہی میں سے ایک نورانی روایت **امام محمد باقرؑ** سے منقول ہے:

مَن ماتَ وَ لَیسَ لَهُ اِمامٌ، فَمیتَتُهُ میتَةٌ جاهِلِیَّةٌ. وَ مَن ماتَ وَ هُوَ عارِفٌ لِاِمامِه، لَم یَضُرُّهُ تَقَدَّمَ هذَا الاَمرُ اَو تَاَخَّرَ. وَ مَن ماتَ وَ هُوَ عارِفٌ لِاِمامِه، کانَ کَمَن هُوَ مَعَ القائِمِ علیه السّلام فی فُسطاطِهِ.

"جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اس کا کوئی امام نہ ہو، اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔ اور جو شخص اپنے امام کی معرفت رکھتے ہوئے مرے، اسے اس بات سے کوئی نقصان نہیں کہ یہ امر جلد واقع ہو یا تاخیر سے۔ اور جو اپنے امام کی معرفت رکھتے ہوئے مرے، وہ اس شخص کی مانند ہے جو قائمؑ کے ساتھ ان کے خیمے میں موجود ہو۔"

)اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۷۳، کتاب الحجۃ، باب: ''جو اپنے امام کو پہچانتا ہو...''، حدیث ۵(

اب معاملہ کہیں زیادہ گہری اہمیت اختیار کر لیتا ہے اور فطری طور پر ایک بنیادی سوال سامنے آتا ہے:

آخر معرفتِ امامؑ کو اتنی عظیم اہمیت کیوں حاصل ہے؟ امامؑ کی یہ کیسی معرفت اور پہچان ہے جو انسان کے لیے اتنے عظیم آثار اور برکات کا سبب بن سکتی ہے؟

حضرت امام مہدیؑ کے زمانۂ ظہور کو پانا اور آپؑ کے خیمے میں حاضر ہونا ایک عظیم نعمت اور آپؑ کے محبّوں کی سب سے بڑی آرزوؤں میں سے ہے۔

تو پھر **معرفتِ امامؑ** کی وہ کون سی حقیقت ہے جس کا اثر اتنی عظیم فضیلت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے؟ اور یہ معرفت کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ ان سوالات کا واضح اور سادہ جواب پیش کیا جائے، تاکہ قاری اس کے مطالعے کے ذریعے حتی الامکان اس موضوع کے مختلف پہلوؤں سے آشنا ہو سکے اور اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو پہچان سکے۔

ان مطالب کی وضاحت کے لیے اختیار کیا گیا طریقہ صرف اور صرف **اہلِ بیتؑ کی روایات سے رجوع** پر مبنی ہے۔ محض عقلی قیاس، ذاتی رائے اور گمان پر مبنی ترجیحات سے جان بوجھ کر اجتناب کیا گیا ہے۔

اسی وجہ سے پوری کتاب میں بڑی تعداد میں روایات نقل کی گئی ہیں۔ بعض مقامات پر ایک روایت کی وضاحت ایک یا متعدد دوسری روایات کے ذریعے کی گئی ہے۔

اس اعتبار سے یہ کتاب بنیادی طور پر **''معرفتِ امامؑ'' سے متعلق روایات کے درمیان ایک علمی سفر** ہے، جس میں ان روایات کے بارے میں صرف مختصر توضیحات پیش کی گئی ہیں۔

لہٰذا اہلِ علم، محققین اور متخصصین کے لیے ان مباحث کی مزید دقیق جانچ، تجزیے اور گہری تحقیق کی وسیع گنجائش باقی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ، تاکہ عربی زبان سے ناواقف قارئین کے لیے کتاب کا مطالعہ دشوار یا تھکا دینے والا نہ ہو، **تمام روایات کا، بلا استثنا، مکمل اور دقیق ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔**

اس طرح عربی زبان سے ناواقف محترم قارئین بھی صرف تراجم پڑھ کر کتاب کے مباحث کو سمجھ سکتے ہیں۔

کتاب کی ترتیب

کتاب **دو حصوں** پر مشتمل ہے:

۱۔ معرفتِ امامِ عصرؑ کی اہمیت

۲۔ زمانۂ غیبت میں معرفتِ امامِ عصرؑ

حصۂ اوّل

پہلے حصے کا آغاز عمومی طور پر **معرفتِ امام کی اہمیت** اور مجموعۂ عقائد میں اس کے مقام و مرتبے کے نسبتاً تفصیلی بیان سے ہوتا ہے۔

یہ بحث بنیادی طور پر اعتقادی اور کلامی نوعیت کی ہے۔

اس کے بعد ان مباحث کا اطلاق خصوصاً **حضرت امام مہدیؑ کو موجودہ زمانے کے امام کی حیثیت سے پہچاننے** پر کیا گیا ہے۔

حصۂ دوم

دوسرے حصے کا آغاز زمانۂ غیبت کی خصوصیات اور حالات کے مختصر بیان سے ہوتا ہے۔

خصوصی توجہ اس حقیقت پر دی گئی ہے کہ **زمانۂ غیبت میں دین پر ثابت قدم رہنا نہایت دشوار ہے۔**

اس کے بعد دوسرے باب میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ **زمانۂ غیبت میں اپنے دین کی حفاظت کا واحد ذریعہ معرفتِ امامؑ ہے۔**

تیسرے باب میں یہ بحث کی گئی ہے کہ زمانۂ غیبت میں معرفتِ امامؑ کس طرح حاصل ہوتی ہے، اس معرفت کی خصوصیات کیا ہیں اور یہ اپنے حاملین میں کیا آثار پیدا کرتی ہے۔

یہ بحث درج ذیل عنوان کے تحت پیش کی گئی ہے:

"معرفتِ امامِ عصرؑ کیسے حاصل کی جائے؟"

یہ باب پوری کتاب کا **عملی نتیجہ اور اس کے مباحث کا نچوڑ** ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے راستہ کھولتا ہے جو معرفتِ امامؑ کے مشتاق ہیں۔

امید ہے کہ یہ باب آپؑ کے تمام محبّوں اور پیروکاروں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

آخر میں، میں **حضرت ولیِ عصرؑ** کی بارگاہِ مقدس میں ان تمام کوتاہیوں اور خطاؤں پر معذرت خواہ ہوں جو روایات سے استفادے یا ان کی توضیح و تشریح میں مجھ سے سرزد ہوئی ہوں۔

اسی طرح اپنے عزیز قارئین سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ کتاب میں پائی جانے والی کسی لغزش یا کمی کو عفو و درگزر کی نگاہ سے دیکھیں۔

شہریور ۱۳۷۵ ہجری شمسی

سید محمد بنی ہاشمی

حصۂ اوّل: بندگیِ خدا کی قدر و کیفیت

تمہید

باب اوّل: معرفت کے ساتھ عبادت —— تخلیقِ انسان کا مقصد

افعالِ الٰہی میں غرض مندی کا صحیح مفہوم

تمہید

جب ہم **افعالِ الٰہی میں غرض مندی** کی بات کرتے ہیں تو یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی مانند نہیں ہے کہ پہلے اپنے لیے ایک یا چند مقاصد متعین کرے اور پھر ان مقاصد تک پہنچنے کے لیے کچھ افعال انجام دے۔

پروردگار کی ذاتِ مقدس کے بارے میں ایسا تصور درست نہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ بعض محرکات اور اسباب سے متأثر ہو کر کسی فعل کے انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ یہ مخلوقات کی خصوصیت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی نسبت دینا **تشبیہ** کا مصداق ہو گا۔

فاعل کی غرض اور فعل کی غرض

بعض لوگوں نے انسانی افعال اور افعالِ الٰہی کی غرض مندی کے فرق کو اس طرح بیان کیا ہے:

انسان اپنے افعال کے ذریعے اپنے کسی نقص کو دور کرنا چاہتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے نقص سے منزّہ ہے۔ لہٰذا اس کے افعال میں غرض کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے کسی نقص کو دور کرنا چاہتا ہے، بلکہ فعلِ الٰہی کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی مخلوق کا نقص دور ہو۔

مثلاً انسان جب پانی پیتا یا کھانا کھاتا ہے تو اس کا مقصد اپنی پیاس یا بھوک کو دور کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر موجود ایک کمی کو دور کرتا اور اس کمال تک پہنچتا ہے جو پہلے اسے حاصل نہیں تھا۔

اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ انسان کے فعل کی غرض دراصل **فاعل کی غرض** ہوتی ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے افعال میں یہ معنی درست نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی فعل کو اس لیے انجام نہیں دیتا کہ اپنی کوئی حاجت پوری کرے یا کسی ایسے کمال و سعادت تک پہنچے جو پہلے اسے حاصل نہ تھی۔

اللہ تعالیٰ کی غرض یہ ہے کہ اس کی مخلوقات ان کمالات تک پہنچیں جو ان کے شایانِ شان ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ انسان کو خلق کرتا ہے اور پھر اسے ایسے راستے پر قرار دیتا ہے جس پر چل کر وہ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ یوں انسان کے نقائص دور ہوتے ہیں اور وہ اپنے مناسب کمالات کی طرف بڑھتا ہے۔

انسان میں ان کمالات کا تحقق، بظاہر، اس کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی غرض قرار دیا جا سکتا ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ کمالات **خود انسان کی غایت** ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کی غرض یہ قرار دی جاتی ہے کہ اس کی مخلوق کمال تک پہنچے۔

اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ افعالِ الٰہی میں غرض، **فعل کی غرض** ہے، اور یہاں ''فعل'' سے مراد خود مخلوقات ہیں۔

لیکن کیا یہ وضاحت واقعی اللہ تعالیٰ کو مخلوقات سے تشبیہ دینے کے اشکال کو حل کر دیتی ہے؟

فعل کی غایت یا علتِ غائی

جواب یہ ہے کہ **فعل کی غرض** کو بھی حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے افعال کی غایت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

غایت اس چیز کو کہتے ہیں جو فاعل کو فعل انجام دینے پر آمادہ کرے۔

مثلاً پانی پینے میں انسان کی غایت اپنی پیاس بجھانا ہے، جو اس کے لیے ایک طرح کا کمال ہے۔ یہی مطلوب کمال اسے پانی پینے پر آمادہ کرتا ہے۔

اس طرح فعل کی غایت، فاعل کے فعل انجام دینے کا سبب بن جاتی ہے۔

جو چیز فاعل کو فعل پر آمادہ کرے اسے **غایت** یا **علتِ غائی** کہا جاتا ہے۔

اسی لیے فلاسفہ کہتے ہیں:

"علتِ غائی، علتِ فاعلی کی علت ہے۔"

زیرِ بحث نظریے کے مطابق، افعالِ الٰہی میں یہ غایت وہ کمال ہوگا جو مخلوق کو حاصل ہوتا ہے۔

پس مخلوقات کو خلق کرنے میں اللہ تعالیٰ کی غرض یہ ہوگی کہ وہ انہیں ان کے مناسب کمالات تک پہنچائے۔

اس صورت میں مخلوق کا کمال، اللہ تعالیٰ کو فعل پر آمادہ کرنے والی غایت قرار پائے گا۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ افعالِ الٰہی کے لیے **غایت** قرار دینا، خواہ اسے "فعل کی غرض" ہی کیوں نہ کہا جائے، پھر بھی درست نہیں؛ کیونکہ بالآخر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کسی محرک یا داعی سے متاثر ہو کر فعل انجام دیتا ہے۔

اصل اشکال یہ ہے کہ غرض کو، اگرچہ "فعل کی غرض" کہا جائے، بالآخر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے۔

کہا جاتا ہے:

"اللہ تعالیٰ کی غرض یہ ہے کہ اپنی مخلوق کو کمال تک پہنچائے۔"

لیکن جیسے ہی ہم اللہ تعالیٰ کی طرف غرض مندی کی نسبت دیتے ہیں، **غایت** کا مفہوم ـــــ یعنی وہ چیز جو فاعل کو فعل پر آمادہ کرے ـــــ ذاتِ مقدسِ الٰہی کے بارے میں ہمارے تصور میں داخل ہو جاتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس مفہوم کا ذاتِ الٰہی سے کوئی تعلق نہیں، تو سوال یہ ہوگا:

پھر اس بات کا کیا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فعل کی آخری غرض، "فعل کی غرض" ہے؟

اور اگر بہر حال اس غرض کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے ـــــ اور بظاہر اس نسبت سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ـــــ تو لازماً یہ نتیجہ نکلے گا کہ ذاتِ مقدسِ پروردگار کسی نہ کسی معنی میں محرکات اور دواعی سے متاثر ہوتی ہے۔

لہٰذا اگر مقصدِ تخلیق کی وضاحت اس طرح بھی کی جائے:

"میں نے اس لیے خلق نہیں کیا کہ مجھے کوئی فائدہ حاصل ہو، بلکہ اس لیے خلق کیا کہ اپنے بندوں پر جود و بخشش کروں۔"

تب بھی اللہ تعالیٰ کو مخلوقات سے تشبیہ دینے کا اشکال باقی رہتا ہے۔

کیونکہ بالآخر ہم نے کسی چیز، یعنی **جود و بخشش اور مخلوقات کو فائدہ پہنچانے** کو اللہ تعالیٰ کے فعل کا محرک اور مؤثر عامل قرار دے دیا۔

اور یہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف نقص کی نسبت دینے کے مترادف ہے۔

جس موجود کی ذات یا اس کے افعال کسی نہ کسی طرح اپنے علاوہ کسی چیز سے متاثر ہوں، وہ مطلقاً بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے وہ احتیاج و وابستگی میں مخلوقات سے مشابہ ہو گا۔

داعی زائد بر ذات یا عینِ ذات؟

ممکن ہے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کے لیے کسی داعی یا محرک کو ماننا صرف اس صورت میں غلط ہو گا جب وہ داعی **ذاتِ مقدس سے زائد** ہو۔

لیکن اگر داعی خود ذاتِ الٰہی کے عین ہو، تو اللہ تعالیٰ اپنے علاوہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہو گا اور نہ ہی کسی غیر کا محتاج ہو گا۔

لیکن یہ مفروضہ اس سے بھی زیادہ بنیادی اشکال رکھتا ہے۔

داعی کا مفہوم ہی یہ ہے کہ فاعل کی ذات کے علاوہ کوئی چیز اسے فعل پر آمادہ کرے۔

یہ تصور معنی نہیں رکھتا کہ کسی شے کی ذات خود ہی اپنے فعل کا محرک بن جائے۔

غایت وہ چیز ہے جو فاعل کو فعل پر آمادہ کرتی ہے۔ اگر غایت خود فاعل ہی کے عین ہو تو اس کا لازمی مطلب یہ ہو گا کہ فاعل خود اپنے آپ کو فعل پر آمادہ کر رہا ہے۔

اور یہ بات بے معنی ہے۔

اگر خود ذات کا وجود فعل کے صدور کے لیے کافی ہے تو کسی الگ ''داعی'' کی ضرورت ہی نہیں۔

اور اگر ذات کا وجود کافی نہیں تو پھر داعی کو عینِ ذات کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس نکتے پر خاص توجہ کیجیے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہاں جس فاعل کی بات ہو رہی ہے ـــــ یعنی ذاتِ مقدسِ پروردگار ـــــ وہ ایسی ذات ہے جس **میں کسی قسم کی کثرت اور تعدد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔**

لہٰذا یہ فرض کرنا ممکن نہیں کہ ذاتِ الٰہی کا ایک پہلو دوسرے پہلو کے لیے داعی بن جائے۔

پس اگرچہ لفظی طور پر ہم **"داعی عینِ ذات"** کی تعبیر استعمال کر سکتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس سے کوئی بامعنی تصور بیان نہیں ہوتا۔

اصولی طور پر کسی فعل کے داعی یا محرک کا تصور ایسی ذات پر منطبق ہی نہیں ہو سکتا جو کسی بھی طرح متاثر ہونے سے منزّہ ہو۔

اس طرح کی تعبیر کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسا مفہوم منسوب کرتے ہیں جو حقیقتاً اس پر صادق نہیں آتا، اور یہی نسبت نادرست ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کسی مکان میں ہے، لیکن چونکہ مکان میں ہونا نقص اور محدودیت کا تقاضا کرتا ہے، اس لیے پھر کہا جائے:

"اللہ تعالیٰ مکان میں ہے، لیکن اس کا مکان مادی یا جسمانی نہیں"!

حالانکہ اصل مفروضہ ہی غلط ہے۔

مکان میں ہونا اپنی حقیقت میں جسمانیت سے وابستہ ہے، اس لیے **غیر مادی مکان** میں ہونے کا تصور بذاتِ خود متناقض ہے۔

اسی طرح **غرض اور غایت** کے مفاہیم، جس حد تک ہمارے لیے قابلِ فہم اور بامعنی ہیں، لازماً اس بات کو شامل ہیں کہ صاحبِ غرض کسی نہ کسی طرح اپنے علاوہ کسی چیز سے متاثر ہو۔

اسی لیے ذاتِ مقدسِ پروردگار کی طرف اس طرح کے مفہوم کی نسبت دینا اس کی تنزیہ اور مطلق پاکیزگی کے منافی ہے۔

افعالِ الٰہی میں حکمت

البتہ افعالِ الٰہی سے غرض مندی کی نفی، اس معنی میں جس کی اوپر وضاحت ہوئی، ہرگز یہ نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف بے مقصد یا عبث افعال کی نسبت دیں۔

ہمارا قطعی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ **حکیم** ہے، اور عقلاً اس کی ذاتِ مقدس کی طرف کسی قسم کے عبث یا بے حکمت فعل کی نسبت نہیں دی جاسکتی۔

لیکن افعالِ الٰہی کا حکیمانہ ہونا لازماً اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو مخلوقات پر قیاس کرکے اس کی غرض مندی کی تشریح و تحلیل کریں۔

چونکہ عقلی ضرورت کی بناپر ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے نقص و عیب سے منزّہ ہے، اس لیے اجمالاً یہ تسلیم کرتے ہیں کہ **اللہ تعالیٰ سے کوئی غیر حکیمانہ فعل صادر نہیں ہوسکتا۔**

لیکن یہ عقیدہ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ حکمتِ الٰہی کو مخلوقات سے تشبیہ اور قیاس کے ذریعے بیان کریں۔

اس موضوع کی تفصیلی تحقیق مزید دقت اور غور کی محتاج ہے، جسے اس کے مناسب مقام پر بیان کیا جائے گا۔

خالق کی غرض یا مخلوق کی غرض؟

بہر حال، گزشتہ بحث کا مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ :

جب ہم اللہ تعالیٰ کے افعال میں غرض کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد کوئی ایسی چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ کو فعل پر آمادہ کرے۔

بلکہ اس کا صحیح مفہوم خود **مخلوقات** کے حوالے سے تلاش کرنا چاہیے۔

موجودہ بحث میں ہماری مراد بالخصوص وہ مخلوقات ہیں جو **عقل اور اختیار** رکھتی ہیں۔

لہٰذا غرض کا مطلب اس **الٰہی تکلیف اور شریعت** کی تکمیل سمجھا جاسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مختار اور مکلف مخلوقات کے لیے مقرر فرمائی ہے۔

پس تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی غرض سے مراد وہ مقصد ہے جو اللہ تعالیٰ نے **اپنی مخلوقات کے لیے مقرر کیا ہے۔**

اگر وہ اپنے پروردگار کے مقرر کردہ راستے پر چلیں تو اس مقصد تک پہنچ جائیں گی جس کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔

اور اگر وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں تو اس مقصد تک نہیں پہنچیں گی۔

لہٰذا:

ہر صاحبِ اختیار مخلوق کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کے مطالبے کے مطابق عمل کرے۔

غرض مندی کا یہ مفہوم اس غرض یا غایت سے بالکل مختلف ہے جو فاعل کو فعل پر آمادہ کرنے والی علت ہوتی ہے۔

یہاں ہم اللہ تعالیٰ کے فعل کے محرک کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہے اور نہ یہ پوچھ رہے ہیں کہ کس چیز نے اللہ تعالیٰ کو تخلیق پر آمادہ کیا۔

ہماری گفتگو صرف اس **مقصد کے بارے میں ہے جسے عاقل اور مختار مخلوقات کو اختیار کرنا چاہیے۔**

غرض مندی کے اس مفہوم کے مطابق، مخلوقات اس الٰہی مقصد کی طرف بڑھیں یا اپنے اختیار کے غلط استعمال کے سبب اس تک نہ پہنچیں، **دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق بامقصد ہے۔**

یہ بات عاقل و مختار مخلوقات، خصوصاً انسانوں، کے بارے میں ہے۔

وہ مخلوقات جو اختیار نہیں رکھتیں، ان کے بارے میں غرض مندی کی وضاحت ایک الگ بحث کی محتاج ہے، جو ہمارے موجودہ موضوع سے خارج ہے۔

لہٰذا جب بھی **کتابِ خدا یا اہلِ بیتؑ کے نورانی کلمات** میں انسان یا کسی دوسری صاحبِ اختیار مخلوق کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے مقصد کا ذکر ہو، تو اسے اسی صحیح معنی میں سمجھنا چاہیے۔

تمہید

ہم سب یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسان کو خلق کرنے میں اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کیا مقصد مقرر فرمایا ہے، تاکہ ہم اپنے آپ کو اس مقصد سے ہم آہنگ کریں اور اس راستے پر چلیں جو ہمارے خالق نے ہمارے لیے مقرر فرمایا ہے۔

آخر انسان کی زندگی کا مقصد خود اس کے خالق کے سوا اور کون متعین کر سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ فرمایا:

وَما خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

"اور میں نے جنّ وانس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔"

(سورۂ ذاریات، ۵۶:۵۱)

جیسا کہ واضح ہے، جنّ وانسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ مقصد یہ ہے کہ وہ **اس کی بندگی اور عبادت** کا فریضہ انجام دیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا کہ میں نے انہیں اس لیے خلق کیا تاکہ خود کسی خاص مقصد تک پہنچوں۔

بلکہ تخلیق کا مقصد ایک ایسی چیز کو قرار دیا گیا ہے جس کا تحقق **جنّ وانسان کے اختیار** میں ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا مقصد در حقیقت وہ مقصد ہے جو **اس نے اپنی مخلوقات کے لیے مقرر فرمایا ہے** اور ان سے چاہا ہے کہ وہ اس کی طرف بڑھیں۔

یہ مقصد **اللہ تعالیٰ کی بندگی** کے سوا کچھ نہیں۔

لیکن یہ بندگی جبری اور غیر اختیاری نہیں ہونی چاہیے۔

ورنہ یہ انسان کے اختیار کے منافی ہو گی، جبکہ اختیار خود انسان کو عطا کیے گئے عظیم ترین کمالات میں سے ہے۔

لہٰذا وہ عبادت جسے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کا مقصد قرار دیا ہے، **اختیاری عبادت** ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو بندگی کا راستہ دکھاتا ہے، لیکن اسے اس کی مرضی اور اختیار کے برخلاف اس راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان سے اپنی بندگی کا مطالبہ کیا ہے۔

یہ مطالبہ **ارادۂ تشریعی** ہے، **ارادۂ تکوینی** نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے **ارادۂ تکوینی** کے تحقق میں انسان کے اختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

مثلاً اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ ہر انسان ایک خاص ماں اور باپ سے پیدا ہو۔ یہ اس کا ارادۂ تکوینی ہے اور اس کے تحقق میں انسان کی خواہش اور اختیار کا کوئی کردار نہیں۔

کبھی اس ارادۂ الٰہی کو **"امر"** سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

امرِ تکوینی سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ ارادۂ تکوینی ہے جس کا تحقق حتمی اور غیر اختیاری ہوتا ہے اور جو ذاتِ مقدسِ پروردگار کے سوا کسی کی خواہش وارادے پر موقوف نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ

"اس کا امر تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے: 'ہو جا'، پس وہ ہو جاتی ہے۔"

(سورۂ یٰسٓ، ۳۶: ۸۲)

یہ اللہ تعالیٰ کا **ارادۂ تکوینی** ہے۔

لیکن ارادۂ الٰہی کی ایک دوسری قسم بھی ہے، یعنی **ارادۂ تشریعی**۔

اس کا اظہار ان اوامر ونواہی کے ذریعے ہوتا ہے جو عقل واختیار رکھنے والی مخلوقات، مثلاً انسانوں، کو دیے گئے ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:

"نماز قائم کرو۔"

(سورۂ بقرہ، ۲: ۴۳)

اور غیبت سے منع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔"

(سورۂ حجرات، ۴۹:۱۲)

ان موارد میں اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ انسان نماز ادا کرے اور غیبت سے پرہیز کرے۔

لیکن اس ارادے کا عملاً پورا ہونا انسان کے **اختیار** پر منحصر ہے۔

انسان اپنے اختیار سے اللہ کے حکم کو ترک اور اس کی ممانعت کی خلاف ورزی کر سکتا ہے۔

وہ نماز چھوڑ سکتا اور غیبت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا **ارادۂ تشریعی** ہے، اور ضروری نہیں کہ خارج میں لازماً واقع ہو۔

اللہ تعالیٰ نے خود چاہا ہے کہ انسان اختیار رکھتے ہوئے، اپنی مرضی سے، اپنے آپ کو پروردگار کے ارادۂ تشریعی کے راستے پر قرار دے۔

انسان کا صاحبِ اختیار ہونا خود اللہ تعالیٰ کے **ارادۂ تکوینی** کا نتیجہ ہے۔

انسان یہ انتخاب نہیں کرتا کہ وہ مختار ہو یا نہ ہو؛ اسے مختار ہی پیدا کیا گیا ہے۔

لیکن جب اسے اختیار کے ساتھ خلق کر دیا گیا تو وہ اپنے خالق کے اوامر و نواہی کا مخاطب قرار پایا، تاکہ اپنے اختیار کے صحیح استعمال کے ذریعے خود کو بندگی کے راستے پر گامزن کرے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا:

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ

"اور تمہارے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔"

(سورۂ اسراء، ۱۷:۲۳)

یہ **قضائے تشریعی** ہے، نہ کہ قضائے تکوینی۔ اس کا عملی تحقق خود انسان کے اختیار پر چھوڑا گیا ہے۔

مذکورہ مطالب کی روشنی میں، زیرِ بحث آیت میں ـــ جہاں تخلیقِ انسان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی بیان کیا گیا ہے ـــ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لیے صرف اوامر و نواہی جاری کیے جاتے ہیں۔

بندہ ان کی اطاعت کرتا ہے یا نافرمانی، یہ خود اس کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اسی لیے **امام جعفر صادقؑ** نے اس آیتِ شریفہ کی تفسیر میں فرمایا:

خَلَقَهُمْ لِيَأْمُرَهُمْ بِالْعِبَادَةِ

"اس نے انہیں اس لیے پیدا کیا تاکہ انہیں اپنی عبادت کا حکم دے۔"

(بحار الانوار، ج ۵، ص ۳۱۴، حدیث ۵، بحوالہ علل الشرائع)

پس اس آیتِ شریفہ کے ترجمے میں **"مقصد"** سے مراد، جنّ و انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے **ارادۂ تشریعی** کے سوا کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ جنّ و انسان کو ـــ جو صاحبِ اختیار ہیں ـــ بندگی کا راستہ دکھاتا ہے، پھر وہ اپنے اختیار سے یا تو عبادت کے راستے میں داخل ہوتے ہیں یا اس سے روگردانی کرتے ہیں۔

دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق عبث یا بے مقصد نہیں ہو جاتی۔

دوسرے لفظوں میں، اگر بعض انسان اپنے اختیار کے غلط استعمال کے سبب اس راستے پر نہ چلیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر فرمایا ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان لوگوں کی تخلیق بے مقصد تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے **اختیاری بندگی** کا مطالبہ کیا ہے؛ یہ ارادہ نہیں فرمایا کہ وہ جبر کے ساتھ اس کے بندے بنیں۔

اگر اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ تکوینی ہوتا تو وہ انسان کے لیے نافرمانی کا راستہ کھلا نہ چھوڑتا۔

انسان کی آزمائش و امتحان

اللہ تعالیٰ کا راستہ کھلا چھوڑ دینا ـــ جسے **تخلیۃ السبیل** کہا جاتا ہے ـــ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ انسان **اپنی خواہش اور اختیار سے** اس کی عبادت کرے۔

یہیں سے **ابتلاء اور امتحان** کا موضوع بھی سامنے آتا ہے۔

قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ

"اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا اور تم میں سے بعض کے درجات بعض پر بلند کیے، تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں عطا کیا ہے اس کے ذریعے تمہاری آزمائش کرے۔"

(سورۂ انعام، ۶:۱۶۵)

اور فرمایا:

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا

"وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے اعتبار سے کون بہتر ہے۔"

(سورۂ ملک، ۶۷:۲)

خلقت میں تفاوت — آزمائش کا ذریعہ

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان جو تفاوت اور اختلافات قرار دیے ہیں، وہ ایسے حالات فراہم کرتے ہیں جن کے ذریعے انسانوں کو انہی اختلافات کی بنیاد پر آزمایا جاتا ہے۔

اگر تمام انسان ہر اعتبار سے یکساں ہوتے، کسی کو دوسرے پر کوئی امتیاز حاصل نہ ہوتا، تو ایک دوسرے پر ظلم کرنے اور حقوق پامال کرنے کے اسباب بھی بہت کم ہو جاتے۔

یہ حقیقت ہماری روایات میں نہایت واضح طور پر بیان ہوئی ہے۔

مثلاً **امام محمد باقرؑ** فرماتے ہیں:

"جب اللہ عزوجل نے آدمؑ کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا تاکہ ان سے اپنی ربوبیت اور ہر نبی کی نبوت کے بارے میں عہد و پیمان لے۔۔۔ تو اللہ عزوجل نے آدمؑ سے فرمایا: 'دیکھو، تم کیا دیکھتے ہو؟'

آدمؑ نے اپنی ذریت کو دیکھا، جو ذرّات کی صورت میں تھی۔۔۔

آدمؑ نے عرض کیا: 'اے میرے پروردگار!۔۔۔تو نے انہیں کس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے؟ اور ان سے یہ عہد لینے سے تیرا مقصود کیا ہے؟'

اللہ عزوجل نے فرمایا: 'یہ کہ وہ میری عبادت کریں، کسی کو میرا شریک قرار نہ دیں، میرے رسولوں پر ایمان لائیں اور ان کی پیروی کریں۔'

آدمؑ نے عرض کیا: 'اے میرے پروردگار! کیا سبب ہے کہ میں بعض ذرّات کو بعض سے بڑا دیکھتا ہوں؟ بعض کا نور بہت زیادہ ہے، بعض کا کم، اور بعض میں کوئی نور نظر نہیں آتا؟'

اللہ عزوجل نے فرمایا: 'میں نے انہیں اسی طرح پیدا کیا ہے تاکہ ان کے تمام حالات میں انہیں آزماؤں۔۔۔'

آدمؑ نے عرض کیا: 'اے میرے پروردگار! اگر تو ان سب کو ایک ہی صورت، ایک ہی انداز، ایک ہی طبیعت، ایک ہی سرشت، ایک ہی رنگ، یکساں عمر اور برابر رزق کے ساتھ پیدا کرتا تو ان میں سے کوئی دوسرے پر ظلم نہ کرتا، ان کے درمیان حسد و بغض پیدا نہ ہوتا اور وہ کسی چیز میں ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرتے۔'

اللہ عزوجل نے فرمایا: 'اے آدم!۔۔۔میں نے اپنے علم کے مطابق ان کے درمیان تفاوت رکھا ہے۔۔۔میری تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں۔ بے شک میں نے جنّ و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے جو میری اطاعت اور عبادت کرے اور میرے رسولوں کی پیروی کرے، اس کے لیے میں نے جنت پیدا کی ہے——اور مجھے اس کے سوا کوئی پروا نہیں۔ اور جو میرا انکار کرے، میری نافرمانی کرے اور میرے رسولوں کی پیروی نہ کرے، اس کے لیے میں نے جہنم پیدا کی ہے——اور مجھے اس کے سوا کوئی پروا نہیں۔

میں نے تمہیں اور تمہاری اولاد کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ مجھے تمہاری یا ان کی کوئی حاجت تھی؛ بلکہ میں نے تمہیں اور انہیں اس لیے پیدا کیا تاکہ دنیا کی زندگی میں، تمہاری حیات کے دوران اور موت سے پہلے، تم سب کو آزماؤں کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔

اسی مقصد کے لیے میں نے دنیاو آخرت، زندگی وموت۔۔۔ جنت و جہنم۔۔۔ کو پیدا کیا۔ اور اپنے محیط علم کے مطابق میں نے ان کی صورتوں، جسموں، رنگوں، عمروں اور رزقوں میں تفاوت رکھا۔۔۔"

)اصولِ کافی، ج ۲، ص ۸، کتاب الایمان والکفر، آخری باب، حدیث ۲(

پس انسان کی تخلیق کا مقصد ایک طرف **اللہ تعالیٰ کی بندگی** اور دوسری طرف **الٰہی امتحان وآزمائش** ہے۔

ان دونوں کو بالآخر یوں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

انسان کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار سے بندگی کے اس راستے میں داخل ہو جسے اللہ تعالیٰ نے انبیاء، رسولوں اور ائمہؑ کے ذریعے اس کے سامنے رکھا ہے، اور اسی کے ذریعے اس کی آزمائش ہو۔

اگر اس راستے پر چلنا اختیاری نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کبھی ایسے حالات پیدا نہ کرتا جن میں انسان کے لیے گناہ اور نافرمانی میں مبتلا ہونے کا امکان موجود ہو۔

اور نہ ہی آخرت میں اسے سزا دی جاتی۔

لہٰذا چونکہ اللہ تعالیٰ نے تشریعی طور پر انسان سے یہ چاہا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے بندگی کے راستے پر چلے، اس لیے بالفرض اگر تمام انسان بھی اپنے اختیار کے غلط استعمال سے اس راستے پر نہ چلیں، تب بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی تخلیق عبث یا حکمتِ الٰہی کے منافی تھی۔

مزید یہ کہ حکمت کا معیار متعین کرنے کے لیے افعالِ الٰہی کو انسانی افعال پر قیاس کرنا بنیادی طور پر درست نہیں۔

اللہ تعالیٰ انسان کو گناہ سے جبراً نہیں روکتا

اس روایت میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کلام میں دو مرتبہ آنے والی تعبیر «لَا أُبَالِي» «ہمیں ایک نہایت دقیق نکتہ سمجھاتی ہے، خصوصاً ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ کا انکار اور نافرمانی کر کے جہنم کے مستحق بن جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

لَا أُبَالِي

یعنی:

"مجھے اس کی پروا نہیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ اپنے اختیار کا غلط استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں اور خود کو جہنم کا مستحق بنالیں تو اللہ تعالیٰ انہیں ان گناہوں کے ارتکاب سے جبراً نہیں روکتا اور نتیجتاً جہنم میں جانے سے بھی انہیں لازماً باز نہیں رکھتا۔

کیونکہ ان پر حجت تمام ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دیے گئے اختیار اور آزادی کے ذریعے ان کی آزمائش کا ارادہ فرمایا ہے۔

جب انہوں نے خود دوسرا راستہ اختیار کر لیا تو ان کا جہنم تک پہنچنا ایسی چیز نہیں جسے اللہ تعالیٰ لازماً روک دے۔

لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ **ارادۂ تکوینی** کے ذریعے تمام انسانوں کو اپنا بندہ بنانا چاہتا تو یا تو انہیں سرے سے اختیار عطا نہ کرتا، یا اختیار دینے کے بعد گناہ کے راستے میں ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتا کہ وہ نافرمانی کر ہی نہ سکتے۔

اللہ تعالیٰ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اپنی مخلوقات کو کس طرح مکمل طور پر مطیع بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن» لَا أُبَالِي «جیسی تعبیرات اور قرآن و روایات میں پائی جانے والی اس سے مشابہ عبارتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ نہیں ہے۔

اور عملی طور پر بھی ہم یہی دیکھتے ہیں۔

جب انسان گناہ اور نافرمانی کے راستے پر چلتا ہے تو ایسا نہیں کہ لازماً کوئی رکاوٹ اس کے سامنے آ کر اسے واپس پلٹنے پر مجبور کر دے۔

بلکہ اکثر انسان وہی کام انجام دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو وہ چاہتا ہے، یعنی اپنے پروردگار کے حکم کی مخالفت۔

تاریخ میں بے شمار مجرم اور ظالم گزرے ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے راستہ کھلا چھوڑا اور انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق گناہ اور ظلم کیے۔

تاریخ اس قسم کے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

یہ شواہد بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں کہ وہ ہر ممکن ذریعے سے انسان کو مجبور کر کے بندگی کے راستے پر لے آئے۔ حالانکہ **تمام ظاہری اور پوشیدہ طاقتیں اسی کے اختیار میں ہیں**، حتیٰ کہ انسان کے افکار اور تصورات بھی اس کے پروردگار کی قدرتِ تکوینی کے تحت ہیں۔

وہ جب چاہے اور جس حالت میں چاہے کسی کام کا خیال انسان کے ذہن سے بالکل مٹا سکتا ہے یا اسے وہ کام بھلا سکتا ہے۔ لیکن معمول کے مطابق ایسا نہیں ہوتا۔

انسان اپنے اختیار کے غلط استعمال کے نتیجے میں عذابِ الٰہی کا مستحق بنتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اسے اس انجام تک پہنچنے سے جبراً نہیں روکتا۔

بحث کا مجموعی نتیجہ

اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے **ارادۂ تشریعی** کے ذریعے ـــــ جو انسان کے اختیار سے منافات نہیں رکھتا ـــــ یہ چاہا ہے کہ جنّ و انسان صرف اسی کے بندے ہوں۔

اور اسی بندگی کو انسانوں کے امتحان اور آزمائش کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

آزمائش اسی وقت حقیقی معنی رکھتی ہے جب انسان اپنے **اختیاری افعال میں آزادی اور اختیار** رکھتا ہو اور اس کے لیے نافرمانی کا راستہ بھی کھلا ہو۔

لہٰذا اگرچہ تخلیقِ انسان کا مقصد یہ ہے کہ انسان **اپنے اختیار سے بندگی کے راستے میں داخل ہو**، لیکن کوئی فرد حقیقتاً عبادت کرتا ہے یا اس سے روگردانی کرتا ہے، اس سے اس الٰہی مقصد کی حقیقت متاثر نہیں ہوتی۔

یہ معاملہ سراسر **تشریعی** ہے، **تکوینی** نہیں۔

تمہید

اب جبکہ یہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے **شعوری اور اختیاری عبادت** کا مطالبہ فرمایا ہے، ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ عبادت کی بنیاد اور اساس کیا ہے۔

اگر **نماز، روزہ، حج** اور دوسرے اعمال کو عبادت کہا جاتا ہے تو سوال یہ ہے کہ آخر کون سی حقیقت ان اعمال کو "عبادت" بناتی ہے؟

اہلِ بیتِ عصمت و طہارتؑ سے ہم تک پہنچنے والی روایات میں عبادت کی بنیاد اور اساس **معرفتِ خدا** کو قرار دیا گیا ہے۔

مثلاً **امام علی رضاؑ** فرماتے ہیں:

أَوَّلُ عِبَادَةِ اللهِ مَعْرِفَتُهُ

"اللہ کی عبادت کی پہلی اور بنیادی منزل، اس کی معرفت ہے۔"

(بحار الانوار، ج ۳، ص ...)

معرفت پر قائم عبادت

اس حدیثِ شریف میں لفظ **"اوّل"** سے مراد زمانی اعتبار سے پہلا مرحلہ نہیں، بلکہ **بنیاد اور اساس** ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی صرف ابتدائی مرحلے میں معرفتِ خدا پر قائم ہوتی ہے اور عبادت کے بعد کے مراحل میں معرفت کا کوئی کردار باقی نہیں رہتا۔

بلکہ **معرفتِ خدا تمام عبادات کی اصل اور بنیاد ہے۔** یہ اس روح کی مانند ہے جو نماز جیسی ہر عبادت کے پیکر میں جاری و ساری رہتی ہے۔ اگر یہ روح موجود نہ ہو تو وہ اعمال حقیقت اور جوہرِ عبادت سے خالی رہ جاتے ہیں۔

البتہ اس حقیقت کو واضح کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ **"معرفتِ خدا"** سے کیا مراد ہے، بالخصوص جب اسے انسان کی طرف منسوب کیا جائے اور اسے اس کے اختیار سے مربوط قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمیں کتاب و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنا ہوگا۔

معرفت کا حاصل ہونا اختیاری نہیں

تمہید کے طور پر یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ہر صاحبِ عقل انسان اپنے وجدان سے یہ حقیقت پاتا ہے کہ **معرفت کا بالفعل حاصل ہونا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔**

کسی خاص علم و معرفت کا پیدا ہونا یا نہ ہونا، اس شخص کے اختیار، خواہش اور ارادے پر منحصر نہیں جسے وہ معرفت حاصل ہوتی ہے۔ انسان علم و معرفت کے بالفعل حصول کے معاملے میں اپنے آپ کو منفعل پاتا ہے۔

اہلِ بیتؑ کی روایات بھی اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں:

قُلتُ لِأَبی عَبدِاللهِ علیه السّلام: أَلمَعرِفَةُ مِن صُنعِ مَن هِیَ؟ قالَ: مِن صُنعِ اللهِ. لَیسَ لِلعِبادِ فیها صُنعٌ.

میں نے امام صادقؑ سے عرض کیا" : **معرفت کس کی بنائی ہوئی ہے؟"**

آپؑ نے فرمایا:

"یہ اللہ کا کام ہے؛ بندوں کا اس کے پیدا کرنے میں کوئی دخل نہیں۔"

)الکافی، ج۱، ص۱۶۳، کتاب التوحید، باب البیان والتعریف ولزوم الحجۃ، حدیث ۲(

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے معرفت عطا فرماتا ہے۔

تمام معارف کی بلند ترین چوٹی **معرفتِ خدا** ہے۔ اس معرفت کی ایک خاص خصوصیت ہے جو دوسری معرفتوں میں نہیں پائی جاتی: اگرچہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے، لیکن اس معرفت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نہ کوئی محسوس شے بن جاتا ہے، نہ عام معنی میں عقل کے احاطے میں آتا ہے اور نہ ہی تخیل و تصور کا موضوع قرار پاتا ہے۔

اسی بناپر معرفتِ خدا کے ساتھ ایک خاص قسم کی **حیرت اور ہیبت** وابستہ ہوتی ہے جو دوسری معرفتوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہ خصوصیت اس حقیقت کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے کہ معرفتِ خدا کا حصول انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔

بہر حال، **معرفت کا بالفعل حاصل ہونا ہمارے اختیار پر موقوف نہیں**، اور معرفتِ خدا کے معاملے میں یہ حقیقت دوسری معرفتوں سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔[1]

معرفت کو قبول یا رد کرنے میں انسان کا کردار

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

پھر معرفت کے سلسلے میں انسان کا کردار کیا ہے؟

اس بارے میں امام صادقؑ فرماتے ہیں:

لَیسَ لِلّهِ عَلَی خَلقِهِ أَن یَعرِفُوا. وَلِلخَلقِ عَلَی اللهِ أَن یُعَرِّفَهُم. وَلِلّهِ عَلَی الخَلقِ إِذا عَرَّفَهُم أَن یَقبَلُوا.

"ابتدا میں اللہ کا اپنی مخلوق پر یہ حق نہیں کہ وہ خود معرفت حاصل کرے، بلکہ مخلوق کا اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ انہیں معرفت عطا فرمائے؛ اور جب اللہ انہیں معرفت عطا فرما دے تو پھر اللہ کا مخلوق پر یہ حق ہے کہ وہ اسے قبول کرے۔"

(الکافی، ج ۱، ص ۱۶۴، کتاب التوحید، باب حجج اللہ علی خلقہ، حدیث ۱)

یہاں ایک نہایت اہم نکتہ یہ ہے کہ **کسی حقیقت کو جان لینا لازماً اسے قبول کرنے اور اس کے سامنے تسلیم ہو جانے کے مترادف نہیں ہے۔**

ممکن ہے ایک یا متعدد حقائق کسی انسان کے لیے بالکل واضح اور روشن ہو جائیں، لیکن وہ اپنے غلط اختیار کے نتیجے میں انہیں قبول نہ کرے اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دے۔

یہ **قبول اور تسلیم** انسان کا اختیاری فعل ہے۔

یہ جسمانی اعضاء کا عمل نہیں بلکہ قلب و روح کا فعل ہے، اسی لیے اسے حواس کے ذریعے محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

جب کسی حقیقت کی معرفت حاصل ہونے کے بعد انسان اس واضح شدہ حقیقت کے سامنے تسلیم ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس نے **معرفت کو قبول کر لیا۔**

اور اگر وہ اس کے سامنے تسلیم ہونے سے انکار کرے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اس معرفت کو رد کر دیا اور اس کا انکار کیا۔

ایک صاحبِ عقل انسان کا وجدان بھی اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے کہ معرفت حاصل ہونے کے بعد انسان اس کے مقابلے میں دو قسم کے باطنی اور روحانی رویّے اختیار کر سکتا ہے:

یا وہ اس پہچانی ہوئی حقیقت کے سامنے دل و جان سے تسلیم ہو کر اسے قبول کر لے، یا حقیقت کو پہچان لینے کے باوجود اس کی مخالفت کرے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دے۔

بہت سے لوگ متعدد حقائق کے مقابلے میں یہی دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

یہیں سے ایسا شخص ملامت اور مذمت کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ہر صاحبِ عقل اس بات کو قابلِ مذمت سمجھتا ہے کہ کسی حقیقت کے واضح اور معلوم ہو جانے کے بعد انسان اسے رد کر دے۔

لیکن جہاں تک **اصل معرفت کے حصول** کا تعلق ہے، اگر کوئی شخص اس سے محروم رہ جائے تو وہ صرف اس بنا پر ملامت کا مستحق نہیں—— بشرطیکہ اس نے معرفت حاصل کرنے کے ضروری مقدمات میں کوتاہی نہ کی ہو۔

کیونکہ بالفعل صاحبِ معرفت بننا یا نہ بننا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

البتہ اگر وہ معرفت تک پہنچنے کے لیے ضروری اختیاری مقدمات میں غفلت اور کوتاہی کرے، یا معرفت حاصل ہو جانے کے بعد ضد، عناد اور انکار کا رویّہ اختیار کرے، تو یقیناً وہ مذمت کا مستحق ہو گا۔

اسی لیے خود عقلِ انسانی یہ حکم کرتی ہے کہ جب کوئی حقیقت انسان کے لیے معلوم اور واضح ہو جائے تو اسے **اس کے سامنے تسلیم ہونا چاہیے۔**

یہ ''چاہیے'' ایک **عقلی وجوب** ہے جو انسان پر حکم فرما ہے۔

روایات بھی اسی حقیقت کی تصدیق اور تاکید کرتی ہیں: انسان پر اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ جب وہ اسے معرفت عطا فرمائے تو انسان اسے رد نہ کرے بلکہ قبول کرے۔

انسان کے لیے سب سے ضروری معرفت

معرفتِ خدا کے بارے میں امام صادقؑ فرماتے ہیں:

إِنَّ أَفضَلَ الفَرائِضِ وَأَوجَبَها عَلَى الإِنسَانِ مَعرِفَةُ الرَّبِّ وَالإِقرارُ لَهُ بِالعُبُودِيَّةِ.

"بے شک انسان پر تمام فرائض میں سب سے افضل اور سب سے زیادہ واجب، پروردگار کی معرفت اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کرنا ہے۔"

(بحار الانوار، ج ۳۶، ص ۴۰۷، حدیث ۱۶، بحوالہ کفایۃ الاثر)

چونکہ معرفتِ خدا تمام معارف سے برتر اور تمام علوم و معارف کی بلند ترین منزل ہے، اور دوسری تمام نعمتوں سے استفادے کا راستہ بھی اس معرفت کو قبول کرنے سے کھلتا ہے، اس لیے **معرفتِ خدا کو قبول کرنا سب سے عظیم اور افضل فریضہ ہے۔**

اس روایت میں **"معرفتِ رب"** کو ایک ایسے اختیاری عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسان پر واجب ہے۔

یہ اختیاری عمل درحقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان **اللہ تعالیٰ کی جانب سے کرائی گئی اپنی معرفت کو قبول کرے۔**

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ایک صاحبِ عقل انسان کے **معرفت کو قبول کرنے کے عمل** کو بھی خود "معرفت" کہا جاتا ہے۔

لہٰذا عمومی طور پر جہاں معرفت کو انسان کا فعل یا اس کی جانب سے انجام پانے والا کام قرار دیا گیا ہو، وہاں اسی معنی کو مراد لینا چاہیے؛ نہ کہ وہ معرفت عطا کرنا جو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور انسان کے اختیار میں نہیں۔

اب جبکہ روایات کی زبان میں **"معرفتِ خدا"** کا مفہوم واضح ہو گیا، یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ نماز، روزہ، حج اور دوسرے اعمال کا حقیقتاً عبادت ہونا اس معرفت پر منحصر ہے جو عبادت کرنے والا اللہ تعالیٰ کے بارے میں رکھتا ہے۔

قصدِ قربت اور **امتثالِ امرِ الٰہی**—جن کے بغیر کوئی عمل عبادت قرار نہیں پا سکتا—اسی معرفت سے انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔

اصولی طور پر نماز جیسے کسی عمل کو عبادت بنانے والی چیز صرف رکوع و سجود کرنا، قبلہ رُخ کھڑا ہونا، اذکار پڑھنا یا دوسرے جسمانی اعمال انجام دینا نہیں ہے۔

یہ تمام اعمال اسی وقت **نماز** بنتے ہیں جب بندہ انہیں اپنے ربّ اور خالق کے سامنے تسلیم و بندگی کے طور پر، اس کے حکم کی اطاعت اور اس کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے انجام دے، اور اس طرح اس کی ہدایات کے مطابق اپنی بندگی کا فریضہ ادا کرے۔

پروردگار کے سامنے یہی مکمل تسلیم **معرفتِ خدا** کہلاتی ہے۔

معرفتِ خدا کا یہ مفہوم عبادت کے لیے محض ایک ابتدائی مقدمہ نہیں، بلکہ یہ **ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔**

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، یہ نماز جیسی ہر عبادت کے پیکر میں جاری روح کی مانند ہے۔ اس کے بغیر عمل، حقیقتِ عبادت سے خالی رہ جاتا ہے۔

اسی لیے امیر المؤمنین امام علیؑ سے روایت ہے:

اَلعِلمُ أَوَّلُ دَلیلٍ، وَالمَعرِفَةُ آخِرُ نِهایَةٍ.

"علم پہلا رہنما ہے اور معرفت آخری منزل۔"

(غرر الکلم و درر الحکم، حدیث ۷۷۳)

اس کا مطلب یہ ہے کہ معرفت **بندگی اور عبادت کے راستے کی آخری منزل** ہے۔

بندگی کا آغاز علم و معرفت سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا بھی معرفت ہی پر ہوتی ہے۔

کیونکہ بندگی کی روح اور حقیقت خود معرفت ہے۔ انسان کی معرفت اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت پر آمادہ کرتی ہے، اور اسی عبادت کے ذریعے اسے مزید معرفت حاصل ہوتی ہے، لیکن پہلے سے بلند درجے پر۔

بندگی کا ہر درجہ انسان کو زیادہ معرفت عطا کرتا ہے، اور یہی بڑھی ہوئی معرفت اسے مزید بندگی کی طرف لے جاتی ہے۔ پھر یہ بلند تر بندگی، معرفت کے ایک اور بلند درجے کا سبب بنتی ہے، اور وہ معرفت انسان کو مزید بلند مراتب کی جانب لے جاتی ہے۔ اس طرح معرفت کی محرک قوت کے ساتھ بندگی کا یہ سفر مسلسل جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جس حد تک چاہے انسان کو معرفت کے مراتب میں بلند فرمائے۔

انسان کے لیے قابلِ حصول تمام معارف میں سب سے بلند **معرفتِ خدا** ہے، جیسا کہ روایات میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ امیر المؤمنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

مَعرِفَةُ اللهِ سُبحانَهُ أَعلَى المَعارِفِ.

"اللہ سبحانہٗ کی معرفت تمام معارف سے بلند تر ہے۔"

(غرر الکلم و درر الحکم، حدیث ۱۲۷۰)

عمل اور معرفت کا باہمی تعلق

امام محمد باقرؑ نے عمل اور معرفت کے باہمی تعلق کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لَا يُقبَلُ عَمَلٌ إِلّا بِمَعرِفَةٍ، وَلَا مَعرِفَةَ إِلّا بِعَمَلٍ، وَمَن عَرَفَ دَلَّتهُ مَعرِفَتُهُ عَلَى العَمَلِ، وَمَن لَم يَعرِف فَلَا عَمَلَ لَهُ.

"کوئی عمل معرفت کے بغیر قبول نہیں ہوتا، اور کوئی معرفت عمل کے بغیر نہیں ہوتی۔ جو معرفت رکھتا ہے، اس کی معرفت اسے عمل کی طرف رہنمائی کرتی ہے؛ اور جو معرفت نہیں رکھتا، اس کے لیے کوئی عمل نہیں۔"

(تحف العقول، امام محمد باقرؑ کے مختصر کلمات، حدیث ۲۴)

پس ایک طرف **معرفت، قبولیتِ عمل کی شرط** ہے اور دوسری طرف حقیقی معرفت، عمل کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ معرفت کے آثار ہوتے ہیں اور وہ آثار انسان کے اعمال میں ظاہر ہوتے ہیں۔ انسان کی معرفت ہمیشہ اس کے عمل اور طرزِ رفتار کی رہنما ہوتی ہے۔

معرفت کے بغیر عمل اپنی حقیقی قدر و قیمت سے خالی ہے، بالکل اسی طرح جیسے روح کے بغیر جسم اپنی حقیقی قدر کھو دیتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، نماز، حج اور زکوٰۃ جیسی عبادات کی روح اور حقیقت وہ معرفت ہے جو ان اعمال کو انجام دینے والے شخص کے اندر موجود ہوتی ہے۔

در حقیقت یہی معرفت اس کی عبادت کا **محرک اور بنیاد** بنتی ہے۔

انسان کی فضیلت کا معیار

اس بنا پر انسان کی معرفت جس قدر زیادہ ہو گی، اس کے اعمال کی قدر بھی اسی قدر زیادہ ہو گی، اور نتیجتاً خود اس انسان کی قدر و منزلت بھی بلند ہو گی۔

اصولی طور پر انسانوں کے درمیان فضیلت کا حقیقی معیار **معرفت** ہے۔

عبادات بھی اسی وقت انسان کو زیادہ فضیلت اور قدر عطا کرتی ہیں جب وہ معرفت کے بلند تر درجے کی بنیاد پر انجام دی جائیں۔

ائمۂ اہلِ بیتؑ سے روایت ہے:

بَعضُكُم أَكثَرُ صَلَاةً مِن بَعضٍ، وَبَعضُكُم أَكثَرُ حَجًّا مِن بَعضٍ، وَبَعضُكُم أَكثَرُ صَدَقَةً مِن بَعضٍ، وَبَعضُكُم أَكثَرُ صِيامًا مِن بَعضٍ، وَأَفضَلُكُم أَفضَلُكُم مَعرِفَةً.

"تم میں سے بعض دوسروں سے زیادہ نماز پڑھتے ہیں، بعض دوسروں سے زیادہ حج کرتے ہیں، بعض دوسروں سے زیادہ صدقہ دیتے ہیں اور بعض دوسروں سے زیادہ روزے رکھتے ہیں؛ لیکن تم میں سب سے افضل وہ ہے جس کی معرفت سب سے افضل ہے۔"

(بحار الانوار، ج۳، ص ۱۴، حدیث ۳۸، بحوالۂ صفات الشیعہ)

یہ روایت **معرفت کو فضیلت کا معیار** قرار دیتی ہے۔

جس شخص کی معرفت زیادہ کامل اور صحیح ہو گی، اس کی قدر و منزلت بھی زیادہ ہو گی۔

اسی طرح نماز، حج، صدقہ اور روزے کی قدر و قیمت بھی عمل کرنے والے کی معرفت کے درجے کے مطابق ہو گی۔

اگر معرفت کو نکال دیا جائے تو جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ محض بے روح جسمانی حرکات کا ایک سلسلہ ہے، جسے حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی بندگی نہیں کہا جا سکتا۔

لہٰذا عبادت اسی وقت قدر و قیمت رکھتی ہے جب وہ معرفت کے ساتھ ہو۔

رسولِ خداؐ نے عبادت کے بارے میں ہمیں یہ تعلیم دی:

أُعبُدِ اللهَ كَأَنَّكَ تَراهُ، فَإِن كُنتَ لَا تَراهُ فَإِنَّهُ يَراكَ.

"اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو؛ اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو یقیناً وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

(بحار الانوار، ج ۷۷، ص ۴۷، حدیث ۳، بحوالۂ مکارم الاخلاق)

رسولِ خداؐ کی اس ہدایت کو عملی جامہ پہنانے کا راستہ یہ ہے کہ انسان اپنی **معرفتِ خدا میں اضافہ کرے۔**

انسان کی معرفت جتنی زیادہ ہو گی، اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اعمال پر حاضر و ناظر پائے گا۔

معرفتِ خدا کا بلند ترین درجہ اللہ تعالیٰ کو **"دیکھنے"** سے تعبیر کیا گیا ہے۔

البتہ یہ دیکھنا جسمانی آنکھوں سے نہیں، بلکہ **حقیقتِ ایمان کے ذریعے قلب کا مشاہدہ** ہے۔

روایت میں آیا ہے:

قالَ: يا أَميرَ المُؤمِنينَ، هَل رَأَيتَ رَبَّكَ حينَ عَبَدتَهُ؟ فَقالَ: وَيلَكَ! ما كُنتُ أَعبُدُ رَبًّا لَم أَرَهُ. قالَ: وَكَيفَ رَأَيتَهُ؟ قالَ: وَيلَكَ! لَا تُدرِكُهُ العُيونُ فِي مُشاهَدَةِ الأَبصارِ، وَلكِن رَأَتهُ القُلوبُ بِحَقائِقِ الإيمانِ.

امیر المؤمنینؑ سے عرض کیا گیا:

"اے امیر المؤمنینؑ! کیا آپ نے اپنے رب کو اس وقت دیکھا ہے جب آپ اس کی عبادت کرتے ہیں؟"

آپؑ نے فرمایا:

"وائے ہو تم پر! میں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا جسے میں نے دیکھا نہ ہو۔"

عرض کیا گیا:

"آپ نے اسے کیسے دیکھا؟"

آپؑ نے فرمایا:

"وائے ہو تم پر! آنکھیں اسے ظاہری نگاہ کے مشاہدے سے نہیں پا سکتیں، بلکہ دل اسے حقائقِ ایمان کے ذریعے دیکھتے ہیں۔"

)الکافی، ج۱، ص۹۸، کتاب التوحید، باب فی ابطال الرؤیۃ، حدیث ۶(

یہ **قلبی رؤیت** معرفتِ پروردگار کا بلند ترین درجہ ہے۔

اگر کسی انسان کو ایسی معرفت عطا ہو جائے تو اس کی عبادت غیر معمولی قدر و منزلت حاصل کر لیتی ہے، جیسا کہ موحّدین کے پیشوا امیر المؤمنینؑ کی عبادت تھی۔

دوسروں کو بھی چاہیے کہ اپنے پروردگار کی معرفت میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر حاضر و ناظر پائیں اور اسی شعور کے ساتھ اس کی عبادت کریں۔

یہ کیفیت انسان میں جس قدر بڑھے گی، اس کی عبادت اسے اسی قدر زیادہ قربِ الٰہی عطا کرے گی۔

اور یوں وہ عبادت کے مقصد و غایت، یعنی **اللہ تعالیٰ کی زیادہ بلند اور کامل معرفت** کے قریب تر ہوتا جائے گا۔

تخلیقِ انسان کا مقصد

گزشتہ مباحث کی روشنی میں **سید الشہداء امام حسین**ؑ کی وہ وضاحت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے جس میں آپؑ نے بندگانِ خدا کی تخلیق کا مقصد بیان فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ اللهَ ـ وَاللهِ ـ مَا خَلَقَ العِبادَ إِلّا لِيَعرِفُوهُ، فَإِذا عَرَفُوهُ عَبَدُوهُ، فَإِذا عَبَدُوهُ استَغنَوا بِعِبادَتِهِ عَن عِبادَةِ مَن سِواهُ.

"اے لوگو! اللہ کی قسم، اللہ نے بندوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی معرفت حاصل کریں۔ پھر جب وہ اس کی معرفت حاصل کر لیں تو اس کی عبادت کریں، اور جب اس کی عبادت کریں تو اس کی عبادت کے ذریعے اس کے سوا ہر ایک کی عبادت سے بے نیاز ہو جائیں۔"

)بحار الانوار، ج۲۳، ص۹۳، حدیث ۴۰، بحوالہ کنز الفوائد، کراجکی(

اس روایت میں امام حسینؑ بندگانِ خدا کی تخلیق کا مقصد سب سے پہلے **معرفتِ خدا** اور اس کے بعد اس کی عبادت کو قرار دیتے ہیں۔

معرفت کی اہمیت اور عبادتِ خدا میں اس کے کردار کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

اگر عبادت معرفت کے بغیر انجام پائے تو حقیقت میں اس کی کوئی حقیقی قدر و قیمت نہیں رہتی۔

لہٰذا انسان کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ پہلے **معرفت** حاصل کرے اور پھر اسی معرفت کی بنیاد پر عبادت و بندگی انجام دے۔

در حقیقت انسان کی معرفت ہی اس کی عبادت کی **محرک اور رہنما** ہونی چاہیے؛ نہ کہ ایسی عبادت جو معرفت سے خالی ہو، کیونکہ ایسی عبادت حقیقتاً عبادت ہی نہیں۔

اس پوری بحث کا تسلسل یوں سمجھا جا سکتا ہے:

معرفت کا عطا ہونا ← معرفت کو قبول کرنا اور تسلیم ہونا ← عبادت و بندگی ← معرفت کے بلند تر درجات

یوں معرفت صرف بندگی کے سفر کا نقطۂ آغاز نہیں، بلکہ اسی سفر کی **روح، محرک اور بلند ترین منزل** بھی ہے۔

باب دوم: عبادتِ خدا میں بندگانِ الٰہی کی مختلف اقسام

معرفت اور ایمان

تمہید

معرفت کی اس قسم کے بارے میں جو انسان کا اپنا فعل اور اس کا اختیاری عمل ہے ـــــ یعنی **اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ معرفت کو قبول کرنا اور اس کے سامنے تسلیم ہونا** ـــــ ہم دینی اصطلاح میں **ایمان** کو معرفتِ خدا کے ہم معنی سمجھ سکتے ہیں۔

کیونکہ ایمان بھی در حقیقت دل کی وہ باطنی تسلیم ہے جو مؤمن کا اختیاری فعل شمار ہوتی ہے۔ یہ بذاتِ خود **قلب کا ایک عمل** ہے، اور انسان کے دوسرے اعمال بھی اسی باطنی تسلیم سے جنم لیتے ہیں۔

لہٰذا مناسب ہے کہ ایمان کی تعریف **اہل بیتؑ کی روایات** کی روشنی میں کی جائے۔

امام صادقؑ سے پوچھا گیا:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟"

آپؑ نے فرمایا:

مَا لَا يَقبَلُ اللهُ شَيئًا إِلّا بِهِ

"وہ چیز جس کے بغیر اللہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتا۔"

عرض کیا گیا:

"وہ کیا ہے؟"

آپؑ نے فرمایا:

الإِيمَانُ بِاللهِ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلّا هُوَ أَعلَى الأَعمَالِ دَرَجَةً وَأَشرَفُهَا وَأَسنَاهَا حَظًّا.

"اللہ پر ایمان ـــــ جس کے سوا کوئی معبود نہیں ـــــ تمام اعمال میں سب سے بلند مرتبہ، سب سے زیادہ شرف اور سب سے اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔"

پھر آپؑ سے عرض کیا گیا:

"کیا آپ بیان فرمائیں گے کہ ایمان کیا ہے؟ کیا ایمان قول اور عمل دونوں کا مجموعہ ہے، یا صرف قول ہے اور اس میں عمل شامل نہیں؟"

آپؑ نے فرمایا:

الإِيمَانُ عَمَلٌ كُلُّهُ، وَالقَولُ بَعضُ ذَلِكَ العَمَلِ.

"ایمان سراسر عمل ہے، اور قول بھی اسی عمل کا ایک حصہ ہے۔"

اعضاء وجوارح کے ذریعے ایمان کا اظہار

یہ سوال کہ ایمان صرف قول کا نام ہے یا قول کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے، دراصل **اسلام اور ایمان** کے درمیان معروف فرق کی بنا پر پیدا ہوا تھا۔

اسلام کے تحقق کے لیے زبانی اقرار کافی ہے۔

یعنی جب کوئی شخص زبان سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسولِ خداؐ کی رسالت کی گواہی دے دے تو اس کے اسلام میں داخل ہونے کے لیے یہی کافی ہے، خواہ دل کی گہرائی میں وہ اس عقیدے کا حامل نہ بھی ہو۔

لہٰذا سوال یہ تھا کہ کیا ایمان بھی اسی طرح ہے یا ایمان کے ساتھ عمل کا ہونا بھی ضروری ہے؟

امام صادقؑ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان حقیقت میں **عمل کے سوا کچھ نہیں**، اور زبان سے اقرار کرنا بھی انہی اعمال میں سے ایک عمل اور ایمان کا ضروری جز ہے۔

اعضاء وجوارح میں ایمان کی تقسیم

ایمان کی بنیاد **قلب کا عمل** ہے، لیکن اس کے آثار انسان کے مختلف اعضاء اور قوی میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ان میں سے ایک زبان ہے، جس کے ذریعے انسان پر لازم ہے کہ جس حقیقت کو اس نے اپنے باطن میں قبول کیا ہے، اس کا اظہار بھی کرے۔

اسی روایت کے تسلسل میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کے اعضاء وجوارح کے درمیان ایمان سے متعلق ذمہ داریاں تقسیم فرمائی ہیں اور ہر عضو کے لیے ایمان کا ایک مخصوص حصہ مقرر کیا ہے۔

ان تمام اعمال کے مرکز اور بنیاد میں **قلب کا عمل** قرار پاتا ہے۔

امامؑ قلب کے عمل کی حقیقت اور دوسرے اعضاء کے اعمال کے مقابلے میں اس کی اہمیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

فَلَيسَ مِن جَوارِحِهِ جارِحَةٌ إِلّا وَقَد وُكِّلَت مِنَ الإِيمَانِ بِغَيرِ مَا وُكِّلَت بِهِ أُختُهَا. فَمِنهَا قَلبُهُ الَّذِي بِهِ يَعقِلُ وَيَفقَهُ وَيَفهَمُ، وَهُوَ أَمِيرُ بَدَنِهِ الَّذِي لَا تَرِدُ الجَوارِحُ وَلَا تَصدُرُ إِلّا عَن رَأيِهِ وَأَمرِهِ.

"اس کے اعضاء و جوارح میں سے کوئی عضو ایسا نہیں جس کے سپرد ایمان سے متعلق کوئی ایسی ذمہ داری نہ کی گئی ہو جو دوسرے عضو کی ذمہ داری سے مختلف ہو۔ ان میں اس کا قلب بھی ہے، جس کے ذریعے وہ عقل سے کام لیتا، فقہ و فہم حاصل کرتا اور بات کو سمجھتا ہے۔ یہی قلب اس کے بدن کا امیر ہے؛ اعضاء و جوارح اسی کی رائے اور حکم کے مطابق کسی کام کی طرف بڑھتے یا اس سے باز رہتے ہیں۔"

قلب کی معرفت

اس کے بعد امامؑ ہر عضو پر عائد ہونے والی ذمہ داری بیان کرتے ہیں۔

قلب کے بارے میں فرماتے ہیں:

فَأَمّا مَا فَرَضَ عَلَى القَلبِ مِنَ الإِيمَانِ فَالإِقرارُ وَالمَعرِفَةُ وَالعَقدُ وَالرِّضَا وَالتَّسلِيمُ بِأَن لَا إِلٰهَ إِلّا اللهُ وَحدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ إِلٰهًا وَاحِدًا لَم يَتَّخِذ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبدُهُ وَرَسُولُهُ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيهِ وَآلِهِ، وَالإِقرارُ بِمَا جَاءَ مِن عِندِ اللهِ مِن نَبِيٍّ وَكِتَابٍ. فَذَلِكَ مَا فَرَضَ اللهُ عَلَى القَلبِ مِنَ الإِقرارِ وَالمَعرِفَةِ، وَهُوَ عَمَلُهُ ... وَهُوَ رَأسُ الإِيمَانِ.

"رہا وہ ایمان جسے اللہ نے قلب پر واجب قرار دیا ہے، تو وہ اقرار، معرفت، عقیدہ، رضا اور تسلیم ہے؛ اس بات کا اقرار کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہ معبودِ واحد ہے، اس نے نہ کوئی زوجہ اختیار کی ہے اور نہ کوئی اولاد؛ اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں؛ نیز ان تمام انبیاء اور کتابوں کا اقرار کرنا جو اللہ کی جانب سے آئے ہیں۔

پس یہی وہ اقرار اور معرفت ہے جسے اللہ نے قلب پر واجب قرار دیا ہے، اور یہی قلب کا عمل ہے۔۔۔اور یہی ایمان کا سر اور اس کی بنیاد ہے۔"

)الکافی، ج ۲، ص ۳۳، کتاب الایمان والکفر، باب : اِلایمان مبثوث لجوارح البدن کلہا، حدیث ۱(

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز واجب قرار دی گئی ہے وہ عین وہی حقیقت ہے جو معرفت کو قبول کرنے اور اسے اپنانے کے لیے ضروری ہے۔

اقرار، عقیدہ، رضا اور تسلیم—یہ سب بالآخر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ معرفت کو **قبول کرنے اور اپنانے** ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

اور یہ تمام امور انسان کے اختیاری افعال ہیں۔

جو شخص ان افعال کو انجام دیتا ہے، اس کے ایمان کا ایک **سر اور بنیاد** موجود ہے۔

اور اگر یہ امور نہ ہوں تو ایمان بے سر ہے؛ اور بے سر ایمان، بے سر جسم کی مانند ہے جو مردہ ہے اور زندگی نہیں رکھتا۔

اسلام اور ایمان کے درمیان فرق

پس معلوم ہوا کہ ایمان کا سر اور اس کی بنیاد وہ **معرفت ہے جو انسان کے قلب کا فعل** ہے۔

یہ معرفت صرف توحید اور نبوت جیسے حقائق سے آگاہ ہو جانے کا نام نہیں، بلکہ یہ **اعتقاد اور قلبی یقین** کے زمرے سے تعلق رکھتی ہے۔

اعتقاد کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل کسی حقیقت کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ اور تعلق قائم کر لے۔

مؤمن صرف وہ شخص نہیں جو یہ جانتا ہو کہ خدا موجود ہے یا کوئی نبی ہے، بلکہ مؤمن وہ ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ، اور سب سے پہلے اپنے **قلب کے ذریعے**، اس حقیقت کے سامنے تسلیم ہو جائے اور اپنے اندر اقرار و قبول کی کیفیت پیدا کرے۔

یہی درحقیقت **اسلام اور ایمان** کے درمیان فرق ہے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

قَالَتِ الأَعرَابُ آمَنَّا قُل لَم تُؤمِنُوا وَلَكِن قُولُوا أَسلَمنَا وَلَمَّا يَدخُلِ الإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُم.

"اعراب نے کہا: ہم ایمان لے آئے۔ کہہ دیجیے: تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، کیونکہ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔"

(سورۂ حجرات، ۴۹:۱۴)

جب امام صادقؑ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

أَلَا تَرَى أَنَّ الإِيمَانَ غَيرُ الإِسلَامِ؟!

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایمان، اسلام سے مختلف ہے؟"!

(الکافی، ج ۲، ص ۲۴، کتاب الایمان والکفر، باب : أَن الإِسلام يحقن به الدم...، حدیث ۳)

پس اسلام اور ایمان کا بنیادی فرق اسی **قلبی قبول اور باطنی تسلیم** میں ہے، جو ایمان میں موجود ہوتی ہے لیکن اسلام میں لازماً موجود نہیں ہوتی۔

یہاں اسلام سے مراد وہ حیثیت ہے جس پر بعض شرعی احکام ـــ جیسے طہارت اور دوسرے فقہی احکام ـــ مترتب ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسے **"اسلامِ فقہی"** کہا جاسکتا ہے۔

یہ وہ اسلام ہے جو زبان سے **شہادتین** کے اقرار کے ذریعے ثابت ہو جاتا ہے اور اس بات پر موقوف نہیں کہ انسان کے دل میں کیا موجود ہے۔

اسی لیے ایک دوسری روایت میں اسلام اور ایمان کا فرق ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

الإِيمَانُ إِقرَارٌ وَعَمَلٌ، وَالإِسلَامُ إِقرَارٌ بِلَا عَمَلٍ.

"ایمان، اقرار کے ساتھ عمل ہے، جبکہ اسلام ایسا اقرار ہے جس کے ساتھ عمل نہیں۔"

(الکافی، ج ۲، ص ۲۴، کتاب الایمان والکفر، باب : أَن الإِسلام يحقن به الدم...، حدیث ۲)

یہاں **اقرار** سے مراد زبانی اقرار ہے، نہ کہ قلب کا باطنی اقرار اور تسلیم۔

اسی طرح یہاں **عمل** سے مراد ایسا عمل ہے جو قلب کے قبول اور تسلیم کی عکاسی کرتا ہو، نہ کہ محض کوئی ظاہری جسمانی حرکت جو بذاتِ خود کوئی حقیقی قدر نہ رکھتی ہو۔

لہٰذا اسلام میں کیا جانے والا زبانی اقرار بھی، جب قلبی تسلیم سے پیدا نہ ہوا ہو، اس معنی میں ''عمل'' نہیں کہلاتا۔

لیکن جب قلب تسلیم ہو جائے اور حقیقی باطنی اعتقاد وجود میں آجائے تو یہی زبانی اقرار **زبان کا عمل** بن جاتا ہے اور قدر و قیمت حاصل کر لیتا ہے۔

کیونکہ کسی عمل کی حقیقی قدر کا معیار **قلب کی معرفت اور اعتقاد** ہے۔

اسلام ــــ ایمان کی شرط

اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ یہی زبانی اقرار **ایمان کی ایک ضروری شرط** ہے۔

در حقیقت اسلام کے بغیر ایمان کا تحقق نہیں ہو سکتا۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

الإِيمَانُ هُوَ الإِقرارُ بِاللِّسَانِ، وَعَقدٌ فِي القَلبِ، وَعَمَلٌ بِالأَركانِ ... فَقَد يَكُونُ العَبدُ مُسلِمًا قَبلَ أَن يَكُونَ مُؤمِنًا، وَلَا يَكُونُ مُؤمِنًا حَتّى يَكُونَ مُسلِمًا، فَالإِسلَامُ قَبلَ الإِيمَانِ وَهُوَ يُشارِكُ الإِيمَانَ.

''ایمان زبان سے اقرار، قلب میں اعتقاد اور اعضاء و جوارح سے عمل کا نام ہے۔۔۔ پس ممکن ہے بندہ مؤمن ہونے سے پہلے مسلمان ہو، لیکن وہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک مسلمان نہ ہو۔ لہٰذا اسلام ایمان سے پہلے ہے اور ایمان میں شریک ہے۔''

(الکافی، ج ۲، ص ۲۷، کتاب الایمان والکفر، باب : آخر منہ وفیہ أن الإسلام قبل الإیمان، حدیث ۱)

لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ صرف قلب کی کیفیت اہم ہے اور زبان کا عمل کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

بلکہ **اسلامِ فقہی، ایمان کے تحقق کی ایک ضروری شرط ہے۔**

ایمان کی جامع تعریف

گزشتہ تمام مباحث کی روشنی میں اگر ہم ایمان کی ایک جامع تعریف کرنا چاہیں تو اسے یوں سمجھا جاسکتا ہے:

ایمان وہ معرفت ہے جس کے آثار انسان کے اعضاء، جوارح اور اعمال میں ظاہر ہوں۔

امیر المؤمنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

الإِيمَانُ مَعرِفَةٌ بِالقَلبِ، وَإِقرارٌ بِاللِّسَانِ، وَعَمَلٌ بِالأَركَانِ.

"ایمان، قلب سے معرفت، زبان سے اقرار اور اعضاء و جوارح سے عمل کا نام ہے۔"

(نہج البلاغہ، نسخۂ فیض الاسلام، حکمت ۲۱۸)

زبان سے اقرار اور ظاہری عمل اسی وقت حقیقی قدر و قیمت حاصل کرتے ہیں جب وہ **قلب کی معرفت** سے پیدا ہوئے ہوں۔

لہٰذا ایمان کی بنیاد **معرفت** ہے، جس کے آثار انسان کے جسم اور اس کے اعمال میں ظاہر ہوتے ہیں۔

نتیجتاً انسان کی معرفت جس قدر بلند اور کامل ہو گی، اس کے ایمان کی فضیلت بھی اسی قدر زیادہ ہو گی۔

رسولِ خداؐ نے فرمایا:

أَفضَلُكُم إِيمَانًا، أَفضَلُكُم مَعرِفَةً.

"تم میں ایمان کے اعتبار سے سب سے افضل وہ ہے جو معرفت کے اعتبار سے سب سے افضل ہو۔"

(بحار الانوار، ج ۶۳، ص ۱۴، حدیث ۳۷، بحوالۂ جامع الاخبار)

ظاہری اسلام اور حقیقی اسلام

تمہید

کبھی **اسلام** سے مراد صرف زبان سے کیا جانے والا اقرار ہوتا ہے، جس کے ساتھ قلبی قبول اور تسلیم کا ہونا ضروری نہیں۔

لیکن بعض مقامات پر اسلام کو **"دین"** کہا گیا ہے۔

دین سے مراد ایک آئین، طریقہ اور نظامِ زندگی ہے۔ **دینِ الٰہی** سے مراد اللہ تعالیٰ کی بندگی کا طریقہ اور پروردگارِ متعال کے سامنے عبودیت اختیار کرنے کا راستہ ہے۔

اس معنی میں دین صرف زبانی اقرار سے متحقق نہیں ہوتا، بلکہ اس کا دائرہ انسان کے **قلب اور عقائد** کو بھی شامل کرتا ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں قرآنِ کریم اس بارے میں کیا فرماتا ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللهِ الإِسلَامُ.

"بے شک اللہ کے نزدیک دین، اسلام ہی ہے۔"

(سورۂ آلِ عمران، ۳:۱۹)

اور فرمایا:

وَمَن يَبتَغِ غَيرَ الإِسلَامِ دِينًا فَلَن يُقبَلَ مِنهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ لَمِنَ الخَاسِرِينَ.

"اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے، وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں یقیناً خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"

(سورۂ آلِ عمران، ۳:۸۵)

زبان سے اسلام کا اقرار

ان آیات میں اسلام کو **دین** قرار دیا گیا ہے؛ یعنی وہ دین جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جس پر آخرت کا اجر اور انجام مترتب ہوتا ہے۔

واضح ہے کہ یہ اسلام اس **ظاہری اسلام** سے مختلف ہے جس پر صرف دنیا کے بعض فقہی احکام و آثار مرتب ہوتے ہیں اور جو آخرت میں انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

ہماری روایات میں اس ظاہری اسلام کو، جس کے آثار اسی دنیا تک محدود ہیں، اس طرح بیان کیا گیا ہے:

الإِسلَامُ يُحقَنُ بِهِ الدَّمُ، وَتُؤَدَّى بِهِ الأَمَانَةُ، وَتُستَحَلُّ بِهِ الفُرُوجُ، وَالثَّوَابُ عَلَى الإِيمَانِ.

"اسلام کے ذریعے جان محفوظ ہو جاتی ہے، امانت ادا کی جاتی ہے اور نکاح حلال ہو جاتا ہے، لیکن ثواب ایمان پر ہے۔"

)الکافی، ج ۲، ص ۲۴، کتاب الایمان والکفر، باب : أن الإسلام یحقن به الدم...، حدیث ۱، از امام صادقؑ(

اسلام کے ذریعے انسان کی جان محفوظ ہوتی ہے، امانتوں کے احکام جاری ہوتے ہیں اور نکاح حلال ہو جاتا ہے؛ لیکن **اجر و ثواب ایمان پر موقوف ہے۔**

یہ تمام آثار اس زبانی اقرار سے متعلق ہیں جس کے احکام انسان کی زندگی تک جاری رہتے ہیں۔ موت کے بعد یہ دنیوی آثار باقی نہیں رہتے۔ یہ اسلام کے دنیوی نتائج ہیں، لیکن انسان کی ابدی نجات میں ان کا کوئی کردار نہیں۔

آخرت میں جو چیز انسان کو فائدہ پہنچاتی ہے وہ **ایمان** ہے، جس کا اس ظاہری اسلام کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

لہٰذا انسان کی حقیقی سعادت صرف ایمان کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کی حقیقی سعادت کا تعلق اس کی آخرت اور روزِ قیامت سے ہے، نہ کہ صرف ان فقہی احکام سے جو دنیا میں اس کی زندگی تک اس پر جاری ہوتے ہیں۔

پس جو لوگ زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں لیکن اپنے باطن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے سامنے تسلیم نہیں ہوتے، انہیں اپنے اس ظاہری اسلام سے آخرت میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

بعض روایات میں اس ظاہری اسلام کو **"زبان کا ایمان "** بھی کہا گیا ہے:

فَإِنَّ قَومًا آمَنُوا بِأَلسِنَتِهِم لِيَحقِنُوا بِهَا دِمَاءَهُم، فَأَدرَكُوا مَا أَمَّلُوا. وَإِنَّا آمَنَّا بِکَ بِأَلسِنَتِنَا وَقُلُوبِنَا لِتَعفُوَ عَنَّا، فَأَدرِكْنَا مَا أَمَّلنَا.

"بے شک کچھ لوگوں نے صرف اپنی زبانوں سے ایمان کا اظہار کیا تاکہ اس کے ذریعے اپنی جانوں کو محفوظ رکھیں، پس انہوں نے وہ چیز حاصل کر لی جس کی انہیں امید تھی۔ لیکن ہم اپنی زبانوں اور اپنے دلوں، دونوں کے ساتھ تجھ پر ایمان لائے ہیں تاکہ تو ہمیں معاف فرمائے؛ پس ہمیں بھی وہ عطا فرما جس کی ہم تجھ سے امید رکھتے ہیں۔"

)بحار الانوار، ج ۹۸، ص ۸۸، بحوالہ اقبال الاعمال، دعائے ابو حمزہ ثمالیؒ کا ایک حصہ (

صرف زبان سے ظاہر کیا جانے والا ایمان، حقیقی ایمان نہیں ہے۔ یہ وہی **ظاہری اور زبانی اسلام** ہے۔

اسی لیے امام سجادؑ نے فرمایا کہ ان لوگوں نے صرف اپنی زبان سے ایمان کا اظہار کیا تھا تاکہ ان کی جانیں محفوظ رہیں۔

حقیقی ایمان اس وقت وجود میں آتا ہے جب **زبان اور قلب دونوں تسلیم ہوں۔**

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور عفو کی امید بھی وہی شخص رکھ سکتا ہے جس کا قلب ایمان لایا ہو۔
محض زبانی ایمان سے صرف اسلام کے دنیوی آثار کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اسلام کی حقیقت

لہٰذا جب اسلام کو **دین** کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے تو اس سے مراد **حقیقی اسلام** ہے؛ یعنی ایسا اسلام جس میں قلب کی حقیقی تسلیم موجود ہو، جو ایمان سے جدا نہیں بلکہ اس کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم کی آیت ﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللهِ الإِسلَامُ﴾ کے ذیل میں ائمۂ اہلِ بیتؑ سے روایت ہوئی ہے:

الَّذِي فِيهِ الإِيمَانُ.

"[اس سے مراد وہ اسلام ہے] جس میں ایمان موجود ہو۔"

(تفسیر البرہان، ج۱، ص۲۷۴)

پس دینِ اسلام سے مراد صرف ظاہری اسلام یا ایمان سے خالی اسلام نہیں، بلکہ **ایمان اس کے تحقق کی شرط ہے۔**

امیر المؤمنین امام علیؑ نے اس حقیقی اسلام کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

لَأَنسَبَنَّ الإِسلَامَ نِسبَةً لَا يَنسِبُهَا أَحَدٌ قَبلِي وَلَا يَنسِبُهَا أَحَدٌ بَعدِي إِلَّا بِمِثلِ ذَلِكَ. إِنَّ الإِسلَامَ هُوَ التَّسلِيمُ، وَالتَّسلِيمُ هُوَ اليَقِينُ، وَاليَقِينُ هُوَ التَّصدِيقُ، وَالتَّصدِيقُ هُوَ الإِقرَارُ، وَالإِقرَارُ هُوَ العَمَلُ، وَالعَمَلُ هُوَ الأَدَاءُ. إِنَّ المُؤمِنَ لَم يَأخُذ دِينَهُ عَن رَأيِهِ، وَلَكِن أَتَاهُ مِن رَبِّهِ فَأَخَذَهُ. إِنَّ المُؤمِنَ يُرَى يَقِينُهُ فِي عَمَلِهِ، وَالكَافِرُ يُرَى إِنكَارُهُ فِي عَمَلِهِ.

"میں اسلام کا ایسا تعارف بیان کروں گا جیسا مجھ سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیا، اور میرے بعد بھی کوئی اسے اسی طرح بیان کیے بغیر بیان نہیں کر سکے گا۔

بے شک اسلام، تسلیم ہے؛ تسلیم، یقین ہے؛ یقین، تصدیق ہے؛ تصدیق، اقرار ہے؛ اقرار، عمل ہے؛ اور عمل، ادائے فریضہ ہے۔

مؤمن اپنا دین اپنی رائے سے حاصل نہیں کرتا، بلکہ اس کا دین اس کے پروردگار کی جانب سے اس تک پہنچتا ہے اور وہ اسے قبول کرتا ہے۔

مؤمن کا یقین اس کے عمل میں دکھائی دیتا ہے اور کافر کا انکار اس کے عمل میں نمایاں ہوتا ہے۔"

)الکافی، ج ۲، ص ۴۵، کتاب الایمان والکفر، باب : نسبۃ الإسلام، حدیث ۱(

اسلام کی تعریف کرتے ہوئے امامؑ نے **"نسبت "** کی تعبیر استعمال فرمائی ہے۔

نسبت کو کسی شخص کے شناختی تعارف یا شناخت نامے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ پس اسلام کی "نسبت" سے مراد اس کی حقیقی شناخت اور وہ بنیادی خصوصیات ہیں جن سے اسلام پہچانا جاتا ہے۔

جس طرح کسی شناختی دستاویز میں وہ بنیادی خصوصیات درج ہوتی ہیں جن کے ذریعے اس کے حامل کی شناخت ہوتی ہے، اسی طرح امیر المؤمنینؑ کی بیان کردہ تعریفِ اسلام میں وہ بنیادی خصوصیات بیان ہوئی ہیں جن کے بغیر اسلام کی حقیقت کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔

اسلام کی حقیقت **تسلیم** کے سوا کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بندگی کی روح بھی اس کے سامنے تسلیم ہونا ہے، اور معرفت بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کرائی گئی معرفت کو **قبول کرنا اور اس کے سامنے تسلیم ہو جانا** ہے۔

اس لیے **"تسلیم "** کی تعبیر نہایت دقیق اور جامع ہے۔

اس تسلیم کا لازمی نتیجہ **یقین** ہے۔

یقین وہ مضبوط اعتقاد ہے جو انسان کی روح میں راسخ ہو جاتا ہے اور اسے اپنے پروردگار کے سامنے کامل اقرار و تصدیق تک پہنچا دیتا ہے۔

عمل کی روح بھی دراصل اللہ تعالیٰ کے سامنے **اقرار، قبول، رضا اور تسلیم** ہے، اور اسی باطنی کیفیت سے ظاہری آثار، یعنی فرائض کی عملی ادائیگی، وجود میں آتے ہیں۔

پس مؤمن اور کافر کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ مؤمن اللہ تعالیٰ کے سامنے تسلیم ہوتا ہے اور اسی چیز کو اپنا دین بناتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر فرمائی ہے۔

اس کے بر خلاف کافر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت کی پروا نہیں کرتا، بلکہ اپنی رائے اور ذاتی پسند کے مطابق عمل کرتا ہے۔

حقیقت میں ایسا شخص اپنے پروردگار کا بندہ اور مطیع نہیں، بلکہ اپنی خواہشات اور میلانات کا پیرو ہوتا ہے۔

یہی مؤمن اور کافر کے درمیان بنیادی فرق ہے۔

ان دونوں کے ظاہری اعمال میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے، وہ دراصل ان کے دلوں میں موجود کیفیت کا عکس ہے۔

مثلاً مؤمن جب نماز پڑھتا ہے تو اس کا یہ عمل اس کے قلب میں موجود یقین کو ظاہر کرتا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی تسلیم کی گواہی دیتا ہے۔

لہٰذا صرف ظاہری اعمال انجام دینا بذاتِ خود اس بات کی دلیل نہیں کہ انسان حقیقتاً بندگی اور عبادت میں مصروف ہے۔

بلکہ یہ اعمال اس کے **باطنی اعتقاد کے مظاہر** ہیں۔

اسی طرح کافر کا نماز سے روگردانی کرنا اس کے منکر قلب اور سرکش روح کا آئینہ ہوتا ہے۔

در حقیقت یہی **انکار اور جحود** کی کیفیت کفر کو جنم دیتی ہے، جس طرح اطاعت اور تسلیم کی روح انسان کو مؤمن بناتی ہے۔

اور یہی تسلیم اور کامل سپردگی وہ **اختیاری معرفت** ہے جسے ہم نے ایمان کے ساتھ ہم معنی قرار دیا تھا۔

کفر کی حقیقت

تمہید

اسلام اور ایمان کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد اب ضروری ہے کہ **کفر** کی حقیقت کو بھی صحیح طور پر سمجھا جائے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا.

"بے شک ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، اب خواہ وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا۔"

(سورۂ انسان، ۷۶:۳)

امام صادقؑ نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

إِمَّا آخِذٌ فَهُوَ شَاكِرٌ، وَإِمَّا تَارِكٌ فَهُوَ كَافِرٌ.

"یا وہ اسے اختیار کرتا ہے، تو وہ شکر گزار ہے؛ اور یا اسے چھوڑ دیتا ہے، تو وہ کافر ہے۔"

(الکافی، ج ۲، ص ۳۸۴، کتاب الایمان والکفر، باب الکفر، حدیث ۴)

دوسرے لفظوں میں، **ہدایت اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتی ہے۔**

جب بندگی کا صحیح راستہ انسان کے سامنے واضح کر دیا جائے تو اگر وہ اسے قبول کر لے تو مؤمن ہے، اور اگر اسے قبول کرنے سے انکار کر دے تو کافر ہو جاتا ہے۔

پس ایمان اور کفر اس وقت معنی پیدا کرتے ہیں جب ہدایت کا راستہ واضح کر دیا گیا ہو۔

اس کے بعد اگر انسان اپنے غلط اختیار کے نتیجے میں جان بوجھ کر بندگی کے راستے سے منہ موڑ لے تو وہ کفر کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

كُلُّ شَيءٍ يَجُرُّهُ الإِقرارُ وَالتَّسلِيمُ فَهُوَ الإِيمَانُ، وَكُلُّ شَيءٍ يَجُرُّهُ الإِنكَارُ وَالجُحُودُ فَهُوَ الكُفرُ.

"ہر وہ چیز جو اقرار اور تسلیم کے نتیجے میں وجود میں آئے، ایمان ہے؛ اور ہر وہ چیز جو انکار اور جحود کے نتیجے میں پیدا ہو، کفر ہے۔"

(الکافی، ج ۲، ص ۳۸۷، کتاب الایمان والکفر، باب الکفر، حدیث ۱۵)

یہ اسی حقیقت کا ایک اور بیان ہے جسے امیر المؤمنینؑ نے پہلے واضح فرمایا تھا:

مؤمن کے اعمال کے آئینے میں اس کی **تسلیم اور یقین** نظر آتا ہے، جبکہ کفر سے متعلق اعمال کے آئینے میں **انکار اور سرکشی** دکھائی دیتی ہے۔

کسی عمل کی صرف ظاہری صورت معیار نہیں ہے۔

اصل اہمیت اس عمل کی **باطنی روح** کی ہے:

کیا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے سامنے بندگی اور تسلیم کی روح سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟

اگر ایسا ہے تو وہ ایمان سے پیدا ہونے والا عمل ہے، اور اگر ایسا نہیں تو وہ کفر کی روح سے پیدا ہونے والا عمل ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ **کون سا عقیدہ اور کون سی معرفت انسان کے عمل کی محرک ہے؟**

جب انسان حق کو پہچان لیتا ہے تو کیا وہ اپنے پروردگار کی اطاعت میں عمل کرتا ہے، یا سرکشی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کرتا ہے؟

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

مَعنَى الكُفرِ كُلُّ مَعصِيَةٍ عُصِيَ اللهُ بِهَا بِجِهَّةِ الجَحدِ وَالإِنكَارِ وَالاِستِخفَافِ وَالتَّهاوُنِ فِي كُلِّ مَا دَقَّ وَجَلَّ.

"کفر کا معنی ہر وہ نافرمانی ہے جس کے ذریعے اللہ کی معصیت، جحود، انکار، حکمِ الٰہی کو حقیر سمجھنے یا اسے ہلکا لینے کی بنا پر کی جائے، خواہ وہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا۔"

(تحف العقول، ص ۳۴۴، کلماتِ امام صادقؑ، بخش: حقیقتِ خروج از ایمان)

پس **کفر کی حقیقت** یہ ہے کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی روح موجود نہ ہو۔

اسی بنا پر کوئی شخص صرف اس وجہ سے کافر نہیں ہو جاتا کہ اس سے اپنے پروردگار کے کسی حکم کی اطاعت نہ ہو سکی۔

بلکہ جب اس کی نافرمانی **تسلیم سے انکار، جحود، یا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور حاکمیت کو حقیر سمجھنے** کے نتیجے میں ہو، تب وہ کفر کا سبب بنتی ہے۔

اس صورت میں چھوٹے اور بڑے گناہ کے درمیان کوئی فرق نہیں رہتا۔

جس شخص نے بنیادی طور پر اپنے مولا کی اطاعت نہ کرنے کا راستہ اختیار کر لیا ہو، اس کے لیے اس کے مولا کا حکم چھوٹا ہو یا بڑا، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اصل چیز **تسلیم اور بندگی کی روح** ہے، جو ایسے شخص میں موجود نہیں۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ فَرَضَ فَرَائِضَ مُوجِبَاتٍ عَلَى العِبَادِ، فَمَن تَرَكَ فَرِيضَةً مِنَ المُوجِبَاتِ فَلَم يَعمَل بِهَا وَجَحَدَهَا كَانَ كَافِرًا...

"بے شک اللہ عزوجل نے اپنے بندوں پر کچھ واجب فرائض مقرر کیے ہیں۔ پس جو شخص ان واجبات میں سے کسی فریضے کو ترک کرے، اس پر عمل نہ کرے اور اس کا انکار بھی کرے، وہ کافر ہے۔۔۔"

)الکافی، ج ۲، ص ۳۸۳، کتاب الایمان والکفر، باب الکفر، حدیث ۱(

کفر اور فسق کا فرق

عمومی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان محض اس وجہ سے **کافر** نہیں ہو جاتا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے کسی حکم پر عمل نہیں کیا۔ ممکن ہے نافرمانی کے باوجود اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے سامنے **تسلیم اور اقرارِ عبودیت کی روح** بالکل ختم نہ ہوئی ہو۔ ممکن ہے انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے، لیکن پھر بھی بندگی کے راستے اور اس کی ربوبیت کے اقرار کی روح سے مکمل طور پر خارج نہ ہوا ہو۔

إِلٰهِي لَمْ أَعْصِكَ حِينَ عَصَيْتُكَ وَأَنَا بِرُبُوبِيَّتِكَ جَاحِدٌ وَلَا بِأَمْرِكَ مُسْتَخِفٌّ... وَلَا لِوَعِيدِكَ مُتَهَاوِنٌ وَلٰكِنْ خَطِيئَةٌ عَرَضَتْ وَسَوَّلَتْ لِي نَفْسِي وَغَلَبَنِي هَوَايَ(2) ...

"اے میرے معبود! جب میں نے تیری نافرمانی کی تو اس حال میں نافرمانی نہیں کی کہ میں تیری ربوبیت کا منکر تھا، نہ تیرے حکم کو حقیر سمجھتا تھا۔۔۔اور نہ تیری وعید کو بے اہمیت جانتا تھا؛ بلکہ ایک خطا میرے سامنے آگئی، میرے نفس نے اسے میرے لیے آراستہ کر دیا اور میری خواہش مجھ پر غالب آگئی۔۔۔"

محض گناہ کا ارتکاب کسی انسان کو **کافر** نہیں بناتا، جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار نہ کرے یا اس کے حکم اور فرمان کو حقیر اور بے اہمیت نہ سمجھے۔

دینی اصطلاح میں ایسے گناہ گار شخص کو **فاسق** کہا جاتا ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

مَعْنَى الْفِسْقِ فَكُلُّ مَعْصِيَةٍ مِنَ الْمَعَاصِي الْكِبَارِ فَعَلَهَا فَاعِلٌ أَوْ دَخَلَ فِيهَا دَاخِلٌ بِجِهَةِ اللَّذَّةِ وَالشَّهْوَةِ وَالشَّوْقِ الْغَالِبِ فَهُوَ فِسْقٌ وَفَاعِلُهُ فَاسِقٌ خَارِجٌ مِنَ الْإِيمَانِ بِجِهَةِ الْفِسْقِ. فَإِنْ دَامَ فِي ذٰلِكَ حَتَّى يَدْخُلَ فِي حَدِّ التَّهَاوُنِ وَالِاسْتِخْفَافِ، فَقَدْ وَجَبَ أَنْ يَكُونَ بِتَهَاوُنِهِ وَاسْتِخْفَافِهِ كَافِرًا(1) .

"فسق کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص گناہانِ کبیرہ میں سے کسی گناہ کا ارتکاب لذت، شہوت یا کسی غالب خواہش کی بنا پر کرے یا اس میں داخل ہو؛ تو یہ فسق ہے اور اس کا مرتکب فاسق ہے، اور اپنے فسق کی وجہ سے ایمان سے خارج ہو گیا ہے۔ پھر اگر وہ

اسی حالت پر قائم رہے، یہاں تک کہ معاملہ بے پروائی اور حکمِ الٰہی کو حقیر سمجھنے کی حد تک پہنچ جائے، تو اپنی اسی بے پروائی اور استخفاف کی وجہ سے وہ کافر ہو جاتا ہے۔"

اگر ایک یا چند گناہوں کا ارتکاب انسان کے لیے اس قدر آسان ہو جائے کہ اسے ان کے ارتکاب کی کوئی پروا نہ رہے، تو یہ کیفیت رفتہ رفتہ اسے **استخفاف** تک پہنچا سکتی ہے؛ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو معمولی سمجھے اور ان کے بارے میں بے پروائی اختیار کرے۔ یہی کیفیت **کفر** ہے۔

پس واضح ہوا کہ **ایمان** اس وقت متحقق ہوتا ہے جب انسان اس حق کو قبول کرے جس کی اسے معرفت حاصل ہو چکی ہے۔ اور تمام حقائق سے بڑھ کر وہ حقیقت اللہ تعالیٰ کی **مطلق ربوبیت** ہے۔

اس ربوبیت کے سامنے تسلیم ہونا ہی پروردگار کے حضور بندگی ہے۔

اگر یہ کیفیت انسان کے اندر موجود نہ رہے تو وہ بندگی کے راستے سے خارج ہو جاتا ہے اور کفر کی راہ اختیار کرتا ہے۔

معرفت میں شک

یہ عدمِ تسلیم دو صورتوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔

کبھی انسان عناد اور ہٹ دھرمی کا رویّہ اختیار کر کے معرفتِ خدا اور اس پر ایمان کا صریحاً انکار کر دیتا ہے۔ یہ **کفر کا شدید درجہ** ہے۔

اور کبھی معاملہ اس درجے کے **جحود اور انکار** تک نہیں پہنچتا، بلکہ معرفتِ خدا اور اس کے تمام لوازم کے سامنے مکمل تسلیم ہونے میں تردّد اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ دوسری کیفیت بھی حقیقت میں حق کے انکار اور اس کے سامنے تسلیم و خاضع ہونے سے گریز ہی کی ایک صورت ہے۔ اگرچہ شدت کے اعتبار سے یہ پہلی حالت جیسی نہیں، لیکن انکار کی اصل حقیقت میں اس سے مختلف بھی نہیں ہے۔

دونوں کے درمیان فرق صرف **درجۂ انکار کی شدت و ضعف** کا ہے، کیونکہ انکار خود ایک ایسی حقیقت ہے جس کے مختلف درجات ہو سکتے ہیں۔

لہٰذا معرفت کے بارے میں **شک**—جو درحقیقت اس معرفت کو قبول کرنے اور اس کے سامنے تسلیم ہونے میں شک ہے—کفر کا ایک کم تر درجہ ہے، اور ایسی کیفیت رکھنے والا شخص کافر قرار پاتا ہے۔

اختیاری اور غیر اختیاری شک

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ **شک** محض ایک غیر اختیاری نفسیاتی کیفیت ہے، لہٰذا شک کرنے والا شخص کسی ذمہ داری کا حامل نہیں اور اسے کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ درست ہے کہ شک اور تردّد کی ایک کیفیت غیر اختیاری طور پر بھی انسان کے اندر پیدا ہو سکتی ہے۔
لیکن جب اس کیفیت کا سبب اختیاری ہو تو خود یہ شک بھی اختیاری شمار ہوتا ہے، اور اسی بنا پر وہ الٰہی تکلیف، امر و نہی کے دائرے میں آ جاتا ہے۔

انسان کے اختیار میں یہ بات ہے کہ جب کوئی حقیقت اس کے لیے واضح ہو جائے تو وہ اس کے سامنے تسلیم ہو جائے اور اس حقیقت کو قبول کرنے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے وجوب میں اپنے آپ کو شک و تردّد میں مبتلا نہ کرے۔
تسلیم کے وجوب میں تردّد نہ کرنا ایک عاقل انسان کا **اختیاری فعل** ہے۔

جب انسان ایسا کرتا ہے تو اسے وہ اطمینان، سکون اور **سکینہ** حاصل ہوتی ہے جو ایمان کے آثار میں سے ہے۔
لیکن اگر وہ حق کو قبول کرنے میں اطمینان اور قلبی سکون کے ساتھ قدم نہ بڑھائے، بلکہ تردّد اور پس و پیش کا شکار ہو جائے تو اس کے اندر شک کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ انکار اور کفر کے مظاہر میں سے ایک ہے۔

شک و تردّد کے اس اختیاری فعل کو **رَیب** کہا جاتا ہے، جبکہ اس سے نفس میں پیدا ہونے والی کیفیت کو **شک** کہتے ہیں۔

لہٰذا جو شخص شک میں مبتلا ہونے سے بچنا چاہتا ہے، اسے اس حقیقت کے سامنے مکمل تسلیم ہونے میں تردّد نہیں کرنا چاہیے جسے وہ حق سمجھ چکا ہے۔

خود عقل اس تسلیم کو واجب قرار دیتی ہے۔

امیر المؤمنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

لَا تَرْتَابُوا فَتَشُكُّوا، وَلَا تَشُكُّوا فَتَكْفُرُوا(1) .

"ریب و تردّد میں نہ پڑو کہ شک میں مبتلا ہو جاؤ، اور شک میں نہ پڑو کہ کفر تک پہنچ جاؤ۔(2) "

شک ـــــ انکار کا ایک درجہ

بظاہر اس کلام میں **شک** سے ممانعت، دراصل پہلے حصے میں بیان ہونے والے **ریب اور تردّد** سے ممانعت ہی کی طرف لوٹتی ہے، نہ یہ کہ شک کے بارے میں ایک الگ اور مستقل ممانعت مراد ہو۔

ایسے شخص کو کافر قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیفیت خود **جحود اور انکار کی ایک صورت** ہے، جیسا کہ بعض روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے:

...فَدَخَلَ عَلَيْهِ أَبُو بَصِيرٍ فَقَالَ: يَا أَبَا عَبْدِ اللهِ، مَا تَقُولُ فِيمَنْ شَكَّ فِي اللهِ؟ فَقَالَ: كَافِرٌ يَا أَبَا مُحَمَّدٍ. قَالَ: فَشَكَّ فِي رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ: كَافِرٌ. ثُمَّ الْتَفَتَ إِلَى زُرَارَةَ فَقَالَ: إِنَّمَا يَكْفُرُ إِذَا جَحَدَ(1) .

ابو بصیر امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"اے ابو عبداللہؑ! اس شخص کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو اللہ کے بارے میں شک کرے؟"

آپؑ نے فرمایا:

"اے ابو محمد! وہ کافر ہے۔"

انہوں نے عرض کیا:

"اور اگر وہ رسولِ خداؐ کے بارے میں شک کرے؟"

آپؑ نے فرمایا:

"وہ کافر ہے۔"

پھر امامؑ زرارہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"وہ صرف اسی وقت کافر ہوتا ہے جب جحود وانکار کرے۔"

روایت کا آخری جملہ واضح کرتا ہے کہ یہاں جس **شک** کی بات ہو رہی ہے وہ در حقیقت **انکار کا ایک درجہ** ہے۔

البتہ لفظ شک کبھی ایک دوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جو ہماری موجودہ بحث سے متعلق نہیں۔

اگر کوئی چیز انسان کے لیے نامعلوم ہو اور وہ اسے سمجھ نہ پایا ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں غیر یقینی کیفیت میں ہے۔

حقیقت میں شک کا یہ معنی **جہالت اور لاعلمی** کی ایک صورت ہے اور اس شک سے کوئی تعلق نہیں جس پر یہاں گفتگو ہو رہی ہے۔

ہم اس شک کی بات کر رہے ہیں جو **علم اور معرفت حاصل ہو جانے کے بعد** انسان کے اپنے اختیار سے پیدا ہوتا ہے۔

ایسا شک قابل مذمت ہے۔

جب انسان کو کسی حقیقت کا علم حاصل ہو جائے تو اسے اس حقیقت کے ساتھ ایسا رویّہ اختیار نہیں کرنا چاہیے گویا وہ ابھی تک مشکوک اور غیر یقینی ہو۔

لیکن عملاً ایسا ہو سکتا ہے۔

انسان کسی حقیقت کے بارے میں یقین رکھنے کے باوجود اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کر سکتا ہے جیسے وہ محض ایک مشکوک امکان ہو۔

موت اس کی ایک واضح مثال ہے۔

بہت سے لوگ موت کے آنے پر مکمل یقین رکھتے ہیں، لیکن ان کا طرزِ زندگی ایسا ہوتا ہے جیسے موت کا واقع ہونا ابھی مشکوک ہو۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

لَمْ يَخْلُقِ اللهُ عَزَّوَجَلَّ يَقِينًا لَا شَكَّ فِيهِ أَشْبَهَ بِشَكٍّ لَا يَقِينَ فِيهِ مِنَ الْمَوْتِ(2) .

"اللہ عزوجل نے موت سے بڑھ کر کوئی ایسی یقینی حقیقت پیدا نہیں کی جس میں کوئی شک نہ ہو، لیکن جو ایسی مشکوک چیز سے مشابہ ہو جس میں گویا کوئی یقین ہی نہ ہو۔"

اگرچہ موت کا واقع ہونا اور اس کا ناگزیر ہونا نہایت واضح اور یقینی ترین حقائق میں سے ہے، لیکن انسانوں کا اس کے ساتھ عملی رویّہ ایسا ہوتا ہے جیسے انہیں اس کے بارے میں کوئی یقین ہی نہ ہو اور اس کا وقوع سراسر مشکوک ہو۔

امیر المؤمنین امام علیؑ کی اس نصیحت کا مفہوم بھی یہی ہے:

لَا تَجْعَلُوا عِلْمَكُمْ جَهْلًا وَيَقِينَكُمْ شَكًّا. إِذَا عَلِمْتُمْ فَاعْمَلُوا، وَإِذَا تَيَقَّنْتُمْ فَأَقْدِمُوا(1) .

"اپنے علم کو جہالت اور اپنے یقین کو شک نہ بناؤ۔ جب جان لو تو عمل کرو، اور جب یقین حاصل ہو جائے تو آگے بڑھو۔"

یقین کو شک اور علم کو جہالت بنا دینے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی یقینی حقیقت کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسے وہ مشکوک ہو، اور اپنے علم کے باوجود ایسا رویّہ اپنائے جیسے وہ اس حقیقت سے ناواقف ہو۔

ایسی صورت میں انسان علم و یقین سے پیدا ہونے والے **اطمینان اور سکون** کو کھو دیتا ہے اور شک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اور اس شک کی بنیاد خود اس کے **اختیار کا غلط استعمال** ہے۔

مستضعف — نہ مؤمن، نہ کافر

تمہید

ایمان اور کفر دونوں کا تعلق **حق کی معرفت** سے ہے۔

اگر انسان اس حقیقت کے سامنے تسلیم ہو جائے جسے اس نے پہچان لیا ہے تو وہ اہلِ ایمان میں سے ہے، اور اگر اس کے سامنے تسلیم ہونے سے انکار کرے تو کافر ہے۔

لیکن جس شخص کے لیے حق سرے سے واضح ہی نہ ہوا ہو، اس کے سامنے نہ ایمان و تسلیم کا راستہ کھلا ہے اور نہ اس معنی میں کافر بننے کا امکان۔

حقیقت اس انداز سے اس تک پہنچی ہی نہیں کہ وہ اسے قبول یا رد کر سکے۔

ایسے لوگ — بشرطیکہ حق کو نہ پہچاننے میں خود ان کی کوتاہی نہ ہو — **مستضعف** کہلاتے ہیں۔

قرآن وسنت میں ان کی حیثیت اور ذمہ داری کو واضح کیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ سے **مستضعف** کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

هُوَ الَّذِي لَا يَهْتَدِي حِيلَةً إِلَى الْكُفْرِ فَيَكْفُرَ، وَلَا يَهْتَدِي سَبِيلًا إِلَى الْإِيمَانِ؛ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُؤْمِنَ وَلَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يَكْفُرَ. فَهُمُ الصِّبْيَانُ وَمَنْ كَانَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ عَلَى مِثْلِ عُقُولِ الصِّبْيَانِ، مَرْفُوعٌ عَنْهُمُ الْقَلَمُ(2) .

"مستضعف وہ ہے جسے ایسا کوئی راستہ نہیں ملتا جس کے ذریعے وہ کفر تک پہنچ کر کافر ہو سکے، اور نہ اسے ایمان تک پہنچنے کا کوئی راستہ ملتا ہے؛ وہ نہ ایمان لانے کی استطاعت رکھتا ہے اور نہ کفر اختیار کرنے کی۔ پس ایسے لوگوں میں بچے اور وہ مرد و عورتیں شامل ہیں جن کی عقل بچوں کی مانند ہے۔ ان سے قلمِ تکلیف اٹھا لیا گیا ہے۔"

عقل وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان حق اور باطل میں تمیز کرتا ہے۔

اور یہی عقل ایک عاقل انسان کو حق کے سامنے تسلیم ہونے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

جو شخص اس نعمتِ الٰہی سے محروم ہو، وہ اپنے پروردگار کے سامنے تسلیم ہونے کے وجوب کو سمجھ ہی نہیں سکتا؛ لہٰذا وہ مؤاخذے اور سزا کا مستحق بھی نہیں۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد سے **شرعی تکلیف** اٹھالی ہے۔

مستضعف کی تعریف

البتہ جو لوگ اسلام کی ہدایت تک نہیں پہنچے، ممکن ہے حق دین کو نہ پہچاننے میں خود ان کی کوتاہی شامل ہو۔

مثلاً فرض کیجیے کہ ایک عیسائی یہ جانتا ہے کہ اسلام، مسیحیت کے برخلاف، یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد بھی ایک نبی مبعوث ہوئے، اور وہ اس دعوے کے درست ہونے کا احتمال بھی دیتا ہے۔

اس صورت میں عقل اس سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ تحقیق کرے اور معلوم کرے کہ اسلام کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔

اگر وہ تحقیق کی کوئی کوشش نہ کرے اور اسی بنا پر حقیقت کبھی اس پر واضح نہ ہو تو اس کوتاہی کا ذمہ دار خود وہ شخص ہے۔

ایسا شخص **جاہلِ مقصّر** ہے۔

جاہلِ مقصّر اس **جاہلِ قاصر** سے مختلف ہے جس نے حق کی تلاش میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ لہٰذا جاہلِ مقصّر کو مستضعف نہیں کہا جاسکتا۔

علم تک پہنچنے کا راستہ اس کے لیے کھلا تھا، لیکن اس نے اپنے اختیار کے غلط استعمال سے خود کو اس علم سے محروم کر دیا۔

ممکن ہے ایسا شخص یہ بھی نہ جانتا ہو کہ اگر وہ تحقیق کرتا تو کس نتیجے تک پہنچتا۔

لیکن یہ بات اس کی ذمہ داری کو ختم نہیں کرتی۔

یہ نہ جاننا کہ تحقیق کے بعد اسے کیا حقیقت معلوم ہوتی، اس بات کے لیے عذر نہیں بن سکتا کہ اس نے اس وقت تحقیق ہی نہ کی جب عقل اس سے تحقیق کا تقاضا کر رہی تھی۔

پس اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے کہ حقیقی **مستضعف** کون ہیں، اور روزِ قیامت ان لوگوں سے مؤاخذہ کر سکتا ہے جنہوں نے حق کی تلاش میں کوتاہی کی، اور پھر انہیں ان کی اسی تقصیر اور کوتاہی پر سزا دے سکتا ہے۔

امام صادقؑ کی درج ذیل روایت ایسے ہی افراد کی طرف اشارہ کرتی ہے:

مَنْ عَرَفَ اخْتِلَافَ النَّاسِ فَلَيْسَ بِمُسْتَضْعَفٍ(1) .

"جو شخص لوگوں کے درمیان موجود اختلافات سے آگاہ ہو، وہ مستضعف نہیں ہے۔"

مستضعفین کا آخری انجام

اگر کوئی شخص حقیقتاً مستضعف ہو تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کے آخری انجام کو قطعی طور پر معین اور ظاہر نہیں فرمایا، بلکہ اس کا معاملہ آخرت پر چھوڑ دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس گروہ، یعنی مستضعفین، کے ساتھ اپنے **عدل** کے مطابق بھی معاملہ کر سکتا ہے اور اپنے **فضل** کے مطابق بھی۔

اگر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ عدل کے مطابق معاملہ فرمائے تو اس کا تعلق ان امور سے ہو سکتا ہے جو **مستقلاتِ عقلیہ** کے ذریعے ثابت ہیں۔

مثلاً عقل مستقل طور پر یہ حکم کرتی ہے کہ ظلم قبیح اور ممنوع ہے، خواہ ایسے لوگوں تک اسلام کی ہدایت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ ایسے امور میں اللہ تعالیٰ اپنے عدل کے مطابق ان سے حساب لے سکتا ہے اور ان کے اختیاری اعمال پر ان کا مؤاخذہ کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے فضل سے ان سے در گزر فرمائے۔

ان دونوں میں سے ان کے ساتھ کون سا معاملہ ہو گا، یہ آخرت میں واضح ہو گا۔ دنیا میں ان کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ بیان نہیں کیا گیا۔

درج ذیل روایت اس مسئلے کو مزید واضح کرتی ہے:

عَنْ زُرَارَةَ ... قَالَ: قُلْتُ لَهُ: مَا تَقُولُ فِي قَوْلِهِ عَزَّوَجَلَّ: «إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا»؟ ... فَقَالَ: وَاللهِ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ وَلَا كَافِرِينَ(3) .

زرارہ کہتے ہیں:

میں نے امامؑ سے اللہ عزوجل کے اس فرمان کے بارے میں سوال کیا:

»إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا«

''سوائے ان مستضعف مردوں، عورتوں اور بچوں کے جو نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ کسی راستے کی رہنمائی پاتے ہیں۔'' سورۂ نساء، ۹۸:۴(

امامؑ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! وہ نہ مؤمن ہیں اور نہ کافر۔''

بظاہر زرارہ کے ذہن میں مستضعفین کے بارے میں ایک مختلف تصور تھا۔ اسی لیے انہوں نے امامؑ سے سوال کیا کہ اگر یہ لوگ بالآخر جنت میں جائیں گے تو مؤمن ہوں گے، اور اگر جہنم میں جائیں گے تو کافر ہوں گے۔

امامؑ نے فرمایا:

وَاللهِ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ وَلَا كَافِرِينَ، وَلَوْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ لَدَخَلُوا الْجَنَّةَ كَمَا دَخَلَهَا الْمُؤْمِنُونَ، وَلَوْ كَانُوا كَافِرِينَ لَدَخَلُوا النَّارَ كَمَا دَخَلَهَا الْكَافِرُونَ...

"اللہ کی قسم! وہ نہ مؤمن ہیں اور نہ کافر۔ اگر وہ مؤمن ہوتے تو اسی طرح جنت میں داخل ہوتے جس طرح مؤمنین داخل ہوتے ہیں، اور اگر وہ کافر ہوتے تو اسی طرح جہنم میں داخل ہوتے جس طرح کفار داخل ہوتے ہیں۔۔۔"

لہٰذا مستضعفین میں سے جو لوگ بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، ان کا جنت میں داخل ہونا مؤمنین کے داخلے کی مانند نہیں ہوگا۔

اور اگر ان میں سے بعض جہنم میں جائیں تو ان کا جہنم میں داخل ہونا بھی کفار کے داخلے کی مانند نہیں ہوگا۔

مؤمنین جنت میں کس طرح داخل ہوتے ہیں؟

چونکہ مؤمنین اللہ تعالیٰ کے وعدۂ الٰہی میں شامل ہیں، اس لیے ایک اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ جنت کے استحقاق کے حامل ہو جاتے ہیں۔

البتہ ابتدا میں اللہ تعالیٰ کا ان سے جنت کا وعدہ کرنا خود اس کے **فضل** کی بنیاد پر ہے۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ ان سے جنت کا وعدہ فرما چکا اور انہوں نے اس کے حکم کے مطابق اس کے سامنے تسلیم اختیار کر لیا، تو بالفرض اگر اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا نہ فرمائے تو یہ ان کے حق میں ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ظلم سے منزّہ ہے۔

لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے **عدل اور اس کے وعدے** کی بنیاد پر جنت میں داخل ہوتے ہیں۔

لیکن جو مستضعفین جنت میں داخل ہوں گے، ان سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا۔

لہٰذا عدل کی بنیاد پر ان کے لیے کسی الٰہی اجر کا استحقاق ثابت نہیں ہوتا۔

انہیں جو کچھ بھی عطا ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے **فضل** سے ہوگا۔

اور اگر انہیں اجر نہ دیا جائے تو ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

پس اگر وہ جنت میں داخل بھی ہوں تو ان کا داخلہ مؤمنین کے داخلے کی مانند نہیں ہوگا۔

یہی اصول ان مستضعفین کے بارے میں بھی جاری ہے جو جہنم میں داخل ہوں گے۔

ان کا حساب کفار کے حساب سے مختلف ہوگا۔

کفار پر **حجت تمام** ہو چکی ہے اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی وعیدیں ان پر لازم ہو چکی ہیں۔

لیکن مستضعفین، اگران اعمال کی بناپر جہنم میں جائیں بھی جن کے بارے میں ان پر حجت تمام تھی، تب بھی دنیا میں انہوں نے انبیاء یاائمہؑ کے ذریعے وہ الٰہی وعیدیں نہیں سنی تھیں اور نہ جہنم کی تفصیلات ان تک پہنچی تھیں۔

لہٰذا اس اعتبار سے ان کی حالت کفار سے مختلف ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ محض جنت میں داخل ہونا لازماً مؤمن ہونے کی دلیل نہیں، اور اسی طرح محض جہنم میں داخل ہونا لازماً کافر ہونے کی دلیل نہیں۔

جو لوگ نہ مؤمن ہیں اور نہ کافر ـــــ یعنی **مستضعفین** ـــــ ممکن ہے بالآخر جنت یا جہنم میں سے کسی ایک میں داخل ہوں۔

زرارہ نے ایک مرتبہ پھر امام محمد باقرؑ سے سوال کیا:

أَمِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ هُمْ أَمْ مِنْ أَهْلِ النَّارِ؟ فَقَالَ: اتْرُكْهُمْ حَيْثُ تَرَكَهُمُ اللهُ.

قُلْتُ: أَفَتُرْجِئُهُمْ؟ قَالَ: نَعَمْ، أُرْجِئُهُمْ كَمَا أَرْجَأَهُمُ اللهُ، إِنْ شَاءَ أَدْخَلَهُمُ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِهِ، وَإِنْ شَاءَ سَاقَهُمْ إِلَى النَّارِ بِذُنُوبِهِمْ وَلَمْ يَظْلِمْهُمْ.

میں نے عرض کیا:

"کیا وہ اہلِ جنت میں سے ہیں یا اہلِ جہنم میں سے؟"

آپؑ نے فرمایا:

"انہیں وہیں چھوڑ دو جہاں اللہ نے انہیں چھوڑا ہے۔"

میں نے عرض کیا:

"تو کیا آپ ان کے معاملے کو مؤخر رکھتے ہیں؟"

آپؑ نے فرمایا:

"ہاں، میں ان کے معاملے کو اسی طرح مؤخر رکھتا ہوں جس طرح اللہ نے اسے مؤخر رکھا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنی رحمت سے انہیں جنت میں داخل کرے، اور اگر چاہے تو ان کے گناہوں کے سبب انہیں جہنم کی طرف لے جائے، اور اس نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا ہوگا۔"

قیامت سے پہلے مستضعفین کے آخری انجام کا معلوم نہ ہونا

پس اللہ تعالیٰ مستضعفین کے معاملے کو روزِ قیامت واضح فرمائے گا۔

دنیا میں ان کے آخری انجام کے بارے میں کوئی قطعی حکم مقرر نہیں کیا گیا، بلکہ ان کا معاملہ **مشیتِ الٰہی** پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

قرآن و سنت سے ثابت اصولوں کے مطابق، ایک اعتبار سے تمام انسانوں کی تقدیر اس دنیا سے پہلے کے عوالم میں معلوم اور معین ہو چکی تھی۔

لیکن پہلی بات یہ ہے کہ بعض افراد کے بارے میں **بداء** کا امکان موجود ہے، یعنی پہلے سے مقدر شدہ امر میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر شخص کا آخری انجام دنیا میں آنے سے پہلے ہی قطعی اور ناقابلِ تغییر طور پر متعین ہو چکا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ رسولِ خداؐ اور ائمہؑ اس سے آگاہ تھے کہ پہلے کیا مقدر کیا جا چکا ہے، لیکن عام طور پر وہ لوگوں کے آخری انجام کے بارے میں اسی سابق تقدیر کی بنیاد پر فیصلہ ظاہر نہیں فرماتے تھے، سوائے بعض مخصوص موارد کے۔

لہٰذا عملی طور پر انہوں نے اپنے پیروکاروں کو یہی تعلیم دی کہ **مستضعفین کے بارے میں اجمالاً یہی عقیدہ رکھا جائے کہ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکم پر چھوڑ دیا گیا ہے** اور ان کے آخری انجام کو متعین کرنے پر اصرار نہ کیا جائے۔

مستضعفین کی شناخت کی دشواری

مستضعفین کے بارے میں آخری اہم نکتہ یہ ہے کہ مذکورہ تعریف کی روشنی میں یہ طے کرنا کہ حقیقتاً کون سے افراد **مستضعف** ہیں، نہایت دشوار اور بعض اوقات ناممکن ہے۔

کیونکہ کسی شخص کے حقیقی مستضعف ہونے کا تعین عموماً ایک **باطنی اور قلبی امر** کی تشخیص پر موقوف ہوتا ہے، اور یہ ایسی چیز ہے جو نہ ظاہری طور پر دکھائی دیتی ہے اور نہ آسانی سے معلوم کی جا سکتی ہے۔

اسی لیے مستضعفین سے متعلق مباحث عموماً **قضایائے شرطیہ** کی صورت رکھتے ہیں۔

یعنی یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ **اگر** کوئی شخص حقیقتاً اُن شرائط کا حامل ہو تو وہ مستضعف ہے؛ لیکن کسی معین شخص کو یقینی طور پر مستضعف قرار دینا آسان نہیں۔

اسی بنا پر ممکن ہے کوئی شخص شریعت کے ظاہری معیار کے مطابق **کافر** شمار ہوتا ہو، لیکن حقیقت میں **مستضعف** ہو۔

دنیا میں ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ **شریعت کے ظاہری احکام** کے مطابق معاملہ کریں۔

مثلاً ہم کسی عیسائی پر محض اس احتمال کی بنا پر اسلام کے فقہی احکام جاری نہیں کر سکتے کہ شاید وہ حقیقت میں مستضعف ہو۔

اگر وہ واقعاً مستضعف ہے تو اس کی حقیقت روزِ قیامت واضح ہو جائے گی، اور ممکن ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اسے جنت میں داخل فرمائے۔

لیکن یہ احتمال دنیا میں اس کے بارے میں ہماری **شرعی اور فقہی ذمہ داری** کو تبدیل نہیں کرتا۔

اور اگر ایسا شخص بالآخر جنت میں داخل بھی ہو جائے تو اس کی حیثیت مؤمنین سے الگ رہے گی۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا، مستضعفین اگر جنت میں داخل ہوں تب بھی ان کا داخلہ مؤمنین کے داخلے کی مانند نہیں ہو گا۔

پس مستضعفین کا حساب اور ان کا آخری مقام — جن کی انفرادی اور حقیقی شناخت مکمل طور پر صرف اللہ تعالیٰ کے علم سے ممکن ہے — **مؤمنین اور کفار، دونوں سے الگ اور ممتاز رہے گا۔**

حصۂ دوم: معرفتِ امامؑ ـــــ بندگیِ خدا کا واحد راستہ

تمہید

باب اوّل: ائمہؑ کا بلند مقام اور ان کی معرفت

بندگی کا راستہ بتانے میں انبیاءؑ کا کردار

اللہ تعالیٰ کی عبادت کس طرح کی جائے کہ اس کی ذاتِ اقدس کے حضور قابلِ قبول ہو، یہ طریقہ خود اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے بتایا جانا ضروری ہے۔

عقل کے ذریعے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنے پروردگار اور اپنے ولیِ نعمت، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیے۔ لیکن یہی عقل ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ **اس کی عبادت کس طریقے اور کس انداز سے کی جائے، اس کی رہنمائی بھی خود اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل کرنی چاہیے۔**

خصوصاً اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہمارے حال پر نہیں چھوڑ دیا کہ ہم جس طریقے سے چاہیں اس کی عبادت کریں۔

بلکہ اس نے اپنی جانب سے رسول بھیجے تاکہ وہ ہمیں اس کی بندگی کا صحیح طریقہ سکھائیں، اور اس طرح اس نے ہم پر اپنی **حجت تمام** کر دی۔

لہٰذا ہم اپنی خواہش کے مطابق جس طریقے کو چاہیں اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کر سکتے۔

اصولی طور پر انسانوں کے لیے **نبوت اور امامت** کا بنیادی فائدہ یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا صحیح راستہ سیکھیں اور اس راہ میں اپنی ذاتی رائے، پسند اور سلیقے کے مطابق آگے نہ بڑھیں۔

ایک عاقل انسان اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسولوں کے بھیجے جانے اور انبیاءؑ کے مبعوث کیے جانے کو بھی ایک مناسب اور پسندیدہ امر سمجھتا ہے۔

لہٰذا جب ایسا شخص انبیاءؑ اور ہادیانِ الٰہی سے آشنا ہوتا ہے تو دینِ حق کو پہچانتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لے۔

اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرنے والوں میں سے ایک شخص نے امام صادقؑ سے سوال کیا:

"آپ کے عقیدے کے مطابق کیا اللہ اس بات پر قادر نہیں کہ اپنی مخلوق پر خود ظاہر ہو جائے، تاکہ وہ اسے دیکھیں، اسے پہچانیں اور یقین کے ساتھ اس کی عبادت کریں؟"

امامؑ نے فرمایا:

لَيْسَ لِلْمُحَالِ جَوَابٌ.

"محال بات کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔"

اللہ تعالیٰ کو جسمانی اور حسی آنکھ سے دیکھنا محال ہے۔ اور جب کوئی چیز بذاتِ خود محال ہو تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے یا نہیں۔

اسی لیے اس منکر خدا کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اس سوال کا جواب نہ ملنے کے فوراً بعد اس نے پوچھا:

فَمِنْ أَيْنَ أَثْبَتَّ أَنْبِيَاءَ وَرُسُلًا؟

"پھر آپ انبیاء اور رسولوں کے وجود کو کس بنیاد پر ثابت کرتے ہیں؟"

امامؑ نے فرمایا:

إِنَّا لَمَّا أَثْبَتْنَا أَنَّ لَنَا خَالِقًا صَانِعًا مُتَعَالِيًا عَنَّا وَعَنْ جَمِيعِ مَا خَلَقَ، وَكَانَ ذٰلِكَ الصَّانِعُ حَكِيمًا مُتَعَالِيًا، لَمْ يَجُزْ أَنْ يُشَاهِدَهُ خَلْقُهُ وَلَا يُلَامِسُوهُ فَيُبَاشِرَهُمْ وَيُبَاشِرُوهُ وَيُحَاجَّهُمْ وَيُحَاجُّوهُ، ثَبَتَ أَنَّ لَهُ سُفَرَاءَ فِي خَلْقِهِ يُعَبِّرُونَ عَنْهُ إِلَى خَلْقِهِ وَعِبَادِهِ، وَيَدُلُّونَهُمْ عَلَى مَصَالِحِهِمْ وَمَنَافِعِهِمْ وَمَا بِهِ بَقَاؤُهُمْ وَفِي تَرْكِهِ فَنَاؤُهُمْ.

فَثَبَتَ الْآمِرُونَ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْحَكِيمِ الْعَلِيمِ فِي خَلْقِهِ، وَالْمُعَبِّرُونَ عَنْهُ جَلَّ وَعَزَّ. وَهُمُ الْأَنْبِيَاءُ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَصَفْوَتُهُ مِنْ خَلْقِهِ؛ حُكَمَاءَ مُؤَدَّبِينَ بِالْحِكْمَةِ، مَبْعُوثِينَ بِهَا، غَيْرَ مُشَارِكِينَ لِلنَّاسِ مَعَ مُشَارَكَتِهِمْ لَهُمْ فِي الْخَلْقِ وَالتَّرْكِيبِ فِي شَيْءٍ مِنْ أَحْوَالِهِمْ، مُؤَيَّدِينَ مِنْ عِنْدِ الْحَكِيمِ الْعَلِيمِ بِالْحِكْمَةِ(1) .

"جب ہمارے لیے یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارا ایک خالق اور صانع ہے جو ہم سے اور اپنی تمام مخلوقات سے برتر و منزّہ ہے، اور یہ کہ وہ صانع حکیم اور بلند و برتر ہے، تو یہ ممکن نہیں کہ اس کی مخلوق اسے دیکھے یا اسے لمس کرے، تاکہ وہ براہِ راست ان سے رابطہ کرے اور وہ اس سے رابطہ کریں، وہ ان سے گفتگو و استدلال کرے اور وہ اس سے گفتگو و استدلال کریں۔

لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ اس کی مخلوق میں اس کے کچھ سفیر ہیں، جو اس کی جانب سے اس کے بندوں اور مخلوق تک اس کا پیغام پہنچاتے ہیں، انہیں ان کی مصلحتوں اور فوائد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور انہیں ان امور سے آگاہ کرتے ہیں جن پر ان کی بقا موقوف ہے اور جنہیں ترک کرنا ان کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔

پس مخلوق کے درمیان حکیم و علیم خدا کی جانب سے امر و نہی کرنے والے اور اس کی طرف سے پیغام پہنچانے والے افراد کا ہونا ثابت ہوا۔ یہی انبیاءؑ اور اس کی مخلوق میں سے اس کے برگزیدہ بندے ہیں؛ وہ صاحبانِ حکمت ہیں، حکمت کے ذریعے تربیت یافتہ اور اسی حکمت کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہیں۔ اگرچہ جسمانی خلقت اور ساخت میں وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مشترک ہیں، لیکن اپنے دوسرے احوال و خصوصیات میں ان جیسے نہیں؛ اور حکیم و علیم خدا کی جانب سے حکمت کے ذریعے ان کی تائید کی گئی ہے۔(1) "

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنی تمام مخلوقات سے بلاواسطہ رابطہ قائم کر سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے اس بات سے زیادہ دشوار نہ تھا کہ وہ چند برگزیدہ افراد سے براہِ راست رابطہ قائم کرے اور پھر انہی کے ذریعے دوسروں سے کلام فرمائے۔

لیکن عملاً اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عمومی طور پر انسانوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا **دوطرفہ اور براہِ راست رابطہ** نہیں ہوتا۔

البتہ ہر انسان اپنے پروردگار سے گفتگو کر سکتا ہے اور اس کے حضور **مناجات** کر سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر شخص کی بات سنتا ہے۔ اس کے لیے کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی **مرضی، رضا اور ناراضی** سے آگاہ ہونا ایک ایسا معاملہ ہے جسے عام انسانوں تک بلاواسطہ نہیں پہنچایا گیا۔(1)

سفارتِ الٰہی اور اللہ کی جانب سے ترجمانی کا مقام

اللہ تعالیٰ کا مخلوقات کی صفات سے منزّہ ہونا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی شخص اپنی جانب سے براہِ راست اس کے روبرو ہو کر اس کے ساتھ گفتگو کا تعلق قائم نہیں کر سکتا۔

انسان اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔

صرف اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے، اپنے ارادے سے اس کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرتا اور اسے لوگوں کے درمیان اپنا **سفیر** اور **معبّر** قرار دیتا ہے۔

لہٰذا اس قسم کے رابطے کا راستہ ہماری جانب سے بند ہے؛ یہ خود اللہ تعالیٰ ہے جو اپنے منتخب بندے کے ساتھ یہ رابطہ قائم کرتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ ایسی نشانیاں بھی فراہم کرتا ہے جن کے ذریعے لوگ پہچان سکیں کہ اس نے کس شخص کے ساتھ یہ خاص رابطہ قائم فرمایا ہے۔

یہ نشانیاں وہ **معجزات** ہیں جو انبیاء اور ائمہؑ کے ہاتھوں ظاہر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ کسی منصب پر فائز ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے لیے منتخب کیا گیا شخص اپنے خالق کی تائید و حمایت سے برخوردار ہو اور کبھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے راستے سے منحرف نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا سفیر اور اس کی جانب سے پیغام پہنچانے والا ہونے کی حقیقت ہی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایسے شخص کا **قول اور فعل دوسروں پر حجت** ہو۔

اگر لوگوں کے ذہن میں یہ احتمال موجود رہے کہ ایسا شخص غلطی یا اشتباہ کر سکتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے پہنچائے ہوئے کسی بھی پیغام پر مکمل اعتماد ممکن نہیں رہے گا۔

اور اس صورت میں رسولوں کو بھیجنے اور انبیاءؑ کو مبعوث کرنے کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

لہٰذا **علم و حکمتِ الٰہی** کا حامل ہونا، جس میں خطا کی کوئی گنجائش نہ ہو، اور ساتھ ہی **کمالِ عصمت**—یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر خطا و انحراف سے محفوظ و مصون رکھا جانا—اللہ کے **سفیر اور معبّر** کے منصب کے لیے ضروری ہے۔

ہادیانِ الٰہی کی شناخت خود اللہ کی جانب سے

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے لیے بیان کی گئی یہ خصوصیات ایسی نہیں ہیں کہ انسان اپنی خواہش اور پسند کے مطابق کسی شخص میں پیدا کر سکے۔

اسی طرح انسان محض اپنی عقل کے ذریعے لازماً یہ بھی نہیں پہچان سکتا کہ یہ خصوصیات کن افراد میں موجود ہیں۔

لہٰذا ان اوصاف کا عطا کیا جانا بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہونا چاہیے اور **ان اوصاف کے حامل افراد کی شناخت و معرفی بھی خود اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہونی چاہیے۔**

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے یہ خصوصیات عطا فرماتا ہے اور خود ہی ان افراد کا تعارف کراتا ہے۔

مثلاً **عصمت** کی صفت کو پہچاننا انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہے۔

زیادہ سے زیادہ، ایک بہت محدود دائرے میں—جس کی تعلیم بھی خود دین نے ہمیں دی ہے—ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی نبی یا امام ظاہراً ہدایتِ الٰہی کے مطابق عمل کر رہا ہے یا نہیں۔

لیکن یہ چیز بذاتِ خود **عصمت** نہیں ہے۔

عصمت سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر ممکن خطا اور انحراف سے **حفاظت اور مصونیت** ہے۔

یہ کوئی ایسی ظاہری صفت نہیں جسے حواس کے ذریعے دیکھا جا سکے یا عام عقلی مشاہدے سے براہِ راست ثابت کیا جا سکے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں اس صفت کے وجود کا یقین حاصل کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ **خود اللہ تعالیٰ ایسی نشانیاں قائم فرمائے جن کے ذریعے ان افراد کو پہچانا جا سکے۔**

ان نشانیوں میں سے ایک **معجزہ** ہے۔

معجزہ ایک ایسا خارقِ عادت فعل ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کے بر گزیدہ بندے کے ساتھ ایک ایسی **قدرتِ الٰہی** موجود ہے جو محض انسانی طاقت نہیں اور جسے عام انسانی صلاحیتوں کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

جب کسی رسول کی نبوت ثابت ہو جائے تو ہمارے **اوصیاءؑ** کی شناخت بھی اسی رسول کے ذریعے ہوتی ہے، جو انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے منصوب و مقرر شدہ ہستیوں کے طور پر متعارف کراتا ہے۔

ایسے کسی دعوے کی صداقت جانچتے وقت ضروری ہے کہ ہمیں اس شخص میں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئے جو **سفارتِ الٰہی اور اللہ کی جانب سے ترجمانی کے منصب** سے ناسازگار ہو۔

اگر ایسی کوئی ناسازگاری پائی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص منصبِ الٰہی کا جھوٹا دعوے دار ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کے بر گزیدہ بندوں کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں تمام انسانوں سے زیادہ صاحبِ علم و معرفت ہونا ضروری ہے، اور ان کے اقوال و اعمال انسان کو **توحیدِ الٰہی کی زیادہ گہری معرفت** تک پہنچانے والے ہونے چاہییں۔

اگر بالفرض وہ خود اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے ناواقف یا ناقص طور پر آگاہ ہوں، اور اپنی ہدایت و تعلیم کے لیے دوسرے انسانوں کے محتاج ہوں، تو ان کے کلام پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں امام صادقؑ کی تعلیم کردہ اس نہایت عمیق دعا کی حکمت واضح ہو جاتی ہے:

اللَّهُمَّ عَرِّفْنِي نَفْسَكَ، فَإِنَّكَ إِنْ لَمْ تُعَرِّفْنِي نَفْسَكَ لَمْ أَعْرِفْ نَبِيَّكَ.

اللَّهُمَّ عَرِّفْنِي رَسُولَكَ، فَإِنَّكَ إِنْ لَمْ تُعَرِّفْنِي رَسُولَكَ لَمْ أَعْرِفْ حُجَّتَكَ.

اللَّهُمَّ عَرِّفْنِي حُجَّتَكَ، فَإِنَّكَ إِنْ لَمْ تُعَرِّفْنِي حُجَّتَكَ ضَلَلْتُ عَنْ دِينِي(1) .

"اے اللہ! مجھے اپنی معرفت عطا فرما، کیونکہ اگر تو مجھے اپنی معرفت عطا نہ فرمائے تو میں تیرے نبی کو نہیں پہچان سکوں گا۔

اے اللہ! مجھے اپنے رسول کی معرفت عطا فرما، کیونکہ اگر تو مجھے اپنے رسول کی معرفت عطا نہ فرمائے تو میں تیری حجت کو نہیں پہچان سکوں گا۔

اے اللہ! مجھے اپنی حجت کی معرفت عطا فرما، کیونکہ اگر تو مجھے اپنی حجت کی معرفت عطا نہ فرمائے تو میں اپنے دین سے گمراہ ہو جاؤں گا۔(1) "

یہ وہ دعا ہے جسے امام صادقؑ نے بالخصوص **امام عصرؑ کے زمانۂ غیبت** کے لیے تعلیم فرمایا ہے۔

اس دعا کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاءؑ کی معرفت، معرفتِ خدا اور خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کی شناخت و معرفی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے؛ جبکہ اللہ تعالیٰ کی حجت کی معرفت انبیاءؑ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

البتہ خود اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے کسی دوسرے واسطے کی ضرورت نہیں۔

اللہ کی معرفت اللہ کے ذریعے، اور رسول کی معرفت رسالت کے ذریعے

اللہ تعالیٰ کی معرفت **خود اللہ کے ذریعے** حاصل ہوتی ہے، جبکہ رسولِ خدا کی معرفت اس **رسالت** کے ذریعے ہوتی ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوئی ہے۔

امیر المؤمنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

اعْرِفُوا اللهَ بِاللهِ، وَالرَّسُولَ بِالرِّسَالَةِ(1) .

"اللہ کو اللہ کے ذریعے پہچانو، اور رسول کو اس کی رسالت کے ذریعے پہچانو۔"

رسول کی رسالت کیا ہے؟

رسالت یہ ہے کہ انسانوں کو اس خدا سے مزید آشنا کیا جائے جس کی معرفت ان کی **فطرت** میں موجود ہے، اور انہیں اس کی زیادہ گہری معرفت اور کامل تر بندگی کے راستے پر آگے بڑھایا جائے۔

اگرچہ انسان ابتدا میں اللہ تعالیٰ کو انبیاءؑ کے ذریعے نہیں پہچانتا—بلکہ **اللہ کو اللہ ہی کے ذریعے پہچانتا ہے**—لیکن انبیاءؑ ہی انسان کو معرفتِ خدا کے راستے پر قائم اور محفوظ رکھتے ہیں۔

ان کا کلام، ان کا عمل اور ان کی پوری زندگی **توحید اور بندگیِ خدا کی دعوت** ہے۔(2)

اور یہی حقیقی انبیاءؑ کو سفارتِ الٰہی اور نبوت کے جھوٹے دعوے داروں سے پہچاننے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔

لہٰذا نبی کی صداقت کی سب سے عظیم اور اہم دلیل، اور اس کی سچائی کی سب سے مضبوط گواہی، خود **ذاتِ اقدسِ پروردگار** ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ(3) .

"کہہ دیجیے: گواہی کے اعتبار سے سب سے بڑی چیز کیا ہے؟ کہہ دیجیے: اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولِ اسلامؐ کے اقوال اور احکام انسان کو **معرفتِ خدا کے راستے پر آگے بڑھاتے ہیں۔**

رسول کی صداقت کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان دیکھے کہ کیا ان کی دعوت اسے اسی خدا کی طرف لے جاتی ہے جسے وہ اپنی فطرت کے ذریعے پہچانتا ہے، اور کیا ان کا کلام اسی **فطری معرفت کی یاددہانی** کراتا ہے۔

تمام انبیائے الٰہیؑ کی بعثت کا مقصد انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی **معرفت اور عبادت** کے لیے تربیت کرنا تھا۔

ان کی تعلیمات پر عمل انسان کو اسی راستے پر آگے بڑھاتا ہے۔

پس کسی نبی کی رسالت اور نبوت کی بنیاد خود **اللہ تعالیٰ اور اس کی جانب سے اس نبی کی شناخت و معرفی** کے ذریعے ثابت ہوتی ہے۔

اور جب رسول کی رسالت کو قبول کر لیا جائے تو جس راستے کی طرف وہ دعوت دیتا ہے، اس پر عملی طور پر چلنا انسان کو **اللہ تعالیٰ کی زیادہ معرفت رکھنے والا اور اس کی ذاتِ اقدس کے حضور زیادہ کامل بندہ** بناتا چلا جاتا ہے۔

ہادیانِ الٰہی کا برگزیدہ ہونا

تمہید

اگر ایسا ہے تو جو ہستیاں انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کے راستے پر تعلیم و ہدایت دینے کے لیے مقرر کی گئی ہیں، ضروری ہے کہ وہ خود **معرفتِ خدا اور اس کی بندگی کے بلند ترین مرتبے** پر فائز ہوں۔

دوسرے لفظوں میں، انہیں اللہ تعالیٰ کے ایسے مخلص اور خالص بندے ہونا چاہیے جنہیں خود اللہ نے **اخلاص**—یعنی بندگی میں کامل خلوص و پاکیزگی—کے مقام تک پہنچایا ہو۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

"اور ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو، جو قوت اور بصیرت کے مالک تھے۔ بے شک ہم نے انہیں ایک خاص صفت کے ساتھ خالص کیا تھا، اور وہ آخرت کی یاد تھی۔ اور بے شک وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور بہترین لوگوں میں سے ہیں۔"

(سورۂ ص، ۳۸:۴۵–۴۷(1))

انبیائے الٰہیؑ کو خود اللہ تعالیٰ نے خالص و پاکیزہ فرمایا ہے اور وہی انہیں خطا اور گناہ سے محفوظ رکھتا ہے۔

مثلاً حضرت یوسفؑ کے بارے میں قرآنِ کریم فرماتا ہے:

"اور یقیناً اس عورت نے یوسف کا ارادہ کیا، اور وہ بھی اس کا ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کی برہان نہ دیکھ لیتے۔ ہم نے اسی طرح ان سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھا؛ بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں میں سے تھے۔"

(سورۂ یوسف، ۱۲:۲۴(2))

حوالہ جات:

(1) سورۂ ص (۳۸)، آیات ۴۵–۴۷۔

(2) سورۂ یوسف (۱۲)، آیت ۲۴۔

بندگیِ خدا میں مقامِ اخلاص

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو گناہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھنا چاہے تو اس کے لیے یہی کافی ہے کہ اس بندے کے اندر اپنی **معرفت** کو اس قدر شدید اور راسخ کر دے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اعمال پر حاضر و ناظر پائے۔

جب یہ باطنی شعور انسان کے اندر قوت اختیار کر لیتا ہے تو وہ گناہ کی طرف نہیں بڑھتا۔

اور یہ کیفیت جس قدر زیادہ نمایاں اور مضبوط ہوتی جاتی ہے، انسان بتدریج اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ **گناہ کرنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا۔**

اسی طرح انسان کے اندر موت اور آخرت کی یاد جس قدر شدید ہو گی، وہ گناہ کے اتنا ہی کم قریب جائے گا۔

ان تمام ذرائع سے اللہ تعالیٰ اپنے بر گزیدہ بندوں کو انحراف اور خطا سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اپنے منتخب بندوں کو پاک و محفوظ رکھنا اس معنی میں نہیں کہ ان سے **اختیار اور آزادیِ ارادہ** سلب کر لی جائے۔

بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسے مقام تک پہنچاتا ہے جہاں وہ **اپنے ہی اختیار اور ارادے سے برائی کی طرف مائل نہیں ہوتے۔**

مثلاً حضرت یوسفؑ نے جب اپنے پروردگار کی برہان دیکھی تو انہوں نے گناہ کا ارادہ تک نہیں کیا۔(1)

وہ برہانِ الٰہی حقیقتاً کیا تھی، ہماری موجودہ بحث میں یہ اہم نہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ **اللہ تعالیٰ اپنے بر گزیدہ بندوں کو ان کے حال پر نہیں چھوڑتا، بلکہ بندگی کے پورے راستے میں ان کی حفاظت فرماتا ہے۔**

اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے خالص بندوں کی حفاظت اور تطہیر اس قدر قطعی اور واضح ہے کہ خود شیطان بھی ان پر اثر انداز ہونے سے مایوس ہو چکا ہے:

"اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور گمراہ کروں گا، سوائے ان کے جو ان میں تیرے خالص کیے ہوئے بندے ہیں۔"

(سورۂ ص، ۳۸:۸۲–۸۳(2))

حاشیہ

(1) امام رضاؑ نے فرمایا:

لَقَدْ هَمَّتْ بِهِ، وَلَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ، لَهَمَّ بِهَا كَمَا هَمَّتْ بِهِ، لَكِنَّهُ كَانَ مَعْصُومًا، وَالْمَعْصُومُ لَا يَهُمُّ بِذَنْبٍ وَلَا يَأْتِيهِ. وَلَقَدْ حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ أَبِيهِ الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ قَالَ: هَمَّتْ بِأَنْ تَفْعَلَ، وَهَمَّ بِأَنْ لَا يَفْعَلَ.

"یقیناً اس عورت نے یوسفؑ کا ارادہ کیا، اور اگر یوسفؑ اپنے پروردگار کی برہان نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی اسی طرح اس کا ارادہ کرتے جس طرح اس نے ان کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن یوسفؑ معصوم تھے، اور معصوم نہ گناہ کا ارادہ کرتا ہے اور نہ اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

میرے والد نے اپنے والد امام صادقؑ سے میرے لیے روایت کی کہ آپؑ نے فرمایا: اس عورت نے اس فعل کے ارتکاب کا ارادہ کیا تھا، جبکہ یوسفؑ نے اسے انجام نہ دینے کا ارادہ کیا تھا۔"

پس حضرت یوسفؑ نے اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور مدد سے نہ صرف گناہ کا ارادہ نہیں کیا بلکہ **عصمتِ الٰہی** کے سبب ان کا ارادہ ہی یہ تھا کہ وہ گناہ نہ کریں۔

(عیون اخبار الرضاؑ، ج ۱، ص ۲۰۱)

(2) سورۂ ص (۳۸)، آیات ۸۲—۸۳۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خالص کیے ہوئے بندوں کا تعارف خود شیطان سے بھی کرایا اور ان کی خصوصی صفت، یعنی **عصمت**، اس پر بھی آشکار کر دی؛ تاکہ تمام مخلوقات جان لیں کہ ان برگزیدہ ہستیوں کا مقام دوسروں سے مختلف ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت صرف ان پاک ہستیوں کو خطرات سے محفوظ رکھنے تک محدود نہیں۔

بلکہ ان کی تربیت اور پرورش کے ہر مرحلے میں اللہ تعالیٰ ان پر خاص توجہ فرماتا ہے، تاکہ ان کی پرورش عین اسی طرح ہو جس طرح وہ چاہتا اور پسند فرماتا ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو وحی کی کہ انہیں ایک صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون کی سرپرستی میں پہنچایا، جو اللہ اور موسیٰؑ دونوں کا دشمن تھا، اور فرمایا:

"اور میں نے اپنی جانب سے تم پر محبت ڈال دی، تاکہ تم میری نگاہ کے سامنے پرورش پاؤ۔"

(سورۂ طٰہٰ، ۲۰:۳۹) (1)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے لیے دوسروں کے دلوں میں — حتیٰ کہ فرعون کے دل میں بھی — ایک خاص محبت پیدا کر دی، تاکہ لوگ ان سے محبت کریں اور موسیٰؑ کی پرورش اسی انداز میں ہو جس طرح اللہ تعالیٰ چاہتا تھا۔

پس اللہ تعالیٰ اپنے بر گزیدہ بندوں کی تربیت کو اپنی **خصوصی رحمت اور خاص عنایت** کے زیرِ سایہ رکھتا ہے، انہیں ان کے منصبِ الٰہی کے لیے تیار کرتا ہے اور ان کے وجود میں اپنی خالص اور کامل بندگی کو جلوہ گر فرماتا ہے۔

انہی آیات کے تسلسل میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ سے فرماتا ہے:

"اور میں نے تمہیں اپنے لیے منتخب کر لیا۔"

)سورۂ طٰہٰ، ۲۰:۴۱(2) (

اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ کو اپنا خاص منتخب بندہ قرار دیتا ہے، کیونکہ اس نے ان کی زندگی کے تمام مراحل میں اپنی مرضی اور رضا کے مطابق ان کی پرورش فرمائی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے دوسرے بر گزیدہ بندے بھی اسی طرح اس کی خصوصی عنایت کے زیرِ سایہ رہے ہیں۔

اسی لیے **ہادیانِ الٰہی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے بہترین، پاکیزہ ترین اور بر گزیدہ بندے رہے ہیں۔**

حوالہ جات:

(1) سورۂ طٰہٰ (۲۰)، آیت ۳۹۔

(2) سورۂ طٰہٰ (۲۰)، آیت ۴۱۔

تمہید

جب اللہ تعالیٰ اپنے بر گزیدہ بندوں کو لوگوں سے متعارف کرادے تو لوگوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ **ان بر گزیدہ ہستیوں کی معرفت کو قبول کریں اور ان کے سامنے تسلیم ہوں۔**

یہ بالکل وہی ذمہ داری ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہونے کے بعد انسان پر عائد ہوتی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ اپنی معرفت عطا فرماتا ہے تو انسان کا فریضہ ہے کہ اسے قبول کرے اور اس کے سامنے تسلیم ہو جائے۔

اس کے بعد اللہ کے رسولوں اور اس کی **حجتوں** کے بارے میں بھی انسان کی یہی ذمہ داری ہے۔

انسان پر واجب **معرفت** کے بارے میں وارد ہونے والی روایات در حقیقت صرف معرفتِ خدا تک محدود نہیں ہیں۔

مثلاً امام صادقؑ کی اس نورانی روایت پر غور کیجیے جسے ہم گزشتہ حصے کے پہلے باب میں بھی نقل کر چکے ہیں:

لَيْسَ لِلَّهِ عَلَى خَلْقِهِ أَنْ يَعْرِفُوا، وَلِلْخَلْقِ عَلَى اللَّهِ أَنْ يُعَرِّفَهُمْ، وَلِلَّهِ عَلَى الْخَلْقِ إِذَا عَرَّفَهُمْ أَنْ يَقْبَلُوا.

"ابتدا میں اللہ کا اپنی مخلوق پر یہ حق نہیں کہ وہ خود معرفت حاصل کرے، بلکہ مخلوق کا اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ انہیں معرفت عطا فرمائے؛ اور جب اللہ انہیں معرفت عطا فرمادے تو پھر اللہ کا مخلوق پر یہ حق ہے کہ وہ اسے قبول کرے۔(1) "

جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے، روایت میں **معرفت کے متعلق** کو کسی خاص مورد کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا۔

لہٰذا یہ روایت صرف معرفتِ خدا کو بیان نہیں کرتی، بلکہ **حجج الٰہی کی معرفت** کو بھی شامل ہے۔

حوالہ:

(1) اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۶۴، کتاب التوحید، باب حجج اللہ علی خلقہ، حدیث ۱۔

معرفتِ رسولؐ کی ضرورت

جس طرح اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہونے کے بعد انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اسے قبول کرے اور اس کے سامنے تسلیم ہو جائے، اسی طرح اللہ کے برگزیدہ بندوں کو پہچان لینے کے بعد بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ **ان کی معرفت کو قبول کرے اور ان کا اقرار کرے۔**

یہ قبول و تسلیم ـــ جو عقلاً بھی واجب ہے اور شرعاً بھی ـــ **معرفتِ امامؑ** سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہی معرفت لوگوں پر واجب ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

إِنَّ أَفْضَلَ الْفَرَائِضِ وَأَوْجَبَهَا عَلَى الْإِنْسَانِ مَعْرِفَةُ الرَّبِّ وَالْإِقْرَارُ لَهُ بِالْعُبُودِيَّةِ ... وَبَعْدُهُ مَعْرِفَةُ الرَّسُولِ وَالشَّهَادَةُ لَهُ بِالنُّبُوَّةِ، وَأَدْنَى مَعْرِفَةِ الرَّسُولِ الْإِقْرَارُ بِنُبُوَّتِهِ، وَأَنَّ مَا أَتَى بِهِ مِنْ كِتَابٍ أَوْ أَمْرٍ أَوْ نَهْيٍ فَذَلِكَ مِنَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ.

"بے شک انسان پر تمام فرائض میں سب سے افضل اور سب سے زیادہ واجب، پروردگار کی معرفت اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کرنا ہے۔۔۔اس کے بعد رسول کی معرفت اور ان کی نبوت کی گواہی دینا ہے۔

اور رسول کی معرفت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ انسان ان کی نبوت کا اقرار کرے اور یہ تسلیم کرے کہ وہ جو کچھ لائے ہیں ـــ خواہ کتاب ہو، کوئی حکم ہو یا کوئی ممانعت ـــ وہ سب اللہ عزوجل کی جانب سے ہے۔(2) "

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ **معرفت کی تفسیر اقرار ـــ یعنی قبول و تسلیم ـــ سے کی گئی ہے۔**

اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے رسول کا تعارف کرائے جانے کے بعد یہی انسان کا حصہ اور اس کا **اختیاری فعل** ہے۔

رسولِ خداؐ کے جانشین، یعنی **امامؑ کی معرفت** بھی معرفتِ رسولؐ کے بعد اسی طرح واجب قرار دی گئی ہے۔ اس موضوع کی تفصیل آئندہ ابواب میں آئے گی۔

حوالہ:

(2) بحار الانوار، ج ۳۶، ص ۴۰۷، حدیث ۱۶، بحوالہ کفایۃ الاثر۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کا راستہ خود معین فرمایا ہے، اور یہ راستہ صرف اور صرف **اس کے برگزیدہ بندوں کی معرفت اور اس منصب وولایت کے سامنے تسلیم ہونے** سے طے ہوتا ہے جو ان کے پروردگار نے انہیں عطا فرمایا ہے۔

اس راستے کے بغیر کسی کی عبادت اللہ تعالیٰ کے حضور قبول نہیں ہوتی۔

لہٰذا اگر کوئی شخص یہ گمان کرے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا ہے، اس کی ربوبیت کا اقرار بھی کرتا ہے اور اس کی ذاتِ اقدس کے سامنے سرِ تسلیم بھی خم کرتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس واحد راستے کا انکار کرتا ہے—یا اس کے بارے میں شک و تردّد رکھتا ہے—جسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے مقرر فرمایا ہے، تو حقیقت میں وہ **اللہ کا بندہ نہیں** بلکہ اپنی خواہشات، میلانات اور ذاتی رائے کی پیروی کر رہا ہے۔

اگر وہ حقیقتاً اپنے پروردگار کے سامنے تسلیم ہے تو آخر کون سی چیز اسے اس **دروازے** کو قبول کرنے سے روکتی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا ہے؟!

حقیقت یہ ہے کہ ایسے شخص نے اللہ تعالیٰ کو حقیقی معنوں میں اپنا **رب، مولا اور اپنے اوپر صاحبِ اختیار** تسلیم ہی نہیں کیا۔

حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے شیطان کا متکبرانہ انکار

حضرت آدمؑ کی تخلیق کے وقت پیش آنے والا واقعہ ان تمام لوگوں کے لیے ایک درس ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اپنی پسند، ذاتی میلان اور پہلے سے قائم کیے ہوئے تصورات کے مطابق کی جا سکتی ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

...قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لِلْمَلَائِكَةِ: اسْجُدُوا لِآدَمَ، فَسَجَدُوا لَهُ، فَأَخْرَجَ إِبْلِيسُ مَا كَانَ فِي قَلْبِهِ مِنَ الْحَسَدِ فَأَبَى أَنْ يَسْجُدَ، فَقَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ؟ فَقَالَ: أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ، خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ.

فَأَوَّلُ مَنْ قَاسَ إِبْلِيسُ، وَاسْتَكْبَرَ، وَالِاسْتِكْبَارُ هُوَ أَوَّلُ مَعْصِيَةٍ عُصِيَ اللَّهُ بِهَا. فَقَالَ إِبْلِيسُ: يَا رَبِّ، أَعْفِنِي مِنَ السُّجُودِ لِآدَمَ وَأَنَا أَعْبُدُكَ عِبَادَةً لَمْ يَعْبُدْكَهَا مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ. فَقَالَ اللَّهُ: لَا حَاجَةَ

لِي إِلَى عِبَادَتِكَ، إِنَّمَا أُرِيدُ أَنْ أُعْبَدَ مِنْ حَيْثُ أُرِيدُ، لَا مِنْ حَيْثُ تُرِيدُ. فَأَبَى أَنْ يَسْجُدَ، فَقَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: اخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ، وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَى يَوْمِ الدِّينِ(2)(1) .

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا: آدمؑ کو سجدہ کرو۔ پس سب نے انہیں سجدہ کیا۔

تب ابلیس نے اپنے دل میں چھپے ہوئے حسد کو ظاہر کر دیا اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ عزوجل نے فرمایا:

'جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا؟'

اس نے کہا:

'میں اس سے بہتر ہوں؛ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔'

پس سب سے پہلے قیاس کرنے والا ابلیس تھا، اور اس نے تکبر کیا۔ تکبر وہ پہلی معصیت تھی جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی گئی۔

پھر ابلیس نے کہا: 'اے میرے رب! مجھے آدمؑ کے سجدے سے معاف کر دے، اور اس کے بدلے میں تیری ایسی عبادت کروں گا جیسی نہ کسی مقرب فرشتے نے کی ہو گی اور نہ کسی مرسل نبی نے۔'

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'مجھے تیری عبادت کی کوئی حاجت نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری عبادت اس طریقے سے کی جائے جس طرح میں چاہتا ہوں، نہ اس طریقے سے جس طرح تو چاہتا ہے۔'

لیکن ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ پس اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

'یہاں سے نکل جا، بے شک تو مردود ہے، اور یقیناً روزِ جزا تک تجھ پر میری لعنت ہے۔(3) ''

ہم دیکھتے ہیں کہ ظاہری طور پر شیطان اللہ تعالیٰ کی الوہیت یا ربوبیت کا انکار نہیں کر رہا تھا۔

بلکہ اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہوئے اس نے خود کہا:

''یارَبِّ—اے میرے رب''!

لیکن چونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے **خلیفہ حضرت آدمؑ کے فضائل اور مقام**—اور بالخصوص ان کی اللہ کی عطا کردہ خلافت—کا اقرار و قبول کرنے سے انکار کیا، اس لیے اس نے تکبر کیا(4)اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے اس راستے کے مقابلے میں ایک دوسرا راستہ تجویز کیا جسے خود اللہ نے مقرر فرمایا تھا۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کی روح اور حقیقت یہی ہے کہ **اس کے حکم کی اطاعت کی جائے۔**

کوئی عمل حقیقی عبادت صرف اسی وقت بنتا ہے جب وہ **امتثالِ امرِ الٰہی** کی نیت سے، اس کے حکم کے سامنے تسلیم اور اس کی مشیت کے حضور سرِ اطاعت خم کرتے ہوئے انجام دیا جائے۔

اگر یہ شرط موجود نہ ہو تو شیطان، انسان یا کوئی دوسری مخلوق خواہ کتنی ہی محنت اور ریاضت کیوں نہ کرے، اس کی کوشش **عبادتِ خدا نہیں** بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی اور نافرمانی ہے۔

بندگیِ خدا کا راستہ خود اللہ تعالیٰ متعین کرتا ہے، اور اس نے اس راستے کو **اپنے برگزیدہ بندوں کے منصبِ الٰہی کے اقرار، قبول اور ان کے سامنے تسلیم** سے جدا نہیں رکھا۔

حوالہ جات

(1)سورۂ اعراف(۷)، آیت ۱۲۔

(2)سورۂ ص(۳۸)، آیات ۷۷—۷۸۔

(3)بحار الانوار، ج۱۱، ص ۱۴۱، حدیث ۷، بحوالۂ تفسیر قمی۔

(4)ائمۂ اہلِ بیتؑ سے منقول متعدد روایات کے مطابق، حضرت آدمؑ کے سامنے سجدے کا حکم ان کی **تعظیم و تکریم** اور ان کی فضیلت کے اقرار کے لیے دیا گیا تھا۔

امیر المؤمنین امام علیؑ حضرت آدمؑ کو سجدہ واجب کیے جانے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لَكِنِ اعْتِرَافًا لِآدَمَ بِالْفَضِيلَةِ

"بلکہ یہ آدمؑ کی فضیلت کے اقرار کے لیے تھا۔"

) تفسیر کنزالد قائق، ج ا، ص ۳۵۵، بحوالہ الاحتجاج (

البتہ حضرت آدمؑ کی فضیلت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ چودہ معصومینؑ کے انوار کے حامل تھے۔

شیطان نے ان مقدس انوار کے سامنے تسلیم اور تواضع کرنے سے انکار کیا، اور اسی بناپر حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے بھی انکار کر دیا، یہاں تک کہ بالآخر کافر ہو گیا۔

اس موضوع پر امام حسن عسکریؑ کے کلام کا ایک حصہ یہ ہے:

أَمَرَ اللَّهُ الْمَلَائِكَةَ بِالسُّجُودِ لِآدَمَ تَعْظِيمًا لَهُ وَأَنَّهُ قَدْ فَضَّلَهُ بِأَنْ جَعَلَهُ وِعَاءً لِتِلْكَ الْأَشْبَاحِ الَّتِي قَدْ عَمَّ أَنْوَارُهَا الْآفَاقَ. فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسُ، أَبَى أَنْ يَتَوَاضَعَ لِجَلَالِ عَظَمَةِ اللَّهِ وَأَنْ يَتَوَاضَعَ لِأَنْوَارِنَا أَهْلَ الْبَيْتِ، وَقَدْ تَوَاضَعَتِ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهَا، فَاسْتَكْبَرَ وَتَرَفَّعَ، وَكَانَ بِإِبَائِهِ ذَلِكَ وَتَكَبُّرِهِ مِنَ الْكَافِرِينَ.

"اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم ان کی تعظیم کے لیے دیا، اور اس لیے کہ اللہ نے انہیں یہ فضیلت عطا کی تھی کہ انہیں ان نورانی اشباح کا ظرف قرار دیا جن کے انوار تمام آفاق میں پھیلے ہوئے تھے۔

پس تمام ملائکہ نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے۔ اس نے اللہ کی عظمت و جلال کے سامنے تواضع کرنے اور ہم اہلِ بیتؑ کے انوار کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا، جبکہ تمام ملائکہ نے تواضع اختیار کی۔ پس اس نے تکبر کیا اور اپنے آپ کو بلند سمجھا، اور اپنے اسی انکار اور تکبر کی وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا۔"

) تفسیر کنزالد قائق، ج ا، ص ۳۵۸، بحوالہ شرح الآیات الباہرۃ (

اس روایت اور اس جیسی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے کفر کا سبب اللہ تعالیٰ کے بر گزیدہ خلفاء—— حضرت آدمؑ اور **چودہ معصومینؑ کے مقدس انوار**—— کے فضائل اور اللہ کی عطا کردہ منازل کا اقرار کرنے سے انکار تھا۔

پس بندگیِ خدا کا راستہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے انسان اپنی پسند، اپنی عقل و قیاس یا پہلے سے قائم کیے ہوئے تصورات کے مطابق خود ایجاد کر لے۔

یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ طے کرے کہ اس کی عبادت کس طرح کی جائے۔

حقیقی بندگی یہ ہے کہ انسان اس کے حکم کو قبول کرے، اس کے برگزیدہ نمائندوں کے سامنے تسلیم ہو، اور عین اسی راستے سے اس کی عبادت کرے جسے خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔

شیطان کا اللہ پر قلبی ایمان نہ رکھنا

جی ہاں؛ اگر کسی انسان کا ایمان محض زبانی اقرار تک محدود نہ ہو بلکہ وہ حقیقتاً اپنے **قلب سے اللہ تعالیٰ پر ایمان** رکھتا ہو، تو ایسے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ پروردگارِ متعال کے حکم کے سامنے مکمل طور پر تسلیم ہو۔

امیر المؤمنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

إِنَّ الْإِيمَانَ قَدْ يَكُونُ عَلَى وَجْهَيْنِ: إِيمَانٌ بِالْقَلْبِ، وَإِيمَانٌ بِاللِّسَانِ، كَمَا كَانَ إِيمَانُ الْمُنَافِقِينَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ لَمَّا قَهَرَهُمْ بِالسَّيْفِ وَشَمِلَهُمُ الْخَوْفُ. فَإِنَّهُمْ آمَنُوا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ. فَالْإِيمَانُ بِالْقَلْبِ هُوَ التَّسْلِيمُ لِلرَّبِّ. وَمَنْ سَلَّمَ الْأُمُورَ لِمَالِكِهَا لَمْ يَسْتَكْبِرْ عَنْ أَمْرِهِ، كَمَا اسْتَكْبَرَ إِبْلِيسُ عَنِ السُّجُودِ لِآدَمَ، وَاسْتَكْبَرَ أَكْثَرُ الْأُمَمِ عَنْ طَاعَةِ أَنْبِيَائِهِمْ، فَلَمْ يَنْفَعْهُمُ التَّوْحِيدُ كَمَا لَمْ يَنْفَعْ إِبْلِيسَ ذَلِكَ السُّجُودُ الطَّوِيلُ. فَإِنَّهُ سَجَدَ سَجْدَةً وَاحِدَةً أَرْبَعَةَ آلَافِ عَامٍ لَمْ يُرِدْ بِهَا غَيْرَ زُخْرُفِ الدُّنْيَا وَالتَّمْكِينِ مِنَ النَّظِرَةِ(1) .

"بے شک ایمان دو طرح کا ہو سکتا ہے: ایک قلب کا ایمان اور دوسرا زبان کا ایمان۔ جیسا کہ رسولِ خداؐ کے زمانے میں منافقین کا ایمان تھا، جب آپؐ نے انہیں شمشیر کے ذریعے مغلوب کر دیا اور خوف نے انہیں گھیر لیا۔ پس وہ اپنی زبانوں سے ایمان لائے، لیکن ان کے دل ایمان نہیں لائے تھے۔

قلب کا ایمان، پروردگار کے سامنے تسلیم ہونا ہے۔ اور جو شخص تمام امور کو ان کے حقیقی مالک کے سپرد کر دے، وہ اس کے حکم کے مقابلے میں تکبر نہیں کرتا؛ جس طرح ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے تکبر کیا، اور جس طرح اکثر امتوں نے اپنے انبیاءؑ کی اطاعت سے تکبر کیا۔ پس ان کا توحید کا اقرار انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکا، جس طرح ابلیس کو اس کا طویل سجدہ کوئی فائدہ نہ دے سکا۔

اس نے ایک ایسا سجدہ کیا جو چار ہزار سال تک جاری رہا، لیکن اس سجدے سے اس کا مقصد دنیا کی زینت اور مہلت حاصل کرنے کے امکان کے سوا کچھ نہ تھا۔(1) "

ہم جانتے ہیں کہ جب شیطان بارگاہِ الٰہی سے نکال دیا گیا تو اس نے درخواست کی کہ اسے روزِ قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت دی جائے۔ یہاں امامؑ واضح فرماتے ہیں کہ اس کے چار ہزار سالہ سجدے کے پیچھے بھی یہی غرض تھی کہ اگر کسی وقت وہ اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگے تو اس کی درخواست قبول ہو جائے۔(2)

یہ ایک **دنیوی غرض** کے سوا کچھ نہ تھا۔

اسی لیے وہ طویل سجدہ شیطان کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا، اور عین اس موقع پر بھی اسے لغزش سے محفوظ نہ رکھ سکا جب اسے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی؛ کیونکہ اس کے اعمال میں **روحِ عبودیت** موجود نہ تھی۔

اس کے اعمال اسے اللہ تعالیٰ کا خالص اور سراپا تسلیم بندہ نہ بنا سکے۔

یہی صورت گزشتہ امتوں میں سے اکثر کی بھی تھی۔

اگرچہ وہ توحید کو قبول کرتے تھے، لیکن چونکہ اپنے انبیاءؑ کے سامنے تسلیم نہیں ہوئے، اس لیے ان کا توحید کا اقرار بھی انہیں فائدہ نہ دے سکا اور نہ انہیں وادیِ ضلالت سے نکال کر راہِ ہدایت پر لا سکا۔

پس نجات کا واحد راستہ **انبیاءؑ اور حجج الٰہی کے سامنے تسلیم ہونا ہے، جو پروردگار کے برگزیدہ بندے ہیں۔**

حوالہ:

(1) بحار الانوار، ج ۲۷، ص ۱۷۵، حدیث ۲۰، بحوالہ الاحتجاج، طبرسی۔

حاشیہ (2)

اس وضاحت کو قبول کرنے کے لیے یہ فرض کرنا ضروری نہیں کہ شیطان کو علمِ غیب حاصل تھا۔

اتنا کہنا کافی ہے کہ اس کے چار ہزار سالہ سجدے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی نہیں تھا، بلکہ اپنی سوچ اور حساب کے مطابق وہ اس عبادت کے ذریعے اللہ کے حضور کوئی مقام و مرتبہ حاصل کرنا چاہتا تھا، تاکہ بعد میں اپنے گمان کے مطابق اس حاصل شدہ مقام سے کسی دنیوی مقصد کے لیے فائدہ اٹھا سکے۔

اس قسم کا ممکنہ تصور اور توقع، شیطان کی نادرست نیت کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔

حجج الٰہی کا مقامِ خلافت

تمہید

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص برگزیدہ بندوں کو **خلیفۃ اللہ ـــــ اللہ کا خلیفہ** قرار دیا ہے۔

حضرت آدمؑ کی تخلیق کے بارے میں قرآنِ کریم فرماتا ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

"اور جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے فرمایا: بے شک میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔"

(سورۂ بقرہ، ۲:۳۰(1))

لیکن حضرت آدمؑ کو **خلیفۂ خدا** کس معنی میں کہا گیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کا مثل و مانند نہیں کہ کوئی شخص عام انسانی معنی میں اس کا جانشین بن سکے۔

تو پھر یہاں **خلافت** سے کیا مراد ہے؟

کسی شخص کا خلیفہ یا نمائندہ وہ ہوتا ہے جو اس شخص تک براہِ راست رسائی نہ ہونے کی صورت میں اس کی جانب سے اس کے امور انجام دیتا ہے۔ جو لوگ اصل صاحبِ منصب سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس کے نمائندے سے رجوع کر کے اس مقصد تک پہنچ سکتے ہیں۔

البتہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے کبھی غائب نہیں۔

لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، بندے کی جانب سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ **دوطرفہ رابطے کا راستہ** محض انسان کی اپنی خواہش اور اختیار سے نہیں کھل جاتا۔

اسی لیے ہم اللہ تعالیٰ کے **خلیفہ** کی طرف رجوع کرتے ہیں، تاکہ اس کے ذریعے وہ چیز حاصل کریں جس تک پہنچنے کا ہمارے پاس اپنی جانب سے کوئی مستقل ذریعہ نہیں۔

خلیفۂ خدا وہ ہستی ہے جس کا اللہ تعالیٰ سے رابطہ ہے، جو اس کی مشیت وارادے سے آگاہ ہے، جو اللہ کے کلام کو کسی دوسری چیز کے ساتھ خلط نہیں کرتی، اور جو شیطانی وسوسوں اور القائات کے اثر سے محفوظ ہے۔

خلیفۂ خدا کی عصمت

اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ **خلیفۃ اللہ** کا عنوان صرف اللہ تعالیٰ کی ان برگزیدہ اور معصوم حجتوں پر صادق آتا ہے جنہیں خود اس نے منتخب فرمایا ہے۔

ان کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو حقیقی معنوں میں اس عنوان سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔

اہلِ بیتؑ کی روایات میں بھی **خلیفۃ اللہ** کا عنوان اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

امام محمد باقرؑ نے اپنے جد بزرگوار امیر المؤمنین امام علیؑ سے زیرِ بحث آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے:

قَالَ: «إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً» لِي عَلَيْهِمْ، فَيَكُونُ حُجَّةً لِي عَلَيْهِمْ فِي أَرْضِي.

"اللہ نے فرمایا: میں زمین میں ان پر اپنی جانب سے ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں، تاکہ وہ میری زمین میں ان پر میری حجت ہو۔"

اسی روایت کے تسلسل میں اللہ تعالیٰ کا ایک اور فرمان نقل ہوا ہے:

إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أَخْلُقَ خَلْقًا بِيَدِي، أَجْعَلُ ذُرِّيَّتَهُ أَنْبِيَاءَ مُرْسَلِينَ، وَعِبَادًا صَالِحِينَ، وَأَئِمَّةً مُهْتَدِينَ. أَجْعَلُهُمْ خُلَفَائِي عَلَى خَلْقِي فِي أَرْضِي، يَنْهَوْنَهُمْ عَنِ الْمَعَاصِي، وَيُنْذِرُونَهُمْ عَذَابِي، وَيَهْدُونَهُمْ إِلَى طَاعَتِي، وَيَسْلُكُونَ بِهِمْ إِلَى طَرِيقِ سَبِيلِي، وَأَجْعَلُهُمْ حُجَّةً لِي(1) .

"بے شک میں چاہتا ہوں کہ اپنے دستِ قدرت سے ایک مخلوق پیدا کروں، اور اس کی ذریت میں انبیائے مرسلین، صالح بندے اور ہدایت یافتہ ائمہ ؑ قرار دوں۔

میں انہیں اپنی زمین میں اپنی مخلوق پر اپنے خلفاء قرار دوں گا۔ وہ انہیں گناہوں سے روکیں گے، میرے عذاب سے ڈرائیں گے، میری اطاعت کی طرف رہنمائی کریں گے، انہیں میرے راستے پر چلائیں گے اور میں انہیں اپنی مخلوق پر اپنی حجت قرار دوں گا۔(1) "

اس عبارت سے واضح ہے کہ **خلیفۃ اللہ کا مقام صرف اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ حجتوں سے مخصوص ہے۔**

لہٰذا ہر انسان کے لیے بلا امتیاز اس عنوان کا استعمال درست نہیں۔

یہ ایک **منصبِ الٰہی** ہے جسے نظر انداز کر کے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا:

"میں اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہوں، لیکن اس کے خلیفہ سے میرا کوئی تعلق نہیں، حالانکہ وہی اللہ کی بندگی تک پہنچنے کا مقرر کردہ دروازہ ہے۔"

ایسا ممکن نہیں۔

کیونکہ خلیفۂ خدا کا انکار اور اس کے سامنے تسلیم ہونے سے گریز، حقیقت میں **خود اللہ تعالیٰ اور اس کی ربوبیت کے تقاضے کا انکار** ہے۔

حوالہ:

(1) تفسیر نور الثقلین، ج۱، ص۵۱—۵۲۔

البتہ اس پوری بحث سے یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے خلفاء اور رسولوں کے سامنے تسلیم ہونے کی حیثیت صرف **طریقیت** کی ہے؛ یعنی وہ محض احکامِ الٰہی معلوم کرنے کا ایک ذریعہ ہیں، جبکہ ان کی نبوت یا امامت کو قبول کرنا بذاتِ خود کوئی مستقل اہمیت نہیں رکھتا۔

ایسا ہرگز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے برگزیدہ بندوں کے **منصبِ الٰہی کو قبول کرنا** لازم قرار دیا ہے، اور اس کے بعد انہی کے ذریعے احکامِ الٰہی حاصل کرنا ضروری قرار پایا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، ان کی معرفت و قبولیت میں **موضوعیت بھی ہے اور طریقیت بھی۔**

ان کی نبوت یا امامت کا اقرار، معرفتِ خدا کو قبول کرنے کے بعد تمام فرائض میں سرفہرست ہے، اور رضائے الٰہی کے حصول کے اسباب میں بلند ترین مقام رکھتا ہے، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے اور اس کی ایک مثال پہلے بھی گزر چکی ہے۔

اس کے بعد تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور ناراضی کو جاننے کا راستہ صرف انہی کی طرف رجوع کرنا ہے۔

لہٰذا اللہ پر ایمان رکھنے والے مؤمن کی ان برگزیدہ ہستیوں کے بارے میں **دو ذمہ داریاں** ہیں:

1. **خود ان ہستیوں کی معرفت کو قبول کرے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ ان کے منصب و مقام کے سامنے تسلیم ہو۔**
2. **جو کچھ ان کے ذریعے بیان اور پہنچایا جائے، اسے قبول کرے۔**

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ يَحِلُّ الْحَلَالَ وَيُحَرِّمُ الْحَرَامَ بِغَيْرِ مَعْرِفَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ لَمْ يُحِلَّ لِلَّهِ حَلَالًا وَلَمْ يُحَرِّمْ لَهُ حَرَامًا. وَإِنَّ مَنْ صَلَّى وَزَكَّى وَحَجَّ وَاعْتَمَرَ وَفَعَلَ ذَلِكَ كُلَّهُ بِغَيْرِ مَعْرِفَةِ مَنِ افْتَرَضَ اللَّهُ عَلَيْهِ طَاعَتَهُ، فَلَمْ يَفْعَلْ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ؛ لَمْ يُصَلِّ وَلَمْ يَصُمْ وَلَمْ يُزَكِّ وَلَمْ يَحُجَّ وَلَمْ يَعْتَمِرْ وَلَمْ يَغْتَسِلْ مِنَ الْجَنَابَةِ وَلَمْ يَتَطَهَّرْ وَلَمْ يُحَرِّمْ لِلَّهِ حَرَامًا وَلَمْ يُحِلَّ لِلَّهِ حَلَالًا. لَيْسَ لَهُ صَلَاةٌ وَإِنْ رَكَعَ وَإِنْ سَجَدَ، وَلَا لَهُ زَكَاةٌ وَلَا حَجٌّ. وَإِنَّمَا ذَلِكَ

كُلُّهُ يَكُونُ بِمَعْرِفَةِ رَجُلٍ مَنَّ اللَّهُ جَلَّ وَعَزَّ عَلَى خَلْقِهِ بِطَاعَتِهِ وَأَمَرَ بِالْأَخْذِ عَنْهُ. فَمَنْ عَرَفَهُ وَأَخَذَ عَنْهُ أَطَاعَ اللَّهَ(1) .

"جو شخص یہ گمان کرے کہ وہ نبیؐ کی معرفت کے بغیر حلالِ الٰہی کو حلال اور حرامِ الٰہی کو حرام قرار دے سکتا ہے، اس نے حقیقت میں نہ اللہ کے کسی حلال کو حلال قرار دیا اور نہ اس کے کسی حرام کو حرام۔

اور جو شخص نماز پڑھے، زکوٰۃ دے، حج و عمرہ بجالائے اور یہ تمام اعمال اس شخص کی معرفت کے بغیر انجام دے جس کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب قرار دی ہے، تو حقیقت میں اس نے ان میں سے کوئی عمل انجام نہیں دیا۔

نہ اس نے نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، نہ زکوٰۃ دی، نہ حج کیا، نہ عمرہ کیا، نہ غسلِ جنابت کیا، نہ طہارت حاصل کی، نہ اللہ کے حرام کو حرام جانا اور نہ اللہ کے حلال کو حلال۔

اس کی کوئی نماز نہیں، اگرچہ وہ رکوع اور سجدہ کرے؛ اس کی نہ کوئی زکوٰۃ ہے اور نہ حج۔

یہ سب کچھ صرف اس شخص کی معرفت کے ساتھ متحقق ہوتا ہے جس کی اطاعت کو اللہ جلّ وعزّ نے اپنی مخلوق پر نعمت قرار دیا اور حکم دیا کہ اس سے اخذ کریں۔ پس جو اسے پہچان لے اور اس سے اخذ کرے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔(1) "

حوالہ:

(1) بحار الانوار، ج ۲۷، ص ۱۷۶، حدیث ۲۱، بحوالہ علل الشرائع۔

پس نجات کے لیے دونوں چیزیں ضروری ہیں:

معرفت اور اخذ —— پہچاننا اور ان سے دین حاصل کرنا۔

ان کی ذات و مقام سے بے اعتنارہ کر محض ان کی ہدایات پر عمل کر لینے کو کافی نہیں سمجھا جا سکتا۔

انبیاءؑ اور ان کے اوصیاءؑ صرف ایسے واسطے یا ناقل نہیں ہیں جن کے ذریعے احکامِ الٰہی انسانوں تک پہنچتے ہیں۔

اس ذمہ داری سے آگے بڑھ کر خود ان کی معرفت، اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان کی صفات، مقام اور منصب کو پہچاننا اور قبول کرنا، بندگیِ خدا کی ایک مستقل شرط ہے۔

اسی لیے ان کے سامنے حقیقی تسلیم لازماً ان دونوں پہلوؤں کو اپنے اندر شامل کرتی ہے۔

اس معاملے میں کوتاہی ایسی چیز نہیں جسے معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔

خلیفۂ خدا کے مقام میں شک

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ خلفاء کے سامنے تسلیم کی اہمیت اس قدر ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے اللہ کی جانب سے عطا کردہ مقام و منصب کے بارے میں **شک** بھی رکھے تو وہ اپنے پروردگار کی خصوصی عنایت اور توجہ سے محروم ہو جاتا ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا خاندان تھا جس کا کوئی فرد جب بھی چالیس راتیں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا اور اپنی حاجت طلب کرتا تو کبھی خالی ہاتھ واپس نہ لوٹتا۔

ایک مرتبہ اسی خاندان کے ایک شخص نے چالیس راتیں **تہجد، عبادت اور دعا** میں گزاریں اور اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت مانگی، لیکن اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔

وہ حضرت عیسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنی حالت کی شکایت کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے دعا فرمائیں۔

حضرت عیسیٰؑ نے وضو کیا، نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؑ کو جواب دیا:

يَا عِيسَى، إِنَّ عَبْدِي أَتَانِي مِنْ غَيْرِ الْبَابِ الَّذِي أُوتِيَ مِنْهُ. إِنَّهُ دَعَانِي وَفِي قَلْبِهِ شَكٌّ مِنْكَ. فَلَوْ دَعَانِي حَتَّى يَنْقَطِعَ عُنُقُهُ وَتَنْتَثِرَ أَنَامِلُهُ، مَا اسْتَجَبْتُ لَهُ.

"اے عیسیٰؑ! میرا یہ بندہ میرے پاس اس دروازے کے علاوہ کسی اور راستے سے آیا ہے جس دروازے سے میرے پاس آنا چاہیے۔ اس نے مجھے اس حال میں پکارا کہ اس کے دل میں تمہارے بارے میں شک موجود تھا۔

پس اگر وہ مجھے اس قدر پکارتا رہے کہ اس کی گردن کٹ جائے اور اس کی انگلیاں بکھر جائیں، تب بھی میں اس کی دعا قبول نہ کروں گا۔"

حضرت عیسیٰؑ اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

تَدْعُو رَبَّكَ وَأَنْتَ فِي شَكٍّ مِنْ نَبِيِّهِ؟

"تم اپنے پروردگار کو پکارتے ہو، جبکہ اس کے نبی کے بارے میں شک رکھتے ہو؟"

اس شخص نے عرض کیا:

يَا رُوحَ اللَّهِ وَكَلِمَتَهُ، قَدْ كَانَ وَاللَّهِ مَا قُلْتَ، فَادْعُ اللَّهَ لِي أَنْ يَذْهَبَ بِهِ عَنِّي.

"اے روح اللہ اور اس کے کلمہ! اللہ کی قسم، معاملہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا آپؑ نے فرمایا۔ پس میرے لیے اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ اس شک کو مجھ سے دور کر دے۔"

حضرت عیسیٰؑ نے اس کے لیے دعا فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول فرمائی، اسے اپنی بارگاہ میں قبول کیا، اور وہ دوبارہ اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی مانند اسی مقام و حالت پر واپس آ گیا۔(1)

حوالہ:

(1) اصولِ کافی، ج ۲، ص ۴۰۰، کتاب الایمان والکفر، باب الشک، حدیث ۹۔

اس روایت سے واضح ہے کہ نبی اور حجتِ خدا کے سامنے تسلیم میں **اس درجے کی کمی اور کوتاہی** بھی اس شخص کو عنایتِ الٰہی سے محروم کرنے کا سبب بن گئی۔

جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، انسان میں **شک** کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنے فریضۂ تسلیم کے بارے میں تردّد اور پس و پیش کا شکار ہو جائے۔

بنی اسرائیل کے اس شخص نے، اگرچہ اپنے آپ کو بے قصور نہیں سمجھا، لیکن اپنے زمانے کے نبیؑ سے درخواست کی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تاکہ اس کا شک دور ہو جائے؛ اور اللہ تعالیٰ نے اس شک کو اس سے دور بھی کر دیا۔

پس اگرچہ شک کی کیفیت کا نفس میں پیدا ہو جانا بذاتِ خود ایک اختیاری فعل نہیں، لیکن اس کے وجود میں آنے کے اسباب انسان کے اپنے **اختیاری اعمال اور انتخاب** سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔

لہٰذا انسان کو ہمیشہ ہوشیار اور محتاط رہنا چاہیے۔

ممکن ہے ایک لمحے کی غفلت، بے پروائی یا اپنے فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی انسان کو ہمیشہ کے لیے **ہلاکت کی کھائی** میں گرادے۔ اور اس کے بعد یہ معلوم نہیں کہ فضلِ الٰہی اس کی دستگیری کرے گا اور اسے اہلِ نجات میں شامل کرے گا یا نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پھر کبھی اس حالت سے باہر نہ آسکے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے سامنے تسلیم میں ایک لمحے کی غفلت بھی روا نہیں۔

برگزیدگانِ الٰہی میں سب سے برگزیدہ

تمہید

اللہ تعالیٰ نے جن ہستیوں کو اپنی بارگاہ کے لیے خاص طور پر منتخب اور برگزیدہ فرمایا ہے، ان سب کے درمیان رسولِ اکرم حضرت محمد مصطفیٰؐ اور آپؐ کے پاکیزہ اہلِ بیتؑ ایسی مخصوص خصوصیات کے حامل ہیں جو انہیں تمام دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اسی بنا پر انہیں بجا طور پر **برگزیدگانِ الٰہی میں سب سے برگزیدہ** کہا جاسکتا ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت آدمؑ کے وصی حضرت شیثؑ کو اپنے والد سے ایک تحریری صحیفہ ورثے میں ملا تھا، جس میں انبیاءؑ اور اوصیائے الٰہی کے مراتب، نیز چودہ معصومینؑ کی تمام دوسروں پر فضیلت سے متعلق مطالب درج تھے۔

یہاں ہم اس صحیفے کے بعض حصے نقل کرتے ہیں، خصوصاً وہ سوالات جو حضرت آدمؑ نے کیے اور ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جو ارشادات فرمائے۔

صحیفے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

بِسمِ اللهِ الرَّحمنِ الرَّحیم. لا اِلهَ اِلّا اَنا الحَیُّ القَیُّومُ... . خَلَقتُ عِبادی لِعِبادَتی. وَ اَلزَمتُهُم حُجَّتی. اَلا اِنّی باعِثٌ فیهِم رُسُلی وَ مُنَزِّلٌ عَلَیهِم کُتُبی. اُبرِمُ ذلِکَ مِن لَدُن اَوَّلِ مَذکورٍ مِن بَشَرٍ اِلی اَحمَدَ نَبیّی وَ خاتَمِ رُسُلی. ...

"اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں؛ میں زندہ اور قائم رکھنے والا ہوں۔۔۔ میں نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا اور ان پر اپنی حجت لازم قرار دی۔ آگاہ رہو! میں ان کے

درمیان اپنے رسول بھیجوں گا اور ان پر اپنی کتابیں نازل کروں گا۔ میں اس سلسلے کو پہلے انسان سے لے کر احمدؐ، جو میرے نبی اور میرے رسولوں کے خاتم ہیں، تک مضبوطی سے قائم رکھوں گا۔۔۔"

اس پر حضرت آدمؑ نے عرض کیا:

قالَ آدَمُ علیه السّلام: مَن هؤُلاءِ الرُّسُلُ؟ وَ مَن اَحمَدُ هذا الَّذی رَفَعتَ وَ شَرَّفتَ؟ قالَ: کُلٌّ مِن ذُرِّیَّتِکَ. وَ اَحمَدُ عاقِبُهُم وَ وارِثُهُم.

"حضرت آدمؑ نے عرض کیا: پروردگارا! یہ رسول کون ہیں؟ اور یہ احمدؐ کون ہیں جنہیں تو نے اتنا بلند مقام اور شرف عطا فرمایا ہے؟ اللہ نے فرمایا: یہ سب تمہاری ذریت میں سے ہوں گے، اور احمدؐ ان سب کے آخر میں آنے والے اور ان کے وارث ہوں گے۔"

حضرت آدمؑ نے پھر عرض کیا:

قالَ: یا رَبِّ بِما اَنتَ باعِثُهُم وَ مُرسِلُهُم؟ قالَ: بِتَوحیدی. ثُمَّ اُقَفّی ذلِکَ بِثَلاثِمِاَةٍ وَ ثَلاثینَ شَریعةً اَنظَمُها وَ اَکمَلُها لِاَحمَدَ جَمیعاً.

"عرض کیا: پروردگارا! تو انہیں کس مقصد کے لیے مبعوث اور ارسال فرمائے گا؟

فرمایا: اپنی توحید کی دعوت کے لیے۔ اس کے بعد میں تین سو تیس شریعتیں مقرر کروں گا، اور ان سب میں سب سے زیادہ منظم اور کامل شریعت احمدؐ کو عطا کروں گا۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے سامنے انبیاء و مرسلینؑ اور ان کے اوصیاءؑ کو نورانی ارواح کی صورت میں پیش فرمایا۔ حضرت آدمؑ نے دیکھا کہ ان میں سے بعض، بعض دوسروں سے زیادہ بلند مرتبہ اور زیادہ نورانی ہیں۔ جب انہوں نے اپنے پروردگار سے اس تفاوت کی وجہ دریافت کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنّی اَنَا اللهُ. لا اِلهَ اِلّا اَنَا الرَّحمنُ الرَّحیمُ العَزیزُ الحَکیمُ، عالِمُ الغُیُوبِ وَ مُضمَراتِ القُلُوبِ. اَعلَمُ ما لَم یَکُن مِمّا یَکُونَ کَیفَ یَکونُ، وَ ما لا یَکُونُ لَو کانَ کَیفَ یَکُونُ.

”بے شک میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں رحمان، رحیم، عزیز اور حکیم ہوں؛ غیب کی چیزوں اور دلوں میں پوشیدہ امور کو جاننے والا ہوں۔ جو چیز ابھی وجود میں نہیں آئی لیکن آئندہ وجود میں آئے گی، میں جانتا ہوں کہ وہ وجود میں آکر کیسی ہو گی؛ اور جو چیز وجود میں آنے والی نہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر وہ وجود میں آتی تو کیسی ہوتی۔“

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اِنّی اطَّلَعتُ – یا عَبدی – فی عِلمی عَلی قُلُوبِ عِبادی، فَلَم اَرَ فیهِم اَطوَعَ لی وَ لا اَنصَحَ لِخَلقی مِن اَنبیائی وَ رُسُلی. فَجَعَلتُ لِذلِک فیهِم رُوحی وَ کَلِمَتی وَ اَلزَمتُهُم عِبءَ حُجَّتی وَ اصطَفَیتُهُم عَلَی البَرایا بِرِسالَتی وَ وَحیی. ...

”اے میرے بندے! میں نے اپنے علم کے ذریعے اپنے بندوں کے دلوں کو دیکھا تو ان میں اپنے انبیاء اور رسولوں سے بڑھ کر کسی کو اپنا اطاعت گزار اور اپنی مخلوق کا خیر خواہ نہ پایا۔ اسی لیے میں نے ان میں اپنی روح اور اپنا کلمہ قرار دیا، اپنی حجت کا بار ان کے سپرد کیا، اور اپنی رسالت اور وحی کے لیے انہیں تمام مخلوقات پر منتخب فرمایا۔۔۔“

چودہ معصومینؑ کی انبیائے الٰہی پر فضیلت

یہاں تک تمام برگزیدگانِ الٰہی کی فضیلت بیان ہوئی۔ اب روایت کے اگلے حصے میں بالخصوص چودہ معصومینؑ کی دوسرے برگزیدہ بندگانِ خدا پر فضیلت کو واضح کیا گیا ہے:

ثُمَّ اطَّلَعتُ علی قُلوبِ المُصطَفَینَ مِن رُسُلی، فَلَم اَجِد فیهِم اَطوَعَ لی وَ لا اَنصَحَ لِخَلقی مِن مُحَمَّدٍ خِیرَتی وَ خالِصَتی. فَاختَرتُهُ عَلی عِلمی وَ رَفَعتُ ذِکرَهُ اِلی ذِکری. ثُمَّ وَجَدتُ کَذلِکَ قُلُوبَ حامَّتِهِ اللّائی مِن بَعدِهِ عَلی صِفَةِ قَلبِهِ فَاَلحَقتُهُم بِهِ وَ جَعَلتُهُم وَرَثَةَ کِتابی وَ وَحیی وَ اَرکانَ حِکمَتی وَ نُوری. وَ آلَیتُ بی اَن لا اُعَذِّبَ بِناری مَن لَقِیَنی مُعتَصِماً بِتَوحیدی وَ حَبلِ مَوَدَّتِهِم اَبَداً.

"پھر میں نے اپنے رسولوں میں سے برگزیدہ ہستیوں کے دلوں کو دیکھا، تو ان میں محمدؐ ــــ جو میرے منتخب اور خالص بندے ہیں ــــ سے بڑھ کر کسی کو اپنا اطاعت گزار اور اپنی مخلوق کا خیر خواہ نہ پایا۔ پس میں نے اپنے علم کی بنا پر انہیں منتخب کیا اور ان کے ذکر کو اپنے ذکر کے ساتھ بلند فرمایا۔

پھر میں نے ان کے بعد آنے والے ان کے قریبی اہلِ بیتؑ کے دلوں کو بھی انہی کے قلب کی صفت پر پایا۔ لہٰذا میں نے انہیں محمدؐ کے ساتھ ملحق کر دیا، انہیں اپنی کتاب اور وحی کا وارث، اور اپنی حکمت اور نور کے ارکان قرار دیا۔

اور میں نے اپنی ذات کی قسم کھائی کہ جو شخص اس حال میں مجھ سے ملاقات کرے کہ میری توحید اور ان کی مودّت کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہو، میں اسے کبھی اپنی آگ کا عذاب نہ دوں گا۔"

پس رسولِ اکرم حضرت محمد مصطفیٰؐ اور اہلِ بیتؑ کو صراحت کے ساتھ **اللہ کے برگزیدگان میں سب سے برگزیدہ** قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس روایت میں جس حکمت کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ازلی علم سے جانتا تھا کہ اگر یہ مقدس ہستیاں بھی دوسری مخلوقات جیسے حالات میں پیدا کی جاتیں، تب بھی یہ سب سے بڑھ کر اس کی اطاعت کرنے والی اور اس کی مخلوق کی سب سے زیادہ خیر خواہ ہوتیں۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی خصوصیات اور امتیازات عطا فرمائے جو دوسروں کو عطا نہیں کیے۔

یہاں تک تقابل چودہ معصومینؑ اور انبیاء و مرسلینِ الٰہی کے درمیان تھا، جس سے ان حضراتؑ کی انبیاء و مرسلینؑ پر فضیلت واضح ہوئی۔

چودہ معصومینؑ کی ملائکہ پر فضیلت

اب ان مقدس ہستیوں کے مقام کو ملائکہ کے ساتھ ملاحظہ کرتے ہیں؛ وہ ملائکہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اس کی بارگاہ کے مقرب بندوں میں شمار ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں درج ذیل روایت نہایت قابل توجہ ہے۔

رسولِ خداؐ نے فرمایا:

ما خَلَقَ اللهُ خَلقاً اَفضَلَ مِنّی وَ لا اَکرَمَ عَلَیهِ مِنّی.

"اللہ تعالیٰ نے مجھ سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہیں کی اور نہ اس کے نزدیک مجھ سے زیادہ مکرم کوئی ہے۔"

امیر المؤمنین امام علیؑ نے عرض کیا:

"یارسول اللہؐ! آپ افضل ہیں یا جبرئیلؑ؟"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

یا عَلِیُّ، اِنَّ اللهَ تَبارَکَ وَ تَعالی فَضَّلَ اَنبیاءَهُ المُرسَلینَ عَلی مَلائِکَتِهِ المُقَرَّبینَ. وَ فَضَّلَنی عَلی جَمیعِ النَبیّینَ وَ المُرسَلینَ. وَ الفَضلُ بَعدی لَکَ – یا عَلِیُّ – وَ لِلاَئِمَّةِ مِن بَعدِکَ. فَاِنَّ المَلائِکَةَ لَخُدّامَنا وَ خُدّامُ مُحِبّینا.

"اے علیؑ! بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے انبیائے مرسلینؑ کو اپنے مقرب فرشتوں پر فضیلت دی ہے، اور مجھے تمام انبیاء ومرسلینؑ پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اور میرے بعد فضیلت تمہارے لیے ہے، اے علیؑ، اور تمہارے بعد آنے والے ائمہؑ کے لیے۔ بے شک فرشتے ہمارے خادم اور ہمارے محبّوں کے خادم ہیں۔"

اس کے بعد رسولِ اکرمؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

اَلَّذینَ یَحمِلُونَ العَرشَ وَ مَن حَولَهُ یُسَبِّحُونَ بِحَمدِ رَبِّهِم وَ یَستَغفِرُونَ لِلَّذینَ آمَنوا

"جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں، وہ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور صاحبانِ ایمان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔"

آپؐ نے واضح فرمایا کہ ان کا یہ طلبِ مغفرت ہماری ولایت کی بنا پر ہے۔

پھر رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

یا عَلِیّ، لَو لا نَحنُ، ما خَلَقَ اللهُ آدَمَ وَ لا حَوّاءَ وَ لَا الجَنَّةَ وَ لَا النّارَ وَ لَا السَّماءَ وَ لَا الاَرضَ. وَ کَیفَ لا نَکُونُ اَفضَلَ مِنَ المَلائِکَةِ وَ قَد سَبَقناهُم اِلَی التَّوحیدِ وَ مَعرِفَةِ رَبَّنا عَزَّوَجَلَّ وَ تَسبیحِهِ وَ تَقدیسِهِ وَ تَهلیلِهِ؟!

"اے علیؑ! اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ نہ آدمؑ کو پیدا کرتا، نہ حواؑ کو، نہ جنت کو، نہ جہنم کو، نہ آسمان کو اور نہ زمین کو۔ اور ہم فرشتوں سے افضل کیوں نہ ہوں، جبکہ ہم نے توحید، اپنے پروردگار عزوجل کی معرفت، اس کی تسبیح، تقدیس اور تہلیل میں ان پر سبقت حاصل کی ہے؟"!

رسولِ اکرمؐ مزید فرماتے ہیں:

لِاَنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ اَرواحُنا فَانطَلَقَنا بِتَوحیدِهِ وَ تَمجیدِهِ، ثُمَّ خَلَقَ المَلائِکَةَ. فَلَمّا شاهَدُوا اَرواحَنا نوراً واحِداً، اِستَعظَموا اُمُورَنا فَسَبَّحنا، لِتَعلَمَ المَلائِکَةُ اَنّا خَلقٌ مَخلُوقونَ وَ اَنَّهُ مُنَزَّهٌ عَن صِفاتِنا. فَسَبَّحَتِ المَلائِکَةُ لِتَسبیحِنا وَ نَزَّهتهُ عَن صِفاتِنا.

"اس لیے کہ اللہ عزوجل نے سب سے پہلے ہماری ارواح کو پیدا فرمایا۔ پھر ہم نے اس کی توحید اور تمجید بیان کی۔ اس کے بعد اللہ نے ملائکہ کو پیدا فرمایا۔

جب انہوں نے ہماری ارواح کو ایک نور کی صورت میں دیکھا تو ہمارے مقام کو بہت عظیم سمجھا۔ اس وقت ہم نے اللہ کی تسبیح کی، تاکہ ملائکہ جان لیں کہ ہم بھی اس کی پیدا کردہ مخلوق ہیں اور اللہ ہماری صفات سے منزّہ ہے۔

پس ہماری تسبیح کے سبب ملائکہ نے بھی اللہ کی تسبیح کی اور اسے ہماری صفات سے پاک و منزّہ قرار دیا۔"

جب ملائکہ نے ان مقدس ہستیوں کے عظیم مرتبے کو دیکھا تو چودہ معصومینؑ نے کہا:

لا اِلهَ اِلّا اللهُ

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

تاکہ ملائکہ جان لیں کہ معبود صرف اللہ ہے اور اہلِ بیتؑ بندگانِ خدا ہیں؛ وہ ایسے معبود نہیں کہ اللہ کے ساتھ یا اللہ کے بجائے ان کی عبادت کی جائے۔

چنانچہ ملائکہ نے بھی کہا:

لا اِلٰہَ اِلّا اللہُ

پھر جب ملائکہ نے ان کے بلند مقام کو دیکھا تو انہوں نے کہا:

اللہُ اَکبَرُ

"اللہ سب سے بڑا ہے۔"

تاکہ ملائکہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر اس چیز سے بزرگ تر ہے جسے عقل و ادراک اپنے احاطے میں لے سکے، اور عظمت و کبریائیِ مطلق اسی کے لیے ہے۔

جب ملائکہ نے اس عزت اور قدرت کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے ان ہستیوں کو عطا فرمائی تھی تو انہوں نے کہا:

لا حَولَ وَ لا قُوَّۃَ اِلّا بِاللہِ العَلِیِّ العَظیمِ

"کوئی طاقت اور قوت نہیں مگر اللہ بلند و عظیم کے ذریعے۔"

اس طرح ملائکہ نے جان لیا کہ ہر طاقت اور قوت کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور انہوں نے بھی یہی کلمات ادا کیے۔

پھر جب انہوں نے وہ نعمتیں دیکھیں جو اللہ تعالیٰ نے ان مقدس ہستیوں کو عطا کی تھیں اور ان کی اطاعت کو واجب قرار دیا تھا، تو انہوں نے کہا:

اَلحَمدُللہِ

"تمام حمد اللہ کے لیے ہے۔"

تاکہ ملائکہ جان لیں کہ ان مقدس ہستیوں کو یہ تمام نعمتیں عطا کرنے پر حمد کا حقیقی مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

چنانچہ ملائکہ نے بھی کہا:

اَلحَمدُللہِ

اسی لیے فرمایا:

فَبِنَا اهتَدَوا اِلی مَعرِفَةِ اللهِ تَعالی وَ تَسبیحِهِ وَ تَهلیلِهِ وَ تَحمیدِهِ.

"پس ہمارے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی تسبیح، اس کی تہلیل اور اس کی حمد کی طرف ہدایت پائے۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا فرمایا، ہمارے انوار کو ان کے صلب میں قرار دیا، اور ملائکہ کو حکم دیا کہ حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کریں، تاکہ ان کی تعظیم ہو اور ان مقدس انوار کا احترام کیا جائے جو ان کے صلب میں موجود تھے۔

پس ملائکہ کا سجدہ **اللہ تعالیٰ کی عبادت، حضرت آدمؑ کی تعظیم، اور حکمِ الٰہی کی اطاعت** تھا، کیونکہ ہم حضرت آدمؑ کی نسل میں قرار دیے گئے تھے۔

اسی لیے رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

فَکَیفَ لا نَکُونُ اَفضَلَ مِنَ المَلائِکَةِ وَ قَد سَجَدُوا لِآدَمَ کُلُّهُم اَجمَعُونَ؟!

"پھر ہم ملائکہ سے افضل کیوں نہ ہوں، جبکہ ان سب نے بلا استثناء آدمؑ کو سجدہ کیا؟"!

چودہ معصومینؑ کی فضیلت کا راز

یہ روایت صرف اس حقیقت کو صراحت سے بیان نہیں کرتی کہ چودہ معصومینؑ کے مقدس انوار انبیاء و مرسلینِ الٰہی اور مقرب ملائکہ سے افضل ہیں، بلکہ اس **افضلیت کے راز** کو بھی واضح کرتی ہے۔

اور وہ راز یہ ہے کہ ان مقدس ہستیوں نے دوسروں سے پہلے **توحید، معرفتِ خدا، تسبیحِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ کو ہر نقص و محدودیت سے منزّہ قرار دینے** میں سبقت حاصل کی۔

یہ نکتہ نہایت اہم ہے۔

جیسا کہ گزشتہ حصے کے پہلے باب میں بیان ہوا، تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے، اور یہی مقصد ایک بندے کے دوسرے بندے پر مرتبے اور فضیلت کا معیار بھی قرار پاتا ہے۔

اور چونکہ بندگیِ خدا کی بنیاد **معرفتِ خدا اور اس کے سامنے اپنی عبودیت کا اقرار** ہے، اس لیے چودہ معصومینؑ نے اس میدان میں سب پر سبقت اور برتری حاصل کر کے بارگاہِ الٰہی میں سب سے بلند مقام و مرتبہ حاصل کیا۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس روایت میں جس مرحلے کا ذکر ہوا ہے وہ حضرت آدمؑ کی زمینی تخلیق سے پہلے **عالمِ ارواح** سے متعلق ہے۔

روایت کے آخر میں حضرت آدمؑ کے زمینی جسم کی تخلیق اور ان کے صلب میں چودہ معصومینؑ کے نور قرار دیے جانے کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔

بہر حال، اللہ تعالیٰ نے انہی مقدس انوار کے ذریعے ملائکہ کو **توحید، تقدیس اور تنزیہ الٰہی** کی تعلیم دی۔

پس زمین پر انسانوں کی تخلیق سے پہلے بھی ملائکہ کے لیے ہدایت کا وسیلہ یہی چودہ معصومینؑ تھے، اور یہی ان کے ملائکہ سے بلند تر مقام کی ایک وجہ ہے۔

چودہ معصومینؑ کی تمام مخلوقات پر فضیلت

ملائکہ کے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کے واقعے میں ایک اور واقعہ بھی پیش آیا، جس کا ذکر ہماری موجودہ بحث سے مناسبت رکھتا ہے۔

امام علی رضاؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ آدَمَ لَمّا اَکرَمَهُ اللهُ تَعالی ذِکرُهُ بِاِسجادِ مَلائِکَتِهِ لَهُ وَ بِاِدخالِهِ الجَنَّةَ، قالَ فی نَفسِهِ: هَل خَلَقَ اللهُ بَشَراً اَفضَلَ مِنّی؟ فَعَلِمَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ ما وَقَعَ فی نَفسِهِ فَناداهُ: اِرفَع رَأسَکَ یا آدَمُ فَانظُر اِلی ساقِ عَرشی. فَرَفَعَ آدَمُ رَأسَهُ فَنَظَرَ اِلی ساقِ العَرشِ فَوَجَدَ عَلَیهِ مَکتوباً: لا اِلهَ اِلّا اللهُ. مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ. عَلِیُّ بنُ اَبی طالِبٍ اَمیرُ المُؤمِنینَ. وَ زَوجَتُهُ فاطِمَةُ سَیِّدَةُ نِساءِ العالَمینَ. وَ الحَسَنُ وَ الحُسَینُ سَیِّدا شَبابِ اَهلِ الجَنَّةِ.

"جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو یہ شرف عطا فرمایا کہ اپنے ملائکہ کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور انہیں جنت میں داخل فرمایا، تو حضرت آدمؑ کے دل میں یہ خیال آیا: کیا اللہ نے مجھ سے افضل بھی کسی انسان کو پیدا کیا ہے؟

اللہ عزوجل نے ان کے دل میں آنے والے خیال کو جان لیا اور انہیں ندا دی: اے آدمؑ! اپنا سر اٹھاؤ اور میرے عرش کے ساق کی طرف دیکھو۔

حضرت آدمؑ نے سر اٹھایا اور عرش کی طرف دیکھا تو وہاں لکھا ہوا پایا:

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ علی بن ابی طالبؑ امیر المؤمنین ہیں۔ ان کی زوجہ فاطمہؑ تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہیں، اور حسنؑ و حسینؑ اہلِ جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔"

حضرت آدمؑ نے عرض کیا:

یارَبِّ مَن هؤلاءِ؟

"پروردگارا! یہ کون ہیں؟"

اللہ عزوجل نے فرمایا:

مِن ذُرِّیَّتِکَ. وَ هُم خَیرٌ مِنکَ وَ مِن جَمیعِ خَلقی. وَ لَولا هُم ما خَلَقتُکَ. وَ لا خَلَقتُ الجَنَّةَ وَ النّارَ، وَ لَا السَّماءَ وَ الاَرضَ.

"یہ تمہاری ذریت میں سے ہیں۔ یہ تم سے بھی بہتر ہیں اور میری تمام مخلوقات سے بھی افضل ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں نہ تمہیں پیدا کرتا، نہ جنت و جہنم کو، اور نہ آسمان و زمین کو۔"

پس اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام مخلوقاتِ الٰہی میں چودہ معصومینؑ سے زیادہ شریف اور افضل کوئی مخلوق نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے امتیازات اور کرامات عطا فرمائے ہیں جو اپنی مخلوقات میں کسی دوسرے کو نہ عطا کیے ہیں اور نہ عطا فرمائے گا۔

اس مقام پر مناسب ہے کہ اہلِ بیتؑ کے بارے میں امام علی نقی الہادیؑ سے منقول **زیارتِ جامعہ کبیرہ** کے چند جملوں پر غور کیا جائے:

آتاکُمُ اللهُ ما لَم یُؤتِ اَحَداً مِنَ العالَمینَ. طَأطَأَ کُلُّ شَریفٍ لِشَرَفِکُم. وَ بَخَعَ کُلُّ مُتَکَبِّرٍ لِطاعَتِکُم. وَ خَضَعَ کُلُّ جَبّارٍ لِفَضلِکُم. وَ ذَلَّ کُلُّ شَیءٍ لَکُم.

"اللہ نے آپؑ کو وہ کچھ عطا فرمایا جو جہانوں میں کسی اور کو عطا نہیں کیا۔ ہر صاحبِ شرف آپؑ کے شرف کے سامنے سر جھکاتا ہے، ہر متکبر آپؑ کی اطاعت کے سامنے مطیع ہو جاتا ہے، ہر جبار آپؑ کی فضیلت کے سامنے خضوع کرتا ہے، اور ہر چیز آپؑ کے سامنے فروتن ہے۔"

چودہ معصومینؑ کے مقام کا ادراک سے بالاتر ہونا

انسانوں کو اس دنیا میں زمینی قالب عطا کیے جانے سے پہلے، گزشتہ عوالم میں اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی ارواح کو پہلے **اپنی معرفت عطا فرمائی۔**

اپنی معرفت عطا فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم حضرت محمد مصطفیٰؐ کو اپنے رسول اور نبی کی حیثیت سے، اور ائمہؑ کو اپنی جانب سے صاحبانِ ولایت کی حیثیت سے تمام مخلوقات کے سامنے متعارف فرمایا۔

اس طرح اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی ان مقدس ہستیوں کے مقام کی عظمت اور رفعت سب پر آشکار ہو چکی تھی۔

ان کے مقام کی یہ معرفت اس حد تک واضح تھی کہ تمام مخلوقات جانتی تھیں کہ وہ چودہ معصومینؑ کے مقام و مرتبے تک پہنچنے کی طمع بھی نہیں کر سکتیں۔

زیارتِ جامعہ کبیرہ میں ہم پڑھتے ہیں:

فَبَلَغَ اللهُ بِكُم اَشرَفَ مَحَلِّ المُكَرَّمينَ وَ اَعلى مَنازِلَ المُقَرَّبينَ وَ اَرفَعَ دَرَجاتِ المُرسَلينَ؛ حَيثُ لا يَلحَقُهُ لاحِقٌ وَ لا يَفوقُهُ فائِقٌ وَ لا يَسبَقُهُ سابِقٌ وَ لا يَطمَعُ فى اِدراكِهِ طامِعٌ.

"پس اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو صاحبانِ کرامت کے سب سے باعزت مقام، مقربین کی بلند ترین منزلوں اور مرسلین کے اعلیٰ ترین درجات تک پہنچایا؛ ایسے مقام تک جہاں کوئی پہنچنے والا آپؑ تک نہیں پہنچ سکتا، کوئی برتری چاہنے والا آپؑ سے بلند نہیں ہو سکتا، کوئی سبقت لے جانے والا آپؑ پر سبقت نہیں لے سکتا، اور کوئی آرزو رکھنے والا اس مقام کے ادراک کی طمع نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد زیارت تمام طبقاتِ مخلوق کو اپنے بیان میں سمیٹتے ہوئے فرماتی ہے:

حَتّی لا یَبقی مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَ لا نَبِیٌّ مُرسَلٌ وَ لا صِدّیقٌ وَ لا شَهیدٌ وَ لا عالِمٌ وَ لا جاهِلٌ وَ لا دَنِیٌّ وَ لا فاضِلٌ وَ لا مُؤمِنٌ صالِحٌ وَ لا فاجِرٌ طالِحٌ وَ لا جَبّارٌ عَنیدٌ وَ لا شَیطانٌ مُریدٌ وَ لا خَلقٌ فیما بَینَ ذلِکَ شَهیدٌ اِلّا عَرَّفَهُم جَلالَةَ اَمرِکُم وَ عِظَمَ خَطَرِکُم وَ کِبَرَ شَأنِکُم وَ تَمامَ نُورِکُم وَ صِدقَ مَقاعِدِکُم وَ ثَباتَ مَقامِکُم وَ شَرَفَ مَحَلِّکُم وَ مَنزِلَتِکُم عِندَهُ وَ کَرامَتَکُم عَلَیهِ وَ خاصَّتَکُم لَدَیهِ وَ قُربَ مَنزِلَتِکُم مِنهُ.

"یہاں تک کہ کوئی مقرب فرشتہ، کوئی رسولِ مرسل، کوئی صدیق، کوئی شہید، کوئی عالم، کوئی جاہل، کوئی پست مرتبہ، کوئی صاحبِ فضیلت، کوئی صالح مؤمن، کوئی بدکردار فاجر، کوئی سرکش جبار، کوئی باغی شیطان، اور ان سب کے درمیان کوئی دوسری مخلوق ایسی باقی نہ رہی جسے اللہ نے آپؑ کے امر کی جلالت، آپؑ کے مقام کی عظمت، آپؑ کی شان کی بلندی، آپؑ کے نور کی کامل تابانی، آپؑ کے مقامات کی صداقت، آپؑ کے مرتبے کے ثبات، آپؑ کے مقام و منزلت کی شرافت، اپنے نزدیک آپؑ کی منزلت، اپنی بارگاہ میں آپؑ کی کرامت، اپنے حضور آپؑ کی خصوصی حیثیت اور اپنے سے آپؑ کے مقام کی قربت سے آگاہ نہ کر دیا ہو۔"

پس اس دنیا میں زمینی تخلیق اختیار کرنے سے پہلے ہی تمام مخلوقات کو چودہ معصومینؑ کے مقام کی مخصوص خصوصیات کی کامل معرفت حاصل ہو چکی تھی۔

جی ہاں، یہ دنیا گزشتہ عوالم کے واقعات اور حقائق کے اعتبار سے **غفلت اور فراموشی کا عالم** ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی قرار پائی کہ انسان اس دنیا میں آنے کے بعد ان امور کو فراموش کر دے جنہیں وہ گزشتہ عوالم میں جانتا تھا، اور پھر یہاں نئے سرے سے آزمائش کے مرحلے سے گزرے۔

لیکن ان امور کا ہماری موجودہ یادداشت سے محو ہو جانا، ان کی حقیقت اور واقعیت کو کسی طرح باطل نہیں کرتا؛ کیونکہ ان کا وجود **معتبر نقلی دلائل** کے ذریعے ثابت ہے۔

معرفتِ اہلِ بیتؑ ـــــ ہر مقامِ الٰہی کی بنیاد

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیتؑ کو اپنی تمام مخلوقات پر برتری عطا فرمائی اور انہیں ایسے فضائل و امتیازات سے نوازا جن کے حصول کی طمع بھی کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، اسی طرح اللہ نے **ان مقدس ہستیوں کی معرفت کو اپنے قرب اور اپنی خصوصی عنایت و توجہ کے حصول کا واحد راستہ قرار دیا ہے۔**

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ان حضراتؑ کی معرفت کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان ان کے خداداد مقام و مرتبے کو پہچان لے تو پھر اسے پورے دل سے اس مقام کو تسلیم کرنا اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔

انسان اس راہ میں جس قدر زیادہ یقین اور استقامت اختیار کرے گا، اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اسی قدر زیادہ عزت، مرتبہ اور مقام حاصل کرے گا۔

یہ حقیقت اس حد تک ہے کہ گزشتہ امتوں کے عظیم انبیاء اور برگزیدگانِ الٰہی بھی، باوجود اس کے کہ وہ نبوت و رسالت جیسے بلند مقامات پر فائز ہوئے، **اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ان سے وابستگی کی برکت ہی سے ان مقامات تک پہنچے۔**

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

مَا نُبِّیَ نَبِیٌّ قَطُّ إِلَّا بِمَعْرِفَةِ حَقِّنَا وَ بِفَضْلِنَا عَلَى مَنْ سِوَانَا

"کسی نبی کو کبھی نبوت عطا نہیں کی گئی مگر ہمارے حق کی معرفت اور دوسروں پر ہماری فضیلت کے اقرار کے ذریعے۔"

اگر نبوت جیسا عظیم مقام بھی اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ان کی فضیلت کے اقرار کے ذریعے حاصل ہوتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو جو بھی دوسری فضیلت عطا فرمائی ہے یا آئندہ عطا فرمائے گا، اور جس شخص نے بھی کوئی کمال حاصل کیا ہے، وہ بھی اسی راستے اور اسی سبب سے حاصل ہوا ہے۔

اس حقیقت کو نقلی دلائل سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ایک دن سلیم بن قیس ہلالی نے مقدادؓ سے درخواست کی کہ امیر المؤمنین امام علیؑ کے بارے میں رسولِ خداؐ سے سنی ہوئی سب سے بہترین بات بیان کریں۔ مقدادؓ نے جواب میں رسولِ اکرمؐ کی ایک حدیث نقل کی، جس کا ایک حصہ یہ ہے:

وَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، مَا أَرَى إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ لَا اتَّخَذَهُ خَلِيلًا إِلَّا بِنُبُوَّتِي وَ الْإِقْرَارِ لِعَلِيٍّ بَعْدِي. وَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، مَا كَلَّمَ اللهُ مُوسَى تَكْلِيمًا وَ لَا أَقَامَ عِيسَى آيَةً لِلْعَالَمِينَ إِلَّا بِنُبُوَّتِي وَ مَعْرِفَةِ عَلِيٍّ بَعْدِي. وَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، مَا تَنَبَّأَ نَبِيٌّ إِلَّا بِمَعْرِفَتِي وَ الْإِقْرَارِ لَنَا بِالْوِلَايَةِ، وَ لَا اسْتَأْهَلَ خَلْقٌ مِنَ اللهِ النَّظَرَ إِلَيْهِ إِلَّا بِالْعُبُودِيَّةِ لَهُ وَ الْإِقْرَارِ لِعَلِيٍّ بَعْدِي.

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اللہ نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کا ملکوت نہیں دکھایا اور نہ انہیں اپنا خلیل بنایا، مگر میری نبوت اور میرے بعد علیؑ کے اقرار کے سبب۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اللہ نے موسیٰؑ سے کلام نہیں کیا اور نہ عیسیٰؑ کو جہانوں کے لیے نشانی قرار دیا، مگر میری نبوت اور میرے بعد علیؑ کی معرفت کے سبب۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! کسی نبی کو نبوت حاصل نہیں ہوئی مگر میری معرفت اور ہماری ولایت کے اقرار کے ذریعے؛ اور اللہ کی مخلوقات میں سے کوئی بھی اس کی خصوصی نظر و عنایت کا مستحق نہیں ہوا مگر اس کی بندگی اور میرے بعد علیؑ کے اقرار کے ذریعے۔"

بحار الانوار، ج ۴۰، ص ۹۶، حدیث ۱۱۶، بحوالۂ کتاب سلیم بن قیس۔

اس روایت کے آخری حصے سے ایک عمومی اور ہمہ گیر اصول سامنے آتا ہے:

جو شخص اللہ تعالیٰ کی خصوصی نظر، عنایت اور لطف کا مستحق بننا چاہتا ہے، اسے اللہ کی بندگی اختیار کرنے کے ساتھ اہلِ بیتؑ کے خداداد مقامات کو تسلیم کرنا ہوگا۔

عالمِ خلقت میں اس اصول سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔

امامؑ ـــ "وجہ اللہ"

اس حقیقت کو سامنے رکھنے سے قرآن اور روایات میں اہلِ بیتؑ کے لیے استعمال ہونے والی بعض تعبیرات کا مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے، جیسے **"وجہ اللہ"، "لسان اللہ"، "باب اللہ" اور "یداللہ"** وغیرہ۔ اب ہم ان تعبیرات کی وضاحت کرتے ہیں۔

ابو الصلت نے امام رضاؑ سے اس روایت کے معنی دریافت کیے:

إِنَّ ثَوَابَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ النَّظَرُ إِلَى وَجْهِ اللهِ تَعَالَى

"بے شک 'لاإلہ إلااللہ' کہنے کا ثواب، اللہ تعالیٰ کے وجہ کی طرف نظر کرنا ہے۔"

امام رضاؑ نے فرمایا:

يَا أَبَا صَلْتٍ، مَنْ وَصَفَ اللهَ تَعَالَى بِوَجْهٍ كَالْوُجُوهِ فَقَدْ كَفَرَ؛ وَ لَكِنْ وَجْهُ اللهِ أَنْبِيَاؤُهُ وَ رُسُلُهُ وَ حُجَجُهُ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِمْ، هُمُ الَّذِينَ بِهِمْ يُتَوَجَّهُ إِلَى اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ إِلَى دِينِهِ وَ مَعْرِفَتِهِ. وَ قَالَ اللهُ تَعَالَى: «كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ * وَ يَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ». وَ قَالَ عَزَّ وَ جَلَّ: «كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ». فَالنَّظَرُ إِلَى أَنْبِيَاءِ اللهِ تَعَالَى وَ رُسُلِهِ وَ حُجَجِهِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ فِي دَرَجَاتِهِمْ ثَوَابٌ عَظِيمٌ لِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. وَ قَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ سَلَّمَ: مَنْ أَبْغَضَ أَهْلَ بَيْتِي وَ عِتْرَتِي، لَمْ يَرَنِي وَ لَمْ أَرَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

"اے ابوالصلت! جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے دوسرے چہروں کی مانند کسی چہرے کا وصف بیان کرے، اس نے کفر کیا۔ بلکہ اللہ کے 'وجہ' سے مراد اس کے انبیاء، رسول اور حجتیں ؑہیں۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جن کے ذریعے اللہ عزوجل، اس کے دین اور اس کی معرفت کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'زمین پر موجود ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور تمہارے پروردگار کا وجہ باقی رہے گا۔' اور اللہ عزوجل نے فرمایا: 'ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کے وجہ کے۔'

پس قیامت کے دن انبیاء، رسولوں اور حجج الٰہی ؑکو ان کے مقامات و درجات میں دیکھنا مؤمنین کے لیے بہت بڑا اجر ہوگا۔

اور رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے: جو شخص میرے اہلِ بیت اور میری عترت سے بغض رکھے گا، وہ قیامت کے دن نہ مجھے دیکھے گا اور نہ میں اسے دیکھوں گا۔"

عیون اخبار الرضا، ج ۱، ص ۱۱۵—۱۱۶۔

پس حجج الٰہی، اور ان میں سرِ فہرست اہلِ بیتؑ، کو **"وجہ اللہ "** کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں وجہ کے معنی چہرے کے ساتھ ساتھ اس **سمت، رخ اور جہت** کے بھی ہیں جس کی طرف توجہ کی جائے۔

انسان کے چہرے کو بھی وجہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے چہرے کے ذریعے پہچانا جاتا ہے اور اس کا چہرہ اس سمت کو ظاہر کرتا ہے جس کی طرف وہ متوجہ ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہے تو اپنا چہرہ اس کی طرف کرتا ہے۔

گویا انسان کا چہرہ وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے دوسرے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس تعبیر کا مفہوم بھی یہی ہے، البتہ **اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان کسی قسم کی تشبیہ کے بغیر۔**

اللہ کے سوا ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ جن ہستیوں کو **وجہ اللہ** کہا گیا ہے، وہ مخلوق ہونے کے اعتبار سے دوسری مخلوقات ہی کی طرح اللہ کی پیدا کردہ ہیں۔ ان کی خصوصی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ **وہ اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا وسیلہ اور راستہ ہیں، اور انسان انہی کی طرف رجوع کر کے دینِ الٰہی اور معرفتِ خدا تک پہنچتا ہے۔**

اسی لیے انہیں **وجہ اللہ** کہا گیا ہے۔

جو شخص اللہ کی عبادت اور اپنے پروردگار کی معرفت کے سامنے تسلیم اختیار کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے یہی مقرر کردہ راستہ ہے۔

اور یہ مقام انہیں خود اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ تمام الٰہی مناصب و مقامات اللہ ہی کی جانب سے مقرر ہوتے ہیں، اور اس کی تعیین و تقرری کے بغیر کوئی شخص ایسا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

تاہم یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ حجج الٰہی اپنی ذات کے اعتبار سے فنا ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے، یعنی عقلاً ان کا فنا ہونا محال ہے۔ ایسا نہیں ہے۔

ہر مخلوق اپنی ذات کے اعتبار سے فنا پذیر ہے، اور مخلوق ہونے کے لحاظ سے اس حکم میں وہ بھی دوسری مخلوقات سے مختلف نہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس پر فنا کا کوئی امکان نہیں۔

جو چیز مخلوق ہے، اس کا فنا ہو جانا عقلاً محال نہیں۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ دوسری مخلوقات کو فنا کرتا ہے تو اپنے ان برگزیدہ بندوں کو فنا نہیں کرتا۔ وہ اس وقت تک باقی رہتے ہیں جب تک اللہ چاہتا ہے۔

یہ بقاان کے اس دنیاوی جسم کے اعتبار سے نہیں، بلکہ ان کے اس **نورانی مقام** کے اعتبار سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے آغازِ خلقت ہی میں انہیں عطا فرمایا تھا اور جو ان کی دنیاوی وفات کے ساتھ ان سے سلب نہیں ہوتا۔

امام محمد باقرؑ نے اس آیت:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ

کی تفسیر میں فرمایا:

مَعْنَاهُ: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا دِينَهُ. وَ نَحْنُ الْوَجْهُ الَّذِي يُؤْتَى اللهُ مِنْهُ. لَمْ نَزَلْ فِي عِبَادِهِ مَا دَامَ اللهُ لَهُ فِيهِمْ رَوِيَّةٌ. فَإِذَا لَمْ يَكُنْ لَهُ فِيهِمْ رَوِيَّةٌ، رَفَعَنَا إِلَيْهِ فَفَعَلَ بِنَا مَا أَحَبَّ.

راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا" **: میں آپؑ پر قربان جاؤں، رَوِيَّة سے کیا مراد ہے؟"**

آپؑ نے فرمایا:

اَلْحَاجَةُ

"اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اس کے دین کے۔ اور ہم وہ 'وجہ' ہیں جس کے ذریعے اللہ کی طرف آیا جاتا ہے۔ ہم اس وقت تک اس کے بندوں کے درمیان موجود رہیں گے جب تک اللہ کو ان کے بارے میں کوئی 'رَوِيَّة' ہے۔ پھر جب ان کے بارے میں اس کی کوئی 'رَوِيَّة' باقی نہ رہے گی تو وہ ہمیں اپنی طرف اٹھالے گا اور ہمارے ساتھ جو چاہے گا کرے گا۔"

راوی نے عرض کیا:

"میں آپؑ پر قربان جاؤں، رَوِيَّة سے کیا مراد ہے؟"

آپؑ نے فرمایا:

"حاجت۔"

بحار الانوار، ج ۲۴، ص ۱۹۳، حدیث ۱۳، بحوالۂ تفسیر قمی۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے بارے میں ''حاجت'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ان پر اپنا فضل و عنایت فرمانا اور انہیں اپنی معرفت و بندگی کے راستے پر قرار دینا چاہتا ہے۔

اس حدیثِ شریف کے مطابق جب تک اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کے درمیان اس مقصد کو جاری رکھنا چاہتا ہے، وہ ائمہؑ کو ان کے درمیان باقی رکھتا ہے اور زمین کو ان کے وجود سے خالی نہیں کرتا۔

یہ مقدس ہستیاں ہدایتِ الٰہی کا واسطہ اور راستہ ہیں، اور اللہ کی معرفت اسی مقرر کردہ ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کے درمیان اس مقصد کو جاری رکھنا نہ چاہے تو انہیں لوگوں کے درمیان سے اٹھالیتا ہے اور ان کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا فنا ہونا فی نفسہٖ محال ہے، بلکہ یہ امر ان کے اور اللہ کے بندوں کے بارے میں مشیت و ارادۂ الٰہی کے تابع ہے۔

اہلِ بیتؑ کے مقامات کے بارے میں ایک جامع روایت

مرحوم شیخ کلینیؒ نے اہلِ بیتؑ کے بعض مقامات کے بارے میں ایک نہایت جامع روایت نقل کی ہے، جس میں امام صادقؑ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللهَ خَلَقَنَا فَأَحْسَنَ خَلْقَنَا، وَ صَوَّرَنَا فَأَحْسَنَ صُوَرَنَا، وَ جَعَلَنَا عَيْنَهُ فِي عِبَادِهِ، وَ لِسَانَهُ النَّاطِقَ فِي خَلْقِهِ، وَ يَدَهُ الْمَبْسُوطَةَ عَلَى عِبَادِهِ بِالرَّأْفَةِ وَ الرَّحْمَةِ، وَ وَجْهَهُ الَّذِي يُؤْتَى مِنْهُ، وَ بَابَهُ الَّذِي يَدُلُّ عَلَيْهِ، وَ خُزَّانَهُ فِي سَمَائِهِ وَ أَرْضِهِ. بِنَا أَثْمَرَتِ الْأَشْجَارُ وَ أَيْنَعَتِ الثِّمَارُ وَ جَرَتِ الْأَنْهَارُ. وَ بِنَا يَنْزِلُ غَيْثُ السَّمَاءِ وَ يَنْبُتُ عُشْبُ الْأَرْضِ. وَ بِعِبَادَتِنَا عُبِدَ اللهُ، وَ لَوْلَا نَحْنُ مَا عُبِدَ اللهُ.

''بے شک اللہ نے ہمیں پیدا فرمایا اور ہماری خلقت کو بہترین بنایا؛ ہمیں صورت عطا فرمائی اور ہماری صورتوں کو بہترین قرار دیا۔ اس نے ہمیں اپنے بندوں کے درمیان اپنی آنکھ، اپنی مخلوق میں اپنی گویا زبان، اور اپنے بندوں پر رأفت و رحمت کے ساتھ پھیلا ہوا اپنا ہاتھ قرار دیا۔

اس نے ہمیں اپنا وہ 'وجہ' قرار دیا جس کے ذریعے اس کی طرف آیا جاتا ہے، اپنا وہ دروازہ بنایا جو اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور آسمان و زمین میں اپنے خزانوں کا امین قرار دیا۔

ہمارے ذریعے درخت پھل دیتے ہیں، پھل پکتے ہیں اور نہریں جاری ہوتی ہیں۔ ہمارے ذریعے آسمان کی بارش نازل ہوتی ہے اور زمین کی نباتات اگتی ہیں۔

ہماری عبادت کے ذریعے اللہ کی عبادت ہوئی، اور اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔"

اصولِ کافی، ج۱، ص ۱۴۴، کتاب التوحید، باب النوادر، حدیث ۵۔

"عین اللہ"، "لسان اللہ" اور "ید اللہ"

گزشتہ روایت میں **"وجہ اللہ"** کے علاوہ، جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں، اہلِ بیتؑ کے لیے چند دوسری تعبیرات بھی استعمال ہوئی ہیں۔

ان میں سے ایک **"عین اللہ"** ــــ **اللہ کی آنکھ** ہے۔

آنکھ انسان کے لیے دیکھنے کا وسیلہ ہے۔ اگر کوئی شخص دوسروں کے اعمال کو دیکھنا اور ان پر گواہ ہونا چاہے تو وہ اپنی آنکھ کے ذریعے ایسا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان مقدس ہستیوں کو اپنے بندوں پر **گواہ اور ان کے اعمال کا ناظر** قرار دیا ہے، تاکہ قیامت کے دن بھی وہ ان کے اعمال کے بارے میں گواہی دیں۔

لہٰذا ممکن ہے کہ **"عین اللہ"** کی تعبیر اسی معنی میں استعمال ہوئی ہو، جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار، ج ۲۴، ص ۲۰۲ میں احتمال دیا ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کو دیکھنے یا ان سے آگاہ ہونے کے لیے اپنے برگزیدہ بندوں کا محتاج ہے۔ ہرگز نہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی کو گواہ مقرر کیے بغیر بھی اپنے بندوں کے ظاہر و باطن اور ان کے تمام اعمال و حالات سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔

بلکہ خود گواہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے ان بر گزیدہ بندوں کو بھی گواہ مقرر فرمایا ہے، جس طرح ملائکہ کے بعض گروہوں کو بھی بندوں کے اعمال پر گواہ بنایا ہے۔

ایک دوسری تعبیر **"لسان اللہ"**—**اللہ کی زبان** ہے۔

زبان وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے انسان کلام کرتا اور اپنے مقصود کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے سفیروں اور حجج کے ذریعے انسانوں سے کلام فرمایا اور انہیں وہ وسیلہ قرار دیا جس کے ذریعے اس کے احکام اور اپنے بندوں سے اس کے مطلوب امور ان تک پہنچتے ہیں۔

اس لحاظ سے ان مقدس ہستیوں کو **لسان اللہ** کہنے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ان مقدس انوار کے لیے **"ید اللہ"**—**اللہ کا ہاتھ** کی تعبیر بھی استعمال ہوئی ہے۔

خود روایت واضح کرتی ہے کہ یہاں ہاتھ سے مراد **رأفت و رحمتِ الٰہی کا ہاتھ** ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی انہی کے ذریعے مخلوقات تک پہنچتی ہے۔

یہ پاک و مقدس ہستیاں عالمِ خلقت میں ہر نعمتِ الٰہی کے پہنچنے کا وسیلہ اور سبب ہیں۔

خود روایت نے اس کے چند نمونے بیان کیے ہیں: بارش کا نزول، پھلوں کا پکنا، نباتات کا اگنا اور درختوں کا پھل دینا۔

معنوی اور روحانی نعمتوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ فضلِ الٰہی انہی کے ذریعے مخلوقات تک پہنچتا ہے، اور دوسرے لوگ انہی کی برکت سے خوانِ نعمتِ الٰہی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ نعمتِ ہدایت بھی انہی کے ذریعے تمام مخلوقات تک پہنچتی ہے۔

پس **ید اللہ** ایک ایسی تعبیر ہے جو رحمت و قدرتِ الٰہی کے ظہور کی طرف اشارہ کرتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے چودہ معصومینؑ کے وجود کے ذریعے مخلوقات تک پہنچایا ہے۔

اس دستِ رحمتِ الٰہی کا سایہ آغازِ خلقت سے اس کے اختتام تک تمام مخلوقات پر پھیلا ہوا ہے اور پھیلا رہے گا، کیونکہ ہر نعمت اسی مقرر کردہ واسطے سے مخلوقات تک پہنچتی ہے۔

ائمہؑ ــــ ''باب اللہ''

مذکورہ روایت میں **''باب اللہ''ــــ اللہ کا دروازہ** کی تعبیر بھی استعمال ہوئی ہے، اور اس کا مفہوم نسبتاً واضح ہے۔

دروازہ وہ راستہ ہے جس سے کسی گھر میں داخل ہوا جاتا ہے۔

پس اگر کوئی شخص **معرفت و بندگیِ خدا کے گھر** میں داخل ہونا چاہے تو اسے اسی دروازے سے داخل ہونا ہوگا جسے خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ کسی دوسرے راستے سے اس گھر میں داخل نہ ہوا جا سکتا ہے اور نہ ایسا کرنا چاہیے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا

''بلکہ نیکی اس کی ہے جو تقویٰ اختیار کرے، اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو۔''

(سورۂ بقرہ ۲:۱۸۹)

اگر کوئی شخص بندگی اور معرفتِ خدا کی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے تو اسے اسی دروازے سے داخل ہونا ہوگا جسے خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے؛ ورنہ وہ اپنی مطلوبہ منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔

اسی لیے مذکورہ روایت کے آخر میں فرمایا گیا:

لَوْلَا نَحْنُ مَا عُبِدَ اللهُ

''اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔''

ائمہؑ نے مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کا راستہ سکھایا۔ بلکہ روایات کے مطابق ملائکہ نے بھی انہی مقدس انوار سے **توحید، تنزیہ اور تقدیسِ الٰہی** کا درس حاصل کیا۔

لہٰذا اگر یہ مقدس ہستیاں نہ ہوتیں تو بندگیِ خدا کا دروازہ بند ہوتا۔

ایک مرتبہ پھر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان مقدس ہستیوں کا محتاج ہے۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ **اللہ تعالیٰ نے خود اپنی عبادت کے لیے یہ دروازہ کھولا اور مقرر فرمایا ہے۔**

اور سب سے بڑھ کر، یہ اس فضل، شرف اور کرامت کا اظہار ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان مقدس انوار کو عطا فرمایا اور اسی کے ذریعے انہیں اپنے قرب کے بلند ترین درجات سے نوازا۔

اسی وجہ سے تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ کامل اور خالص بندگی بھی انہی کی ہے۔ **عبدِ خدا ہونے کا شرف** انہیں ہر دوسری مخلوق سے زیادہ کامل صورت میں عطا ہوا ہے۔

اسی حقیقت کی طرف اس جملے میں اشارہ ہے:

بِعِبَادَتِنَا عُبِدَ اللّٰهُ

"ہماری عبادت کے ذریعے اللہ کی عبادت ہوئی۔"

یعنی جس کامل طریقے سے یہ مقدس ہستیاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہیں، کوئی دوسرا اس طرح اس کی عبادت کرنے پر قادر نہیں۔

اس کے باوجود خود ان حضراتؑ نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حقِ عبودیت کی ادائیگی کے مقابلے میں اپنی عاجزی اور کوتاہی کا اقرار فرمایا ہے۔

اور یہی احساس و اقرار دراصل اس عمیق **معرفتِ خدا** کا نتیجہ ہے جو انہیں حاصل ہے۔

"ہمارے ذریعے اللہ کی عبادت ہوئی" اور "ہمارے ذریعے اللہ کی معرفت حاصل ہوئی" کا مفہوم

امام محمد باقرؑ سے ایک دوسری روایت منقول ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں:

بِنَا عُبِدَ اللّٰهُ، وَ بِنَا عُرِفَ اللّٰهُ، وَ بِنَا وُحِّدَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى، وَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ سَلَّمَ حِجَابُ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى.

"ہمارے ذریعے اللہ کی عبادت ہوئی، ہمارے ذریعے اللہ کی معرفت حاصل ہوئی، ہمارے ذریعے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا گیا، اور محمدؐ اللہ تبارک و تعالیٰ کا حجاب ہیں۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۴۵، کتاب التوحید، باب النوادر، حدیث ۱۰۔

ان حضرات ؑ کے ذریعے بندگیِ خدا کے تحقق کے دو پہلو ہیں۔

پہلا، **خود ان حضرات ؑ کی اللہ تعالیٰ سے معرفت اور ان کی عبادت**؛ اور دوسرا، **دوسروں کی عبادت میں ان کی بے مثال وساطت**، کیونکہ تمام مخلوقات انہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف ہدایت پاتی ہیں۔

لہٰذا عالمِ خلقت میں جہاں کہیں بھی کوئی موحّد موجود ہے، اس نے ان مقدس ہستیوں کے وجود کی برکت سے توحید تک رسائی حاصل کی ہے۔

اسی مناسبت سے حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کو **"حجاب اللہ "** کہا گیا ہے۔

یہاں **حجاب** سے مراد **واسطہ اور وسیلہ** ہے۔

رسولِ اکرم ؐ اور آپ ؐ کے پاکیزہ اہلِ بیت ؑ اللہ اور مخلوقات کے درمیان واسطۂ ہدایت ہونے کے اعتبار سے اللہ کا حجاب ہیں۔

یقیناً اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی مخلوق اپنی مستقل حیثیت میں اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔

بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مخلوقات کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان مقدس ہستیوں کی معرفت کو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی عبادت کا وسیلہ قرار دیں۔

ان کے بغیر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور عبادت **اس طریقے سے حاصل نہ ہوتی جسے خود اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔**

امام صادق ؑ فرماتے ہیں:

اَلْاَوْصِیَاءُ هُمْ اَبْوَابُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ الَّتِی یُؤْتٰی مِنْهَا، وَلَوْلَا هُمْ مَا عُرِفَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَبِهِمِ احْتَجَّ اللّٰهُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی عَلٰی خَلْقِهِ.

"اوصیاء ؑ اللہ عزوجل کے وہ دروازے ہیں جن کے ذریعے اس کی طرف آیا جاتا ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو اللہ عزوجل کی معرفت حاصل نہ ہوتی، اور انہی کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مخلوق پر حجت قائم کی ہے۔"

پس **معرفتِ امام ؑ** اور **معرفتِ خدا** کے باہمی تعلق کو مزید واضح کرنے کے لیے اب ہم **"امام ؑ کی معرفت "** کے موضوع کا زیادہ تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

تمہید

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، **اللہ اور اس کے رسولؐ کی معرفت** خود اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کا فعل ہے۔ مخلوقات کو معرفت عطا کرنے میں کوئی دخل حاصل نہیں۔ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں معرفت عطا فرمائے تو وہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں اور اسے قبول کریں۔

یہی حقیقت **معرفتِ امامؑ** کے بارے میں بھی جاری ہے۔ امامؑ کی معرفت کے سلسلے میں انسان کا کردار یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح امامؑ کا تعارف کرایا ہے، انسان اسی تعارف کو قبول کرے اور اس کے سامنے تسلیم ہو جائے۔

لہٰذا سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ائمہؑ کا تعارف کس طرح کرایا ہے۔

یہ تعارف دو طریقوں سے ہوا ہے: ایک، **ان کی ذوات اور شخصیات کی تعیین و معرفی** کے ذریعے؛ اور دوسرا، **ان صفات اور خصوصیات کی معرفی کے ذریعے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہیں۔**[1]

اس تعارف کے بعد انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ انہی مقدس ہستیوں کو ان خداداد صفات و کمالات کا حامل سمجھے، دل سے اس حقیقت پر ایمان رکھے اور خلوص و صدق کے ساتھ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔

اگر ائمہؑ کے تمام خصوصی فضائل و امتیازات بیان کیے جائیں تو بحث بہت طویل ہو جائے گی اور اس کتاب کے دائرۂ کار سے باہر نکل جائے گی۔ لہٰذا یہاں صرف چند اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امام رضاؑ فرماتے ہیں:

اَلْإِمَامُ أَمِينُ اللهِ فِي خَلْقِهِ، وَ حُجَّتُهُ عَلَى عِبَادِهِ، وَ خَلِيفَتُهُ فِي بِلَادِهِ، وَ الدَّاعِي إِلَى اللهِ، وَ الذَّابُّ عَنْ حُرَمِ اللهِ. اَلْإِمَامُ الْمُطَهَّرُ مِنَ الذُّنُوبِ، وَ الْمُبَرَّأُ مِنَ الْعُيُوبِ، الْمَخْصُوصُ بِالْعِلْمِ، الْمَوْسُومُ بِالْحِلْمِ، نِظَامُ الدِّينِ، وَ عِزُّ الْمُسْلِمِينَ، وَ غَيْظُ الْمُنَافِقِينَ، وَ بَوَارُ الْكَافِرِينَ.

"امامؑ اللہ کی مخلوق میں اس کا امین، اس کے بندوں پر اس کی حجت، اس کی سرزمین میں اس کا خلیفہ، اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور اللہ کی حرمتوں کا دفاع کرنے والا ہے۔

امامؑ گناہوں سے پاک اور عیوب سے منزّہ ہے۔اسے علم کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اور حلم و بردباری سے ممتاز فرمایا گیا ہے۔وہ دین کا نظام، مسلمانوں کی عزت، منافقین کے غیظ و غضب کا سبب اور کافروں کی ہلاکت کا باعث ہے۔"

*اصولِ کافی، ج ۱، ص ۲۰۰، کتاب الحجۃ، باب نادر جامع فی فضل الامام وصفاتہ، حدیث ۱۔ *[2]

اگر ہم صرف انہی چند صفات کو صحیح طور پر سمجھ لیں تو یہی امامؑ کے سامنے کامل تسلیم اور دل و جان سے ان سے وابستگی پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں؛ چہ جائیکہ ان عظیم ہستیوں کی دوسری صفات و خصوصیات بھی ہمارے سامنے واضح ہو جائیں۔

ہم "**خلیفۃ اللہ**" کی تعبیر پہلے بیان کر چکے ہیں۔وہاں یہ بات واضح ہوئی تھی کہ مخلوقات کے لیے اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرنے اور اس کی رضا و ناراضی کو جاننے کا مقرر کردہ راستہ صرف اس کے خلیفہ سے وابستگی اور اس کے کلام کو ارادۂ الٰہی کا بیان سمجھنے کے ذریعے ہے۔

ایسی ہستی شیطانی اثرات سے مغلوب نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے شیطان کے ضرر اور خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

اسی لیے امامؑ کے بارے میں فرمایا گیا:

اَلْمُطَهَّرُ مِنَ الذُّنُوبِ

"گناہوں سے پاک کیا گیا۔"

یہ تعبیر ائمہؑ کے مقامِ **عصمت** کو بیان کرتی ہے۔

ائمہؑ وہ ہستیاں ہیں جن کی زبان سے وحیِ الٰہی کی تعلیم کے خلاف کوئی بات صادر نہیں ہوتی۔جب وہ کسی چیز کا حکم دیتے ہیں تو ان کا حکم، حکمِ خدا ہوتا ہے، اور جب کسی چیز سے روکتے ہیں تو ان کی ممانعت بھی اللہ کی ممانعت ہوتی ہے۔

اسی روایت میں ایک اور تعبیر ہے:

اَلْمَخْصُوصُ بِالْعِلْمِ

"وہ ہستی جسے علم کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ امامؑ وہ ہستی ہے جسے **تمام علوم سے خصوصی طور پر بہرہ مند کیا گیا ہے**۔اللہ تعالیٰ نے علم کی کوئی ایسی قسم پیدا نہیں کی جس سے امامؑ بے خبر ہو۔

لہٰذا اگر کوئی دوسرا شخص علم کا کوئی حصہ حاصل کرنا چاہے تو چونکہ علم امامؑ کے پاس ہے، اسے وہ علم امامؑ ہی سے حاصل کرنا چاہیے اور کسی دوسرے دروازے کی طرف رخ نہیں کرنا چاہیے۔

ایسی ہی ہستی ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں پر حقیقی **حجت** ہو سکتی ہے۔

حجت ایسی قطعی اور فیصلہ کن دلیل کو کہتے ہیں جس کے بعد کسی عذر کی گنجائش باقی نہ رہے۔امامؑ چونکہ ان بے مثال خصوصیات کے حامل ہیں، اس لیے ان کا قول، فعل اور تقریر ـــــ یعنی کسی عمل پر ان کی خاموش تائید ـــــ بندوں پر اللہ کی حجت ہے اور انہیں بندگیِ خدا کا صحیح راستہ دکھاتی ہے۔

اگر لوگ حقیقتاً اور دل و جان سے ائمہؑ کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور خود کو ان کے سپرد کر دیں تو معاشرے میں دینِ الٰہی کا نظام صحیح طور پر قائم ہو جائے، مسلمانوں کو عزت حاصل ہو، منافقین غیظ و غضب میں مبتلا ہوں اور کافروں کا غلبہ ختم ہو جائے۔

آگے چل کر ہم **"آمینُ اللہِ فی خَلقِہ"** ـــــ **مخلوق میں اللہ کا امین** کی تعبیر پر مزید تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

امامؑ اپنے زمانے کی یکتا ہستی ہے

امام رضاؑ کے مذکورہ کلام کا اگلا حصہ یہ ہے:

اَلْإِمَامُ وَاحِدُ دَهْرِهِ، لَا يُدَانِيهِ أَحَدٌ، وَ لَا يُعَادِلُهُ عَالِمٌ، وَ لَا يُوجَدُ مِنْهُ بَدَلٌ، وَ لَا لَهُ مِثْلٌ وَ نَظِيرٌ، مَخْصُوصٌ بِالْفَضْلِ كُلِّهِ مِنْ غَيْرِ طَلَبٍ مِنْهُ لَهُ وَ لَا اكْتِسَابٍ، بَلِ اخْتِصَاصٌ مِنَ الْمُفَضِّلِ الْوَهَّابِ.

"امامؑ اپنے زمانے کی یکتا ہستی ہے۔کوئی اس کے مقام کے قریب نہیں پہنچ سکتا، کوئی عالم اس کا ہم پلہ نہیں، اس کا کوئی بدل نہیں پایا جا سکتا اور نہ اس کی کوئی مثل و نظیر ہے۔

وہ تمام فضیلتوں کے ساتھ مخصوص ہے، بغیر اس کے کہ اس نے انہیں خود طلب کیا ہو یا اپنی کوشش سے حاصل کیا ہو؛ بلکہ یہ اس ذات کی جانب سے خصوصی عطا ہے جو فضیلت عطا کرنے والی اور بے پایاں بخشش فرمانے والی ہے۔"

امامؑ کو بالکل اسی طرح پہچاننا چاہیے۔ ان کی کسی بھی صفت میں کسی دوسرے کو ان کا ہم مرتبہ یا نظیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہر اعتبار سے انہیں یکتا اور بے مثال ماننا چاہیے، یہاں تک کہ ہمیں یقین ہو کہ **تمام فضائل و کمالات سب سے پہلے اور کامل ترین صورت میں انہی کو عطا کیے گئے ہیں۔**

یہ تعبیر:

مَخْصُوصٌ بِالْفَضْلِ كُلِّهِ

"تمام فضیلتوں کے ساتھ مخصوص"

اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی کسی کو کوئی نعمت، فضل یا کمال عطا فرماتا ہے تو اس نعمت و فضیلت میں امامؑ کو اس شخص پر تقدم اور برتری حاصل ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں، کوئی کمال کسی مخلوق تک اس طرح نہیں پہنچتا کہ اس کمال میں امامؑ کی سبقت، اولویت اور برتری محفوظ نہ ہو۔ لہٰذا انسان کو اپنے ہر فضل، نعمت اور کمال کے سلسلے میں خود کو امامؑ کا مرہونِ منت سمجھنا چاہیے۔

مؤمنین پر ائمہؑ کی ولایت

امامؑ کی اسی خصوصیت کو دینی اصطلاح میں **ولایت** کہا جاتا ہے۔ رسولِ اکرمؐ اور ائمہؑ کے مقام کی عظمت اس مفہوم کے ذریعے بخوبی سمجھی جا سکتی ہے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَ رَسُولُهُ وَ الَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَ يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَ هُمْ رَاكِعُونَ ۝ وَ مَنْ يَتَوَلَّ اللهَ وَ رَسُولَهُ وَ الَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْغَالِبُونَ

''تمہارا ولی صرف اللہ، اس کا رسول اور وہ صاحبانِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اور جو اللہ، اس کے رسول اور صاحبانِ ایمان کی ولایت قبول کرے، تو بے شک اللہ ہی کا گروہ غالب آنے والا ہے۔''

(سورۂ مائدہ ۵: ۵۵–۵۶)[1]

اپنے مقام پر اس آیت سے یہ حقیقت ثابت کی گئی ہے کہ وہ صاحبانِ ایمان جو حالتِ رکوع میں صدقہ دیتے ہیں، **امیر المؤمنین علیؑ اور آپؑ کی اولاد میں سے ائمہؑ ہیں**، جنہیں قرآن کی صریح الٰہی تعیین کے مطابق تمام مؤمنین پر مقامِ ولایت حاصل ہے۔

اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ یہاں **ولایت** سے مراد **سرپرستی، صاحبِ اختیار ہونا اور مؤمنین پر خود ان سے زیادہ حقِ تصرف رکھنا** ہے۔

اسی مقام کے لیے قرآنِ کریم نے رسولِ خداؐ کے بارے میں ایک دوسری تعبیر استعمال کی ہے:

اَلنَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ

''نبی مؤمنین پر خود ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔''

(سورۂ احزاب ۳۳: ۶)[2]

جو شخص انسان پر خود اس سے زیادہ حق و اختیار رکھتا ہو، اس کے ارادے کو انسان کے اپنے ارادے پر مقدم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہی مقام ان مقدس ہستیوں کو عطا فرمایا ہے۔

پس **ان کی ولایت، ولایتِ الٰہی کے تحت اور اسی کی عطا کردہ ولایت ہے**، اور یہ حضرات **اولیائے الٰہی** ہیں؛ یعنی وہ ہستیاں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر ولایت و اختیار عطا فرمایا ہے۔

لہٰذا اگر مؤمن حقیقتاً صاحبِ ایمان ہیں تو جس طرح وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی ولایت کے سامنے تسلیم ہیں، اسی طرح انہیں ائمہؑ کی ولایت کے سامنے بھی خاضع و تسلیم ہونا چاہیے اور ان کے مقابلے میں اپنے لیے کسی مستقل اختیار یا فیصلہ سازی کا حق نہیں سمجھنا چاہیے۔

ائمہؑ کے لیے **ولایت** کی تعبیر بہت سی روایات میں استعمال ہوئی ہے۔ اگر ہم اس کے مفہوم میں صحیح غور کریں تو معرفتِ امامؑ کے سلسلے میں بہت سی اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ولی، سرپرست اور نگہبان کے معنی میں، اس شخص کو کہتے ہیں جس کی سرپرستی اور اختیار میں کسی فرد یا جماعت کو دیا گیا ہو اور جس کے سپرد ان کی حفاظت، نگرانی اور نگہداشت کی ذمہ داری کی گئی ہو۔

مثلاً باپ کو اپنے کم سن بچے پر **ولایت** حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت میں بچہ اس کے سپرد کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کی حفاظت کرے، اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کی بنیادی مادی و معنوی ضروریات پوری کرے۔

نابالغ بچہ اپنے نفع و نقصان کو صحیح طور پر نہیں پہچان سکتا۔ اس سلسلے میں اس کا سہارا اور پشت پناہ اس کے والدین ہوتے ہیں۔ اگر وہ خود کو ان کے سپرد کر دے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر چلے تو خطرات اور نقصانات سے محفوظ رہتا ہے، ورنہ خود اپنی حفاظت کی مکمل صلاحیت نہیں رکھتا۔

بچے کی سب سے بڑی امید اس کے والدین ہوتے ہیں۔ جب بھی اسے کوئی مشکل یا پریشانی پیش آتی ہے تو وہ انہی کی طرف رخ کرتا اور ان کی پناہ لے کر اپنی مشکل کا حل تلاش کرتا ہے۔

ائمہؑ کا عام انسانوں سے تعلق بھی اس پہلو سے ایک شفیق باپ اور اس کے کم سن بچوں کے تعلق سے مشابہ ہے؛ ایسے بچے جو اپنے نفع و نقصان کو پوری طرح نہیں سمجھتے اور اس لیے ہر معاملے میں اپنے سرپرست کی طرف رجوع کے محتاج ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاءؑ کے سپرد لوگوں کی حفاظت و سرپرستی کی ذمہ داری فرمائی ہے اور انہیں یہ ذمہ داری دی ہے کہ وہ انسانوں کو **بندگی اور معرفتِ خدا** کے راستے کی طرف لے جائیں۔

اگر انسان ان اولیائے الٰہی کی پناہ اختیار کریں اور خود کو ان کی تعلیم و تربیت کے سپرد کر دیں تو یقیناً وہ بندگیِ خدا کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

یہ اولیائے الٰہی نہ اس علم سے محروم ہیں جس کی اس ذمہ داری کے لیے ضرورت ہے اور نہ اس قدرت سے جو اسے انجام دینے کے لیے درکار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانوں کی صحیح معنوی تربیت کے لیے ضروری **علم اور قدرت** دونوں عطا فرمائے ہیں اور انہیں وسیع اختیارات بھی سپرد کیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو ان کے امانت دارانہ تصرف پر کامل اعتماد ہے۔ جو کچھ ان کے سپرد کیا گیا ہے، اس کی حفاظت اور استعمال میں وہ ذرہ برابر کوتاہی یا خیانت نہیں کرتے، بلکہ اپنی الٰہی ذمہ داری کو بہترین صورت میں انجام دیتے ہیں۔

ائمہؑ کو تفویضِ اختیار ـــــ تفویض

پہلی روایت میں آنے والی تعبیر:

أَمِينُ اللهِ فِي خَلْقِهِ

"اللہ کی مخلوق میں اس کا امین"

ممکن ہے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو؛ یعنی ائمہؑ ان امور میں اللہ کے امانت دار ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے اختیار میں قرار دیا ہے، اور وہ اس امانت میں ذرہ برابر خیانت نہیں کرتے۔

بلکہ معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کے سپرد فرمایا ہے، اس کے بارے میں ان سے اس انداز میں حساب نہیں لیتا جس طرح عام بندوں سے لیا جاتا ہے، بلکہ انہیں یہ اختیار عطا فرمایا ہے کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق عمل کریں۔

لیکن ان کا ارادہ، ارادۂ الٰہی کے تابع اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ وہ وہی چاہتے ہیں جو اللہ چاہتا ہے۔

اسی بنا پر لوگوں پر اپنی ولایت کے استعمال میں وہ مؤاخذے اور ملامت کے مستحق نہیں ہوتے۔

قرآنِ کریم حضرت سلیمانؑ کے بارے میں، جنہیں ایک عظیم سلطنت عطا کی گئی تھی، فرماتا ہے:

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ

"یہ ہماری عطا ہے؛ اب چاہو تو عطا کرو اور چاہو تو روک لو، تم سے کوئی حساب نہیں۔"

(سورۂ ص ۳۹:۳۸)[1]

قرآنِ کریم کے مطابق حضرت سلیمانؑ کو ہوا پر اختیار عطا کیا گیا، وہ جانوروں سے گفتگو کرتے تھے اور انہیں ایک نہایت وسیع اور عظیم الشان حکومت عطا ہوئی تھی۔

روایات کے مطابق خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ کو وہ تمام چیزیں عطا کی گئیں جو سابقہ انبیاء کو دی گئی تھیں، بلکہ اس کے علاوہ بھی وہ کچھ عطا فرمایا گیا جو دوسروں کو نہیں دیا گیا تھا۔

امام کاظمؑ فرماتے ہیں:

مَا آتَى اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ نَبِيًّا مِنْ أَنْبِيَائِهِ شَيْئًا إِلَّا وَ قَدْ آتَى مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ مِثْلَهُ، وَ زَادَهُ مَا لَمْ يُؤْتِهِمْ.

"اللہ عزوجل نے اپنے انبیاء میں سے کسی نبی کو کوئی چیز عطا نہیں کی مگر یہ کہ محمدؐ کو بھی اس کی مانند عطا فرمائی، اور اس کے علاوہ انہیں وہ کچھ بھی عطا فرمایا جو دوسرے انبیاء کو نہیں دیا گیا تھا۔"

الکافی، ج۶، ص۲۸۱۔[2]

ایک مرتبہ ایک شخص امام صادقؑ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص داخل ہوا اور امامؑ سے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں سوال کیا۔ امامؑ نے اسے جواب دیا۔

پھر ایک دوسرا شخص آیا اور اسی آیت کے بارے میں سوال کیا، مگر امامؑ نے اسے پہلے جواب سے مختلف جواب دیا۔

راوی کہتا ہے:

"میں نے اپنے دل میں کہا: یہ کیسے ممکن ہے کہ امام اتنی غلطیاں کر رہے ہوں؟"

اسی دوران ایک تیسرا شخص آیا اور اسی آیت کے بارے میں سوال کیا۔ امامؑ نے اسے ایسا جواب دیا جو پہلے دونوں جوابات سے مختلف تھا۔

تب میں سمجھ گیا کہ معاملہ **تقیہ** کا تھا۔[1]

اس کے بعد امامؑ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

إِنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ فَوَّضَ إِلَى سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ فَقَالَ: «هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ». وَ فَوَّضَ إِلَى نَبِيِّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ: «مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَ مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا». فَمَا فَوَّضَ إِلَى رَسُولِ اللهِ فَقَدْ فَوَّضَهُ إِلَيْنَا.

"بے شک اللہ عزوجل نے سلیمان بن داؤدؑ کو اختیار تفویض فرمایا اور کہا: 'یہ ہماری عطا ہے؛ چاہو تو عطا کرو اور چاہو تو روک لو، تم سے کوئی حساب نہیں۔'

اور اس نے اپنے نبیؐ کو اختیار تفویض فرمایا اور کہا: 'رسول تمہیں جو کچھ دے اسے لے لو اور جس چیز سے روکے اس سے باز رہو۔'

پس اللہ نے جو کچھ رسولِ خداؐ کو تفویض فرمایا، وہ ہمیں بھی تفویض فرمایا ہے۔"

*اصولِ کافی، ج ۱، ص ۲۶۵، کتاب الحجۃ، باب التفویض الی رسول اللہؐ...، حدیث ۲۔ *4

پس یہاں معاملہ **تفویضِ اختیار** کا ہے۔

ایسی تفویض اسی وقت ممکن ہے جب یہ مقدس ہستیاں ہر اعتبار سے کامل امانت داری کے اس مقام پر فائز ہوں جو اس عظیم ذمہ داری کے لیے ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں امین قرار دیا، اس ذمہ داری کے لیے تمام ضروری صلاحیتیں عطا فرمائیں اور جو کچھ ان کے سپرد کیا اسے پوری امانت داری کے ساتھ سنبھالنے کا اختیار بھی دیا۔

لہٰذا انہیں اختیار تفویض کرنے کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ امورِ مخلوقات اللہ تعالیٰ کے اختیار سے خارج ہو گئے۔

بلکہ یہ حضرات اللہ کے بندوں کی تربیت بالکل اسی طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ چاہتا ہے، اور انہیں اسی کمال کی طرف لے جاتے ہیں جس تک اللہ انہیں پہنچانا چاہتا ہے۔

اسی بنا پر بحیثیتِ انسان ہماری ذمہ داری ہے کہ ہر حالت اور ہر معاملے میں ان کی طرف رجوع کریں اور ان سے سوال کریں۔

البتہ ہر شخص کو ہر حال میں جواب دینا ان پر واجب نہیں؛ انہیں اختیار حاصل ہے کہ جس طرح مناسب سمجھیں عمل کریں۔

راوی کہتا ہے:

میں نے امام رضاؑ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا:

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

"**اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پوچھو۔"** *1

امامؑ نے فرمایا:

نَحْنُ أَهْلُ الذِّكْرِ، وَ نَحْنُ الْمَسْؤُولُونَ

"ہم اہلِ ذکر ہیں اور ہم ہی وہ ہیں جن سے سوال کیا جانا چاہیے۔"

میں نے عرض کیا:

"تو کیا آپ ہی وہ ہیں جن سے سوال کرنا لازم ہے اور ہم وہ ہیں جنہیں آپ سے سوال کرنا چاہیے؟"

آپؑ نے فرمایا:

"ہاں۔"

میں نے عرض کیا:

"کیا آپ پر ہمیں جواب دینا بھی واجب ہے؟"

آپؑ نے فرمایا:

لَا، ذَاكَ إِلَيْنَا، إِنْ شِئْنَا فَعَلْنَا، وَ إِنْ شِئْنَا لَمْ نَفْعَلْ. أَمَا تَسْمَعُ قَوْلَ اللهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى: «هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ»؟

"نہیں۔ یہ ہمارے اختیار میں ہے؛ اگر چاہیں تو جواب دیں اور اگر چاہیں تو نہ دیں۔ کیا تم نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا: 'یہ ہماری عطا ہے؛ چاہو تو عطا کرو اور چاہو تو روک لو، تم سے کوئی حساب نہیں'؟"

*الکافی، ج۱، ص۲۱۰، کتاب الحجۃ، باب أن الذکر...، حدیث ۳۔ *2

ائمہؑ کو عطا کردہ یہ **تفویضِ اختیار** اس باطل عقیدے سے بالکل مختلف ہے جسے **مفوّضہ** اختیار کرتے تھے۔

مفوّضہ کا عقیدہ یہ تھا کہ بعض امور اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار سے خارج کر کے مخلوقات کے حوالے کر دیے گئے ہیں اور مخلوقات ان امور میں مستقل اختیار رکھتی ہیں۔

لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ لوگوں کی **ہدایت، تعلیم اور تربیت** کے امور اہلِ بیتؑ کے سپرد کیے گئے ہیں،[1] اور **ان کے قلوب مشیتِ الٰہی کے ظروف ہیں**۔ ان کے دلوں میں وہی ارادہ پیدا ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

کامل بن ابراہیم مدنی نامی ایک شخص اسی مسئلے کے بارے میں حضرت بقیۃ اللہ امام مہدیؑ سے سوال کرنے کے لیے حاضر ہوا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، امامؑ نے فرمایا:

جِئْتَ تَسْأَلُ عَنْ مَقَالَةِ الْمُفَوِّضَةِ، كَذَبُوا، بَلْ قُلُوبُنَا أَوْعِيَةٌ لِمَشِيَّةِ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ، فَإِذَا شَاءَ اللهُ تَعَالَى شِئْنَا، وَ اللهُ يَقُولُ: «وَ مَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ.«

"تم مفوّضہ کے عقیدے کے بارے میں سوال کرنے آئے ہو۔انہوں نے جھوٹ کہا ہے۔بلکہ ہمارے دل اللہ عزوجل کی مشیت کے ظروف ہیں۔پس جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو چاہتا ہے تو ہم بھی وہی چاہتے ہیں۔اور اللہ فرماتا ہے:

'اور تم کچھ نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔'"

(سورۂ انسان ۷۶:۳۰)[21]

الخرائج والجرائح، ج۱، ص۴۵۹۔[2]

ایک دوسری روایت میں آیا ہے:

إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى جَعَلَ قُلُوبَ الْأَئِمَّةِ مَوْرِدًا لِإِرَادَتِهِ، وَ إِذَا شَاءَ شَيْئًا شَاؤُوهُ، وَ هُوَ قَوْلُهُ: «وَ مَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ.«

"بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے ائمہؑ کے قلوب کو اپنے ارادے کے ورود کا مقام قرار دیا ہے۔جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ بھی اسی کا ارادہ کرتے ہیں۔اور یہی اس کا فرمان ہے:

'اور تم کچھ نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔'"

تفسیر البرہان، ج۴، ص۴۱۶۔[3]

ہاں، اگر اہلِ بیتؑ اس مقام کے حامل نہ ہوتے تو انہیں اس قدر وسیع اختیار عطا کرنا یقیناً وہی باطل **تفویض** ہوتا۔

لیکن چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس بلند مقام پر فائز اور اس کی خصوصی عنایت ولطف کے مورد ہیں، اس لیے بندوں کے بارے میں ان کا ارادہ وہی ہوتا ہے جو اللہ ان کے لیے چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت اور اپنی معرفت کا حکم دیا ہے، اور ان مقدس ہستیوں کو ہر اعتبار سے اس مقصد کے لیے مکمل اہلیت عطا فرمائی ہے کہ وہ لوگوں کو اس منزل تک پہنچائیں۔

امام صادقؑ کی زبان سے امامؑ کا تعارف

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

فَالْإِمَامُ هُوَ الْمُنْتَجَبُ الْمُرْتَضَى، وَ الْهَادِي الْمُنْتَجَى، وَ الْقَائِمُ الْمُرْتَجَى. اصْطَفَاهُ اللهُ لِذَلِكَ وَ اصْطَنَعَهُ عَلَى عَيْنِهِ فِي الذَّرِّ حِينَ ذَرَأَهُ، وَ فِي الْبَرِيَّةِ حِينَ بَرَأَهُ، ظِلًّا قَبْلَ خَلْقِ نَسَمَةٍ عَنْ يَمِينِ عَرْشِهِ، مَحْبُوًّا بِالْحِكْمَةِ فِي عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَهُ. اخْتَارَهُ بِعِلْمِهِ وَ انْتَجَبَهُ لِطُهْرِهِ، بَقِيَّةً مِنْ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَ خِيَرَةً مِنْ ذُرِّيَّةِ نُوحٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَ مُصْطَفًى مِنْ آلِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَ سُلَالَةً مِنْ إِسْمَاعِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَ صَفْوَةً مِنْ عِتْرَةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ سَلَّمَ. لَمْ يَزَلْ مَرْعِيًّا بِعَيْنِ اللهِ يَحْفَظُهُ وَ يَكْلَؤُهُ بِسِتْرِهِ، مَطْرُودًا عَنْهُ حَبَائِلُ إِبْلِيسَ وَ جُنُودُهُ، مَدْفُوعًا عَنْهُ وَقُوبُ الْغَوَاسِقِ وَ نُفُوثُ كُلِّ فَاسِقٍ، مَصْرُوفًا عَنْهُ قَوَارِفُ السُّوءِ، مُبَرَّأً مِنَ الْعَاهَاتِ، مَحْجُوبًا عَنِ الْآفَاتِ، مَعْصُومًا مِنَ الزَّلَّاتِ، مَصُونًا عَنِ الْفَوَاحِشِ كُلِّهَا.

”پس امامؑ وہ برگزیدہ ہستی ہے جسے اللہ نے منتخب کیا اور پسند فرمایا؛ وہ ہادی ہے جس کی طرف نجات کے لیے رجوع کیا جاتا ہے، اور وہ قائم ہے جس کے قیام کی امید رکھی جاتی ہے۔

اللہ نے اسے اسی مقصد کے لیے منتخب فرمایا اور اپنی خصوصی نگرانی میں اس کی پرورش فرمائی؛ عالمِ ذر میں، جب اسے وجود بخشا، اور عالمِ خلقت میں، جب اسے پیدا فرمایا۔ انسانی جانوں کی تخلیق سے پہلے اسے اپنے عرش کے دائیں جانب ایک سایہ کی صورت میں قرار دیا، اور اپنے علمِ غیب میں اسے حکمت سے نوازا۔

اللہ نے اپنے علم کی بنا پر اسے منتخب فرمایا اور اس کی پاکیزگی کے سبب اسے برگزیدہ کیا۔ وہ آدمؑ کی باقی ماندہ پاک نسل، نوحؑ کی ذریت کا برگزیدہ، آلِ ابراہیمؑ کا منتخب، اسماعیلؑ کی نسل کا پاکیزہ سلسلہ اور عترتِ محمدؐ کا خالص و برگزیدہ فرد ہے۔

وہ ہمیشہ اللہ کی خصوصی نگاہ و نگرانی میں رہا ہے۔ اللہ اس کی حفاظت کرتا اور اپنی پردۂ حفاظت میں اس کی نگہبانی فرماتا ہے۔ ابلیس اور اس کے لشکروں کے جال اس سے دور رکھے گئے ہیں؛ تاریکیوں کے حملے اور ہر فاسق کے وسوسے اس سے دفع کیے گئے ہیں؛ برائی کی تہمتیں اور آلودگیاں اس سے دور کر دی گئی ہیں۔ وہ عیوب سے پاک، آفات سے محفوظ، لغزشوں سے معصوم اور ہر قسم کی بے حیائی سے محفوظ ہے۔“

*اصولِ کافی، ج ۱، ص ۲۰۴، کتاب الحجۃ، باب نادر جامع فی فضل الامام وصفاتہ، حدیث ۲۔ *[1]

جب امامؑ کی شخصیت اور مقام کا اس طرح تعارف کرا دیا گیا تو امام صادقؑ آگے فرماتے ہیں:

فَلَيْسَ يَجْهَلُ حَقَّ هَذَا الْعَالِمِ إِلَّا شَقِيٌّ، وَ لَا يَجْحَدُهُ إِلَّا غَوِيٌّ، وَ لَا يَصُدُّ عَنْهُ إِلَّا جَرِيٌّ عَلَى اللهِ جَلَّ وَ عَلَا.

"ایسے عالم کے حق سے وہی شخص ناواقف رہتا ہے جو بد بخت ہو؛ اس کا جحود و انکار وہی کرتا ہے جو گمراہ ہو؛ اور اس سے وہی شخص روگردانی کرتا ہے جو اللہ جلّ وعلا کے مقابلے میں جسارت کرنے والا ہو۔"

*اصولِ کافی، ج ۱، ص ۲۰۵، کتاب الحجۃ، باب نادر جامع فی فضل الامام وصفاتہ، حدیث ۲۔ *[1]

حوالہ جات اور توضیحی حواشی

۱۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت اور اس کے مختلف درجات کی تفصیلی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: آفتاب در غربت، حصہ دوم، باب دوم۔

۲۔ اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۹۳، کتاب الحجۃ، باب أن الأئمۃ خلفاء اللہ عز و جل...، حدیث ۲۔

۳۔ بحار الانوار، ج ۲۶، ص ۲۸۱، حدیث ۲۹، بحوالۂ بصائر الدرجات۔

۴۔ بحار الانوار، ج ۴۰، ص ۹۶، حدیث ۱۱۶، بحوالۂ کتاب سلیم بن قیس۔

۵۔ بحار الانوار، ج ۲۴، ص ۱۹۳، حدیث ۱۳، بحوالۂ تفسیر قمی۔

۶۔ اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۴۴، کتاب التوحید، باب النوادر، حدیث ۵۔

۷۔ اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۴۵، کتاب التوحید، باب النوادر، حدیث ۱۰۔

۸۔ اصولِ کافی، ج ۱، ص ۲۰۰، کتاب الحجۃ، باب نادر جامع فی فضل الامام وصفاتہ، حدیث ۱۔

۹۔ قرآنِ کریم، سورۂ مائدہ ۵۵: ۵–۵۶۔

۱۰۔ قرآنِ کریم، سورۂ احزاب ۶: ۳۳۔

۱۱۔ قرآنِ کریم، سورۂ ص ۳۹: ۳۸۔

۱۲۔ الکافی، ج ۶، ص ۲۸۱۔

۱۳۔اصولِ کافی، ج۱، ص۲۶۵، کتاب الحجۃ، باب التفویض الی رسول اللہؐ...، حدیث ۲۔

۱۴۔قرآنِ کریم، سورۂ نحل ۴۳:۱۶۔

۱۵۔اصولِ کافی، ج۱، ص۲۱۰، کتاب الحجۃ، باب اُن الذکر...، حدیث ۳۔

۱۶۔قرآنِ کریم، سورۂ انسان ۳۰:۷۶۔

۱۷۔الخرائج والجرائح، ج۱، ص۴۵۹۔

۱۸۔تفسیر البرہان، ج۴، ص۴۱۶۔

۱۹۔اصولِ کافی، ج۱، ص۲۰۴، کتاب الحجۃ، باب نادر جامع فی فضل الامام وصفاتہ، حدیث ۲۔

۲۰۔اصولِ کافی، ج۱، ص۲۰۵، کتاب الحجۃ، باب نادر جامع فی فضل الامام وصفاتہ، حدیث ۲۔

متنی حاشیہ ـــــ مختلف جوابات اور تقیہ

ائمہؑ کی زندگی میں متعدد مواقع پر ایک ہی سوال کے مختلف جوابات نقل ہوئے ہیں۔اس کے مختلف اسباب ہو سکتے تھے، جن میں سے ایک **تقیہ** تھا۔ لہٰذا صرف اس بناپر کہ امامؑ نے ایک ہی سوال کے مختلف جوابات دیے، ان کی طرف خطا کی نسبت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ ائمہؑ معصوم ہیں۔

متنی حاشیہ ـــــ تفویض کا مقصود

یہاں، اور اس پوری بحث میں، **تفویض** سے مراد رزق پہنچانے یا بندوں کی تخلیق کا اختیار ائمہؑ کے سپرد کیا جانا نہیں ہے۔ زیرِ بحث موضوع صرف **لوگوں کی ہدایت، تعلیم اور تربیت میں ائمہؑ کا کردار اور انہیں عطا کردہ اختیار** ہے۔

عالمِ تکوین میں امامؑ کے فیوضِ الٰہی کا واسطہ ہونے کی تفصیلی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: آفتاب در غربت، حصہ دوم، باب اوّل، عنوان "**عالمِ تکوین میں امامؑ بحیثیتِ نعمتِ الٰہی**"۔

ائمہؑ کو عطا کردہ **تفویضِ اختیار** کی مزید تفصیلی وضاحت بھی وہیں بیان ہوئی ہے۔

متنی حاشیہ—نام اور صفات کے ذریعے معرفتِ امامؑ

امامؑ کو ان کے نام اور صفات کے ذریعے پہچاننے اور معرفتِ امامؑ کے مختلف درجات کی تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو :

آفتاب در غربت، حصہ دوم، باب دوم۔

باب دوم

ایمان اور معرفتِ امامؑ کا باہمی تعلق

معرفتِ امامؑ کی ذمہ داری

تمہید

اب تک جو کچھ بیان ہوا، وہ ائمہؑ کی ان صفات و خصوصیات کی محض ایک جھلک ہے جو خود ان حضرات کی روایات میں بیان ہوئی ہیں۔ بحیثیتِ انسان ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان صفات و کمالات کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں اور انہیں دل و جان سے قبول کریں۔

معرفتِ امامؑ کے سلسلے میں ہمارا کردار یہی ہے کہ **اللہ تعالیٰ نے امامؑ کا جو تعارف کرایا ہے، ہم اسے قبول کریں۔** یہی وہ **معرفتِ امامؑ** ہے جو معرفتِ خدا اور معرفتِ رسولؐ کے بعد ہم پر واجب قرار دی گئی ہے۔

اس روایت کے تسلسل میں، جس میں پہلے **معرفتِ خدا** اور پھر **معرفتِ رسولؐ** کو افضل ترین فرائض قرار دیا گیا تھا، آگے فرمایا گیا ہے:

وَ بَعدَهُ مَعرِفَةُ الاِمامِ الَّذی بِهِ یُؤتَمُّ، بِنَعتِهِ وَ صِفَتِهِ وَ اسمِهِ فی حالِ العُسرِ وَ الیُسرِ. وَ اَدنی مَعرِفَةِ الاِمامِ اَنَّهُ عِدلُ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم – اِلّا دَرَجَةَ النُّبُوَّةِ – وَ وارِثُهُ وَ اَنَّ طاعَتَهُ طاعَةُ اللهِ وَ طاعَةُ رَسُولِ اللهِ وَ التَّسلیمُ لَهُ فی کُلِّ اَمرٍ وَ الرَّدُّ اِلَیهِ وَ الاَخذُ بِقَولِهِ وَ یَعلَمُ اَنَّ الاِمامَ بَعدَ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم عَلِیُّ بنُ اَبی طالِبٍ، وَ بَعدَهُ الحَسَنُ، وَ بَعدَهُ الحُسَینُ، ثُمَّ عَلِیُّ بنُ الحُسَینِ، ثُمَّ مُحَمَّدُ بنُ عَلِیٍّ، ثُمَّ اَنَا، ثُمَّ بَعدی موسَی ابنی، وَ بَعدَهُ عَلِیُّ ابنُهُ، وَ بَعدَ عَلِیٍّ مُحَمَّدٌ ابنُهُ، وَ بَعدَ مُحَمَّدٍ عَلِیٌّ ابنُهُ، وَ بَعدَ عَلِیٍّ الحَسَنُ ابنُهُ، وَ الحُجَّةُ مِن وُلدِ الحَسَنِ.

"اور اس کے بعد اس امام کی معرفت ہے جس کی پیروی کی جاتی ہے؛ یعنی سختی اور آسانی، دونوں حالتوں میں اس کے اوصاف، صفات اور نام کی معرفت۔

اور امامؑ کی معرفت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ انسان یہ پہچانے کہ امامؑ، مقامِ نبوت کے علاوہ، نبیؐ کے ہم پایہ اور ان کے وارث ہیں؛ ان کی اطاعت، اللہ کی اطاعت اور رسولِ خداؐ کی اطاعت ہے؛ ہر معاملے میں ان کے سامنے تسلیم ہونا، امور کو ان کی طرف پلٹانا اور ان کے قول کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ رسولِ خداؐ کے بعد امام علی بن ابی طالبؑ ہیں، ان کے بعد حسنؑ، پھر حسینؑ، پھر علی بن الحسینؑ، پھر محمد بن علیؑ، پھر میں، پھر میرے بعد میرا بیٹا موسیٰؑ، ان کے بعد ان کے فرزند علیؑ، علیؑ کے بعد ان کے فرزند محمدؑ، محمدؑ کے بعد ان کے فرزند علیؑ، علیؑ کے بعد ان کے فرزند حسنؑ، اور حجت، حسنؑ کی اولاد میں سے ہوں گے۔"

بحار الانوار، ج ۳۶، ص ۴۰۷، حدیث ۱۶، بحوالہ کفایۃ الاثر۔

اس بیان کے مطابق **معرفتِ امامؑ کا کم سے کم واجب درجہ** دو حصوں پر مشتمل ہے:

اوّل : امامؑ کے فضائل وصفات پر ایمان اور ان ذمہ داریوں کی معرفت جو امامؑ کے سلسلے میں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔

دوم : ہر امامؑ کو ان کے نام اور نسب کے ساتھ، انفرادی طور پر پہچاننا۔

امامؑ کے سلسلے میں امت کی پانچ ذمہ داریاں

معرفتِ امامؑ کے کم سے کم واجب درجے کے پہلے حصے میں درج ذیل امور شامل ہیں:

۱۔ مقامِ نبوت کے علاوہ رسولِ خداؐ کی دیگر صفات و کمالات امامؑ میں بھی موجود ہیں

مختصراً، یہاں **نبوت** سے مراد شریعت کا مقرر کیا جانا اور **وحیِ تشریعی** کا براہِ راست مخاطب و حامل ہونا ہے۔

دین اور شریعت کی وحی رسولِ خداؐ پر مکمل ہو چکی تھی۔ ائمہؑ دینی احکام اور عقائد کے سلسلے میں جو کچھ بیان فرماتے ہیں، وہ سب رسولِ خداؐ سے حاصل کردہ ہے؛ ان پر براہِ راست کوئی نئی **وحیِ تشریعی** نازل نہیں ہوتی۔

البتہ وحی کی وہ قسم جو تشریع سے متعلق نہیں بلکہ مخصوص واقعات اور جزوی امور سے تعلق رکھتی ہے، ائمہؑ کو براہِ راست عطا ہو سکتی ہے۔[1] ایسی وحی مقامِ نبوت کا باعث نہیں بنتی، کیونکہ اس میں کوئی نئی شریعت یا قانون سازی نہیں ہوتی۔

لہٰذا یہ ممکن ہے کہ امامؑ اس وحیِ شریعت کو سنیں جو جبرئیلؑ رسولِ خداؐ کے لیے لاتے ہیں، بلکہ جبرئیلؑ کو دیکھیں بھی، لیکن اس وحی کے اصل مخاطب اور دریافت کرنے والے رسولِ خداؐ ہوں، امامؑ نہیں۔

دوسرے الفاظ میں، جبرئیلؑ وحیِ تشریعی رسولِ خداؐ کے لیے لاتے ہیں، جبکہ امامؑ اس امر کے شاہد و ناظر ہوتے ہیں۔

امیر المؤمنین علیؑ سے منقول ہے کہ رسولِ خداؐ نے آپؑ سے فرمایا:

اِنَّکَ تَسمَعُ ما اَسمَعُ وَ تَری ما اَری اِلّا اِنَّکَ لَستَ بِنَبِیٍّ وَ لکِنَّکَ لَوَزِیرٌ. وَ اِنَّکَ لَعَلی خَیرٍ.

"اے علیؑ! جو کچھ میں سنتا ہوں تم بھی سنتے ہو، اور جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھتے ہو؛ فرق صرف یہ ہے کہ تم نبی نہیں ہو، بلکہ میرے وزیر ہو، اور یقیناً تم خیر پر ہو۔"

نہج البلاغہ، فیض الاسلام، خطبہ ۲۳۴، خطبۂ قاصعہ۔

پس مقامِ نبوت کے علاوہ رسولِ خداؐ کے دیگر تمام کمالات ـــ جن میں علم، عصمت، ولایت وغیرہ شامل ہیں ـــ امامؑ کو بھی حاصل ہیں۔ لہٰذا امامؑ، نبوت کے سوا، رسولِ خداؐ کی تمام صفات و کمالات کے وارث ہیں۔

حاشیہ ۱

یہاں "جزوی امور" سے مراد ایسے مخصوص حقائق و واقعات ہیں جن سے امامؑ وحیِ الٰہی کے ذریعے آگاہ ہوتے ہیں؛ مثلاً مستقبل میں پیش آنے والے بعض واقعات یا لوگوں کے قلوب اور باطنی حالات میں موجود امور۔

ایسی چیزیں شریعت کا حصہ نہیں ہوتیں۔

شریعت ان عمومی اصولوں اور قوانین پر مشتمل ہے جو عقائد، اخلاق اور عمومی احکام کو اپنے دائرے میں لیتے ہیں۔

جزوی امور کے بارے میں وحی مقامِ نبوت کا باعث نہیں بنتی، کیونکہ اس میں کوئی تشریع نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ امامؑ اس وحیِ شریعت کو سنیں جو جبرئیلؑ رسولِ خداؐ کے لیے لاتے ہیں، بلکہ جبرئیلؑ کو دیکھیں بھی؛ تاہم وحی کے اصل مخاطب رسولِ خداؐ ہوتے ہیں، امامؑ نہیں۔ جبرئیلؑ رسولِ خداؐ کے لیے وحیِ شریعت کے حامل ہوتے ہیں، جبکہ امامؑ اس امر کے شاہد و ناظر ہوتے ہیں۔

۲۔امامؑ کی اطاعت، حقیقت میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ہے

امامؑ کی اطاعت، اللہ اور رسولِ خداؐ کی اطاعت سے جدا اور مستقل کوئی اطاعت نہیں۔

بلکہ امامؑ کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت اور رسولِ خداؐ کی اطاعت ہے۔

۳۔ہر معاملے میں بلا استثنا امامؑ کے فیصلے کے سامنے تسلیم ہونا چاہیے

تسلیم کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی معاملے میں امامؑ کا موقف ہمارے لیے واضح ہو جائے تو اس پر عمل کرنے میں ہمارے اندر کوئی تردّد باقی نہ رہے۔

امامؑ کے موقف کو قبول کرنا ہمارے لیے دشوار اور گراں نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہمیں آسانی اور آمادگی کے ساتھ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے؛ خواہ وہ بات ہماری اپنی عقل و فہم کے اعتبار سے پوری طرح واضح ہو یا نہ ہو۔

۴۔ہر معاملے کو امامؑ کی طرف پلٹانا ضروری ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر معاملے میں—خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو، اخلاق سے، معاشرتی امور سے یا ذاتی معاملات سے —ہمارا پہلا قدم **امامؑ کی طرف رجوع** ہونا چاہیے۔

جب تک ہم اس مسئلے کو امامؑ کی طرف نہ پلٹائیں، ہمیں یہ یقین نہیں کر لینا چاہیے کہ ہماری اپنی سمجھ ہی لازماً درست ہے۔ مثلاً توحید، معاد اور دیگر اعتقادی تفصیلات ہوں، یا احکامِ شرعی اور اخلاقی مسائل، ان سب میں ہمارا بنیادی مرجع اور اصل سرچشمہ **ائمہؑ کی روایات** ہونی چاہئیں، نہ کہ افراد کی آراء یا اپنی اور دوسروں کی ناقص فہم پر اعتماد۔

۵۔امامؑ کی طرف رجوع کرنے کے بعد انہی کے موقف کو اختیار کرنا چاہیے

روایات کی طرف ہمارا رجوع اس غرض سے نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اپنی پہلے سے قائم کردہ رائے کو ان پر مسلط کریں یا حدیث کو اپنی ذاتی فہم، پسند اور رجحان کے مطابق معنی پہنائیں۔

بلکہ عملی طور پر ائمہؑ کی روایات سے جو بات سمجھی جائے، اسے ہر دوسری چیز پر مقدم رکھنا چاہیے۔

ان نکات سے واضح ہو جاتا ہے کہ کسی شخص کی **معرفتِ امامؑ کا درجہ** اس بات پر منحصر ہے کہ یہ پانچ امور اس کے اندر کس حد تک متحقق ہوئے ہیں۔

یہ امور جس قدر کامل، مضبوط اور گہرے ہوں گے، اس کی معرفت بھی اسی قدر بلند ہو گی؛ اور جس قدر ان میں کمی ہو گی، اسی قدر اس کی معرفت بھی ناقص ہو گی۔

لہٰذا محض دعویٰ یا سطحی شناخت کی بنیاد پر کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے امامؑ کی حقیقی معرفت حاصل ہے۔

دوسرا حصہ: مخصوص ائمہؑ کی شناخت

روایت کا دوسرا حصہ ان ہستیوں کی تعیین سے متعلق ہے جو منصبِ امامت پر فائز ہیں، اور اس میں شیعۂ اثنا عشری کے **بارہ ائمہؑ** کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امامت محض ایک عمومی تصور نہیں ہے جس کے مصداق کی تعیین لوگوں پر چھوڑ دی گئی ہو؛ بلکہ ائمہؑ مخصوص اور معین ہستیاں ہیں، جنہیں ان کے نام اور نسب کے ساتھ پہچاننا اور ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔

لہٰذا بعض شیعہ فرقوں، مثلاً **زیدیہ**، کا یہ نظریہ کہ اہلِ بیتِ رسولؐ میں سے کسی بھی شخص کو امام تسلیم کر لینا عقیدۂ امامت کے لیے کافی ہے، قابلِ قبول نہیں رہتا۔

زیارتِ جامعہ کبیرہ میں اہلِ بیتؑ کا تعارف

تمہید

اہلِ بیتؑ کی حقیقی معرفت صرف اور صرف انہی کے بیانات کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے، کیونکہ حقیقت میں ان کے یہ بیانات **اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کا تعارف** ہیں۔

لہٰذا ان مقدس ہستیوں کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ہمیں انہی کی روایات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ محض عقلی بحث اس مقام پر ہمیں مطلوبہ منزل تک نہیں پہنچا سکتی۔

اہلِ بیتؑ کا نہایت خوب صورت اور جامع تعارف پیش کرنے والی بہترین مأثور نصوص میں سے ایک **زیارتِ جامعہ کبیرہ** ہے، جو امام ہادیؑ سے منقول ہے۔

آیئے اس عظیم زیارت کے بعض فقروں پر مختصر نظر ڈالتے ہیں، جو ہمیں ان مقدس ہستیوں کی معرفت سے قریب کرتے ہیں۔ ساتھ ہی محترم قارئین کو دعوت دیتے ہیں کہ اس عظیم زیارت کے الفاظ اور معانی میں خود بھی غور و تدبر کریں۔

ائمہؑ کے خداداد کمالات

زیارت کے ابتدائی فقروں میں ائمہؑ کے الٰہی مقامات اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صفات و کمالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

اَلسَّلامُ عَلَیکُم یا اَهلَ بَیتِ النُّبُوَّةِ وَ مَوضِعَ الرِّسالَةِ وَ مُختَلَفَ المَلائِکَةِ وَ مَهبِطَ الوَحیِ ... وَ ساسَةَ العِبادِ ... وَ اَبوابَ الایمانِ وَ اُمَناءَ الرَّحمنِ.

"سلام ہو آپ پر، اے اہلِ بیتِ نبوتؑ! اے مقامِ رسالت! اے فرشتوں کی آمد و رفت کے مرکز! اے نزولِ وحی کے مقام!... اے بندگانِ خدا کے امور کی تدبیر و سرپرستی کرنے والو!... اے ایمان کے دروازو! اور اے خدائے رحمان کے امانت دارو"!

اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیتؑ کو اپنے بندوں کے امور کی تدبیر و سرپرستی کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

اللہ نے انہیں امین قرار دیا اور جو ذمہ داری ان کے سپرد فرمائی، اس میں ان کی امانت داری ایسی ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں ارادۂ الٰہی سے ذرہ برابر منحرف نہیں ہوتے۔

اَلسَّلامُ عَلی اَئِمَّةِ الهُدی وَ مَصابیحِ الدُّجی ... وَ کَهفِ الوَری.

"سلام ہو ہدایت کے اماموںؑ پر، تاریکیوں میں روشن چراغوں پر... اور مخلوقات کی پناہ گاہوں پر۔"

اہلِ بیتؑ راہِ ہدایت کے پیشوا اور نمونۂ عمل ہیں۔ جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں میں وہ ایسے روشن چراغ ہیں جو **صراطِ مستقیم** دکھاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کے لیے جائے امن اور پناہ گاہ قرار دیا ہے تاکہ بندے ان کی پناہ اختیار کریں۔

اَلسَّلامُ عَلَی الدُّعاةِ اِلی اللهِ وَ الاَدِلّاءِ عَلی مَرضاةِ اللهِ ... وَ المُظهِرینَ لِاَمرِ اللهِ وَ نَهیِهِ وَ عِبادِهِ المُکرَمینَ الَّذینَ لا یَسبِقُونَهُ بِالقَولِ وَ هُم بِاَمرِهِ یَعمَلُونَ.

"سلام ہو ان ہستیوں پر جو اللہ کی طرف دعوت دینے والی اور رضائے الٰہی کی راہ دکھانے والی ہیں... جو اللہ کے امر و نہی کو ظاہر کرنے والی اور اس کے وہ معزز بندے ہیں جو قول میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔"

لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینا رسولؐ اور امامؑ کا بنیادی فریضہ ہے، اور یہی تمام انبیائے الٰہی کی جدوجہد کا مرکزی مقصد بھی رہا ہے۔ اللہ کی رضا اور ناراضی انسانوں کے لیے اہلِ بیتؑ ہی کے ذریعے واضح ہوتی ہے۔ ان کے اقوال و افعال، امر و نہیِ الٰہی کو آشکار کرتے ہیں۔

وہ اللہ کے معزز بندے ہیں جو اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق ہی بولتے اور عمل کرتے ہیں۔ ارادۂ الٰہی کے مقابلے میں ان کی کوئی مستقل خواہش و ارادہ نہیں۔

رَضِيَكُم خُلَفاءَ فی اَرضِهِ ... وَ اَنصاراً لِدينِهِ ... وَ تَراجِمَةً لِوَحيِهِ وَ اَركاناً لِتَوحيدِهِ وَ شُهَداءَ عَلی خَلقِهِ وَ اَعلاماً لِعِبادِهِ وَ مَناراً فی بِلادِهِ وَ اَدِلّاءَ عَلی صِراطِهِ. عَصَمَكُمُ اللهُ مِنَ الزَّلَلِ وَ آمَنَكُم مِنَ الفِتَنِ وَ طَهَّرَكُم مِنَ الدَّنَسِ وَ اَذهَبَ عَنكُمُ الرِّجسَ وَ طَهَّرَكُم تَطهيراً.

"اللہ نے آپ کو اپنی زمین میں اپنے خلفاء کی حیثیت سے پسند فرمایا... اپنے دین کے مددگار... اپنی وحی کے ترجمان، اپنی توحید کے ارکان، اپنی مخلوق پر گواہ، اپنے بندوں کے لیے نشانیاں، اپنی سرزمینوں میں مینارِ ہدایت اور اپنے راستے کی رہنمائی کرنے والے قرار دیا۔

اللہ نے آپ کو لغزشوں سے محفوظ رکھا، فتنوں سے امان عطا فرمائی، ہر آلودگی سے پاک کیا، آپ سے ہر رجس کو دور رکھا اور آپ کو ایسا پاک کیا جیسا پاک کرنے کا حق ہے۔"

اہلِ بیتؑ کی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ **دینِ خدا کے مددگار** ہیں؛ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت اور بقا انہی کے ذریعے فرماتا ہے۔

بندوں کے دلوں میں توحیدِ الٰہی کا عقیدہ اہلِ بیتؑ کے وجود کے سہارے قائم ہے، اور یہی مقدس ہستیاں اللہ کی طرف جانے والے راستے کی رہنمائی کرتی ہیں۔

اب تک ائمہؑ کے کمالات کی صرف ایک مختصر سی جھلک ہمارے سامنے آئی ہے۔

ذمہ داریِ الٰہی کی ادائیگی میں ائمہؑ کا طرزِ عمل

زیارتِ جامعہ کبیرہ کے اگلے حصے میں اہلِ بیتؑ کے طرزِ عمل اور اس کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے ساتھ انہوں نے اللہ کی سپرد کردہ ذمہ داریوں کو ادا فرمایا:

فَعَظَّمتُم جَلالَهُ. وَ اَكبَرتُم شَأنَهُ. وَ مَجَّدتُم كَرَمَهُ. وَ اَدَمتُم ذِكرَهُ. وَ وَكَّدتُم ميثاقَهُ. وَ اَحكَمتُم عَقدَ طاعَتِهِ. وَ نَصَحتُم لَهُ فِی السِّرِّ وَ العَلانيَةِ. وَ دَعَوتُم اِلی سَبيلِهِ بِالحِكمَةِ وَ المَوعِظَةِ الحَسَنَةِ. وَ بَذَلتُم اَنفُسَكُم فی مَرضاتِهِ. وَ صَبَرتُم عَلی ما اَصابَكُم فی جَنبِهِ. وَ اَقَمتُمُ الصَّلاةَ. وَ آتَيتُمُ الزَّكاةَ. **وَآمَرتُم بِالمَعرُوفِ. وَ نَهَيتُم**

عَنِ المُنکَرِ. وَ جاهَدتُم فِی اللهِ حَقَّ جِهادِهِ. حَتّی اَعلَنتُم دَعوَتَهُ، وَ بَیَّنتُم فَرائِضَهُ، وَ اَقَمتُم حُدُودَهُ، وَ نَشَرتُم شَرائِعَ اَحکامِهِ، وَ سَنَنتُم سُنَّتَهُ، وَ صِرتُم فی ذلِکَ مِنهُ اِلَی الرِّضا، وَ سَلَّمتُم لَهُ القَضاءَ، وَ صَدَّقتُم مِن رُسُلِهِ مَن مَضی.

"پس آپ نے اس کے جلال کی عظمت بیان کی، اس کی شان کو بزرگ جانا اور اس کے کرم کی بزرگی کو آشکار کیا۔ آپ نے ہمیشہ اس کا ذکر قائم رکھا، اس کے عہد و میثاق کو مضبوط کیا اور اس کی اطاعت کے پیمان کو مستحکم فرمایا۔

آپ نے پوشیدہ اور آشکار، ہر حال میں خلوص کے ساتھ اس کے لیے خیر خواہی کی؛ حکمت اور بہترین نصیحت کے ذریعے اس کے راستے کی طرف دعوت دی؛ اس کی رضا کی خاطر اپنی جانیں نثار کر دیں اور اس کی راہ میں آپ پر جو مصائب آئے ان پر صبر کیا۔

آپ نے نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، نیکی کا حکم دیا، برائی سے روکا اور اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کیا جیسا اس کی راہ میں جہاد کرنے کا حق ہے۔

یہاں تک کہ آپ نے اس کی دعوت کو آشکار کر دیا، اس کے فرائض کو واضح فرمایا، اس کی حدود کو قائم کیا، اس کے احکام و شریعت کو عام کیا اور اس کی سنت کو جاری و برقرار فرمایا۔

اور اس تمام راہ میں آپ اس مقام تک پہنچے کہ اللہ آپ سے راضی ہو گیا؛ آپ نے اس کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھا اور آپ سے پہلے گزرنے والے اس کے رسولوں کی تصدیق فرمائی۔"

زیارت کا یہ حصہ نہایت واضح طور پر بتاتا ہے کہ اہلِ بیتؑ نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے سپرد کی گئی ذمہ داری کے امتحان کو کامیابی کے ساتھ پورا کیا اور اپنی الٰہی ذمہ داری کو بہترین صورت میں انجام دیا۔

مذکورہ تمام تعبیرات کا تعلق **حرمتِ الٰہی کی پاسداری** سے ہے اور خلاصہ یہ کہ ان مقدس ہستیوں نے لوگوں کو ان ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جو ان کے پروردگار کے مقابلے میں ان پر عائد ہوتی ہیں۔

یہی ائمہؑ کا بنیادی مشن تھا، اور اس عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے میں انہوں نے کسی چیز سے دریغ نہیں کیا۔

اس راہ میں ان پر جو شدید مصائب اور بلائیں آئیں، انہوں نے ان سب پر صبر کیا اور دعوتِ الٰہی کو آشکار و عام کرنے کے لیے عظیم ترین جدوجہد فرمائی۔

ان سب نے—آخری حجتِ الٰہیؑ کے سوا، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذخیرۂ محفوظ کی حیثیت سے باقی رکھا ہے—اسی راہ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔

اپنے پورے سفر میں ایک لمحے کے لیے بھی ان کے اندر تزلزل یا شک پیدا نہیں ہوا۔ وہ اپنے پروردگار کے ارادے کے سامنے کامل تسلیم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

انہوں نے اس راہ کو اس انداز سے طے کیا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا:

صِرتُم فی ذلِکَ مِنهُ اِلَی الرِّضا

"اور اس راہ میں آپ اس مقام تک پہنچے کہ اللہ آپ سے راضی ہو گیا۔"

یہاں تک کہ دوست اور دشمن، سب کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ:

اَللّٰهُ اَعلَمُ حَیثُ یَجعَلُ رِسالَتَهُ.

"اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے۔"

سورۂ انعام ۶:۱۲۴۔

ائمہؑ—حق اور رضائے الٰہی کا معیار

اب جبکہ یہ واضح ہو گیا کہ اہلِ بیتؑ نے اپنی الٰہی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کس طرح عمل فرمایا، زیارتِ جامعہ کبیرہ کا تیسرا حصہ، گزشتہ حصے کے نتیجے کے طور پر، ہمارے سامنے آتا ہے:

فَالرّاغِبُ عَنکُم مارِقٌ. وَ اللّازِمُ لَکُم لاحِقٌ. وَ المُقَصِّرُ فی حَقِّکُم زاهِقٌ. وَ الحَقُّ مَعَکُم وَ فیکُم وَ مِنکُم وَ اِلَیکُم. وَ اَنتُم اَهلُهُ وَ مَعدِنُهُ. وَ میراثُ النُّبُوَّةِ عِندَکُم. وَ اِیابُ الخَلقِ اِلَیکُم. وَ حِسابُهُم عَلَیکُم.

"پس جو آپ سے روگردانی کرے وہ دین سے خارج ہو گیا، جو آپ سے وابستہ رہے وہ منزل تک پہنچ گیا، اور جو آپ کے حق میں کوتاہی کرے وہ ہلاک ہو گیا۔ حق آپ کے ساتھ ہے، آپ کے اندر ہے، آپ ہی سے صادر ہوتا ہے اور آپ ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ آپ ہی اہلِ حق اور اس کا سرچشمہ ہیں۔ میراثِ نبوت آپ کے پاس ہے، مخلوق کی بازگشت آپ ہی کی طرف ہے اور ان کا حساب آپ ہی سے وابستہ ہے۔"

یہ ان بلند ترین مقامات میں سے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص برگزیدہ بندوں کو عطا فرمائے ہیں۔ اور جیسا کہ خود زیارت کے الفاظ سے واضح ہے، ان مقامات کی بنیاد زیارت کے گزشتہ حصے میں بیان ہو چکی ہے۔

پچھلے حصے میں واضح ہوا کہ اہلِ بیتؑ کا طرزِ عمل **رضائے الٰہی کی نشانی اور دینِ خدا کا عملی مظہر** تھا۔ اللہ کی رضا اور ناراضی کے مقابلے میں ان کی اپنی کوئی مستقل رضا یا ناراضی نہیں تھی، بلکہ ان کی رضا و ناراضی مکمل طور پر رضائے الٰہی اور غضبِ الٰہی کے تابع تھی۔ انہوں نے لوگوں کو اللہ اور اس کی بندگی کے سوا کسی اور چیز کی طرف دعوت نہیں دی۔

لہٰذا جو شخص ان کی دعوت کو قبول نہ کرے اور انہیں رد کر دے، اس نے حقیقت میں اللہ کی دعوت کو رد کیا؛ اور جو انہیں قبول کرے، اس نے حقیقت میں اللہ کی دعوت کو قبول کیا۔

پس اہلِ بیتؑ سے روگردانی، درحقیقت اللہ سے روگردانی اور اس کے دین سے نکل جانے کے مترادف ہے۔

اسی طرح جو شخص ان کے اس خداداد مقام کو نہ پہچانے اور یہ گمان کرے کہ وہ کسی دوسرے راستے سے اللہ کی رضا و ناراضی کو پہچان سکتا اور اس کی عبادت کر سکتا ہے، وہ اپنے لیے ہلاکت اور بدبختی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ ائمہؑ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی، انسان کو اس راستے سے دور کر دیتی ہے جس کی طرف وہ نوعِ انسانی کی رہنمائی کرتے ہیں، اور اس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

دوسرے الفاظ میں، اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کی حفاظت کا واحد راستہ یہ قرار دیا ہے کہ ان حقوق کی حفاظت کی جائے جو اہلِ بیتؑ کو مخلوق پر عطا کیے گئے ہیں۔

اللہ نے انہیں اپنی رضا و خوشنودی کا مظہر، اپنی وحی کا ترجمان اور اپنی بندگی کے راستے کی نشانی قرار دیا ہے۔ لہٰذا عملی طور پر جو شخص اس اعتبار سے ان کے حقوق کی رعایت نہ کرے، وہ خطا اور شیطانی فریب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے گمراہی سے حفاظت کی ضمانت دی ہے جو ان سے وابستہ رہے۔

پس اہلِ بیتؑ کے اس مقام و مرتبے کی معرفت میں کوتاہی انسان کو اعتقاد اور عمل، دونوں اعتبار سے، بندگیِ خدا کے اس راستے سے باہر لے جاتی ہے جس کی سلامتی کی ضمانت دی گئی ہے۔

ان تمام معانی کو سب سے جامع انداز میں زیارتِ جامعہ کبیرہ کا یہی فقرہ بیان کرتا ہے:

وَ الحَقُّ مَعَکُم وَ فیکُم وَ مِنکُم وَ اِلَیکُم وَ اَنتُم اَھلُہُ وَ مَعدِنُہُ.

"حق آپ کے ساتھ ہے، آپ کے اندر ہے، آپ ہی سے صادر ہوتا ہے اور آپ ہی کی طرف لوٹتا ہے؛ اور آپ ہی اہلِ حق اور اس کا سرچشمہ ہیں۔"

حق ہمیشہ اہلِ بیتؑ کے ساتھ ہے اور کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔ بلکہ حق انہی سے جاری ہوتا ہے اور بالآخر انہی کی طرف لوٹتا ہے۔ ایسا کوئی حق نہیں جو ان کے سرچشمے سے جاری نہ ہوا ہو۔

لہٰذا اہلِ حق وہی شخص ہے جو امامؑ کی معرفت رکھتا ہو، ان سے جدا نہ ہو اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے منہ نہ موڑے۔

اور چونکہ حق ان مقدس ہستیوں میں مجسم ہے، اس لیے قیامت کے دن مخلوق کا حساب بھی ان سے وابستہ ہے۔ آخرت میں انسانوں کے اعمال **حق کے معیار** پر پرکھے جائیں گے؛ اور جب کچھ ہستیاں اپنے تمام اعمال و کردار میں خود معیارِ حق ہوں تو لازماً وہ مخلوق کے اعمال کے حساب و میزان کا مرجع اور معیار بھی قرار پاتی ہیں۔

اَمرُہُ اِلَیکُم. مَن والاکُم فَقَد والَی اللہَ. وَ مَن عاداکُم فَقَد عادَی اللہَ. وَ مَن اَحَبَّکُم فَقَد اَحَبَّ اللہَ. وَ مَن اَبغَضَکُم فَقَد اَبغَضَ اللہَ. وَ مَنِ اعتَصَمَ بِکُم فَقَدِ اعتَصَمَ بِاللہِ. اَنتُمُ السَّبیلُ الاَعظَمُ وَ الصِّراطُ الاَقوَمُ وَ شُھَداءُ دارِ الفَناءِ وَ شُفَعاءُ دارِ البَقاءِ ... وَ البابُ المُبتَلی بِہِ النّاسُ. مَن اَتاکُم نَجی. وَ مَن لَم یَأتِکُم ھَلَکَ.

"اس کا امر آپ کے سپرد ہے۔ جس نے آپ سے ولایت و دوستی رکھی، اس نے اللہ سے ولایت و دوستی رکھی؛ جس نے آپ سے دشمنی کی، اس نے اللہ سے دشمنی کی؛ جس نے آپ سے محبت کی، اس نے اللہ سے محبت کی؛ جس نے آپ سے بغض رکھا، اس نے اللہ سے بغض رکھا؛ اور جس نے آپ سے تمسک کیا، اس نے اللہ سے تمسک کیا۔

آپ ہی سب سے عظیم راہ اور سب سے سیدھا راستہ ہیں؛ آپ دارِ فنا کے گواہ اور دارِ بقا کے شفاعت کرنے والے ہیں... اور آپ ہی وہ دروازہ ہیں جس کے ذریعے لوگوں کو آزمایا جاتا ہے۔ جو آپ کے پاس آیا، نجات پا گیا، اور جو آپ کے پاس نہ آیا، ہلاک ہو گیا۔"

گزشتہ فقروں کے معانی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ سے محبت یا دشمنی کی پہچان، اہلِ بیتؑ سے محبت یا دشمنی ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ چنانچہ انسان کی نجات یا ہلاکت کا تعلق اہلِ بیتؑ کی ولایت کو قبول یا رد کرنے سے ہے۔

باطل عقیدۂ تفویض کی نفی

گزشتہ مباحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں اپنے امور کے سلسلے میں ائمہؑ کو نہایت وسیع ذمہ داری اور اختیار عطا فرمایا ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ **تفویض** کے باطل عقیدے کے مطابق انہیں اللہ سے مستقل اختیار دے دیا گیا ہو۔

زیارت کے درج ذیل الفاظ اسی حقیقت پر گواہ ہیں:

اِلَی اللهِ تَدعُونَ. وَ عَلَیهِ تَدُلُّونَ. وَ بِهِ تُؤمِنُونَ. وَ لَهُ تُسَلِّمُونَ. وَ بِاَمرِهِ تَعمَلُونَ. وَ اِلی سَبیلِهِ تُرشِدُونَ. وَ بِقَولِهِ تَحکُمُونَ.

"آپ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اسی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اسی پر ایمان رکھتے ہیں، اسی کے سامنے تسلیم ہیں، اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں، اسی کی راہ کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں اور اسی کے فرمان کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔"

یہ الفاظ باطل عقیدۂ تفویض کے ہر احتمال کو ختم کر دیتے ہیں، تاکہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ اگر انسان کی سعادت و شقاوت اہلِ بیتؑ سے وابستگی یا ان سے جدائی پر منحصر ہے تو گویا اختیار اللہ کے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔

ایسا ہرگز نہیں۔

بلکہ اہلِ بیتؑ لوگوں کی سعادت و شقاوت کا معیار اسی لیے ہیں کہ وہ صرف اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اسی کا راستہ دکھاتے ہیں، اسی کے سامنے تسلیم ہیں، اسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں اور اسی کی مشیت کے مطابق فیصلہ فرماتے ہیں۔

اہلِ بیتؑ کے پاس جو کچھ ہے اور وہ جو کچھ انجام دیتے ہیں، وہ **بندگی و عبودیت کی بلند ترین تجلی** ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انہی کامل بندوں کو عالمِ عبودیت میں حق و حقیقت کا معیار قرار دیا ہے۔

اسی سابقہ مضمون کے ایک اور نتیجے کے طور پر زیارت میں فرمایا گیا ہے:

سَعِدَ مَن والاکُم. وَ هَلَکَ مَن عاداکُم. وَ خابَ مَن جَحَدَکُم. وَ ضَلَّ مَن فارَقَکُم. وَ فازَ مَن تَمَسَّکَ بِکُم. وَ اَمِنَ مَن لَجَاَ اِلَیکُم. وَ مَن سَلِمَ مَن صَدَّقَکُم. وَ هُدِیَ مَنِ اعتَصَمَ بِکُم. مَنِ اتَّبَعَکُم فَالجَنَّةُ مَأواهُ. وَ مَن خالَفَکُم فَالنّارُ مَثواهُ. وَ مَن جَحَدَکُم کافِرٌ. وَ مَن حارَبَکُم مُشرِکٌ. وَ مَن رَدَّ عَلَیکُم فی اَسفَلِ دَرَکٍ مِنَ الجَحیمِ.

"سعادت مند ہوا وہ جس نے آپ کی ولایت قبول کی، اور ہلاک ہوا وہ جس نے آپ سے دشمنی کی۔ محروم و نامراد ہوا وہ جس نے آپ کا انکار کیا، اور گمراہ ہوا وہ جو آپ سے جدا ہو گیا۔

کامیاب ہوا وہ جس نے آپ سے تمسک کیا، امن میں آگیا وہ جس نے آپ کی پناہ لی، سلامت رہا وہ جس نے آپ کی تصدیق کی، اور ہدایت یافتہ ہوا وہ جس نے آپ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

جو آپ کی پیروی کرے، جنت اس کا ٹھکانا ہے؛ اور جو آپ کی مخالفت کرے، آگ اس کا مقام ہے۔ جو آپ کا انکار کرے وہ کافر ہے، جو آپ سے جنگ کرے وہ مشرک ہے، اور جو آپ کے فرمان کو رد کرے وہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہو گا۔"

یہ تمام نتائج اسی حقیقت کے آثار ہیں کہ ائمہؑ **معیارِ حق** ہیں، جیسا کہ گزشتہ بحث میں واضح ہوا۔

تمام عوالمِ وجود میں اہلِ بیتؑ کا مقام

حق کا یہ معیار کسی ایک عالم یا کسی مخصوص دور تک محدود نہیں، بلکہ تمام عوالمِ وجود میں جاری و ساری ہے۔

اسی لیے زیارت آگے بڑھتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اہلِ بیتؑ کی رضا و ناراضی حق و باطل، بلکہ جنت و جہنم کے امتیاز کا معیار ہے۔

لہٰذا ان کے مقامات صرف ان کی ظاہری دنیوی زندگی کے زمانے تک محدود نہیں، بلکہ آغازِ خلقت سے لے کر عالمِ دنیا، اور دنیا کے اختتام کے بعد قیامت کے قیام تک، یہ فضائل و مقامات ان کے لیے ثابت رہے ہیں اور رہیں گے:

اَشهَدُ اَنَّ هذا سابِقٌ لَکُم فیما مَضی وَ جارٍ لَکُم فیما بَقِیَ.

"میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ مقام گزشتہ زمانوں میں بھی آپ کے لیے ثابت تھا اور آئندہ بھی آپ کے لیے جاری و برقرار رہے گا۔"

ہمارے لیے اہلِ بیتؑ کی وجودی برکات کی ایک جھلک

اس کے بعد زیارت اہلِ بیتؑ کی نورانی خلقت اور اس کے بعد کے ان مراحل کا ذکر کرتی ہے جو تمام مخلوقات کے لیے بے شمار خیرات و برکات کا سرچشمہ بنے:

خَلَقَکُمُ اللهُ اَنواراً فَجَعَلَکُم بِعَرشِهِ مُحدِقینَ؛ حَتّی مَنَّ عَلَینا بِکُم فَجَعَلَکُم فی بُیُوتٍ اَذِنَ اللهُ اَن تُرفَعَ وَ یُذکَرَ فیهَا اسمُهُ. وَ جَعَلَ صَلَواتَنا عَلَیکُم وَ ما خَصَّنا بِهِ مِن وِلایَتِکُم طیباً لِخَلقِنا وَ طَهارَةً لِاَنفُسِنا وَ تَزکِیَةً لَنا وَ کَفّارَةً لِذُنُوبِنا.

"اللہ نے آپ کو انوار کی صورت میں خلق فرمایا اور اپنے عرش کے گرد قرار دیا؛ یہاں تک کہ آپ کے ذریعے ہم پر احسان فرمایا اور آپ کو ان گھروں میں قرار دیا جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند رکھا جائے اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے۔ اور اس نے آپ پر ہماری صلوات اور آپ کی اس ولایت کو، جس سے اس نے ہمیں مخصوص فرمایا، ہماری خلقت کی پاکیزگی، ہمارے نفوس کی طہارت، ہماری تزکیہ اور ہمارے گناہوں کے کفارے کا ذریعہ قرار دیا۔"

پس اہلِ بیتؑ کی نورانی خلقت کے بعد کے مراحل اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمیں ان کی معرفت عطا کیا جانا، دراصل وہ عظیم احسان ہے جو اللہ نے ہم پر فرمایا ہے۔

انہیں اپنی بندگی کے لیے کبھی ہماری ضرورت نہ تھی اور نہ آج انہیں ہماری کوئی حاجت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ **ہمیں اپنی پاکیزگی اور بندگیِ خدا کے صحیح راستے پر قائم رہنے کے لیے اہلِ بیتؑ کی ضرورت ہے۔**

اللہ نے ان کے ذریعے ہم پر احسان فرمایا تاکہ ہم راہِ ہدایت پر چل سکیں۔

لیکن افسوس کہ تاریخ نے دیکھا کہ ہدایتِ الٰہی کے انہی پیشواؤں اور انسانیت کے سب سے بڑے خیر خواہوں کے ساتھ—— جنہوں نے اپنی رسالت کی ادائیگی کے بدلے لوگوں سے کبھی کوئی اجر یا معاوضہ طلب نہیں کیا—— اسی جاہل اور ظالم انسانیت نے کس قدر ظلم روا رکھا۔

ان کے تمام پیش رو ائمہؑ ان لوگوں کے ہاتھوں شہید ہوئے جو بظاہر خود کو رسولِ خداؐ کا پیروکار کہتے تھے۔

ائمہؑ کی زیارت کرنے والا جب ان کے مقامات پر گہرا یقین پیدا کرتا ہے تو اس مقام تک پہنچتا ہے کہ اپنی جان، اپنے والدین، اہل و عیال اور تمام مال کو ان پر قربان کر دینے کی تمنا کرتا ہے اور عرض کرتا ہے:

بِاَبی اَنتُم وَ اُمّی وَ نَفسی وَ اَهلی وَ مالی! مَن اَرادَ اللهَ بَدَاَ بِکُم. وَ مَن وَحَّدَهُ قَبِلَ عَنکُم. وَ مَن قَصَدَهُ تَوَجَّهَ بِکُم.

"میرے ماں باپ، میری جان، میرے اہل و عیال اور میرا مال آپ پر قربان! جس نے اللہ کو چاہا، اس نے آپ ہی سے آغاز کیا؛ جس نے اللہ کو یکتا مانا، اس نے توحید آپ ہی سے قبول کی؛ اور جس نے اللہ کو اپنا مقصود بنایا، وہ آپ ہی کے وسیلے سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔"

ان فقروں میں اہلِ بیتؑ کو اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا واحد راستہ اور تمام معارف، خصوصاً **توحید** کی معرفت میں بنیادی و مقدم مقام رکھنے والی ہستیاں قرار دیا گیا ہے۔

اس فقرے پر خصوصی توجہ:

مَن وَحَّدَهُ قَبِلَ عَنکُم

"جس نے اللہ کو یکتا مانا، اس نے توحید آپ ہی سے قبول کی۔"

ہم پر یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ تمام دینی معارف، بالخصوص **توحیدِ حقیقی**، اہلِ بیتؑ ہی کے ذریعے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ جو شخص معرفتِ خدا ان سے حاصل نہ کرے اور ان کی دیگر تعلیمات کے سامنے تسلیم نہ ہو، وہ بالآخر **تشبیہ** میں گرفتار ہو جائے گا اور حقیقی موحّد باقی نہیں رہ سکے گا۔

تاریخ کی حقیقت بھی اسی امر کی گواہ ہے کہ انسانوں کے بڑے بڑے مفکرین میں سے جس نے توحیدِ الٰہی کے باب میں مکتبِ اہلِ بیتؑ کے سامنے تسلیم اختیار نہیں کیا، وہ بالآخر کسی نہ کسی صورت میں تشبیہ کے دام میں گرفتار ہوا اور شرک و الحاد کے خطرات سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا۔

بِاَبی اَنتُم وَ اُمّی وَ نَفسی! بِمُوالاتِکُم عَلَّمَنَا اللهُ مَعالِمَ دینِنا.

"میرے ماں باپ اور میری جان آپ پر قربان! آپ کی ولایت و دوستی کے ذریعے اللہ نے ہمیں ہمارے دین کی نشانیاں اور بنیادی معارف سکھائے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس اہلِ بیتؑ نہ ہوتے اور ہمیں ان کی معرفت حاصل نہ ہوتی تو ہم اسلام کے بارے میں کچھ نہ جانتے اور جہالت و گمراہی کی تاریکیوں میں باقی رہتے۔

گناہوں کی بخشش کے لیے رضائے امامؑ کی ضرورت

زیارت کے آخری حصوں میں زائر، ولی و حجتِ خدا کو مخاطب کر کے عرض کرتا ہے:

یا وَلِیَّ اللهِ، اِنَّ بَینی وَ بَینَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ ذُنُوباً لا یَأتی عَلَیها اِلّا رِضاکُم. فَبِحَقِّ مَنِ ائتَمَنَکُم عَلی سِرِّهِ وَ استَرعاکُم اَمرَ خَلقِهِ وَ قَرَنَ طاعَتَکُم بِطاعَتِهِ، لَمّا استَوهَبتُم ذُنُوبی وَ کُنتُم شُفَعائی؛ فَاِنّی لَکُم مُطیعٌ. مَن اَطاعَکُم فَقَد اَطاعَ اللهَ. وَ مَن عَصاکُم فَقَد عَصَی اللهَ. وَ مَن اَحَبَّکُم فَقَد اَحَبَّ اللهَ. وَ مَن اَبغَضَکُم فَقَد اَبغَضَ اللهَ.

"اے ولیِ خدا! میرے اور اللہ عزوجل کے درمیان ایسے گناہ ہیں جنہیں آپ کی رضا کے سوا کوئی چیز مٹا نہیں سکتی۔ پس اس ذات کے حق کا واسطہ جس نے آپ کو اپنے راز کا امین بنایا، اپنی مخلوق کے امور کی نگہبانی آپ کے سپرد کی اور آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ قرار دیا؛ میرے گناہوں کی بخشش طلب فرمایئے اور میرے شفیع بنیے، کیونکہ میں آپ کا مطیع ہوں۔

جس نے آپ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی؛ جس نے آپ کی نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی؛ جس نے آپ سے محبت کی، اس نے اللہ سے محبت کی؛ اور جس نے آپ سے بغض رکھا، اس نے اللہ سے بغض رکھا۔"

گزشتہ مباحث کی تاکید کے علاوہ، یہاں دو اہم نکات قابلِ توجہ ہیں۔

پہلا یہ کہ انسان کے گناہوں کی بخشش کے لیے ضروری شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ **ولیِ خدا اس سے راضی ہو۔**

اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیتؑ کی رضا کو اپنی رضا کے ساتھ اس طرح وابستہ فرمایا ہے کہ جب تک ان کی رضا حاصل نہ ہو، بندہ رضائے الٰہی کا مستحق بھی نہیں بنتا۔

دوسرا اہم نکتہ اس تعبیر میں ہے:

اِستَرعاکُم اَمرَ خَلقِهِ

"اس نے اپنی مخلوق کے امور کی نگہبانی آپ کے سپرد کی۔"

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کا معاملہ ائمہؑ کے سپرد فرمایا اور انہیں اس کی نگہبانی اور سرپرستی کی ذمہ داری عطا کی۔

لفظ **راعی** اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے کسی چیز یا چند افراد کی حفاظت، دیکھ بھال اور پرورش کی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔ بھیڑوں کے گلے کے نگہبان کو بھی **راعی** کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ ان کی حفاظت، دیکھ بھال اور پرورش کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیتؑ کو امتِ اسلامیہ کا **راعی** قرار دیا ہے اور امت کی حفاظت، نگہبانی اور اللہ و دینِ الٰہی کی طرف ہدایت کی ذمہ داری ان کے سپرد فرمائی ہے۔

اس کے مقابلے میں اللہ نے لوگوں سے یہ چاہا ہے کہ وہ اس کی جانب سے مقرر کردہ سرپرستوں اور معلموں کی طرف رجوع کریں، ان کے سامنے تسلیم ہوں اور ان کے امر کو امرِ خدا اور ان کی نہی کو نہیِ خدا سمجھیں۔

اگر انسان اپنے آپ کو اس طرح اولیائے الٰہی کے سپرد کر دے تو پھر اسے گمراہی کا خوف نہیں رہتا، کیونکہ وہ خود اس کی ضروری مدد کرتے اور خطرات سے اس کی حفاظت فرماتے ہیں؛ بالکل اسی طرح جیسے چرواہا اپنے گلے کو خطرات سے بچاتا ہے اور کسی بھی بھیڑ کو بھیڑیے یا کسی اور درندے کا شکار نہیں ہونے دیتا۔

یہ بھی **ولایتِ ائمہؑ** کا ایک مفہوم ہے؛ یعنی مخلوق پر ان کی خداداد سرپرستی اور اختیار۔

امام باقرؑ نے محمد بن مسلم سے فرمایا:

كُلُّ مَن دانَ اللهَ عَزَّوَجَلَّ بِعِبادَةٍ يَجهَدُ فيها نَفسَهُ وَ لا اِمامَ لَهُ مِنَ اللهِ، فَسَعيُهُ غَيرُ مَقبُولٍ وَ هُوَ ضالٌّ مُتَحَيِّرٌ وَ اللهُ شانِئٌ لِاَعمالِهِ. وَ مَثَلُهُ كَمَثَلِ شاةٍ ضَلَّت عَن راعيها وَ قَطيعِها فَهَجَمَت ذاهِبَةً وَ جائِيَةً يَومَها. فَلَمّا جَنَّها اللَّيلُ بَصُرَت بِقَطيعِ غَنَمٍ مَعَ راعيها فَحَنَّت اِلَيها وَ اغتَرَّت بِها فَباتَت مَعَها فى

مَربَضِها. فَلَمّا اَن ساقَ الرّاعی قَطیعَهُ اَنکَرَت راعِیَها وَ قَطیعَها، فَهَجَمَت مُتَحَیِّرَةً تَطلُبُ راعِیَها وَ قَطیعَها، فَبَصُرَت بِغَنَمٍ مَعَ راعیها فَحَنَّت اِلَیها وَ اغتَرَّت بِها، فَصاحَ بِهَا الرّاعی: اِلحَقی بِراعیکِ وَ قَطیعِکِ فَاَنتِ تائِهَةٌ مُتَحَیِّرَةٌ عَن راعیکِ وَ قَطیعِکِ. فَهَجَمَت ذَعِرَةً مُتَحَیِّرَةً تائِهَةً، لا راعِیَ لَها یُرشِدُها اِلی مَرعاها اَو یَرُدُّها. فَبَینا هِیَ کَذلِکَ اِذا اغتَنَمَ الذِّئبُ ضَیعَتَها فَاَکَلَها.

''جو شخص اللہ عزوجل کی ایسی عبادت کرے جس میں اپنے آپ کو سخت مشقت میں ڈال دے، لیکن اس کے لیے اللہ کی جانب سے مقرر کردہ کوئی امام نہ ہو، تو اس کی کوشش قبول نہیں ہوتی۔ وہ گمراہ اور سرگرداں ہے اور اللہ اس کے اعمال کو ناپسند فرماتا ہے۔

اس کی مثال اس بھیڑ کی سی ہے جو اپنے چرواہے اور اپنے گلے سے بچھڑ گئی ہو۔ وہ سارا دن ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ جب رات چھا جاتی ہے تو اسے ایک گلہ اپنے چرواہے کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ اس کی طرف مائل ہوتی ہے اور اسے اپنا گلہ سمجھ کر دھوکا کھا جاتی ہے، چنانچہ رات ان کے باڑے میں گزار دیتی ہے۔

جب صبح چرواہا اپنے گلے کو لے کر چلتا ہے تو وہ اس چرواہے اور گلے کو اجنبی پاتی ہے۔ پھر حیران و سرگرداں ہو کر اپنے چرواہے اور گلے کی تلاش میں بھٹکنے لگتی ہے۔

پھر اسے ایک اور گلہ اپنے چرواہے کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس کی طرف مائل ہوتی اور اس سے دھوکا کھا جاتی ہے۔ وہ چرواہا اسے آواز دیتا ہے: اپنے چرواہے اور اپنے گلے کے پاس جاؤ! تم اپنے چرواہے اور گلے سے جدا ہو کر بھٹکی ہوئی اور سرگرداں ہو۔

چنانچہ وہ خوف زدہ، حیران اور سرگرداں ہو کر پھر بھاگنے لگتی ہے۔ اس کا کوئی چرواہا نہیں جو اسے اس کی چراگاہ کی طرف رہنمائی کرے یا اسے واپس لوٹائے۔ وہ اسی حالت میں ہوتی ہے کہ بھیڑیا اس کی بے سرپرستی کو غنیمت جانتا ہے اور اسے کھا جاتا ہے۔''

اور روایت کے تسلسل میں امامؑ فرماتے ہیں:

"اسی طرح، اللہ کی قسم اے محمد! اس امت میں جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اس کے لیے اللہ عزوجل کی جانب سے مقرر کردہ کوئی ظاہر اور عادل امام نہ ہو، وہ گمراہی اور سرگردانی کی حالت میں صبح کرتا ہے؛ اور اگر اسی حالت میں مر جائے تو کفر و نفاق کی موت مرتا ہے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۳، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۸۔

اس نورانی روایت میں امامؑ کو **چرواہے** اور امت کو **گلے** سے تشبیہ دی گئی ہے۔

وہ مسلمان جس نے اسلام کو تو قبول کیا ہے لیکن اللہ کی جانب سے مقرر کردہ امامؑ کو قبول نہیں کیا، اس بھیڑ کی مانند ہے جو اپنے چرواہے اور گلے سے بچھڑ گئی ہو۔ وہ کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر پناہ تلاش کرتی ہے، مختلف گروہوں سے واسطہ پڑتا ہے اور ہر گروہ اس کے ساتھ اپنے طریقے سے پیش آتا ہے۔ یا تو وہ اسے اپنے اندر جگہ نہیں دیتا، یا وہاں اسے وہ امن و پناہ نہیں ملتی جس کی اسے تلاش ہوتی ہے۔

چنانچہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتی رہتی ہے، یہاں تک کہ اسی حیرانی اور سرگردانی کے عالم میں بیابان کے بھیڑیے کا شکار ہو کر ہلاک ہو جاتی ہے۔

جس مسلمان کا کوئی امام نہ ہو، اس کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔

مسلمان ہونے کے ناتے وہ اللہ کی عبادت کرنا چاہتا ہے۔ عبادت میں کوشش اور محنت بھی کرتا ہے، لیکن دین حاصل کرنے کے لیے اس راستے کی پیروی نہیں کرتا جسے اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔

کبھی وہ کسی خاص گروہ یا مکتب کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں اسے وہ گروہ دیندار اور معرفتِ خدا رکھنے والا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی ظاہری اسلامی صورت اسے دھوکا دیتی ہے، یا ان کی بظاہر خوب صورت عبادات اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور وہ ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔

لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ جس حقیقت کی وہ تلاش کر رہا تھا وہ وہاں موجود نہیں۔ معرفت اور عبادتِ خدا سے قریب ہونے کے بجائے وہ ان سے مزید دور ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ اس گروہ کو چھوڑ دیتا ہے۔

روایت میں **تاریک رات** جہالت اور گمراہی کی طرف اشارہ ہے۔

اس کا ان لوگوں کے درمیان رات گزارنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ ان کی حقیقت سے واقف نہیں؛ ان کے ظاہر سے دھوکا کھا کر ان کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔

لیکن **صبح** اس لمحے کی علامت ہے جب اس کے دل میں علم و آگہی کی روشنی طلوع ہوتی ہے اور وہ اس گروہ کی گمراہ اور بے ایمان حقیقت کو پہچان لیتا ہے۔ اب وہ ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، کیونکہ ان کے پیشوا اور رہنما کو اللہ کی طرف رہنمائی کرنے کے قابل نہیں پاتا۔

یہ اس کی حالت بعض فکری و اعتقادی گروہوں کے سلسلے میں ہے۔

بعض دوسرے مکاتب اور ان کے پیروکاروں کو وہ دور سے بظاہر نیک سمجھتا ہے اور ان کی اسلامی ظاہری صورت سے دھوکا کھا جاتا ہے۔ لیکن جب قریب پہنچتا ہے تو وہ ابتدا ہی میں اسے قبول نہیں کرتے، کیونکہ وہ بعض ایسے عقائد و امور کا پابند ہوتا ہے جنہیں وہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے وہ اسے اپنا ساتھی یا ہم مذہب نہیں سمجھتے۔

یوں وہ وہاں سے بھی رد کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح اسے کہیں امن اور پناہ نہیں ملتی۔ اسے کوئی ایسا مکتب یا دینی راستہ نہیں ملتا جو اسے اس حقیقت تک پہنچا سکے جس کی اسے تلاش ہے۔ جن راستوں کو اس نے آزمایا، بالآخر وہ سب اسے اپنے سے دور اور بے تعلق محسوس ہونے لگتے ہیں۔

یوں وہ حیرت و سرگردانی میں مبتلا رہتا ہے۔

ایک طرف وہ اللہ اور قیامت کے عقیدے کو چھوڑ نہیں سکتا اور نہ رسولِ اسلامؐ کی رسالت کا انکار کر سکتا ہے؛ دوسری طرف مختلف مکاتب سے جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا ہے وہ اس کے سوالات، اعتراضات اور اعتقادی شبہات کا اطمینان بخش جواب نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ حیران و سرگرداں رہتا ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پاس رجوع کرنے کے لیے کوئی محفوظ مرکز نہیں۔ یہ کیفیت جاری رہتی ہے، یہاں تک کہ بالآخر شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کوئی باطل فکری جریان، یا ایسا شخص جو دین کو سمجھنے کی کوئی اہلیت نہیں رکھتا، اسے گمراہ کر دیتا ہے اور رفتہ رفتہ دین کے بنیادی اصولوں —— **خدا، معاد اور نبوت** —— کے بارے میں اس کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔

ضروری نہیں کہ ایمان کا یہ زوال ظاہری اور علانیہ صورت اختیار کرے۔ ممکن ہے انسان دین، خدا اور قیامت کے نام تو باقی رکھے، لیکن باطن میں ان کی حقیقت سے خالی ہو چکا ہو۔

ایسا شخص ممکن ہے نماز بھی پڑھتا رہے، لیکن اندر سے اللہ کے وجود اور رسولِ خداؐ کی صداقت کے بارے میں شک میں مبتلا ہو اور قیامت پر اس کا حقیقی ایمان نہایت کمزور ہو چکا ہو۔

جو شخص ایسی حالت میں دنیا سے جائے، وہ اسلام، اللہ اور رسولِ خداؐ پر حقیقی ایمان کے ساتھ نہیں مرا، بلکہ اس کی موت کفر و نفاق کی حالت میں واقع ہوئی ہے۔

موجودہ دور کے بعض فکری رجحانات، جو خود کو روشن فکری اور فکری تجدد کا نمائندہ بھی قرار دیتے ہیں، ان مطالب کی صداقت کی ایک نمایاں مثال ہیں۔

ایسے افراد موجود ہیں جو نہ دین میں بصیرت رکھتے ہیں اور نہ اس میدان میں کوئی تخصصی اہلیت، لیکن اس کے باوجود دین شناسی کے مدعی بن جاتے ہیں۔ دوسرے لوگ ان کے ظاہر سے دھوکا کھاتے ہیں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ رفتہ رفتہ ان کے دینی عقائد اپنی بنیادوں سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

اس خرابی کی جڑ یہ ہے کہ نہ ان افراد کو اہلِ بیتؑ کی صحیح معرفت حاصل ہے اور نہ ان کے پیروکار اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ دینی امور میں **رجوع اہلِ بیتؑ ہی کی طرف ہونا چاہیے۔** نتیجتاً وہ بتدریج کفر اور گمراہی کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

ہاں، **امامؑ کی معرفت نہ رکھنے اور ان کے واجب حقوق کو نہ پہچاننے کا یہی انجام ہے۔**

پس اسلام کی حفاظت ـــــ یعنی توحید، نبوت اور معاد کی حفاظت ـــــ صرف اسی شخص کے لیے ممکن ہے جو اہلِ بیتؑ کی ولایت اور دینی امور میں ان کی رہنمائی کو قبول کرے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح عقائد اور درست بندگیِ خدا تک رسائی، وحی کے سوا کسی اور راستے سے ممکن نہیں؛ اور وحیِ الٰہی کے حقیقی ترجمان صرف **اہلِ بیتِ عصمت و طہارتؑ** ہیں۔

لہٰذا دین میں جس کسی کے پاس بھی کوئی صحیح تعلیم پہنچی ہے ـــــ خواہ عقائد سے متعلق ہو، اخلاق سے یا احکام سے ـــــ اس نے اسے بالواسطہ یا بلاواسطہ انہی سے حاصل کیا ہے، چاہے خود اسے اس حقیقت کا شعور نہ ہو۔

اس دعوے کی بہترین دلیل وہ روایات ہیں جو رسولِ خداؐ، ائمۂ طاہرینؑ اور حضرت فاطمہ زہراؑ سے **توحیدِ الٰہی** کے بارے میں ہم تک پہنچی ہیں۔

چونکہ توحید اسلام اور تمام ادیانِ الٰہی کی بنیادی اور مرکزی اساس ہے، اس لیے اسی موضوع کے ذریعے اہلِ بیتؑ کی حقانیت اور دوسروں کے راستوں کی کمزوری کو پہچانا جاسکتا ہے۔

اس سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ توحید کے نہایت دقیق اور لطیف معارف ـــــ جو عقل مند انسان کی فطرت اور وجدان کے ساتھ کامل ہم آہنگی رکھتے ہیں ـــــ صرف اہلِ بیتؑ کے ذریعے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرے لوگوں نے ـــــ خواہ امامت کے باطل مدعی ہوں یا کوئی اور ـــــ ایسی تعلیمات کے ہم پایہ کوئی کلام پیش نہیں کیا۔

ادیان اور فلسفے کی تاریخ میں بڑے سے بڑے انسانی مفکرین نے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ اہلِ بیتؑ کے ایک کلام کے ساتھ بھی قابلِ قیاس نہیں۔

جو شخص ائمہؑ کی توحیدی تعلیمات سے آشنا ہو اور انہیں انسانی فکری مکاتب کے ساتھ، خواہ کسی حد تک ہی، موازنہ کرے تو یہ حقیقت اس پر واضح ہو جاتی ہے۔

انسانی مفکرین میں سے کوئی بھی انسان کو توحید کی اس دقیق حد پر متوازن رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جہاں **تعطیل** اور **تشبیہ** دونوں کی نفی ہوتی ہے۔ بالآخر وہ ان دو میں سے کسی ایک وادی میں جا گرا۔

لیکن مکتبِ اہلِ بیتؑ میں انسان جتنا ان کی تعلیمات سے آشنا ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی **حقیقتِ توحید** کے شعور سے قریب ہوتا جاتا ہے اور نہ تعطیل میں گرفتار ہوتا ہے، نہ تشبیہ میں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تصدیق ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو قرآنِ کریم اور روایات کی توحیدی تعلیمات سے گہری آشنائی پیدا کرے۔

ان توضیحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ توحید کے بارے میں اہلِ بیتؑ کی تعلیمات، امتِ اسلامیہ کی **راعیانہ سرپرستی اور نگہبانی** کا ایک نمایاں مظہر ہیں۔

جو شخص انہیں اپنا مرجع اور قابلِ اعتماد سرچشمہ قرار دیتا ہے، وہ اس باب میں انحراف اور گمراہی سے محفوظ رہتا ہے۔

امامؑ کو راعی سے تشبیہ دینے کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ وضاحت ضروری ہے کہ امامؑ کو **راعی** اور امت کو بھیڑوں کے گلے سے تشبیہ دینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان، امامؑ کی رہنمائی کے بغیر، خیر و شر میں کسی قسم کی تمیز ہی نہیں کر سکتا اور اس کی حیثیت ایسی بھیڑ کی مانند ہے جو آنکھیں بند کر کے اپنے چرواہے کے پیچھے چلتی ہے۔ اس تشبیہ سے ایسا مفہوم اخذ کرنا بالکل غلط اور حقیقت کے خلاف ہے۔

ہر تشبیہ میں **مشبّہ** اور **مشبّہ بہ** کے درمیان ایک خاص **وجہِ شبہ** ہوتی ہے، اور یہی مشترک پہلو تشبیہ کی بنیاد بنتا ہے۔ اس مخصوص پہلو کے علاوہ مشبّہ بہ کی دوسری خصوصیات کو مشبّہ کی طرف منتقل نہیں کیا جا سکتا، جب تک کوئی ایسی دلیل یا قرینہ موجود نہ ہو جو یہ ظاہر کرے کہ متکلم کی مراد بھی یہی تھی۔

زیرِ بحث تشبیہ میں انسانوں کو بھیڑوں کے گلے سے صرف اس اعتبار سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ اپنی **ابدی سعادت کے راستے کو مکمل طور پر خود دریافت کرنے کے لیے کافی علم نہیں رکھتے**۔ جس طرح بھیڑوں کا گلہ چرواہے کی رہنمائی کے بغیر صحیح راستے اور خطرات کے درمیان مکمل تمیز نہیں کر سکتا، اسی طرح انسان بھی راہِ سعادت طے کرنے کے لیے رہنمائی کا محتاج ہے۔

اس کے باوجود خود بھیڑ بھی ایک محدود درجے کی فہم و آگہی رکھتی ہے۔ مثلاً وہ بھیڑیے جیسے خطرے کو پہچانتی اور اس سے فرار کرتی ہے۔ لیکن یہ محدود آگہی ان تمام غلطیوں اور خطرات سے اسے محفوظ رکھنے کے لیے کافی نہیں جو اسے درپیش ہو سکتے ہیں۔ پس ایک بھیڑ بھی، اپنی حد تک، اپنے نفع اور نقصان کی کچھ پہچان رکھتی ہے۔

انسان یقیناً بھیڑ سے کہیں زیادہ بلند درجے کی فہم و شعور رکھتا ہے، اور اسی کو **عقل** کہا جاتا ہے۔ عقل انسان کو حیوانات سے ممتاز کرنے والے عظیم ترین امتیازات میں سے ایک ہے۔ لیکن تنہا عقل انسان کو کمالِ انسانی کے تمام درجات تک — یعنی **کاملِ بندگیِ خدا** تک — پہنچانے کے لیے کافی نہیں۔

یہی وہ پہلو ہے جس میں انسان اور بھیڑ کے درمیان تشبیہ قائم ہوتی ہے: **دونوں ایک راعی اور رہنما کے محتاج ہیں۔**

اہم بات یہ ہے کہ خود یہی عقل، انسان کو اللہ کی جانب سے مقرر کردہ معصوم رہنماؤں کی ضرورت کا ادراک کراتی ہے۔ عقل انسان پر اس کی اپنی ناتوانی واضح کرتی ہے کہ وہ ان کی مدد و رہنمائی کے بغیر بندگیِ خدا کے راستے کو صحیح اور کامل طور پر طے نہیں کر سکتا۔

لہٰذا عقل مند انسان کا ائمہؑ کی پیروی کرنا کسی طرح بھی اندھی یا بے دلیل پیروی نہیں ہے۔ بلکہ خود عقل اس اتباع کی ضرورت کی تصدیق کرتی ہے۔

پس ہادیانِ الٰہی کی پیروی کو جہالت سے پیدا ہونے والی پیروی، یا تعبیر کے طور پر **"بھیڑ چال"** قرار دینا درست نہیں۔ امت کو بھیڑوں کے گلے سے تشبیہ دینے کو اس قسم کی جانب دارانہ اور غلط تعبیر کا سبب نہیں بننا چاہیے۔

معرفتِ امامؑ — تمام خیر کا سرچشمہ

تمہید

گزشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ان کی پیروی محض **تعبّد** کا مسئلہ نہیں، بلکہ عقلِ انسانی بھی اس کا تقاضا کرتی ہے۔

جو شخص اللہ کو پہچانتا ہے، اس کے پاس اللہ تک پہنچنے کے لیے اس راستے کے سوا کوئی راستہ نہیں جسے خود اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔ کسی دوسرے راستے سے وہ یہ نہیں جان سکتا کہ رضائے الٰہی کس چیز میں ہے اور ناراضیِ خدا کس چیز میں۔

ایک عقل مند انسان، جسے عالمِ غیب تک رسائی حاصل نہیں، کسی ایسے شخص کی پیروی نہیں کرتا جو خود اسی کی طرح حقیقت سے بے خبر اور ناآشنا ہو۔ بلکہ وہ ایسے شخص کی تلاش کرتا ہے جو ان امور کا کامل علم رکھتا ہو جن سے وہ خود ناواقف ہے۔

جب وہ ایسے شخص کو پہچان لیتا ہے تو پھر اس کی پیروی کی ضرورت کے بارے میں کسی مزید تردّد اور تامل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اتباعِ امامؑ کی ضرورت کی عقلی بنیاد

پس انسانوں کا ائمۂ طاہرینؑ کی طرف رجوع کرنا **جاہل کا عالم کی طرف رجوع** ہے، اور یہ ایک عقلی حکم ہے؛ محض کوئی بے دلیل یا صرف تعبّدی حکم نہیں۔

جس طرح ایک عقل مند انسان اپنے مادی اور دنیوی معاملات میں، کسی چیز سے ناواقف ہونے کی صورت میں، صاحبِ علم اور ماہر شخص سے رجوع کرتا ہے اور ہر کام کو اس کے صحیح ذریعے سے انجام دیتا ہے، اسی طرح عقل روحانی اور ابدی امور میں بھی یہی اصول نافذ کرتی ہے۔

اسی لیے معرفتِ امامؑ کی ضرورت بیان کرتے ہوئے اسی عقلی اصول کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ امام باقرؑ فرماتے ہیں:

يَا أَبَا حَمْزَةَ، يَخْرُجُ أَحَدُكُمْ فَرَاسِخَ فَيَطْلُبُ لِنَفْسِهِ دَلِيلًا، وَ أَنْتَ بِطُرُقِ السَّمَاءِ أَجْهَلُ مِنْكَ بِطُرُقِ الْأَرْضِ، فَاطْلُبْ لِنَفْسِكَ دَلِيلًا.

"اے ابو حمزہ! تم میں سے کوئی شخص جب چند فرسخ کا سفر کرنے کے لیے نکلتا ہے تو اپنے لیے ایک راہنما تلاش کرتا ہے؛ جبکہ تم آسمان کے راستوں سے زمین کے راستوں کی نسبت کہیں زیادہ ناواقف ہو۔ پس اپنے لیے ایک راہنما تلاش کرو۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۴، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۱۰۔

"آسمان کے راستوں" سے مراد ہدایتِ الٰہی کے وہ راستے ہیں جن کا علم وحی کے ذریعے مخصوص ہستیوں کو عطا کیا گیا ہے۔ جس کے پاس یہ علم ہو، عقل کے حکم کے مطابق اسی کی پیروی ہونی چاہیے۔

اگر امتِ مسلمہ میں چودہ معصومینؑ کے علاوہ کسی اور کے پاس بھی ایسا علم ہوتا تو اس کی پیروی بھی ممکن ہوتی۔ لیکن امتِ مسلمہ میں یہ علم چودہ معصومینؑ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، لہٰذا ہماری پیروی بھی انہی تک محدود ہونی چاہیے۔

کسی کو یہ حقیقت پسند آئے یا نہ آئے، حقیقت اپنی جگہ تبدیل نہیں ہوتی۔ بہر حال ہم ان کے علم کے محتاج ہیں۔ لہٰذا خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، ان کی پیروی کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہؑ کو **"بابُ اللہ"** ـــ **اللہ کے دروازے** کہا گیا ہے۔

جو شخص منزل تک پہنچنا چاہتا ہے، اسے اسی راستے سے گزرنا ہوگا؛ کسی دوسرے راستے سے منزل تک رسائی ممکن نہیں۔ اس کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو بیمار ہو جائے۔ عقل حکم کرتی ہے کہ وہ طبیب سے رجوع کرے۔ اگر کوئی مریض کہے: "میں شفا براہِ راست اللہ سے چاہتا ہوں، اس لیے ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤں گا؛ گھر بیٹھ کر دعا کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ اللہ مجھے شفا دے دے"، تو تمام عقلاء اس کے طرزِ عمل کو نادرست قرار دیں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے شفا چاہتا ہے، اسے اس ذریعے سے شفا حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جسے اللہ نے شفا کا وسیلہ قرار دیا ہے؛ اس مثال میں فرض کیا گیا ہے کہ طبیب سے رجوع کرنا وہی وسیلہ ہے۔

البتہ اس مثال میں کوئی ایسا طبیب نہیں جسے اللہ نے نام لے کر مخصوص طور پر مقرر فرمایا ہو۔ لیکن مسئلۂ امامت میں تمام تاکید انہی ہستیوں کی طرف رجوع پر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمایا اور خود انہیں **"ابوابُ اللہ"** قرار دیا ہے۔

لہٰذا جو شخص اہلِ بیتؑ کے فضائل و کمالات کو کسی حد تک بھی پہچان لے، اس کے لیے ان کی پیروی کی ضرورت محض ایک تعبّدی حکم نہیں رہتی بلکہ ایک واضح **عقلی حکم** بن جاتی ہے۔

روایات میں اسلام کے بنیادی فرائض اور ولایت کے درمیان اسی نسبت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال درج ذیل روایت ہے:

عَنْ زُرَارَةَ، عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسَةِ أَشْيَاءَ: عَلَى الصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ وَ الْحَجِّ وَ الصَّوْمِ وَ الْوِلَايَةِ.

قَالَ زُرَارَةُ: فَقُلْتُ: وَ أَيُّ شَيْءٍ مِنْ ذَلِكَ أَفْضَلُ؟ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: الْوِلَايَةُ أَفْضَلُ، لِأَنَّهَا مِفْتَاحُهُنَّ وَ الْوَالِي هُوَ الدَّلِيلُ عَلَيْهِنَّ.

زرارہ امام باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: نماز، زکات، حج، روزہ اور ولایت۔"

زرارہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا" **: ان میں سب سے افضل کون سی ہے؟"**

امامؑ نے فرمایا:

"ولایت سب سے افضل ہے، کیونکہ وہ ان سب کی کنجی ہے، اور ولی ہی ان کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔"

اصولِ کافی، ج ۲، ص ۱۸، کتاب الایمان والکفر، باب دعائم الاسلام، حدیث ۵۔

اگر رسولِ خداؐ اور آپؐ کے اہلِ بیتؑ کی معرفت نہ ہوتی تو نہ نماز ہمارے لیے واضح ہوتی، نہ روزہ، نہ حج، نہ زکات اور نہ دین کا کوئی دوسرا حکم۔

یہی حقیقت اعتقادی امور میں بھی جاری ہے۔ امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى لَوْ شَاءَ لَعَرَّفَ الْعِبَادَ نَفْسَهُ، وَ لَكِنْ جَعَلَنَا أَبْوَابَهُ وَ صِرَاطَهُ وَ سَبِيلَهُ وَ الْوَجْهَ الَّذِي يُؤْتَى مِنْهُ. فَمَنْ عَدَلَ عَنْ وِلَايَتِنَا، أَوْ فَضَّلَ عَلَيْنَا غَيْرَنَا، فَإِنَّهُمْ عَنِ الصِّرَاطِ لَنَاكِبُونَ. فَلَا سَوَاءٌ مَنِ اعْتَصَمَ النَّاسُ بِهِ، وَ لَا سَوَاءٌ حَيْثُ ذَهَبَ النَّاسُ إِلَى عُيُونٍ كَدِرَةٍ يَفْرَغُ بَعْضُهَا فِي بَعْضٍ، وَ ذَهَبَ مَنْ ذَهَبَ إِلَيْنَا إِلَى عُيُونٍ صَافِيَةٍ تَجْرِي بِأَمْرِ رَبِّهَا، لَا نَفَادَ لَهَا وَ لَا انْقِطَاعَ.

"بے شک اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتا تو خود اپنے بندوں کو براہِ راست اپنی معرفت عطا فرماتا، لیکن اس نے ہمیں اپنے دروازے، اپنا صراط، اپنی راہ اور وہ سمت قرار دیا ہے جس کے ذریعے اس کی طرف آیا جاتا ہے۔

پس جو ہماری ولایت سے روگردانی کرے یا ہمارے مقابلے میں کسی اور کو برتری دے، وہ یقیناً صراط سے منحرف ہے۔

جن سے لوگوں نے تمسک کیا ہے وہ ہمارے برابر نہیں ہو سکتے۔ لوگ ایسے گدلے چشموں کی طرف گئے ہیں جن میں ایک کا پانی دوسرے میں گرتا ہے، جبکہ جو ہماری طرف آیا وہ ایسے پاک وصاف چشموں کی طرف آیا جو اپنے پروردگار کے حکم سے جاری ہیں؛ نہ ان کا پانی ختم ہوتا ہے اور نہ ان کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۴، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۹۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیتؑ کو اپنی قربت تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ ہر چیز میں —— حتیٰ کہ توحید اور معرفتِ خدائے واحد میں بھی —— وہ فیضِ الٰہی کا واسطہ ہیں۔

جب تک انسان ان کی طرف رجوع نہ کرے، وہ حقیقی توحید اور صحیح معرفتِ خدا تک نہیں پہنچ سکتا، اور جو کچھ وہ اپنے طور پر حاصل کرتا ہے وہ اسے ضروری حفاظت اور ہدایت فراہم نہیں کر سکتا۔

جن لوگوں نے دوسروں کی طرف رجوع کیا، انہوں نے علم و معرفت کے صاف چشمے سے پانی نہیں لیا۔ اگر دوسروں تک معرفت کے اس پانی کا کچھ حصہ پہنچا بھی، تو انہوں نے اسے اپنی آراء اور افکار کی مٹی اور دوسری آلودگیوں سے ملا دیا؛ اس طرح وہ خالص معرفتِ الٰہی سے محروم رہے اور نتیجتاً اللہ کے صراطِ مستقیم سے دور ہو گئے۔

معرفت کا وہ چشمہ جس میں کسی قسم کی آلودگی نہیں، اور جس کے پاک پانی میں کسی چیز کی آمیزش نہیں ہوئی، صرف اہلِ بیتؑ کے قلوب و زبان سے جاری ہوتا ہے۔ یہی چشمہ معرفت کے پیاسوں کو حقیقی طور پر سیراب کر سکتا ہے۔

ان کے علم کی کوئی انتہا نہیں، اور جو شخص ان کے چشمے پر آتا ہے وہ پیاسا واپس نہیں لوٹتا۔

پس جو عقل مند انسان ایسی ہستیوں کو پہچان لے، وہ دوسروں کی طرف کیوں جائے؟ اور اپنے آپ کو اہلِ بیتؑ کے سپرد کرنے میں کیوں تردّد کرے؟

اگر انسان سب کچھ ائمہؑ سے حاصل کرے تو وہ دوسروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اور ان کی ولایت و سرپرستی کو قبول کر کے تمام خیر حاصل کر سکتا ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

نَحْنُ أَصْلُ كُلِّ خَيْرٍ، وَ مِنْ فُرُوعِنَا كُلُّ بِرٍّ، فَمِنَ الْبِرِّ التَّوْحِيدُ وَ الصَّلَاةُ وَ الصِّيَامُ وَ كَظْمُ الْغَيْظِ وَ الْعَفْوُ عَنِ الْمُسِيءِ وَ رَحْمَةُ الْفَقِيرِ وَ تَعَهُّدُ الْجَارِ وَ الْإِقْرَارُ بِالْفَضْلِ لِأَهْلِهِ.

"ہم ہر خیر کی اصل ہیں، اور ہر نیکی ہماری شاخوں میں سے ہے۔ پس نیکیوں میں توحید، نماز، روزہ، غصے کو پی جانا، بدی کرنے والے کو معاف کرنا، فقیر پر رحم کرنا، پڑوسی کی خبر گیری کرنا اور صاحبِ فضیلت کی فضیلت کا اقرار کرنا شامل ہے۔"

روضۃ الکافی، ص ۲۴۲، حدیث ۳۳۶۔

چونکہ اہلِ بیتؑ خود فضل و عنایتِ الٰہی کا ثمر ہیں، اس لیے وہ ہر خیر کی اصل اور سرچشمہ ہیں۔ تمام نیکیاں شجرۂ اہلِ بیتؑ کی شاخیں اور اس کے پھل ہیں۔

تمام خیر کے سرِ فہرست اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان ہے، جو دین کی بنیاد ہے؛ اور اس کے بعد دوسری تمام نیکیاں آتی ہیں جو دین کی فروع ہیں۔ دین کی اصل اور اس کی فروع، دونوں اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ولایت کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔

اصول و فروعِ دین میں انسان کی امامؑ سے نیاز مندی

اصول اور فروعِ دین کے ان امور میں جو عقل کی مستقل دریافت کے دائرے سے باہر ہیں اور جہاں صرف **تعبّد** ہی حاکم ہے، اولیائے الٰہی کی رہنمائی سے انسان کی نیاز مندی بالکل واضح ہے۔

روزہ اور نماز ایسے احکام ہیں جن کے وجوب کو انسان صرف اپنی عقل کے ذریعے دریافت نہیں کر سکتا۔ لیکن جب حجتِ خدا اور زبانِ وحی اس کی ذمہ داری بیان کر دے تو وہ تعبّداً اس کی پیروی کرتا ہے۔

تاہم دین کے اکثر مسائل اس نوعیت کے نہیں ہیں۔

اصولِ دین، بالخصوص توحید، اور فروع کے بھی بہت سے امور، خصوصاً باطنی و اخلاقی مسائل میں عقلِ انسانی کو ایک خاص روشنی اور ادراک حاصل ہے۔

اللہ کی توحید انسانی **فطرت اور عقل** کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ عقل واضح طور پر حکم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو **تعطیل اور تشبیہ، دونوں سے منزّہ** سمجھا جائے۔

اسی طرح غصہ پی جانا، خطاکار کو معاف کرنا، پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک اور اسی نوع کے بہت سے امور عقلی ہیں اور عقل مند انسان ان کی خوبی کو سمجھ سکتا ہے۔

لیکن ایسے امور میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ انسان کو **صحیح اور عقلانی راستے پر ثابت قدم رکھا جائے**۔ اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

انسان تربیت اور تزکیے کا محتاج ہے۔ اس کے بغیر ممکن ہے کہ ابتدا میں بہت سی حقیقتوں کو جانتا ہو، لیکن بہت جلد صحیح راستے سے منحرف ہو جائے اور جو کچھ اس کے پاس تھا اسے بھی کھو بیٹھے۔

جب ایک عقل مند انسان کے اندر صحیح عقیدۂ توحید کی چنگاری روشن ہوتی ہے تو وہ فوراً اس کی تصدیق کرتا ہے۔ لیکن انسانی افکار اور غلط اثرات اسے اس صحیح عقیدے پر قائم رہنے سے روک سکتے ہیں۔ شیطانی وسوسے ـــ خواہ شیاطینِ جن کی طرف سے ہوں یا شیاطینِ انس کی جانب سے ـــ اسے صحیح راستے پر باقی رہنے نہیں دیتے۔

اسی لیے، اگرچہ اہلِ بیتؑ کی تعلیمات میں توحید نہایت روشن اور تقریباً بدیہی حقیقت ہے، لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ ـــ حتیٰ کہ وہ افراد جنہوں نے اس موضوع میں ائمہؑ کی روایات کو دیکھا اور سنا بھی ہے ـــ انسانی افکار کے مضر اثرات سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکے، کیونکہ انہوں نے ان روایات کے سامنے خضوع و تسلیم کا رویہ اختیار نہیں کیا۔

نتیجتاً انہوں نے قرآن کی آیات اور روایات کو اپنے بنائے ہوئے فکری سانچوں کے مطابق تاویل اور تفسیر کرنا شروع کر دیا۔

ایسے افراد در حقیقت ان لوگوں کی مثال ہیں جنہوں نے فکری اور عملی، دونوں اعتبار سے اہلِ بیتؑ پر دوسروں کو ترجیح دی۔ انہوں نے دوسروں کی توحیدی تعلیمات کو ائمہؑ کے کلمات پر پرکھنے کے بجائے، دوسروں کی تعلیمات کو اصل و بنیاد قرار دیا اور پھر روایات کی تفسیر انہی کے مطابق کرنے لگے۔

اسی وجہ سے، اگرچہ مکتبِ اہلِ بیتؑ میں مسئلۂ توحید روشن ترین حقائق میں سے ہے، پھر بھی بہت سے مفکرین اور دین کے طالب علموں سے اس کی حقیقت پوشیدہ رہ گئی۔

پس انسان ان امور میں بھی، جو خالص تعبّدی نہیں ہیں، ایک **معصوم معلّم اور مربّی** کا محتاج ہے۔ اسے اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنا چاہیے تاکہ اس کی ہدایات اور تربیتی نظام کے مطابق پرورش پائے اور انحراف سے محفوظ رہے۔

جب معرفتِ خدا جیسے روشن ترین مسئلے میں انسان کی حالت یہ ہے تو **بطریقِ اولیٰ** معرفتِ رسولؐ، معرفتِ امامؑ اور معرفتِ معاد میں یہ ضرورت کہیں زیادہ ہوگی، جو اصول و ارکانِ دین میں شمار ہوتے ہیں؛ کیونکہ ان امور میں تعبّدی پہلو توحید کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔

بہر حال، ہر خیر کا سرچشمہ اہلِ بیتؑ ہیں اور ان سے تمسک کے ذریعے ہر خیر تک پہنچا جا سکتا ہے:

إِنْ ذُكِرَ الْخَيْرُ كُنْتُمْ أَوَّلَهُ وَ أَصْلَهُ وَ فَرْعَهُ وَ مَعْدِنَهُ وَ مَأْوَاهُ وَ مُنْتَهَاهُ.

"جب خیر کا ذکر ہو تو آپ ہی اس کا آغاز، اس کی اصل، اس کی شاخ، اس کا سرچشمہ، اس کی پناہ گاہ اور اس کی انتہا ہیں۔"

بحار الانوار، ج ۱۰۲، ص ۱۳۲، بحوالہ عیون اخبار الرضاؑ؛ زیارتِ جامعہ کبیرہ کے فقرات۔

ائمہؑ خیر کی اصل بھی ہیں اور اس کی شاخ بھی، نیکی کی جڑ بھی اور اس کی فرع بھی، اس کا آغاز بھی اور اس کی انتہا بھی، اور تمام خیر کا سرچشمہ بھی۔

خیر وہ ہے جو وہ فرمائیں اور جس پر وہ عمل کریں۔

امامؑ — شفیق باپ اور مہربان ماں

اس سے بہتر مربّی اور معلّم کون ہو سکتا ہے جس کی خود اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایت کے زیرِ سایہ تربیت ہوئی ہو؟

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ولایت اور سرپرستی انہیں عطا فرمائی ہے، اور وہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ انتہائی محبت، بزرگواری، سخاوت اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ وہ ان کے لیے باپ اور ماں کی طرح کامل خیر خواہی اور دل سوزی رکھتے ہیں۔

امام رضاؑ فرماتے ہیں:

اَلْإِمَامُ الْمَاءُ الْعَذْبُ عَلَى الظَّمَاءِ وَ الدَّالُّ عَلَى الْهُدَى وَ الْمُنْجِي مِنَ الرَّدَى ... اَلْإِمَامُ الْأَنِيسُ الرَّفِيقُ وَ الْوَالِدُ الشَّفِيقُ وَ الْأَخُ الشَّقِيقُ وَ الْأُمُّ الْبَرَّةُ بِالْوَلَدِ الصَّغِيرِ وَ مَفْزَعُ الْعِبَادِ فِي الدَّاهِيَةِ النَّآدِ.

"امامؑ پیاسے کے لیے شیریں اور گوارا پانی، ہدایت کی طرف رہنمائی کرنے والا اور ہلاکت سے نجات دینے والا ہے... امامؑ محبت کرنے والا مونس، شفیق باپ، حقیقی بھائی، اپنے چھوٹے بچے کے لیے نہایت مہربان ماں، اور سخت و ہولناک مصیبت میں بندگانِ خدا کی پناہ گاہ ہے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۲۰۰، کتاب الحجۃ، باب نادر جامع فی فضل الامام وصفاتہ، حدیث ۱۔

ایک شفیق باپ جب اپنے بچے کو غلط راستے پر چلتے یا کوئی خطا کرتے دیکھتا ہے تو نرمی اور محبت کے ساتھ اسے اس غلطی پر قائم رہنے سے روکتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے اسے انحراف میں گرنے سے بچاتا ہے۔

بھائی سختی اور مصیبت کے وقت اپنے بھائی کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ جس کے پاس اپنے جیسا ایک بھائی ہو وہ کبھی خود کو بالکل بے سہارا محسوس نہیں کرتا۔

مہربان ماں اپنے بچے سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبت کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ بچے کی جگہ ہر سختی اور تکلیف خود برداشت کر لے تاکہ اس کا بچہ دکھ اور مصیبت میں مبتلا نہ ہو۔

یہ تمام صفات ـــــ بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر ـــــ وجودِ مبارکِ امامؑ میں جمع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستی کو اپنے بندوں کا مربّی، باپ اور ماں قرار دیا ہے۔

جو شخص ایسے امامؑ کی ولایت قبول کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایسی ہستی کی محبت، شفقت اور سرپرستی کے سایے میں دے دیتا ہے۔ پھر اسے کسی خطرے سے خوف زدہ ہونے یا کسی معاملے میں دل کو مضطرب رکھنے کی ضرورت نہیں۔

ایسا کون سا باپ ہو سکتا ہے جو امامؑ سے زیادہ شفیق، زیادہ عالم، زیادہ قدرت رکھنے والا، زیادہ متقی، زیادہ خدا شناس اور مدد کرنے پر زیادہ قادر ہو؟

امامؑ اپنے زیرِ ولایت شخص کے لیے وہ کام انجام دے سکتے ہیں جو کوئی باپ یا ماں اپنے بچے کے لیے کبھی انجام نہیں دے سکتے۔

جس شخص کے پاس ایسا ولی ہو اور جس نے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا ہو، جب بھی اس کا قدم پھسلنے لگے، جب بھی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئے، جب بھی خواہشاتِ نفس اس پر غالب ہونے لگیں، یا کوئی اور ایسی کیفیت پیش آئے، اس کا مربّی اور سرپرست اس پر نگاہ رکھتا ہے۔

امامؑ کے بارے میں بیان کردہ ان تمام صفات کے ہوتے ہوئے وہ اپنے بچے کو کبھی بے سہارا نہیں چھوڑتے۔

جب بچہ ابھی چلنا نہ جانتا ہو، یا کسی ایسے تاریک راستے پر جانا چاہے جس پر پہلے کبھی نہ چلا ہو، تو وہ اپنا ہاتھ اپنے باپ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اب خواہ اس کی آنکھیں بند ہوں، اسے اطمینان ہوتا ہے کہ وہ منزل تک پہنچ جائے گا اور راستہ نہیں بھٹکے گا۔

بندگانِ خدا بھی ان بچوں کی مانند ہیں جنہیں بندگیِ خدا کا راستہ اپنے مربّی اور باپ کا ہاتھ تھام کر طے کرنا چاہیے، تاکہ اس راستے میں شیاطین کے شر سے محفوظ رہیں۔

لیکن جس کا کوئی امام نہ ہو اور جس نے ایسی ہستی کی ولایت قبول نہ کی ہو، وہ اس بے باپ بچے کی مانند ہے جو راستہ نہیں جانتا، پھر بھی اپنی بچگانہ حرکات اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ایک ایسے راستے کو طے کرنا چاہتا ہے جس میں بڑے بڑے لوگ بھی گر چکے ہیں۔

کیا ایسا ممکن ہے؟

ایسا شخص مشکلات کے سامنے خود کو بے پناہ اور بے سہارا پاتا ہے، جبکہ اہلِ معرفت امامؑ کو اپنی پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔

امامؑ کی ہدایت کی دو صورتیں

شیعہ عقیدے کے مطابق امامؑ کی ہدایت دو صورتوں میں ہوتی ہے:

1. **ارائۃ الطریق ـــــ راستہ دکھانا**
2. **ایصالُ اِلَی المطلوب ـــــ منزل تک پہنچانا**

پہلی صورت یہ ہے کہ ناواقف شخص کو راستہ دکھا دیا جائے تاکہ وہ خود اس راستے پر چل کر منزل تک پہنچے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ناواقف شخص کو محض اس کے اپنے قدموں سے نہیں، بلکہ اس کے مربّی اور راہنما کی مدد سے منزل کی طرف لے جایا جائے۔ اس صورت میں انسان کو امامؑ سے جدا نہیں ہونا چاہیے، تاکہ ان کی معیت و سرپرستی میں مطلوبہ منزل تک پہنچ سکے۔

پس افراد پر امامؑ کی ولایت کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک صورت میں اور کبھی دونوں صورتوں میں بیک وقت جلوہ گر ہو سکتی ہے۔

البتہ اس فیض و عنایت کی کیفیت خود امامؑ کے اختیار سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے زیرِ ولایت افراد پر کس مقدار میں لطف و عنایت فرمائیں:

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ.

"یہ ہماری عطا ہے؛ پس چاہو تو عطا کرو اور چاہو تو روک رکھو، تم سے کوئی حساب نہیں۔"

قرآنِ کریم، سورۂ ص 38:39۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان کے لطف و عنایت سے زیادہ حصہ حاصل کریں تو ہمیں ان سے اپنی محبت اور وابستگی میں اضافہ کرنا چاہیے اور ہر ممکن طریقے سے ان کی توجہ اور رضا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

گزشتہ تمام مطالب کی روشنی میں **معرفتِ امامؑ** کی قدر و اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ جسے یہ قیمتی گوہر اور **اکسیرِ اعظم** نصیب ہو جائے، اس نے حقیقت میں تمام خیر اور **خیرِ کثیر** کے سرچشمے تک رسائی حاصل کر لی۔

اس حکمت کے بارے میں جس کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے:

وَيُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

"اور جسے حکمت عطا کر دی گئی، اسے یقیناً خیرِ کثیر عطا کر دیا گیا۔"

قرآنِ کریم، سورۂ بقرہ 2:269۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

طَاعَةُ اللهِ وَ مَعْرِفَةُ الْإِمَامِ.

"اللہ کی اطاعت اور امامؑ کی معرفت۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۵، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۱۱۔

حکمت ایسا محکم علم ہے جس میں سستی اور کمزوری در نہیں آتی اور جو متزلزل نہیں ہوتا۔ راہِ ہدایت میں مضبوط ترین بنیاد **اللہ کی اطاعت و تسلیم اور امامؑ کی معرفت** ہے؛ کیونکہ حقیقی اطاعتِ خدا اسی کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔

جو اپنے امامؑ کو پہچان لے اور ان کی ولایت قبول کر لے، وہ تمام خیر حاصل کر لیتا ہے؛ اور جو اپنے امامؑ کو نہ پہچانے، وہ حقیقی خیر سے محروم رہتا ہے۔ پس **خیرِ کثیر، معرفتِ امامؑ ہی ہے۔**

معرفتِ امامؑ ـــــ معرفتِ خدا کی واحد بنیاد

تمہید

معرفتِ خدا کی بحث میں بیان ہو چکا ہے کہ **معرفت عطا کرنا خود اللہ کا کام ہے۔** جب اللہ تعالیٰ اپنا تعارف کرادے اور انسان اس عطا شدہ معرفت کو قبول کر کے اس کے سامنے تسلیم ہو جائے تو اس نے معرفتِ خدا کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔

ایسے شخص کو **عارفِ خدا** یا صاحبِ معرفتِ خدا کہا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں اس تعبیر سے مراد صرف وہ شخص نہیں جس پر حقیقت ذہنی اور علمی طور پر واضح ہو گئی ہو، بلکہ مراد **اللہ پر ایمان رکھنے والا شخص** ہے۔

ممکن ہے کسی شخص پر حجت تمام ہو چکی ہو اور اللہ نے اسے اپنی معرفت تک پہنچا دیا ہو، لیکن جب تک وہ اس معرفت کے سامنے تسلیم نہ ہو، اسے حقیقی معنی میں عارفِ خدا نہیں کہا جاتا۔

پس عارفِ خدا وہ ہے جو معرفت حاصل ہونے کے بعد **اس کی تصدیق بھی کرے۔**

اسی لیے اس بحث میں ہم **"معرفتِ خدا"** کو انسان کے ایک اختیاری عمل کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں؛ یعنی اللہ کی عطا کردہ معرفت کو **قبول کرنا اور اس کے سامنے تسلیم ہونا۔**

صحیح معرفتِ خدا کی تعریف

اس مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اب بحث یہ ہے کہ :

معرفتِ امامؑ کے بغیر معرفتِ خدا ممکن نہیں۔

اسی طرح معرفتِ امامؑ سے بھی مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ امامؑ کا تعارف کرادے تو انسان اس تعارف کو قبول کرے، اس کے سامنے تسلیم ہو جائے اور یوں معرفتِ امامؑ کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

ایسے شخص کو صاحبِ معرفتِ امام کہا جاتا ہے؛ یعنی وہ امامؑ پر ایمان رکھتا اور ان کی امامت کو قبول کرتا ہے۔

اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ **امامؑ پر ایمان کے بغیر اللہ پر حقیقی ایمان ممکن نہیں۔**

کیونکہ اگر کوئی شخص حقیقتاًاللہ کے سامنے تسلیم اور اس کا بندہ ہے تو اسے بندگی کے اس دروازے اور واحد راستے کے سامنے بھی تسلیم ہونا چاہیے جسے خود اللہ نے اپنی عبادت کے لیے پسند اور مقرر فرمایا ہے۔

امامت اور ولایت وہ دروازہ ہے جسے اللہ نے اپنی بندگی کے لیے کھولا ہے اور اسی دروازے کے ذریعے اپنی عبادت ممکن قرار دی ہے۔

لہٰذا یہ قابلِ قبول نہیں کہ کوئی شخص اللہ کی معرفت کا دعویٰ کرے لیکن اس امر کے سامنے تسلیم ہونے سے انکار کر دے۔ جو شخص اللہ کو اپنا رب مانتا ہے، اسے اللہ کے نبی کو اس کا نبی اور اللہ کے امام کو اس کا امام بھی ماننا ہو گا۔

اگر ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی وہ شک و تردّد میں مبتلا ہو تو حقیقت میں اس کا شک معرفتِ خدا ہی کی طرف پلٹتا ہے، اور اس طرح وہ حقیقی معرفتِ خدا کا حامل نہیں رہتا۔

پس معرفتِ امامؑ، معرفتِ خدا کا ایک ناگزیر تقاضا ہے۔

ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں:

قَالَ لِي أَبُو جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ: إِنَّمَا يَعْبُدُ اللهَ مَنْ يَعْرِفُ اللهَ، فَأَمَّا مَنْ لَا يَعْرِفُ اللهَ، فَإِنَّمَا يَعْبُدُهُ هَكَذَا ضَلَالًا .قُلْتُ: جُعِلْتُ فِدَاكَ؛ فَمَا مَعْرِفَةُ اللهِ؟ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: تَصْدِيقُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَ تَصْدِيقُ رَسُولِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ مُوَالَاةُ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ الِائْتِمَامُ بِهِ وَ بِأَئِمَّةِ الْهُدَى عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَ الْبَرَاءَةُ إِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ عَدُوِّهِمْ. هَكَذَا يُعْرَفُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ.

امام باقرؑ نے مجھ سے فرمایا:

"اللہ کی عبادت صرف وہی کرتا ہے جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو۔ اور جو اللہ کی معرفت نہیں رکھتا، وہ اس طرح محض گمراہی میں اس کی عبادت کرتا ہے۔"

میں نے عرض کیا" : **میں آپ پر قربان! معرفتِ خدا کیا ہے؟"**

امامؑ نے فرمایا:

"اللہ عزوجل کی تصدیق کرنا، اس کے رسولؐ کی تصدیق کرنا، علیؑ کی ولایت و دوستی اختیار کرنا، انہیں اور ائمۂ ہدیٰؑ کو اپنا امام و پیشوا ماننا، اور ان کے دشمنوں سے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں بیزاری اختیار کرنا۔ اللہ عزوجل کی معرفت اسی طرح حاصل ہوتی ہے۔"

اصولِ کافی، ج۱، ص ۱۸۰، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۱۔

یہاں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ رسولؐ کو رسول ماننا اور امامؑ کو امام تسلیم کرنا، خود **معرفتِ خدا** کے مفہوم میں شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ **بابِ بندگیِ خدا پر ایمان کے بغیر اللہ پر حقیقی ایمان ممکن نہیں۔**

اسی موضوع میں جابر جعفی نے امام باقرؑ سے ایک اور روایت نقل کی ہے:

إِنَّمَا يَعْرِفُ اللهَ عَزَّوَجَلَّ وَ يَعْبُدُهُ مَنْ عَرَفَ اللهَ وَ عَرَفَ إِمَامَهُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ، وَ مَنْ لَا يَعْرِفُ اللهَ عَزَّوَجَلَّ وَ لَا يَعْرِفُ الْإِمَامَ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ، فَإِنَّمَا يَعْرِفُ وَ يَعْبُدُ غَيْرَ اللهِ هَكَذَا . وَ اللهِ . ضَلَالًا .

"اللہ عزوجل کو حقیقتاً وہی پہچانتا اور اس کی عبادت کرتا ہے جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو اور ہم اہلِ بیتؑ میں سے اپنے امام کو پہچانتا ہو۔

اور جو اللہ عزوجل کی معرفت نہیں رکھتا اور ہم اہلِ بیتؑ میں سے اپنے امام کو نہیں پہچانتا، وہ حقیقت میں اس طرح غیرِ خدا کو پہچانتا اور اسی کی عبادت کرتا ہے—اللہ کی قسم! یہ گمراہی ہے۔"

اصولِ کافی، ج۱، ص ۱۸۱، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۴۔

ایسا شخص حقیقت میں اللہ کے بجائے اپنی خواہشات کی پیروی کر رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن کی زبان میں وہ گمراہ ترین لوگوں میں شمار ہوتا ہے:

عَنْ أَبِي الْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي قَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: «وَ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللهِ» قَالَ: يَعْنِي مَنِ اتَّخَذَ دِينَهُ رَأْيَهُ بِغَيْرِ إِمَامٍ مِنْ أَئِمَّةِ الْهُدَى.

اللہ عزوجل کے اس فرمان کے بارے میں:

وَ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللهِ

"اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے؟"

قرآنِ کریم، سورۂ قصص 28:50۔

ابوالحسنؑ نے فرمایا:

"اس سے مراد وہ شخص ہے جو ائمۂ ہدیٰؑ میں سے کسی امام کے بغیر اپنی ذاتی رائے ہی کو اپنا دین بنالے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۳۷۴، کتاب الحجۃ، باب من دان اللہ عزوجل بغیر امام من اللہ جل جلالہ، حدیث ۱۔

لہٰذا امامؑ کا انکار حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے انکار کی طرف لوٹتا ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

كَانَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا، ثُمَّ كَانَ الْحَسَنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا، ثُمَّ كَانَ الْحُسَيْنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا، ثُمَّ كَانَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا، ثُمَّ كَانَ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا. مَنْ أَنْكَرَ ذَلِكَ كَانَ كَمَنْ أَنْكَرَ مَعْرِفَةَ اللهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَ مَعْرِفَةَ رَسُولِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ.

"رسولِ خداؐ کے بعد امیر المؤمنین علیؑ امام تھے، پھر امام حسنؑ امام ہوئے، پھر امام حسینؑ، پھر علی بن الحسینؑ، اور پھر محمد بن علیؑ امام ہوئے۔ جو شخص اس حقیقت کا انکار کرے، وہ اس شخص کی مانند ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی معرفت اور اس کے رسولؐ کی معرفت کا انکار کرے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۱، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۵۔

اس کے بعد راوی خود اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اس کے زمانے کے امام، **امام جعفر صادقؑ** ہیں، اور وہ اپنی اس معرفت و فہم کو تین مرتبہ امامؑ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔

امامؑ کو راعی سے تشبیہ دینے کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ وضاحت ضروری ہے کہ امامؑ کو **راعی** اور امت کو بھیڑوں کے گلے سے تشبیہ دینے کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ انسان، امامؑ کی رہنمائی کے بغیر، خیر و شر میں کسی قسم کی تمیز ہی نہیں کر سکتا اور اس کی حیثیت ایسی بھیڑ کی مانند ہے جو آنکھیں بند کر کے اپنے چرواہے کے پیچھے چلتی ہے۔ اس تشبیہ سے ایسا مفہوم اخذ کرنا بالکل غلط اور حقیقت کے خلاف ہے۔

ہر تشبیہ میں **مشبّہ** اور **مشبّہ بہ** کے درمیان ایک خاص **وجہِ شبہ** ہوتی ہے، اور یہی مشترک پہلو تشبیہ کی بنیاد بنتا ہے۔ اس مخصوص پہلو کے علاوہ مشبّہ بہ کی دوسری خصوصیات کو مشبّہ کی طرف منتقل نہیں کیا جا سکتا، جب تک کوئی ایسی دلیل یا قرینہ موجود نہ ہو جو یہ ظاہر کرے کہ متکلم کی مراد بھی یہی تھی۔

زیرِ بحث تشبیہ میں انسانوں کو بھیڑوں کے گلے سے صرف اس اعتبار سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ اپنی **ابدی سعادت کے راستے کو مکمل طور پر خود دریافت کرنے کے لیے کافی علم نہیں رکھتے**۔ جس طرح بھیڑوں کا گلہ چرواہے کی رہنمائی کے بغیر صحیح راستے اور خطرات کے درمیان مکمل تمیز نہیں کر سکتا، اسی طرح انسان بھی راہِ سعادت طے کرنے کے لیے رہنمائی کا محتاج ہے۔

اس کے باوجود خود بھیڑ بھی ایک محدود درجے کی فہم و آگہی رکھتی ہے۔ مثلاً وہ بھیڑیے جیسے خطرے کو پہچانتی اور اس سے فرار کرتی ہے۔ لیکن یہ محدود آگہی ان تمام غلطیوں اور خطرات سے اسے محفوظ رکھنے کے لیے کافی نہیں جو اسے درپیش ہو سکتے ہیں۔ پس ایک بھیڑ بھی، اپنی حد تک، اپنے نفع اور نقصان کی کچھ پہچان رکھتی ہے۔

انسان یقیناً بھیڑ سے کہیں زیادہ بلند درجے کی فہم و شعور رکھتا ہے، اور اسی کو **عقل** کہا جاتا ہے۔ عقل انسان کو حیوانات سے ممتاز کرنے والے عظیم ترین امتیازات میں سے ایک ہے۔ لیکن تنہا عقل انسان کو کمالِ انسانی کے تمام درجات تک ــــ یعنی **کامل بندگیِ خدا** تک ــــ پہنچانے کے لیے کافی نہیں۔

یہی وہ پہلو ہے جس میں انسان اور بھیڑ کے درمیان تشبیہ قائم ہوتی ہے: **دونوں ایک راعی اور رہنما کے محتاج ہیں۔**

اہم بات یہ ہے کہ خود یہی عقل، انسان کو اللہ کی جانب سے مقرر کردہ معصوم رہنماؤں کی ضرورت کا ادراک کراتی ہے۔ عقل انسان پر اس کی اپنی ناتوانی واضح کرتی ہے کہ وہ ان کی مدد و رہنمائی کے بغیر بندگیِ خدا کے راستے کو صحیح اور کامل طور پر طے نہیں کر سکتا۔

لہٰذا عقل مند انسان کا ائمہؑ کی پیروی کرنا کسی طرح بھی اندھی یا بے دلیل پیروی نہیں ہے۔ بلکہ خود عقل اس اتباع کی ضرورت کی تصدیق کرتی ہے۔

پس ہادیانِ الٰہی کی پیروی کو جہالت سے پیدا ہونے والی پیروی، یا تعبیر کے طور پر **"بھیڑ چال"** قرار دینا درست نہیں۔ امت کو بھیڑوں کے گلے سے تشبیہ دینے کو اس قسم کی جانب دارانہ اور غلط تعبیر کا سبب نہیں بننا چاہیے۔

معرفتِ امامؑ — تمام خیر کا سرچشمہ

تمہید

گزشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ان کی پیروی محض **تعبّد** کا مسئلہ نہیں، بلکہ عقلِ انسانی بھی اس کا تقاضا کرتی ہے۔

جو شخص اللہ کو پہچانتا ہے، اس کے پاس اللہ تک پہنچنے کے لیے اس راستے کے سوا کوئی راستہ نہیں جسے خود اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔ کسی دوسرے راستے سے وہ یہ نہیں جان سکتا کہ رضائے الٰہی کس چیز میں ہے اور ناراضیِ خدا کس چیز میں۔

ایک عقل مند انسان، جسے عالمِ غیب تک رسائی حاصل نہیں، کسی ایسے شخص کی پیروی نہیں کرتا جو خود اسی کی طرح حقیقت سے بے خبر اور ناآشنا ہو۔ بلکہ وہ ایسے شخص کی تلاش کرتا ہے جو ان امور کا کامل علم رکھتا ہو جن سے وہ خود ناواقف ہے۔

جب وہ ایسے شخص کو پہچان لیتا ہے تو پھر اس کی پیروی کی ضرورت کے بارے میں کسی مزید تردّد اور تامل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اتباعِ امامؑ کی ضرورت کی عقلی بنیاد

پس انسانوں کا ائمۂ طاہرینؑ کی طرف رجوع کرنا **جاہل کا عالم کی طرف رجوع** ہے، اور یہ ایک عقلی حکم ہے؛ محض کوئی بے دلیل یا صرف تعبّدی حکم نہیں۔

جس طرح ایک عقل مند انسان اپنے مادی اور دنیوی معاملات میں، کسی چیز سے ناواقف ہونے کی صورت میں، صاحبِ علم اور ماہر شخص سے رجوع کرتا ہے اور ہر کام کو اس کے صحیح ذریعے سے انجام دیتا ہے، اسی طرح عقل روحانی اور ابدی امور میں بھی یہی اصول نافذ کرتی ہے۔

اسی لیے معرفتِ امامؑ کی ضرورت بیان کرتے ہوئے اسی عقلی اصول کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ امام باقرؑ فرماتے ہیں:

يَا أَبَا حَمْزَةَ، يَخْرُجُ أَحَدُكُمْ فَرَاسِخَ فَيَطْلُبُ لِنَفْسِهِ دَلِيلًا، وَ أَنْتَ بِطُرُقِ السَّمَاءِ أَجْهَلُ مِنْكَ بِطُرُقِ الْأَرْضِ، فَاطْلُبْ لِنَفْسِكَ دَلِيلًا.

"اے ابو حمزہ! تم میں سے کوئی شخص جب چند فرسخ کا سفر کرنے کے لیے نکلتا ہے تو اپنے لیے ایک راہنما تلاش کرتا ہے؛ جبکہ تم آسمان کے راستوں سے زمین کے راستوں کی نسبت کہیں زیادہ ناواقف ہو۔ پس اپنے لیے ایک راہنما تلاش کرو۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۴، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۱۰۔

"آسمان کے راستوں" سے مراد ہدایتِ الٰہی کے وہ راستے ہیں جن کا علم وحی کے ذریعے مخصوص ہستیوں کو عطا کیا گیا ہے۔ جس کے پاس یہ علم ہو، عقل کے حکم کے مطابق اسی کی پیروی ہونی چاہیے۔

اگر امتِ مسلمہ میں چودہ معصومینؑ کے علاوہ کسی اور کے پاس بھی ایسا علم ہوتا تو اس کی پیروی بھی ممکن ہوتی۔ لیکن امتِ مسلمہ میں یہ علم چودہ معصومینؑ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، لہٰذا ہماری پیروی بھی انہی تک محدود ہونی چاہیے۔

کسی کو یہ حقیقت پسند آئے یا نہ آئے، حقیقت اپنی جگہ تبدیل نہیں ہوتی۔ بہر حال ہم ان کے علم کے محتاج ہیں۔ لہٰذا خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، ان کی پیروی کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

ائمہؑ ــــ ابوابُ اللہ

یہی وجہ ہے کہ ائمہؑ کو **"بابُ اللہ"** ــــ **اللہ کے دروازے** کہا گیا ہے۔

جو شخص منزل تک پہنچنا چاہتا ہے، اسے اسی راستے سے گزرنا ہوگا؛ کسی دوسرے راستے سے منزل تک رسائی ممکن نہیں۔

اس کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو بیمار ہو جائے۔ عقل حکم کرتی ہے کہ وہ طبیب سے رجوع کرے۔ اگر کوئی مریض کہے: ''میں شفا براہِ راست اللہ سے چاہتا ہوں، اس لیے ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤں گا؛ گھر بیٹھ کر دعا کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ اللہ مجھے شفا دے دے''، تو تمام عقلاء اس کے طرزِ عمل کو نادرست قرار دیں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے شفا چاہتا ہے، اسے اس ذریعے سے شفا حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جسے اللہ نے شفا کا وسیلہ قرار دیا ہے؛ اس مثال میں فرض کیا گیا ہے کہ طبیب سے رجوع کرنا وہی وسیلہ ہے۔

البتہ اس مثال میں کوئی ایسا طبیب نہیں جسے اللہ نے نام لے کر مخصوص طور پر مقرر فرمایا ہو۔ لیکن مسئلۂ امامت میں تمام تاکید انہی ہستیوں کی طرف رجوع پر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمایا اور خود انہیں **''ابواب اللہ''** قرار دیا ہے۔

لہٰذا جو شخص اہلِ بیتؑ کے فضائل و کمالات کو کسی حد تک بھی پہچان لے، اس کے لیے ان کی پیروی کی ضرورت محض ایک تعبّدی حکم نہیں رہتی بلکہ ایک واضح **عقلی حکم** بن جاتی ہے۔

روایات میں اسلام کے بنیادی فرائض اور ولایت کے درمیان اسی نسبت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال درج ذیل روایت ہے:

عَنْ زُرَارَةَ، عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسَةِ أَشْيَاءَ: عَلَى الصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ وَ الْحَجِّ وَ الصَّوْمِ وَ الْوِلَايَةِ.

قَالَ زُرَارَةُ: فَقُلْتُ: وَ أَيُّ شَيْءٍ مِنْ ذَلِكَ أَفْضَلُ؟ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: الْوِلَايَةُ أَفْضَلُ، لِأَنَّهَا مِفْتَاحُهُنَّ وَ الْوَالِي هُوَ الدَّلِيلُ عَلَيْهِنَّ.

زرارہ امام باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: نماز، زکات، حج، روزہ اور ولایت۔''

زرارہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا'' **: ان میں سب سے افضل کون سی ہے؟''**

امامؑ نے فرمایا:

''ولایت سب سے افضل ہے، کیونکہ وہ ان سب کی کنجی ہے، اور ولی ہی ان کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔''

اصولِ کافی، ج ۲، ص ۱۸، کتاب الایمان والکفر، باب دعائم الاسلام، حدیث ۵۔

اگر رسولِ خداؐ اور آپؐ کے اہلِ بیتؑ کی معرفت نہ ہوتی تو نہ نماز ہمارے لیے واضح ہوتی، نہ روزہ، نہ حج، نہ زکات اور نہ دین کا کوئی دوسرا حکم۔ یہی حقیقت اعتقادی امور میں بھی جاری ہے۔ امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى لَوْ شَاءَ لَعَرَّفَ الْعِبَادَ نَفْسَهُ، وَ لَكِنْ جَعَلَنَا أَبْوَابَهُ وَ صِرَاطَهُ وَ سَبِيلَهُ وَ الْوَجْهَ الَّذِي يُؤْتَى مِنْهُ. فَمَنْ عَدَلَ عَنْ وِلَايَتِنَا، أَوْ فَضَّلَ عَلَيْنَا غَيْرَنَا، فَإِنَّهُمْ عَنِ الصِّرَاطِ لَنَاكِبُونَ. فَلَا سَوَاءٌ مَنِ اعْتَصَمَ النَّاسُ بِهِ، وَ لَا سَوَاءٌ حَيْثُ ذَهَبَ النَّاسُ إِلَى عُيُونٍ كَدِرَةٍ يَفْرَغُ بَعْضُهَا فِي بَعْضٍ، وَ ذَهَبَ مَنْ ذَهَبَ إِلَيْنَا إِلَى عُيُونٍ صَافِيَةٍ تَجْرِي بِأَمْرِ رَبِّهَا، لَا نَفَادَ لَهَا وَ لَا انْقِطَاعَ.

"بے شک اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتا تو خود اپنے بندوں کو براہِ راست اپنی معرفت عطا فرماتا، لیکن اس نے ہمیں اپنے دروازے، اپنا صراط، اپنی راہ اور وہ سمت قرار دیا ہے جس کے ذریعے اس کی طرف آیا جاتا ہے۔

پس جو ہماری ولایت سے روگردانی کرے یا ہمارے مقابلے میں کسی اور کو برتری دے، وہ یقیناً صراط سے منحرف ہے۔

جن سے لوگوں نے تمسک کیا ہے وہ ہمارے برابر نہیں ہو سکتے۔ لوگ ایسے گدلے چشموں کی طرف گئے ہیں جن میں ایک کا پانی دوسرے میں گرتا ہے، جبکہ جو ہماری طرف آیا وہ ایسے پاک وصاف چشموں کی طرف آیا جو اپنے پروردگار کے حکم سے جاری ہیں؛ نہ ان کا پانی ختم ہوتا ہے اور نہ ان کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے۔"

اصولِ کافی، ج۱، ص۱۸۴، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۹۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیتؑ کو اپنی قربت تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ ہر چیز میں —— حتیٰ کہ توحید اور معرفتِ خدائے واحد میں بھی —— وہ فیضِ الٰہی کا واسطہ ہیں۔

جب تک انسان ان کی طرف رجوع نہ کرے، وہ حقیقی توحید اور صحیح معرفتِ خدا تک نہیں پہنچ سکتا، اور جو کچھ وہ اپنے طور پر حاصل کرتا ہے وہ اسے ضروری حفاظت اور ہدایت فراہم نہیں کر سکتا۔

جن لوگوں نے دوسروں کی طرف رجوع کیا، انہوں نے علم و معرفت کے صاف چشمے سے پانی نہیں لیا۔ اگر دوسروں تک معرفت کے اس پانی کا کچھ حصہ پہنچا بھی، تو انہوں نے اسے اپنی آراء اور افکار کی مٹی اور دوسری آلودگیوں سے ملا دیا؛ اس طرح وہ خالص معرفتِ الٰہی سے محروم رہے اور نتیجتاً اللہ کے صراطِ مستقیم سے دور ہو گئے۔

معرفت کا وہ چشمہ جس میں کسی قسم کی آلودگی نہیں، اور جس کے پاک پانی میں کسی چیز کی آمیزش نہیں ہوئی، صرف اہلِ بیتؑ کے قلوب و زبان سے جاری ہوتا ہے۔ یہی چشمہ معرفت کے پیاسوں کو حقیقی طور پر سیراب کر سکتا ہے۔

ان کے علم کی کوئی انتہا نہیں، اور جو شخص ان کے چشمے پر آتا ہے وہ پیاسا واپس نہیں لوٹتا۔

پس جو عقل مند انسان ایسی ہستیوں کو پہچان لے، وہ دوسروں کی طرف کیوں جائے؟ اور اپنے آپ کو اہلِ بیتؑ کے سپرد کرنے میں کیوں تردّد کرے؟

اگر انسان سب کچھ ائمہؑ سے حاصل کرے تو وہ دوسروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اور ان کی ولایت و سرپرستی کو قبول کر کے تمام خیر حاصل کر سکتا ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

نَحْنُ أَصْلُ كُلِّ خَيْرٍ، وَ مِنْ فُرُوعِنَا كُلُّ بِرٍّ، فَمِنَ الْبِرِّ التَّوْحِيدُ وَ الصَّلَاةُ وَ الصِّيَامُ وَ كَظْمُ الْغَيْظِ وَ الْعَفْوُ عَنِ الْمُسِيءِ وَ رَحْمَةُ الْفَقِيرِ وَ تَعَهُّدُ الْجَارِ وَ الْإِقْرَارُ بِالْفَضْلِ لِأَهْلِهِ.

"ہم ہر خیر کی اصل ہیں، اور ہر نیکی ہماری شاخوں میں سے ہے۔ پس نیکیوں میں توحید، نماز، روزہ، غصے کو پی جانا، بدی کرنے والے کو معاف کرنا، فقیر پر رحم کرنا، پڑوسی کی خبر گیری کرنا اور صاحبِ فضیلت کی فضیلت کا اقرار کرنا شامل ہے۔"

روضۃ الکافی، ص ۲۴۲، حدیث ۳۳۶۔

چونکہ اہلِ بیتؑ خود فضل و عنایتِ الٰہی کا ثمر ہیں، اس لیے وہ ہر خیر کی اصل اور سرچشمہ ہیں۔ تمام نیکیاں شجرۂ اہلِ بیتؑ کی شاخیں اور اس کے پھل ہیں۔

تمام خیر کے سرِ فہرست اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان ہے، جو دین کی بنیاد ہے؛ اور اس کے بعد دوسری تمام نیکیاں آتی ہیں جو دین کی فروع ہیں۔ دین کی اصل اور اس کی فروع، دونوں اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ولایت کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔

اصول و فروعِ دین میں انسان کی امامؑ سے نیاز مندی

اصول اور فروعِ دین کے ان امور میں جو عقل کی مستقل دریافت کے دائرے سے باہر ہیں اور جہاں صرف **تعبّد** ہی حاکم ہے، اولیائے الٰہی کی رہنمائی سے انسان کی نیاز مندی بالکل واضح ہے۔

روزہ اور نماز ایسے احکام ہیں جن کے وجوب کو انسان صرف اپنی عقل کے ذریعے دریافت نہیں کر سکتا۔ لیکن جب حجتِ خدا اور زبانِ وحی اس کی ذمہ داری بیان کر دے تو وہ تعبّداً اس کی پیروی کرتا ہے۔

تاہم دین کے اکثر مسائل اس نوعیت کے نہیں ہیں۔

اصولِ دین، بالخصوص توحید، اور فروع کے بھی بہت سے امور، خصوصاً باطنی و اخلاقی مسائل میں عقلِ انسانی کو ایک خاص روشنی اور ادراک حاصل ہے۔

اللہ کی توحید انسانی **فطرت اور عقل** کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ عقل واضح طور پر حکم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو **تعطیل اور تشبیہ، دونوں سے منزّہ** سمجھا جائے۔

اسی طرح غصہ پی جانا، خطاکار کو معاف کرنا، پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک اور اسی نوع کے بہت سے امور عقلی ہیں اور عقل مند انسان ان کی خوبی کو سمجھ سکتا ہے۔

لیکن ایسے امور میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ انسان کو **صحیح اور عقلانی راستے پر ثابت قدم رکھا جائے**۔ اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

انسان تربیت اور تزکیے کا محتاج ہے۔ اس کے بغیر ممکن ہے کہ ابتدا میں بہت سی حقیقتوں کو جانتا ہو، لیکن بہت جلد صحیح راستے سے منحرف ہو جائے اور جو کچھ اس کے پاس تھا اسے بھی کھو بیٹھے۔

جب ایک عقل مند انسان کے اندر صحیح عقیدۂ توحید کی چنگاری روشن ہوتی ہے تو وہ فوراً اس کی تصدیق کرتا ہے۔ لیکن انسانی افکار اور غلط اثرات اسے اس صحیح عقیدے پر قائم رہنے سے روک سکتے ہیں۔ شیطانی وسوسے—خواہ شیاطینِ جن کی طرف سے ہوں یا شیاطینِ انس کی جانب سے—اسے صحیح راستے پر باقی رہنے نہیں دیتے۔

اسی لیے، اگرچہ اہلِ بیتؑ کی تعلیمات میں توحید نہایت روشن اور تقریباً بدیہی حقیقت ہے، لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ —— حتیٰ کہ وہ افراد جنہوں نے اس موضوع میں ائمہؑ کی روایات کو دیکھا اور سنا بھی ہے —— انسانی افکار کے مضر اثرات سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکے، کیونکہ انہوں نے ان روایات کے سامنے خضوع و تسلیم کا رویہ اختیار نہیں کیا۔

نتیجتاً انہوں نے قرآن کی آیات اور روایات کو اپنے بنائے ہوئے فکری سانچوں کے مطابق تاویل اور تفسیر کرنا شروع کر دیا۔

ایسے افراد در حقیقت ان لوگوں کی مثال ہیں جنہوں نے فکری اور عملی، دونوں اعتبار سے اہلِ بیتؑ پر دوسروں کو ترجیح دی۔

انہوں نے دوسروں کی توحیدی تعلیمات کو ائمہؑ کے کلمات پر پرکھنے کے بجائے، دوسروں کی تعلیمات کو اصل و بنیاد قرار دیا اور پھر روایات کی تفسیر انہی کے مطابق کرنے لگے۔

اسی وجہ سے، اگرچہ مکتبِ اہلِ بیتؑ میں مسئلۂ توحید روشن ترین حقائق میں سے ہے، پھر بھی بہت سے مفکرین اور دین کے طالب علموں سے اس کی حقیقت پوشیدہ رہ گئی۔

پس انسان ان امور میں بھی، جو خالص تعبّدی نہیں ہیں، ایک **معصوم معلّم اور مربّی** کا محتاج ہے۔ اسے اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنا چاہیے تاکہ اس کی ہدایات اور تربیتی نظام کے مطابق پرورش پائے اور انحراف سے محفوظ رہے۔

جب معرفتِ خدا جیسے روشن ترین مسئلے میں انسان کی حالت یہ ہے تو **بطریقِ اولیٰ** معرفتِ رسولؐ، معرفتِ امامؑ اور معرفتِ معاد میں یہ ضرورت کہیں زیادہ ہوگی، جو اصول و ارکانِ دین میں شمار ہوتے ہیں؛ کیونکہ ان امور میں تعبّدی پہلو توحید کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔

بہر حال، ہر خیر کا سرچشمہ اہلِ بیتؑ ہیں اور ان سے تمسک کے ذریعے ہر خیر تک پہنچا جا سکتا ہے:

إِنْ ذُكِرَ الْخَيْرُ كُنْتُمْ أَوَّلَهُ وَ أَصْلَهُ وَ فَرْعَهُ وَ مَعْدِنَهُ وَ مَأْوَاهُ وَ مُنْتَهَاهُ.

"جب خیر کا ذکر ہو تو آپ ہی اس کا آغاز، اس کی اصل، اس کی شاخ، اس کا سرچشمہ، اس کی پناہ گاہ اور اس کی انتہا ہیں۔"

بحار الانوار، ج ۱۰۲، ص ۱۳۲، بحوالۂ عیون اخبار الرضاؑ؛ زیارتِ جامعہ کبیرہ کے فقرات۔

ائمہؑ خیر کی اصل بھی ہیں اور اس کی شاخ بھی، نیکی کی جڑ بھی اور اس کی فرع بھی، اس کا آغاز بھی اور اس کی انتہا بھی، اور تمام خیر کا سرچشمہ بھی۔ **خیر وہ ہے جو وہ فرمائیں اور جس پر وہ عمل کریں۔**

امامؑ — شفیق باپ اور مہربان ماں

اس سے بہتر مربّی اور معلّم کون ہو سکتا ہے جس کی خود اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایت کے زیرِ سایہ تربیت ہوئی ہو؟

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ولایت اور سرپرستی انہیں عطا فرمائی ہے، اور وہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ انتہائی محبت، بزرگواری، سخاوت اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ وہ ان کے لیے باپ اور ماں کی طرح کامل خیر خواہی اور دل سوزی رکھتے ہیں۔

امام رضاؑ فرماتے ہیں:

اَلْإِمَامُ الْمَاءُ الْعَذْبُ عَلَى الظَّمَاءِ وَ الدَّالُّ عَلَى الْهُدَى وَ الْمُنْجِي مِنَ الرَّدَى ... اَلْإِمَامُ الْأَنِيسُ الرَّفِيقُ وَ الْوَالِدُ الشَّفِيقُ وَ الْأَخُ الشَّقِيقُ وَ الْأُمُّ الْبَرَّةُ بِالْوَلَدِ الصَّغِيرِ وَ مَفْزَعُ الْعِبَادِ فِي الدَّاهِيَةِ النَّآدِ.

"امامؑ پیاسے کے لیے شیریں اور گوارا پانی، ہدایت کی طرف رہنمائی کرنے والا اور ہلاکت سے نجات دینے والا ہے... امامؑ محبت کرنے والا مونس، شفیق باپ، حقیقی بھائی، اپنے چھوٹے بچے کے لیے نہایت مہربان ماں، اور سخت و ہولناک مصیبت میں بندگانِ خدا کی پناہ گاہ ہے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۲۰۰، کتاب الحجۃ، باب نادر جامع فی فضل الامام وصفاتہ، حدیث ۱۔

ایک شفیق باپ جب اپنے بچے کو غلط راستے پر چلتے یا کوئی خطا کرتے دیکھتا ہے تو نرمی اور محبت کے ساتھ اسے اس غلطی پر قائم رہنے سے روکتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے اسے انحراف میں گرنے سے بچاتا ہے۔

بھائی سختی اور مصیبت کے وقت اپنے بھائی کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ جس کے پاس اپنے جیسا ایک بھائی ہو وہ کبھی خود کو بالکل بے سہارا محسوس نہیں کرتا۔

مہربان ماں اپنے بچے سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبت کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ بچے کی جگہ ہر سختی اور تکلیف خود برداشت کر لے تاکہ اس کا بچہ دکھ اور مصیبت میں مبتلا نہ ہو۔

یہ تمام صفات — بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر — وجودِ مبارکِ امامؑ میں جمع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستی کو اپنے بندوں کا مربّی، باپ اور ماں قرار دیا ہے۔

جو شخص ایسے امامؑ کی ولایت قبول کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایسی ہستی کی محبت، شفقت اور سرپرستی کے سایے میں دے دیتا ہے۔ پھر اسے کسی خطرے سے خوف زدہ ہونے یا کسی معاملے میں دل کو مضطرب رکھنے کی ضرورت نہیں۔

ایسا کون سا باپ ہو سکتا ہے جو امامؑ سے زیادہ شفیق، زیادہ عالم، زیادہ قدرت رکھنے والا، زیادہ متقی، زیادہ خدا شناس اور مدد کرنے پر زیادہ قادر ہو؟

امامؑ اپنے زیرِ ولایت شخص کے لیے وہ کام انجام دے سکتے ہیں جو کوئی باپ یا ماں اپنے بچے کے لیے کبھی انجام نہیں دے سکتے۔

جس شخص کے پاس ایسا ولی ہو اور جس نے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا ہو، جب بھی اس کا قدم پھسلنے لگے، جب بھی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئے، جب بھی خواہشاتِ نفس اس پر غالب ہونے لگیں، یا کوئی اور ایسی کیفیت پیش آئے، اس کا مربّی اور سرپرست اس پر نگاہ رکھتا ہے۔

امامؑ کے بارے میں بیان کردہ ان تمام صفات کے ہوتے ہوئے وہ اپنے بچے کو کبھی بے سہارا نہیں چھوڑتے۔

جب بچہ ابھی چلنا نہ جانتا ہو، یا کسی ایسے تاریک راستے پر جانا چاہے جس پر پہلے کبھی نہ چلا ہو، تو وہ اپنا ہاتھ اپنے باپ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اب خواہ اس کی آنکھیں بند ہوں، اسے اطمینان ہوتا ہے کہ وہ منزل تک پہنچ جائے گا اور راستہ نہیں بھٹکے گا۔

بندگانِ خدا بھی ان بچوں کی مانند ہیں جنہیں بندگیِ خدا کا راستہ اپنے مربّی اور باپ کا ہاتھ تھام کر طے کرنا چاہیے، تاکہ اس راستے میں شیاطین کے شر سے محفوظ رہیں۔

لیکن جس کا کوئی امام نہ ہو اور جس نے ایسی ہستی کی ولایت قبول نہ کی ہو، وہ اس بے باپ بچے کی مانند ہے جو راستہ نہیں جانتا، پھر بھی اپنی بچگانہ حرکات اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ایک ایسے راستے کو طے کرنا چاہتا ہے جس میں بڑے بڑے لوگ بھی گر چکے ہیں۔

کیا ایسا ممکن ہے؟

ایسا شخص مشکلات کے سامنے خود کو بے پناہ اور بے سہارا پاتا ہے، جبکہ اہلِ معرفت امامؑ کو اپنی پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔

امامؑ کی ہدایت کی دو صورتیں

شیعہ عقیدے کے مطابق امامؑ کی ہدایت دو صورتوں میں ہوتی ہے:

1. ارائۃ الطریق—**راستہ دکھانا**

2. ایصالُ اِلَی المطلوب—**منزل تک پہنچانا**

پہلی صورت یہ ہے کہ ناواقف شخص کو راستہ دکھا دیا جائے تاکہ وہ خود اس راستے پر چل کر منزل تک پہنچے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ناواقف شخص کو محض اس کے اپنے قدموں سے نہیں، بلکہ اس کے مربّی اور راہنما کی مدد سے منزل کی طرف لے جایا جائے۔ اس صورت میں انسان کو امامؑ سے جدا نہیں ہونا چاہیے، تاکہ ان کی معیت و سرپرستی میں مطلوبہ منزل تک پہنچ سکے۔

پس افراد پر امامؑ کی ولایت کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک صورت میں اور کبھی دونوں صورتوں میں بیک وقت جلوہ گر ہو سکتی ہے۔

البتہ اس فیض و عنایت کی کیفیت خود امامؑ کے اختیار سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے زیرِ ولایت افراد پر کس مقدار میں لطف و عنایت فرمائیں:

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ.

"یہ ہماری عطا ہے؛ پس چاہو تو عطا کرو اور چاہو تو روک رکھو، تم سے کوئی حساب نہیں۔"

قرآنِ کریم، سورۂ ص 38:39۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان کے لطف و عنایت سے زیادہ حصہ حاصل کریں تو ہمیں ان سے اپنی محبت اور وابستگی میں اضافہ کرنا چاہیے اور ہر ممکن طریقے سے ان کی توجہ اور رضا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

گزشتہ تمام مطالب کی روشنی میں **معرفتِ امامؑ** کی قدر و اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ جسے یہ قیمتی گوہر اور **اکسیرِ اعظم** نصیب ہو جائے، اس نے حقیقت میں تمام خیر اور **خیرِ کثیر** کے سرچشمے تک رسائی حاصل کر لی۔

اس حکمت کے بارے میں جس کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے:

وَيُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

"اور جسے حکمت عطا کر دی گئی، اسے یقیناً خیرِ کثیر عطا کر دیا گیا۔"

قرآنِ کریم، سورۂ بقرہ 2:269۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

طَاعَةُ اللهِ وَ مَعْرِفَةُ الْإِمَامِ.

"اللہ کی اطاعت اور امامؑ کی معرفت۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۵، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۱۱۔

حکمت ایسا محکم علم ہے جس میں سستی اور کمزوری در نہیں آتی اور جو متزلزل نہیں ہوتا۔ راہِ ہدایت میں مضبوط ترین بنیاد **اللہ کی اطاعت و تسلیم اور امامؑ کی معرفت** ہے؛ کیونکہ حقیقی اطاعتِ خدا اسی کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔

جو اپنے امامؑ کو پہچان لے اور ان کی ولایت قبول کر لے، وہ تمام خیر حاصل کر لیتا ہے؛ اور جو اپنے امامؑ کو نہ پہچانے، وہ حقیقی خیر سے محروم رہتا ہے۔

پس **خیرِ کثیر، معرفتِ امامؑ ہی ہے۔**

معرفتِ امامؑ ـــــ معرفتِ خدا کی واحد بنیاد

تمہید

معرفتِ خدا کی بحث میں بیان ہو چکا ہے کہ **معرفت عطا کرنا خود اللہ کا کام ہے۔** جب اللہ تعالیٰ اپنا تعارف کرا دے اور انسان اس عطا شدہ معرفت کو قبول کر کے اس کے سامنے تسلیم ہو جائے تو اس نے معرفتِ خدا کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔

ایسے شخص کو **عارفِ خدا** یا صاحبِ معرفتِ خدا کہا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں اس تعبیر سے مراد صرف وہ شخص نہیں جس پر حقیقت ذہنی اور علمی طور پر واضح ہو گئی ہو، بلکہ مراد **اللہ پر ایمان رکھنے والا شخص** ہے۔

ممکن ہے کسی شخص پر حجت تمام ہو چکی ہو اور اللہ نے اسے اپنی معرفت تک پہنچا دیا ہو، لیکن جب تک وہ اس معرفت کے سامنے تسلیم نہ ہو، اسے حقیقی معنی میں عارفِ خدا نہیں کہا جاتا۔

پس عارفِ خدا وہ ہے جو معرفت حاصل ہونے کے بعد **اس کی تصدیق بھی کرے۔**

اسی لیے اس بحث میں ہم **"معرفتِ خدا"** کو انسان کے ایک اختیاری عمل کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں؛ یعنی اللہ کی عطا کردہ معرفت کو **قبول کرنا اور اس کے سامنے تسلیم ہونا۔**

صحیح معرفتِ خدا کی تعریف

اس مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اب بحث یہ ہے کہ :

معرفتِ امامؑ کے بغیر معرفتِ خدا ممکن نہیں۔

اسی طرح معرفتِ امامؑ سے بھی مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ امامؑ کا تعارف کرا دے تو انسان اس تعارف کو قبول کرے، اس کے سامنے تسلیم ہو جائے اور یوں معرفتِ امامؑ کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

ایسے شخص کو صاحبِ معرفتِ امام کہا جاتا ہے؛ یعنی وہ امامؑ پر ایمان رکھتا اور ان کی امامت کو قبول کرتا ہے۔

اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ **امامؑ پر ایمان کے بغیر اللہ پر حقیقی ایمان ممکن نہیں۔**

کیونکہ اگر کوئی شخص حقیقتاً اللہ کے سامنے تسلیم اور اس کا بندہ ہے تو اسے بندگی کے اس دروازے اور واحد راستے کے سامنے بھی تسلیم ہونا چاہیے جسے خود اللہ نے اپنی عبادت کے لیے پسند اور مقرر فرمایا ہے۔

امامت اور ولایت وہ دروازہ ہے جسے اللہ نے اپنی بندگی کے لیے کھولا ہے اور اسی دروازے کے ذریعے اپنی عبادت ممکن قرار دی ہے۔

لہٰذا یہ قابلِ قبول نہیں کہ کوئی شخص اللہ کی معرفت کا دعویٰ کرے لیکن اس امر کے سامنے تسلیم ہونے سے انکار کر دے۔

جو شخص اللہ کو اپنا رب مانتا ہے، اسے اللہ کے نبی کو اس کا نبی اور اللہ کے امام کو اس کا امام بھی ماننا ہو گا۔

اگر ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی وہ شک و تردّد میں مبتلا ہو تو حقیقت میں اس کا شک معرفتِ خدا ہی کی طرف پلٹتا ہے، اور اس طرح وہ حقیقی معرفتِ خدا کا حامل نہیں رہتا۔

پس معرفتِ امامؑ، معرفتِ خدا کا ایک ناگزیر تقاضا ہے۔

ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں:

قَالَ لِي أَبُو جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ: إِنَّمَا يَعْبُدُ اللهَ مَنْ يَعْرِفُ اللهَ، فَأَمَّا مَنْ لَا يَعْرِفُ اللهَ، فَإِنَّمَا يَعْبُدُهُ هَكَذَا ضَلَالًا.

قُلْتُ: جُعِلْتُ فِدَاكَ؛ فَمَا مَعْرِفَةُ اللهِ؟ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: تَصْدِيقُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَ تَصْدِيقُ رَسُولِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ مُوَالَاةُ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ الِائْتِمَامُ بِهِ وَ بِأَئِمَّةِ الْهُدَى عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَ الْبَرَاءَةُ إِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ عَدُوِّهِمْ. هَكَذَا يُعْرَفُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ.

امام باقرؑ نے مجھ سے فرمایا:

"اللہ کی عبادت صرف وہی کرتا ہے جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو۔ اور جو اللہ کی معرفت نہیں رکھتا، وہ اس طرح محض گمراہی میں اس کی عبادت کرتا ہے۔"

میں نے عرض کیا" : **میں آپ پر قربان! معرفتِ خدا کیا ہے؟"**

امامؑ نے فرمایا:

"اللہ عزوجل کی تصدیق کرنا، اس کے رسولؐ کی تصدیق کرنا، علیؑ کی ولایت و دوستی اختیار کرنا، انہیں اور ائمۂ ہدیٰؑ کو اپنا امام و پیشوا ماننا، اور ان کے دشمنوں سے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں بیزاری اختیار کرنا۔ اللہ عزوجل کی معرفت اسی طرح حاصل ہوتی ہے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۰، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۱۔

یہاں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ رسولؐ کو رسول ماننا اور امامؑ کو امام تسلیم کرنا، خود **معرفتِ خدا** کے مفہوم میں شامل ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ **بابِ بندگیِ خدا پر ایمان کے بغیر اللہ پر حقیقی ایمان ممکن نہیں۔**

اسی موضوع میں جابر جعفی نے امام باقرؑ سے ایک اور روایت نقل کی ہے:

إِنَّمَا يَعْرِفُ اللهَ عَزَّوَجَلَّ وَ يَعْبُدُهُ مَنْ عَرَفَ اللهَ وَ عَرَفَ إِمَامَهُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ، وَ مَنْ لَا يَعْرِفُ اللهَ عَزَّوَجَلَّ وَ لَا يَعْرِفُ الْإِمَامَ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ، فَإِنَّمَا يَعْرِفُ وَ يَعْبُدُ غَيْرَ اللهِ هَكَذَا . وَ اللهِ . ضَلَالًا.

"اللہ عزوجل کو حقیقتاً وہی پہچانتا اور اس کی عبادت کرتا ہے جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو اور ہم اہلِ بیتؑ میں سے اپنے امام کو پہچانتا ہو۔ اور جو اللہ عزوجل کی معرفت نہیں رکھتا اور ہم اہلِ بیتؑ میں سے اپنے امام کو نہیں پہچانتا، وہ حقیقت میں اس طرح غیرِ خدا کو پہچانتا اور اسی کی عبادت کرتا ہے—اللہ کی قسم! یہ گمراہی ہے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۱، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۴۔

ایسا شخص حقیقت میں اللہ کے بجائے اپنی خواہشات کی پیروی کر رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن کی زبان میں وہ گمراہ ترین لوگوں میں شمار ہوتا ہے:

عَنْ أَبِي الْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي قَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: «وَ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللهِ» قَالَ: يَعْنِي مَنِ اتَّخَذَ دِينَهُ رَأْيَهُ بِغَيْرِ إِمَامٍ مِنْ أَئِمَّةِ الْهُدَى.

اللہ عزوجل کے اس فرمان کے بارے میں:

وَ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللهِ

"اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے؟"

قرآنِ کریم، سورۂ قصص 28:50۔

ابوالحسنؑ نے فرمایا:

"اس سے مراد وہ شخص ہے جو ائمۂ ہدیٰؑ میں سے کسی امام کے بغیر اپنی ذاتی رائے ہی کو اپنا دین بنا لے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۳۷۴، کتاب الحجۃ، باب من دان اللہ عزوجل بغیر امام من اللہ جل جلالہ، حدیث ۱۔

لہٰذا امامؑ کا انکار حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے انکار کی طرف لوٹتا ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

كَانَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا، ثُمَّ كَانَ الْحَسَنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا، ثُمَّ كَانَ الْحُسَيْنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا، ثُمَّ كَانَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا، ثُمَّ كَانَ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِمَامًا. مَنْ أَنْكَرَ ذَلِكَ كَانَ كَمَنْ أَنْكَرَ مَعْرِفَةَ اللهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَ مَعْرِفَةَ رَسُولِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ.

"رسولِ خداؐ کے بعد امیر المؤمنین علیؑ امام تھے، پھر امام حسنؑ امام ہوئے، پھر امام حسینؑ، پھر علی بن الحسینؑ، اور پھر محمد بن علیؑ امام ہوئے۔ جو شخص اس حقیقت کا انکار کرے، وہ اس شخص کی مانند ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی معرفت اور اس کے رسولؐ کی معرفت کا انکار کرے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۱، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۵۔

اس کے بعد راوی خود اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اس کے زمانے کے امام، **امام جعفر صادقؑ** ہیں، اور وہ اپنی اس معرفت و فہم کو تین مرتبہ امامؑ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔

قرآن میں "ہدایت" اور "ضلالت" کا دقیق مفہوم

اس مقام پر ہمارے لیے **ہدایت** کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ انسان اس وقت تک حقیقی ہدایت یافتہ افراد میں شمار نہیں ہوتا جب تک وہ ائمہؑ کی ولایت کا اقرار نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہ نبوت کے بغیر توحید قابلِ قبول ہے اور نہ امامت کے بغیر نبوت۔ **توحید، نبوت اور امامت** —— یہ تینوں ایک ساتھ جمع ہوں تبھی "ہدایت" کا مفہوم تحقق پاتا ہے؛ ورنہ انسان ابھی "ضلالت" سے باہر نہیں نکلا۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى

"اور بے شک میں اس شخص کے لیے بہت زیادہ بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے، ایمان لائے، عملِ صالح انجام دے اور پھر ہدایت پائے۔" قرآنِ کریم، سورۂ طٰہٰ 20:82۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی مغفرت ان لوگوں کو شامل ہوتی ہے جو توبہ، ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ **ہدایت** بھی حاصل کریں۔

پس ان تین چیزوں کے موجود ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ ہدایت بھی حاصل ہو چکی ہو۔

تو پھر ہدایت کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہوتی ہے؟

امام باقرؑ اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس سوال کا جواب فرماتے ہیں:

وَ اللهِ لَوْ أَنَّهُ تَابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَ لَمْ يَهْتَدِ إِلَى وِلَايَتِنَا وَ مَوَدَّتِنَا وَ مَعْرِفَةِ فَضْلِنَا، مَا أَغْنَى ذَلِكَ عَنْهُ.

"اللہ کی قسم! اگر کوئی شخص توبہ کرے، ایمان لائے اور عملِ صالح انجام دے، لیکن ہماری ولایت، ہماری مودّت اور ہماری فضیلت کی معرفت کی طرف ہدایت نہ پائے تو یہ سب چیزیں اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گی۔"

تفسیر البرہان، ج۳، ص۴۰، حدیث۸۔

اب سوال یہ ہے کہ اس آیت میں **توبہ، ایمان اور عملِ صالح** سے کیا مراد ہے؟

اس سوال کا جواب بھی امام باقرؑ کے کلام میں ملتا ہے:

أَمَّا التَّوْبَةُ فَمِنَ الشِّرْكِ بِاللهِ، وَ أَمَّا الْإِيمَانُ فَهُوَ التَّوْحِيدُ لِلَّهِ، وَ أَمَّا الْعَمَلُ الصَّالِحُ فَهُوَ أَدَاءُ الْفَرَائِضِ، وَ أَمَّا الِاهْتِدَاءُ فَبِوُلَاةِ الْأَمْرِ وَ نَحْنُ هُم.

"توبہ سے مراد اللہ کے ساتھ شرک سے توبہ کرنا ہے، ایمان سے مراد اللہ کی توحید کا اقرار ہے، عملِ صالح سے مراد فرائض کو ادا کرنا ہے، اور ہدایت پانے سے مراد اُولاتِ امر کے ذریعے ہدایت پانا ہے——اور وہ ہم ہیں۔"

تفسیر فرات بن ابراہیم کوفی، ج۱، ص۲۵۷، حدیث۳۵۱۔

اسی طرح اس آیت میں **اہتداء** یعنی "ہدایت پانے" کے مفہوم کے بارے میں داؤد رقّی کہتے ہیں:

میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "یہ وہ کون سی ہدایت ہے جو توبہ، ایمان اور عملِ صالح کے بعد آتی ہے؟"

امامؑ نے فرمایا:

مَعْرِفَةُ الْأَئِمَّةِ. وَ اللهِ. إِمَامٍ بَعْدَ إِمَامٍ.

"اللہ کی قسم! اس سے مراد ائمہؑ کی معرفت ہے——ایک امام کے بعد دوسرے امام کی معرفت۔"

بحار الانوار، ج۲۷، ص۱۹۸، حدیث۶۴، بحوالہ فضائل الشیعہ۔

منکرِ ولایت کا شرک

پس جو شخص اللہ کو پہچانتا ہو، اس پر ایمان رکھتا ہو اور احکامِ الٰہی کے مطابق عمل بھی کرتا ہو، لیکن تمام ائمہؑ کی ولایت و امامت کو نہ پہچانے اور اس کے سامنے تسلیم نہ ہو، وہ ابھی ضلالت سے باہر نہیں نکلا اور اہلِ نجات میں شامل نہیں ہوا۔

ممکن ہے ایسا شخص خود کو مؤمن بھی سمجھتا ہو، لیکن اگر **وُلاتِ امر** کی حقیقت اس پر واضح ہو چکی ہو اور اس کے باوجود وہ ان کے سامنے تسلیم ہونے سے انکار کرے تو حقیقت میں وہ **مشرک** ہے، موحّد نہیں؛ خواہ خود اسے یہ سمجھ نہ آئے کہ وہ کس طرح شرک میں مبتلا ہوا ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى أَخْبَرَ الْعِبَادَ بِطُرُقِ الْهُدَى وَ شَرَعَ لَهُمْ فِيهَا الْمَنَارَ وَ أَخْبَرَهُمْ كَيْفَ يَسْلُكُونَ فَقَالَ: «وَ إِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى». وَ قَالَ: «إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ». فَمَنِ اتَّقَى اللهَ فِيمَا أَمَرَهُ، لَقِيَ اللهَ مُؤْمِنًا بِمَا جَاءَ بِهِ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ. هَيْهَاتَ! هَيْهَاتَ! فَاتَ قَوْمٌ وَ مَاتُوا قَبْلَ أَنْ يَهْتَدُوا وَ ظَنُّوا أَنَّهُمْ آمَنُوا وَ أَشْرَكُوا مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ .أَنَّهُ مَن أَتَى الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا اهْتَدَى، وَ مَنْ أَخَذَ فِي غَيْرِهَا سَلَكَ طَرِيقَ الرَّدَى. وَ صَلَ اللهُ طَاعَةَ وَلِيِّ أَمْرِهِ بِطَاعَةِ رَسُولِهِ، وَ طَاعَةَ رَسُولِهِ بِطَاعَتِهِ. فَمَنْ تَرَكَ طَاعَةَ وُلَاةِ الْأَمْرِ، لَمْ يُطِعِ اللهَ وَ لَا رَسُولَهُ. وَ هُوَ الْإِقْرَارُ بِمَا أُنْزِلَ مِنْ عِنْدِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ.

"بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہدایت کے راستوں سے آگاہ فرمایا، ان راستوں میں ان کے لیے نشانیاں قائم کیں اور انہیں بتایا کہ ان راستوں پر کس طرح چلنا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا:

'اور بے شک میں اس شخص کے لیے بہت زیادہ بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے، ایمان لائے، عملِ صالح انجام دے اور پھر ہدایت پائے۔'

اور فرمایا:

'اللہ صرف متقین ہی سے قبول فرماتا ہے۔'

پس جو شخص اللہ کے احکام کے سلسلے میں تقوائے الٰہی اختیار کرے، وہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ محمدؐ جو کچھ لے کر آئے تھے اس پر ایمان رکھتا ہو گا۔

ہیہات! ہَیہات! ایک قوم ہدایت پانے سے پہلے ہی راہ سے رہ گئی اور مر گئی۔ وہ سمجھتی رہی کہ ایمان لے آئی ہے، حالانکہ اس نے ایسی جگہ سے شرک کیا جہاں سے اسے شعور بھی نہ تھا۔

جو شخص گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا وہ ہدایت پا گیا، اور جس نے ان کے دروازوں کے علاوہ کسی اور راستے سے داخل ہونے کی کوشش کی، اس نے ہلاکت کی راہ اختیار کی۔

اللہ نے اپنے ولیِ امر کی اطاعت کو اپنے رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ اور اپنے رسولؐ کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ پس جو وُلاتِ امر کی اطاعت ترک کر دے، اس نے نہ اللہ کی اطاعت کی اور نہ اس کے رسولؐ کی۔ اور یہی اللہ عزوجل کی جانب سے نازل کردہ امر کا اقرار ہے۔"

اصولِ کافی، ج ۱، ص ۱۸۲، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث ۶۔

ایسے لوگوں کو مشرک قرار دیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ توحید ہونے کے ناتے ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ صرف اللہ کے سامنے تسلیم ہوں اور اس کی بندگی و عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔

لیکن عملاً انہوں نے اسی اللہ کی اطاعت کرنے کے بجائے جسے انہوں نے پہچانا اور قبول کیا تھا، اور عبادت میں اس راستے پر چلنے کے بجائے جسے خود اللہ نے مقرر فرمایا تھا، اپنی رائے اور ذاتی پسند کے مطابق ایک ایسا راستہ اختیار کیا جو اللہ کے مقرر کردہ راستے کے علاوہ تھا۔

گویا وہ گھر میں اس کے مقررہ دروازے کے بجائے کسی اور راستے سے داخل ہونا چاہتے تھے۔

یہ حقیقت میں **شرک** ہے، خواہ انہیں خود اس بات کا شعور نہ ہو کہ یہ شرک ہے۔

یہ اس وجہ سے نہیں کہ انہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ رسولؐ اور امامؑ کی اطاعت ان کا فریضہ ہے؛ بلکہ وہ یہ بات جانتے تھے، لیکن اس گہری حقیقت کو نہیں سمجھ سکے تھے کہ **حجتِ خدا کے سامنے تسلیم نہ ہونا انسان کو دائرۂ توحید سے نکال کر شرک کی طرف لے جاتا ہے۔** اس طرح وہ ایسے شرک میں مبتلا ہوئے جس کا انہیں خود شعور نہ تھا:

أَشْرَكُوا مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ

"انہوں نے ایسی جگہ سے شرک کیا جہاں سے انہیں شعور بھی نہ تھا۔"

کسی شخص کے مشرک ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے عقیدے کے تمام نتائج اور لوازم سے بھی پوری طرح آگاہ ہو۔ جب اسے اپنی ذمہ داری معلوم ہو اور اس پر حجت تمام ہو چکی ہو تو عدالتِ الٰہی کے سامنے محض اس بنا پر معذور نہیں ہو گا کہ وہ اپنے طرزِ فکر کے تمام نتائج سے واقف نہیں تھا۔

بت پرست صراحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح ائمہؑ کا انکار کرنے والے ایسی ہستیوں کا انکار کرتے ہیں جن کا انکار، گزشتہ صریح روایات کے مطابق، اللہ کے انکار کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی حجت کے انکار کو اپنے انکار کے حکم میں قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص ائمۂ طاہرینؑ کی امامت اور ولایت کا انکار کرتا ہے، وہ حقیقت میں اللہ کا انکار کرتا ہے؛ اگرچہ بعض دنیوی مصالح و احکام کے اعتبار سے ان دونوں گروہوں کے فقہی احکام ایک جیسے نہیں ہیں۔

انکارِ امامت کے مختلف درجات

انکارِ امامت کے مختلف درجات ہیں۔ بعض درجات زیادہ شدید ہیں اور بعض نسبتاً کم۔

جو شخص ائمہؑ کو اللہ کی جانب سے مقرر کردہ معصوم پیشوا اور حجتِ الٰہی کے طور پر پہچان چکا ہو، لیکن اس کے باوجود ان کی امامت کے سامنے تسلیم نہ ہو، وہ ان کا منکر ہے؛ خواہ وہ صراحتاً ان کی امامت کا انکار کرے، یا زبان سے صاف انکار نہ کرے لیکن عملاً اسے قبول کرنے سے گریز کرے۔

یہ کیفیت بذاتِ خود **انکار اور جحود** کی ایک صورت ہے۔

اس سے شدید تر درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص ائمہؑ کی مخالفت کرے اور ان سے بیزاری و دشمنی کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھے۔

یہ تمام صورتیں ائمہؑ کی امامت کے انکار کے درجات ہیں، اور اللہ کے حکم و فیصلے کے مطابق ایسا انکار، اللہ کے انکار کے حکم میں ہے۔

البتہ چونکہ انکار کے یہ درجات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس لیے ان سے متعلق بعض شرعی احکام بھی مختلف ہوتے ہیں۔

مثلاً ائمہؑ سے عداوت رکھنے والے شخص کے بارے میں دنیوی فقہی احکام وہ نہیں رہتے جو عام مسلمانوں کے ہیں؛ اس کے بدن کو مسلمانوں کی طرح پاک نہیں سمجھا جاتا، اس کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال نہیں ہوتا، وغیرہ۔

جبکہ انکار کے نسبتاً نچلے درجات میں یہ احکام جاری نہیں ہوتے۔

بہر حال، انکار کے درجات مختلف ہونے کے باوجود منکرینِ امامت ایک بات میں مشترک ہیں:

وہ ائمہؑ کی امامت کے سامنے تسلیم نہیں ہوئے۔

اسی پہلو سے انہیں کافر اور مشرک قرار دیا گیا ہے۔

البتہ یہاں پھر اس نکتے پر توجہ ضروری ہے کہ ممکن ہے انہیں خود اس بات کا علم اور شعور نہ ہو کہ ائمہؑ کی امامت کا انکار حقیقت میں اللہ کے انکار کی طرف لوٹتا ہے۔ لیکن ان کی یہ بے خبری یا غفلت، ان کے کفر و شرک کی حقیقت کو تبدیل نہیں کرتی:

أَشْرَكُوا مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ

"انہوں نے ایسی جگہ سے شرک کیا جہاں سے انہیں شعور بھی نہ تھا۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَ يَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ

"بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور اس سے کم جس گناہ کو چاہے بخش دیتا ہے۔"

قرآنِ کریم، سورۂ نساء 4:48۔

پس دین میں سب سے اہم مسئلہ **امامت اور ولایت** ہی ہے، کیونکہ یہی باقی تمام امور کی حفاظت اور ضمانت کرتی ہیں۔ ان کے بغیر کسی چیز — حتیٰ کہ توحید، جو دین کی بنیاد اور روح ہے — کے صحیح طور پر تحقق کی کافی ضمانت باقی نہیں رہتی۔

اگر توحید کے بارے میں اہلِ بیتؑ کی تعلیمات موجود نہ ہوتیں تو خدا شناس لوگ معرفتِ خدا کے صحیح راستے پر قائم نہ رہ سکتے۔

شیطانی القاءات اور وسوسوں کے زیرِ اثر سب کے سب خالقِ متعال کے بارے میں گمراہی اور **تشبیہ** میں مبتلا ہو جاتے۔

آج بھی، جبکہ ہماری حدیثی کتابیں ائمہؑ کے توحیدی خطبات اور تعلیمات سے بھری ہوئی ہیں اور یہ تعلیمات صدیوں سے بہت سے مسلمان مفکرین کی دسترس میں رہی ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ بیتؑ کے حقیقی پیروکار ـــــ یعنی حقیقی اہلِ توحید ـــــ دوسروں کی نسبت بہت کم ہیں۔

پھر اگر اہلِ بیتؑ کا وجود ہی نہ ہوتا اور انہوں نے یہ تعلیمات بیان نہ فرمائی ہوتیں تو صورتِ حال کیا ہوتی؟

ایسی صورت میں کہا جا سکتا تھا کہ کوئی حقیقی موحّد باقی نہ رہتا۔

بہر حال، امامت وولایت کا انکار دراصل دین کی بنیاد اور اساس کا انکار ہے۔ یہ انسان کو دائرۂ توحید سے نکال کر شرک کے دائرے میں لے جاتا ہے۔

البتہ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اس میں کوئی تضاد نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اس گروہ کے لیے دنیا میں بعض ایسے احکام مقرر فرمائے جن میں ان کے ظاہری شرعی احکام اہلِ ایمان کے بعض احکام کے ساتھ مشترک ہوں۔

مثلاً جو لوگ ولایت کو قبول نہیں کرتے لیکن اہلِ بیتؑ سے دشمنی اور عداوت بھی نہیں رکھتے، ان کے بدن کو پاک قرار دیا جاتا ہے؛ جبکہ وہ غیر مسلم مشرکین جو کھلے طور پر اللہ کا انکار کرتے ہیں، ان کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔

یہ دنیوی حکم ان سے کفر و شرک کی حقیقت کو ختم نہیں کرتا۔ یہ صرف بعض دنیوی مصالح کے پیشِ نظر مقرر کیا گیا ہے اور موت کے ساتھ اس کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے؛ آخرت میں اس حکم کا کوئی اثر نہیں رہتا۔

منکرِ امامؑ ـــــ مسلمان ہوتے ہوئے کافر

اس وضاحت کے بعد یہ استدلال درست نہیں ہو گا کہ:

”چونکہ شیعہ، ائمہؑ کا انکار کرنے اور ان کے فرامین کو رد کرنے والوں کو کافر اور غیر مسلم قرار نہیں دیتے، لہٰذا ولایت و امامت ایمان کا بنیادی جز نہیں ہو سکتیں؛ ورنہ ان کے انکار سے انسان کافر اور مرتد ہو جاتا۔“

واقعہ یہ ہے کہ شیعہ ائمہؑ کے منکرین کو **مسلمان** بھی سمجھتے ہیں اور اسی کے ساتھ انہیں **کافر** بھی قرار دیتے ہیں۔

یہاں مراد وہ **کفر ہے جو ایمان کے مقابلے میں ہے، نہ کہ اسلام کے مقابلے میں۔**

جو کفر اسلام کے مقابلے میں ہو وہ انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر کے الحاد یا ارتداد تک لے جاتا ہے؛ لیکن جو کفر ایمان کے مقابلے میں ہو، وہ ظاہری اسلام کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔

لہٰذا ممکن ہے کوئی شخص ظاہری اعتبار سے مسلمان ہو، لیکن ایمان کے مقابلے میں کفر کا حامل ہو؛ اور اس نوع کا کفر ضروری نہیں کہ اسے مرتد بنا دے یا دنیوی و فقہی اعتبار سے دائرۂ اسلام سے خارج کر دے۔

پس اگرچہ **امامت ایمان کا بنیادی رکن، بلکہ اس کی اساس اور روح ہے،** لیکن اگر ظاہری اسلام برقرار ہو تو اس کا انکار لازماً انسان کو دنیا کے فقہی احکام میں دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

رسولِ خداؐ فرماتے ہیں:

حَدَّثَنِي جَبْرَئِيلُ عَنْ رَبِّ الْعِزَّةِ جَلَّ جَلَالُهُ أَنَّهُ قَالَ:

مَنْ عَلِمَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا وَحْدِي، وَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدِي وَ رَسُولِي، وَ أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ خَلِيفَتِي، وَ أَنَّ الْأَئِمَّةَ مِنْ وُلْدِهِ حُجَجِي، أَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِي، وَ نَجَّيْتُهُ مِنَ النَّارِ بِعَفْوِي، وَ أَبَحْتُ لَهُ جِوَارِي، وَ أَوْجَبْتُ لَهُ كَرَامَتِي، وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْهِ نِعْمَتِي، وَ جَعَلْتُهُ مِنْ خَاصَّتِي وَ خَالِصَتِي. إِنْ نَادَانِي لَبَّيْتُهُ، وَ إِنْ دَعَانِي أَجَبْتُهُ، وَ إِنْ سَأَلَنِي أَعْطَيْتُهُ، وَ إِنْ سَكَتَ ابْتَدَأْتُهُ، وَ إِنْ أَسَاءَ رَحِمْتُهُ، وَ إِنْ فَرَّ مِنِّي دَعَوْتُهُ، وَ إِنْ رَجَعَ إِلَيَّ قَبِلْتُهُ، وَ إِنْ قَرَعَ بَابِي فَتَحْتُهُ.

وَ مَنْ لَمْ يَشْهَدْ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا وَحْدِي، أَوْ شَهِدَ بِذَلِكَ وَ لَمْ يَشْهَدْ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدِي وَ رَسُولِي، أَوْ شَهِدَ بِذَلِكَ وَ لَمْ يَشْهَدْ أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ خَلِيفَتِي، أَوْ شَهِدَ بِذَلِكَ وَ لَمْ يَشْهَدْ أَنَّ الْأَئِمَّةَ مِنْ وُلْدِهِ حُجَجِي، فَقَدْ جَحَدَ نِعْمَتِي، وَ صَغَّرَ عَظَمَتِي، وَ كَفَرَ بِآيَاتِي وَ كُتُبِي. إِنْ قَصَدَنِي حَجَبْتُهُ، وَ إِنْ سَأَلَنِي حَرَمْتُهُ، وَ إِنْ نَادَانِي لَمْ أَسْمَعْ نِدَاءَهُ، وَ إِنْ دَعَانِي لَمْ أَسْتَجِبْ دُعَاءَهُ، وَ إِنْ رَجَانِي خَيَّبْتُهُ، وَ ذَلِكَ جَزَاؤُهُ مِنِّي، وَ مَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ.

”جبرئیلؑ نے ربّ العزت ـــ جلّ جلالہ ـــ کی جانب سے مجھ سے بیان کیا کہ اللہ نے فرمایا:

جو شخص یہ جان لے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں یکتا ہوں؛ محمدؐ میرے بندے اور رسول ہیں؛ علی بن ابی طالبؑ میرے خلیفہ ہیں؛ اور ان کی اولاد سے ائمہؑ میری حجتیں ہیں ـــ میں اپنی رحمت سے اسے جنت میں داخل کروں گا، اپنے عفو سے اسے آگ سے نجات دوں گا، اسے اپنے قرب میں رہنے کی اجازت دوں گا، اپنی کرامت اس کے لیے لازم قرار دوں گا، اپنی نعمت اس پر تمام کروں گا اور اسے اپنے خاص اور برگزیدہ بندوں میں قرار دوں گا۔

اگر وہ مجھے پکارے گا تو میں لبیک کہوں گا، اگر مجھ سے دعا کرے گا تو اس کی دعا قبول کروں گا، اگر مجھ سے مانگے گا تو اسے عطا کروں گا، اگر خاموش رہے گا تو خود اپنی عنایت میں پہل کروں گا، اگر وہ خطا کرے گا تو اس پر رحم کروں گا، اگر مجھ سے دور بھاگے گا تو اسے اپنی طرف بلاؤں گا، اگر میری طرف پلٹے گا تو اسے قبول کروں گا، اور اگر میرے دروازے پر دستک دے گا تو اس کے لیے دروازہ کھول دوں گا۔

اور جو شخص اس بات کی گواہی نہ دے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میں یکتا ہوں؛ یا اس کی گواہی تو دے لیکن یہ گواہی نہ دے کہ محمدؐ میرے بندے اور رسول ہیں؛ یا اس کی بھی گواہی دے لیکن یہ نہ مانے کہ علی بن ابی طالبؑ میرے خلیفہ ہیں؛ یا یہ بھی مانے لیکن اس بات کی گواہی نہ دے کہ علیؑ کی اولاد سے ائمہؑ میری حجتیں ہیں ـــ اس نے میری نعمت کا جحود کیا، میری عظمت کو حقیر جانا اور میری آیات اور میری کتابوں کا کفر کیا۔

اگر وہ میرا قصد کرے گا تو میں اسے اپنے سے محجوب رکھوں گا؛ اگر مجھ سے مانگے گا تو اسے محروم کر دوں گا؛ اگر مجھے پکارے گا تو اس کی پکار نہیں سنوں گا؛ اگر مجھ سے دعا کرے گا تو اس کی دعا قبول نہیں کروں گا؛ اور اگر مجھ سے امید رکھے گا تو اس کی امید پوری نہیں کروں گا۔

یہ میری جانب سے اس کی جزا ہے، اور میں اپنے بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔“

کمال الدین، باب ۲۴، حدیث ۳۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ جو شخص ائمہؑ کی ولایت کو رد کر دے، اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے لیے کوئی حقیقی مقام و منزلت باقی نہیں رہتی۔

حتیٰ کہ توحید و نبوت پر ایمان، بلکہ امیر المؤمنین علیؑ کی امامت کا اعتقاد بھی، اگر باقی ائمہؑ کے انکار کے ساتھ ہو تو انسان کو لطف و عنایتِ الٰہی کا مستحق نہیں بناتا۔

گزشتہ تمام مباحث کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ:

تمام خیر و برکت صرف تمام ائمہؑ کی ولایت کو قبول کرنے کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

مذکورہ روایت ان بے شمار اور عظیم نعمتوں اور عنایاتِ الٰہی کی صرف ایک جھلک پیش کرتی ہے جو **اہلِ ولایت اور صاحبانِ معرفتِ ائمہؑ** کو عطا ہوتی ہیں۔

ولایت — توحید کی لازمی شرط

اس سلسلے میں ایک نہایت مشہور حدیث ہے جسے **حدیثِ سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر)** کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کی سند میں آٹھ معصوم ہستیاں شامل ہیں۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب امام رضاؑ مدینہ سے مرو کی جانب سفر کرتے ہوئے نیشاپور پہنچے۔ جب آپؑ وہاں سے روانہ ہونے لگے تو محدثین اور علمائے حدیث آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"آپؑ ہمارے درمیان سے تشریف لے جا رہے ہیں؛ کیا آپؑ ہمارے لیے کوئی حدیث بیان نہیں فرمائیں گے تاکہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں؟"

امامؑ اپنے کجاوے میں تشریف فرما تھے۔ آپؑ نے اپنا سرِ مبارک کجاوے سے باہر نکالا اور فرمایا:

سَمِعتُ اَبی موسَی بنَ جَعفَرٍ یَقُولُ: سَمِعتُ اَبی جَعفَرَ بنَ مُحَمَّدٍ یَقولُ: سَمِعتُ اَبی مُحَمَّدَ بنَ عَلِیٍّ یَقولُ: سَمِعتُ اَبی عَلِیَّ بنَ الحُسَینِ یَقُولُ: سَمِعتُ اَبی الحُسَینَ بنَ عَلِیٍّ یَقولُ: سَمِعتُ اَبی اَمیرَالمُؤمِنینَ عَلِیَّ بنَ اَبی طالبٍ علیهم السّلام یَقولُ: سَمِعتُ النَبِیَّ صلی الله علیه و آله و سلم یَقولُ: سَمِعتُ اللهَ عَزَّوَجَلَّ

يَقُولُ: لا اِلهَ اِلّا اللهُ حِصنی. فَمَن دَخَلَ حِصنی، اَمِنَ مِن عَذابی. (فَلَمّا مَرَّتِ الرّاحِلَةُ نَادانا:) بِشُروطِها. وَ اَنَا مِن شُروطِها(1) .

''میں نے اپنے والد موسیٰ بن جعفرؑ سے سنا، انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے والد جعفر بن محمدؑ سے سنا، انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے والد محمد بن علیؑ سے سنا، انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے والد علی بن الحسینؑ سے سنا، انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے والد حسین بن علیؑ سے سنا، انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے والد امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ سے سنا، انہوں نے فرمایا: میں نے رسولِ خداؐ سے سنا، آپؐ نے فرمایا: میں نے اللہ عزوجل کو فرماتے ہوئے سنا:

'لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ میرا قلعہ ہے؛ پس جو میرے قلعے میں داخل ہو گیا، وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔'

پھر جب امامؑ کی سواری آگے بڑھ گئی تو آپؑ نے ہمیں پکار کر فرمایا:

'اس کی کچھ شرطیں ہیں، اور میں ان شرطوں میں سے ایک ہوں۔'''

(1) عیون اخبار الرضاؑ، باب ۳۷، حدیث ۴۔

پس کلمۂ توحید ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ ''اسی وقت عذابِ الٰہی سے نجات کا ذریعہ بنتا ہے جب اس کے ساتھ ائمہؑ کی ولایت بھی موجود ہو۔ در حقیقت خالص اور حقیقی توحید اسی صورت میں متحقق ہوتی ہے۔

اسی بنا پر امیر المؤمنین علیؑ کی ولایت بھی وہی اثر رکھتی ہے جو خود کلمۂ توحید کا ہے:

عَنِ الرِّضا، عَن اَبیهِ، عَن آبائِهِ، عَن عَلِیِّ بنِ اَبی طالِبٍ علیهم السّلام، عَنِ النَّبِیِّ صلی الله علیه و آله و سلم عَن جَبرئیلَ، عَن میکائیلَ، عَن اِسرافیلَ، عَن اللَّوحِ، عَنِ القَلَمِ قالَ: یَقولُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: وِلایَةُ عَلِیِّ بنِ اَبی طالِبٍ حِصنی. فَمَن دَخَلَ حِصنی، اَمِنَ مِن عَذابی(1) .

''امام رضاؑ نے اپنے آبائے طاہرینؑ سے، انہوں نے علی بن ابی طالبؑ سے، انہوں نے رسولِ خداؐ سے، آپؐ نے جبرئیلؑ سے، انہوں نے میکائیلؑ سے، انہوں نے اسرافیلؑ سے، انہوں نے لوح سے اور لوح نے قلم سے نقل کیا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے:

'علی بن ابی طالبؑ کی ولایت میرا قلعہ ہے؛ پس جو میرے قلعے میں داخل ہو گیا، وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔'''

(1) عیون اخبار الرضاؑ، باب ۳۸، حدیث ۱۔

مذکورہ دونوں احادیث ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں، کیونکہ **امیر المؤمنین علیؑ کی ولایت، توحیدِ الٰہی کی روح اور اس کی محافظ وضامن ہے۔**

ممکن ہے کوئی شخص بظاہر اہلِ توحید دکھائی دے، لیکن اگر وہ اہلِ ولایت نہیں ہے تو اس کی توحید قابلِ قبول نہیں۔ اس کے برعکس، اگر کوئی شخص حقیقتاً امیر المؤمنین علیؑ کی ولایت کو قبول کرنے والا ہے تو نہ صرف اس کی توحید قابلِ قبول ہے بلکہ اس نے رسولِ اکرمؐ کی نبوت ورسالت کا بھی اقرار کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ اور دیگر ائمہؑ کی ولایت **توحید و نبوت دونوں کی روح اور اساس** ہے۔

اسی حقیقت کو ایک معاصر شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

توحید و نبوّت و امامت ہر سہ در گفتنِ یک علی ولیّ اللہ است

"توحید، نبوت اور امامت ـــــ یہ تینوں 'علی ولیُّ اللہ' کہنے میں جمع ہیں۔(2) "

البتہ یہاں **"کہنے"** سے مراد صرف زبان سے الفاظ ادا کر دینا نہیں، بلکہ **دل سے اعتقاد رکھنا اور اس حقیقت کو قبول کرنا** ہے۔

(2) خلوتگاہِ راز، حبیب چایچیان۔

امیر المؤمنین علیؑ کا اپنے کلام میں تعارف

ایک صاحبِ عقل انسان جب علیؑ کو حقیقتاً پہچان لے تو پھر ان کی ولایت اور اپنے اوپر ان کے حقِ ولایت کے سامنے تسلیم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

امیر المؤمنین علیؑ اپنے مقام کا تعارف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

اَنَا الهادی، اَنَا المُهتَدی، وَ اَنَا اَبُوالیَتامی، وَ المَساکینِ وَ زَوجُ الاَرامِلِ. وَ اَنَا مَلجَاُ کُلِّ ضَعیفٍ وَ مَأمَنُ کُلِّ خائِفٍ. وَ اَنَا قائِدُ المُؤمِنینِ [اِلَی الجَنَّةِ]. وَ اَنَا حَبلُ اللهِ المَتینُ. وَ اَنَا عُروَةُ اللهِ الوُثقی وَ کَلِمَةُ اللهِ التَّقوی. وَ اَنَا عَینُ اللهِ وَ لِسانُهُ الصّادِقُ وَ یَدُهُ. وَ اَنَا جَنبُ اللهِ الَّذی یَقُولُ: «اَن تَقولَ نَفسٌ یا حَسرتی عَلی ما فَرَّطتُ فی جَنبِ اللهِ».(1) وَ اَنَا یَدُ اللهِ المَبسوطَةُ عَلی عِبادِهِ بِالرَّحمَةِ وَ المَغفِرَةِ. وَ اَنَا بابُ

حِطَّةٍ. مَن عَرَفَنی وَ عَرَفَ حَقّی، فَقَد عَرَفَ رَبُّهُ. لِاَنّی وَصِیُّ نَبِیِّهِ فی اَرضِهِ وَ حُجَّتُهُ عَلی خَلقِهِ. لا یُنکِرُ هذا اِلّا رادٌّ عَلَی اللهِ وَ عَلی رَسُولِهِ(2).

''میں ہادی ہوں اور خود ہدایت یافتہ ہوں۔ میں یتیموں اور مسکینوں کا باپ اور بیوہ عورتوں کا سرپرست ہوں۔ میں ہر کمزور کی پناہ گاہ اور ہر خوف زدہ کے لیے مقامِ امن ہوں۔

میں مؤمنین کا قائد [جنت کی طرف] ہوں۔ میں اللہ کی مضبوط رسی ہوں۔ میں اللہ کا محکم دستاویز اور کلمۂ تقویٰ ہوں۔ میں عین اللہ، اس کی سچی زبان اور اس کا ہاتھ ہوں۔

میں 'جنب اللہ' ہوں، جس کے بارے میں اللہ فرماتا ہے:

»اَن تَقولَ نَفسٌ یا حَسرتی عَلی ما فَرَّطتُ فی جَنبِ اللهِ«

'کہیں کوئی نفس یہ نہ کہے: ہائے افسوس! میں نے جنبِ اللہ کے حق میں جو کوتاہی کی۔'

اور میں اللہ کا وہ کشادہ ہاتھ ہوں جو اس کے بندوں پر رحمت اور مغفرت کے ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ میں بابِ حطّہ ہوں۔

جس نے مجھے پہچانا اور میرے حق کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا؛ کیونکہ میں زمین میں اس کے نبیؐ کا وصی اور اس کی مخلوق پر اس کی حجت ہوں۔

اس حقیقت کا انکار وہی شخص کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو رد کرنے والا ہو۔''

(1) سورۂ زمر 39:56۔

(2) معانی الاخبار، ص ۱۷—۱۸۔

لفظ ''جنب'' کے لغوی معنی کسی شخص کے پہلو یا جانب کے ہیں۔ اسی مناسبت سے جو چیز کسی کے انتہائی قریب ہو، اسے بھی اس کی جانب یا پہلو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

امیر المؤمنین علیؑ، باوجود اس کے کہ اللہ کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ سے اپنے انتہائی قرب اور اس کی جانب سے عطا کردہ بلند مقام کے سبب ''جنب اللہ'' کہلاتے ہیں۔ اسی بنا پر آپؑ کے حق میں کوتاہی کو اللہ کے حق میں کوتاہی شمار کیا گیا ہے۔

یہ تعبیر ہر گز اس معنی میں نہیں کہ ـــــ معاذ اللہ ـــــ امیر المؤمنینؑ اللہ کا کوئی جزیا جسمانی ''پہلو'' ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسم، اجزاء اور مخلوقات کی صفات سے منزّہ ہے۔ **''جنب اللہ''** دراصل اس قربِ خاص اور منصبِ الٰہی کی تعبیر ہے جو اللہ نے امیر المؤمنینؑ کو عطا فرمایا ہے۔

مذکورہ حدیث میں استعمال ہونے والی دوسری تعبیرات ـــــ جیسے **عین اللہ، لسان اللہ اور ید اللہ** ـــــ کی وضاحت گزشتہ مباحث میں ہو چکی ہے۔ یہ تمام تعبیرات بھی اللہ کی جانب سے عطا کردہ منصب، قرب اور وساطت کو بیان کرتی ہیں، نہ کہ کسی قسم کی الوہیت یا اللہ سے مستقل قدرت و اختیار کو۔

اس حدیث سے ہمارے لیے جو بنیادی حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

امامؑ کی معرفت اور ان کے حق کی معرفت کے بغیر رب کی حقیقی معرفت ممکن نہیں۔

کیونکہ امامؑ اور ان کے حق کا انکار، حقیقت میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم و حجت کو رد کرنا ہے۔

باب سوم: دینداری میں تولّیٰ اور تبرّیٰ کا کردار

حقیقتِ ایمان ـــ اہلِ بیتؑ کی خاطر محبت اور دشمنی

تمہید

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہوئی کہ دین کی حقیقت اور اسلام کی روح، **اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بندگی اور تسلیم** ہے۔ لہٰذا عبادات کو اپنا حقیقی اثر دکھانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ عبادت گزار کے اندر یہی کیفیت پیدا کریں۔

اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسری تمام عبادات اسی لیے مقرر کی گئی ہیں کہ بندے کو اللہ کے سامنے اس طرح تسلیم و فرمانبردار بنائیں جس طرح اللہ چاہتا ہے۔ اگر یہ عبادات انسان میں یہ اثر پیدا نہ کریں تو وہ روح سے خالی محض ظاہری صورتیں رہ جاتی ہیں؛ بالکل ان بے جان پتلوں کی طرح جو شکل و صورت میں انسان سے مشابہ ہوتے ہیں، مگر انسانیت کی کوئی حقیقی صفت اپنے اندر نہیں رکھتے۔

انسان ہونا محض ظاہری جسم و صورت سے وابستہ نہیں، بلکہ **انسان کی روح** ہی اس کے جسم کو انسانی قدر و منزلت عطا کرتی ہے۔

عبادت کی روح ـــ اللہ کے حضور فروتنی اور تسلیم

اسی طرح عبادات کی روح بھی **اللہ تعالیٰ کے سامنے تسلیم، فروتنی اور بندگی** ہے۔ پروردگار کے سامنے تسلیم کے بغیر انجام پانے والے اعمال ایسے جسم کی مانند ہیں جس میں روح نہ ہو اور ایسی صورت کی مانند ہیں جس میں زندگی نہ ہو۔

اسی لیے اگر عبادت گزار کے اندر **عُجب** ـــ یعنی اپنے عمل پر خود پسندی اور خود ستائی ـــ پیدا ہو جائے تو یہی کیفیت اس کے تمام اعمال کو تباہ کر دیتی ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

مَن دَخَلَهُ العُجبَ هَلَکَ(1) .

"جس شخص کے اندر عُجب داخل ہو گیا، وہ ہلاک ہو گیا۔"

(1) اصولِ کافی، ج ۲، ص ۳۱۳، کتاب الایمان والکفر، باب العجب، حدیث ۲۔

کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو انہی عبادات کے ذریعے اللہ سے دور ہو گئے، جبکہ ان کا گمان یہ تھا کہ وہ انہی اعمال کے ذریعے اس سے قریب ہو رہے ہیں!

رسولِ خداؐ فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

قالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: ... .اِنَّ مِن عِبادِیَ المُؤمِنینَ لِمَن یَجتَهِدُ فی عِبادَتی فَیقُومُ مِن رُقادِهِ وَ لَذیذِ وَسادِهِ فَیَتَهَجَّدُ لِیَ اللَّیالِیَ فَتَتعَبُ نَفسُهُ فی عِبادَتی، فَاَضرِبُهُ بِالنُّعاسِ اللَّیلَةَ وَ اللَّیلَتَینِ، نَظَراً مِنّی لَهُ وَ اِبقاءً عَلَیهِ. فَیَنامُ حَتّی یُصبِحُ فَیَقُومُ وَ هُوَ ماقِتٌ لِنَفسِهِ زارِئٌ عَلَیها. وَ لَو اُخَلّی بَینَهُ وَ بَینَ ما یُریدُ مِن عِبادَتی، لَدَخَلَهُ العُجبُ مِن ذلِکَ فَیُصَیِّرُهُ العُجبُ اِلَی الفِتنَةِ بِاَعمالِهِ فَیَأتیهِ مِن ذلِکَ ما فیهِ هَلاکُهُ لِعُجبِهِ بِاَعمالِهِ وَ رِضاهُ عَن نَفسِهِ حَتّی یَظُنَّ اَنَّهُ قَد فاقَ العابِدینَ وَ جازَ فی عِبادَتِهِ حَدَّ التَّقصیرِ فَیَتَباعَدُ مِنّی عِندَ ذلِکَ وَ هُوَ یَظُنُّ اَنَّهُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ(2) .

”میرے مؤمن بندوں میں بعض ایسے ہیں جو میری عبادت میں بہت زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی نیند اور آرام دہ بستر کو چھوڑ کر اٹھتے ہیں اور راتوں کو میرے لیے عبادت و تہجد میں گزارتے ہیں، یہاں تک کہ میری عبادت میں ان کا جسم تھک جاتا ہے۔ میں اس پر اپنی عنایت اور اسے راہِ بندگی پر محفوظ رکھنے کے لیے ایک یا دو راتیں اس پر نیند غالب کر دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ صبح تک سوتا رہتا ہے۔ جب بیدار ہوتا ہے تو اپنے آپ سے ناراض ہوتا اور خود کو ملامت کرتا ہے۔

لیکن اگر میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دوں تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق میری عبادت کرتا رہے تو انہی عبادات کی وجہ سے اس میں عُجب پیدا ہو جائے گا۔ پھر یہی عُجب اسے اپنے اعمال کے بارے میں فریب میں مبتلا کر دے گا، اور اس کے اعمال پر غرور اور اپنے آپ سے راضی ہونے کی وجہ سے وہ ہلاکت تک پہنچ جائے گا۔

یہاں تک کہ وہ یہ گمان کرنے لگے گا کہ وہ تمام عبادت گزاروں سے آگے نکل گیا ہے اور اپنی عبادت میں ہر قسم کی کوتاہی کی حد سے گزر چکا ہے۔ اس وقت وہ مجھ سے دور ہو جائے گا، جبکہ اس کا گمان یہ ہو گا کہ وہ میرے قریب ہو رہا ہے۔“

(2) اصولِ کافی، ج ۲، ص ۶۰، کتاب الایمان والکفر، باب الرضا بالقضاء، حدیث ۴۔

پس اگر عبادات راہِ بندگی میں انسان کے اندر اللہ کے سامنے تسلیم کی کیفیت کو بڑھانے کا سبب نہ بنیں تو وہ اسے پروردگار کے قریب کرنے کے بجائے رضائے الٰہی سے دور کر دیتی ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں کبھی ایک گناہ، اللہ کے نزدیک ایک نیکی سے بہتر ہو جاتا ہے۔

امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:

سَيِّئَةٌ تَسُوؤُکَ خَيرٌ عِندَاللهِ مِن حَسَنَةٍ تُعجِبُکَ(1) .

"وہ برائی جو تمہیں رنجیدہ کر دے، اللہ کے نزدیک اس نیکی سے بہتر ہے جو تمہیں عُجب میں مبتلا کر دے۔"

(1) نہج البلاغہ، فیض الاسلام، حکمت ۴۳۔

وہ گناہ جس کے ارتکاب پر انسان رنجیدہ اور شرمندہ ہو، اسے توبہ، دعا اور اللہ کے حضور اپنی کوتاہی سے درگزر کی التجا کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی کیفیت اللہ تعالیٰ کے سامنے بندگی اور تسلیم کا اظہار ہے۔

اس کے برعکس، وہ نیکی جو انسان کو اپنے آپ پر فریفتہ، خوش اور مطمئن کر دے، اس کے اندر خود پرستی اور خود بینی کی روح کو بیدار کرتی ہے۔ انسان اپنی نظر میں جتنا بڑا ہوتا جاتا ہے، اپنے پروردگار کے سامنے اتنا ہی کم اپنے آپ کو چھوٹا اور عاجز محسوس کرتا ہے، اور یوں حقیقتِ بندگی سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

لہٰذا اللہ کی بندگی کا معیار صرف یہ نہیں کہ انسان کتنی عبادات انجام دیتا ہے۔ یہ اعمال اسی وقت حقیقی عبادت بنتے ہیں جب انسان کو اللہ کے سامنے تسلیم اور اس کے حکم کا فرمانبردار بنائیں۔

اسی بنا پر کبھی اللہ اپنے مؤمن بندے کو ایسے نیک عمل سے بھی روک دیتا ہے جو اس کے اندر روحِ بندگی کو تباہ کر سکتا ہو۔ اللہ اپنے مؤمن بندے کی بھلائی چاہتا ہے، اس لیے اس کی ایسی تدبیر فرماتا ہے کہ وہ عُجب کا شکار نہ ہو۔

البتہ یہ خاص عنایت مؤمنین کے لیے ہے؛ یعنی ان لوگوں کے لیے جنہوں نے خود کو اپنے پروردگار کی **ولایت اور سرپرستی** میں دے دیا ہے اور اپنے اختیار اور مصلحت کو اس کے سپرد کر دیا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ اللہ ان کی بھلائی کو سب سے بہتر جانتا ہے اور ان کے ساتھ وہی معاملہ فرماتا ہے جس میں ان کی خیر و مصلحت ہو۔

یہیں **رضا بالقضاء—اللہ کے فیصلے پر راضی رہنے** کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔

مؤمن بندہ جانتا ہے کہ اگر اس نے اپنے پروردگار کی ولایت و سرپرستی قبول کرلی ہے تو پھر اسے جو خوشی یا سختی پیش آئے، بالآخر اسی کی بھلائی کے لیے ہے اور اس میں اس کے لیے کوئی حقیقی شر نہیں۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

فیما اَوحَی اللهُ عَزَّوَجَلَّ اِلی موسَی بنِ عِمرانَ علیه السّلام: یا موسَی بنِ عِمرانَ، ما خَلَقتُ خَلقاً اَحَبَّ اِلَیَّ مِن عَبدِیَ المُؤمِنِ. فَاِنّی اِنَّما اَبتَلیهِ لِما هُوَ خَیرٌ لَهُ. وَ اُعافیهِ لِما هُوَ خَیرٌ لَهُ. وَ اَزوی عَنهُ ما هُوَ شَرٌّ لَهُ لِما هُوَ خَیرٌ لَهُ. وَ اَنَا اَعلَمُ بِما یَصلَحُ عَلَیهِ عَبدی. فَلیَصبِر عَلی بَلائی، وَ لیَشکُر نَعمائی، وَ لیَرضَ بِقَضائی، اَکتُبهُ فِی الصِّدّیقینَ عِندی، اِذا عَمِلَ بِرِضائی وَ اَطاعَ اَمری(1) .

"اللہ عزوجل نے موسیٰ بن عمرانؑ کی طرف جو وحی فرمائی، اس میں یہ بھی تھا:

اے موسیٰ بن عمران! میں نے اپنی مخلوق میں اپنے مؤمن بندے سے زیادہ محبوب کسی کو پیدا نہیں کیا۔ میں اگر اسے آزمائش میں مبتلا کرتا ہوں تو اس لیے کہ اسی میں اس کی بھلائی ہے؛ اور اگر اسے عافیت عطا کرتا ہوں تو اس لیے کہ اسی میں اس کی بھلائی ہے؛ اور اگر کسی ایسی چیز کو اس سے دور رکھتا ہوں جو اس کے لیے نقصان دہ ہے تو یہ بھی اسی کی خیر و مصلحت کے لیے ہے۔

میں سب سے بہتر جانتا ہوں کہ میرے بندے کی بھلائی کس چیز میں ہے۔ پس اسے چاہیے کہ میری آزمائش پر صبر کرے، میری نعمتوں کا شکر ادا کرے اور میرے فیصلے پر راضی رہے۔ جب وہ میری رضا کے مطابق عمل کرے اور میرے حکم کی اطاعت کرے تو میں اسے اپنے نزدیک صدیقین میں لکھ دوں گا۔"

(1) اصولِ کافی، ج ۲، ص ۶۱، کتاب الایمان والکفر، باب الرضا بالقضاء، حدیث ۷۔

یہ اپنے مؤمن بندے پر اللہ کی **ولایت و سرپرستی** کا ایک جلوہ ہے: اللہ اس کی بہترین انداز سے تدبیر فرماتا ہے اور اسے ایسے راستے پر جانے نہیں دیتا جس میں اس کی حقیقی مصلحت نہ ہو، خواہ بظاہر وہ راستہ عبادت اور نیک اعمال ہی کا کیوں نہ دکھائی دے۔

مؤمن بندے پر ولایتِ الٰہی کا تصرف

پس اللہ کی بندگی کا حاصل یہ ہے کہ انسان اس کے سامنے سراپا تسلیم ہو جائے اور اللہ نے اس کے لیے جو کچھ اختیار کیا ہے اس پر راضی رہے، خواہ وہ اس کی اپنی خواہش کے مطابق ہو یا اس کے برخلاف۔

ایسا شخص حقیقتاً **ولایتِ الٰہی** کو قبول کر چکا ہے، اور انسان کے مؤمن ہونے کی پہچان بھی اسی کیفیت سے ہوتی ہے۔

...عَمَّن ذَکَرَہُ، عَن اَبی عَبدِاللهِ علیه السّلام قالَ: قُلتُ لَهُ: بِاَیِّ شَیءٍ یَعلَمُ المؤمِنُ بِاَنَّهُ مُؤمِنٌ؟ قالَ: بِالتَّسلیمِ لِلّهِ وَ الرِّضا فیما وَرَدَ علَیهِ مِن سُرورٍ اَو سَخَطٍ(1) .

راوی کہتا ہے: **"میں نے امام صادقؑ سے عرض کیا: مؤمن کس چیز کے ذریعے جان سکتا ہے کہ وہ حقیقتاً مؤمن ہے؟"**

آپؑ نے فرمایا: **"اللہ کے سامنے تسلیم ہونے اور جو کچھ اس پر وارد ہو ــــ خواہ خوشی کا باعث ہو یا ناگواری کا ــــ اس پر راضی رہنے کے ذریعے۔"**

(1) اصولِ کافی، ج ۲، ص ۶۲، کتاب الایمان والکفر، باب الرضا بالقضاء، حدیث ۱۲۔

اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام عبادات، اگر حقیقتاً اللہ کی عبادت ہوں، تو انہیں عبادت گزار کی روح میں یہی اثر پیدا کرنا چاہیے۔

نماز، روزہ، حج اور دوسری عبادات جب اللہ کی پسند کے مطابق انجام دی جائیں تو انسان کو اس مقام تک لے جاتی ہیں کہ **وہ اس چیز سے راضی ہو جس سے اللہ راضی ہے اور اس چیز سے ناراض ہو جس سے اللہ ناراض ہے۔**

مؤمن بندہ رضائے الٰہی اور ناراضیِ الٰہی کے مقابلے میں اپنی کوئی مستقل پسند و ناپسند قائم نہیں کرتا۔ جسے اس کا پروردگار دوست رکھتا ہے، وہ اسے دوست رکھتا ہے؛ اور جسے اللہ ناپسند کرتا ہے، وہ بھی اسے ناپسند کرتا ہے۔

انسان کی محبت اور نفرت جتنی زیادہ محبت و نفرتِ الٰہی کے مطابق ہوتی جائے گی، ایمان میں اس کا حصہ بھی اتنا ہی زیادہ ہو گا۔

روایات میں اسی حقیقت کو **الحبّ فی اللہ والبغض فی اللہ** ــــ یعنی **اللہ کی خاطر محبت اور اللہ کی خاطر نفرت** ــــ کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ رسولِ خداؐ فرماتے ہیں:

یا عَبدَاللهِ، اَحبِب فِی اللهِ. وَ اَبغِض فِی اللهِ. وَ والِ فِی اللهِ. وَ عادِ فِی اللهِ. فَاِنَّه لا تُنالُ وِلایَةِ اللهِ اِلّا بِذلِکَ. وَ لا یَجِدُ رَجُلٌ طَعمَ الایمانِ، وَ اِن کَثُرَت صَلاتُهُ وَ صیامُهُ، حَتّی یَکونَ کَذلِکَ(2). ...

"اے بندۂ خدا! اللہ کی خاطر محبت کرو، اللہ کی خاطر نفرت کرو، اللہ کی خاطر دوستی رکھو اور اللہ کی خاطر دشمنی کرو؛ کیونکہ ولایتِ الٰہی اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور کوئی شخص ایمان کا ذائقہ نہیں چکھ سکتا، خواہ اس کی نمازیں اور روزے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، جب تک وہ ایسا نہ ہو جائے۔"

(2) بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۲۳۶، حدیث ۱، بحوالہ علل الشرائع، عیون اخبار الرضاؑ اور امالی صدوق۔

اللہ کی خاطر محبت و نفرت ـــــ درجۂ ایمان کا معیار

الحبّ فی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کی خاطر اور اسی کے سبب محبت کرے۔ اس کی تمام محبتیں اللہ کے لیے ہوں۔ وہ کسی شخص یا چیز سے اس لیے محبت کرے کہ اللہ اسے محبوب رکھتا ہے، اور جسے اللہ ناپسند کرتا ہے اسے بھی اسی لیے ناپسند کرے کہ وہ اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ ہر معاملے میں اس کی محبت اور نفرت اللہ ہی کی خاطر ہو۔

ایسے شخص نے حقیقتاً اللہ کو اپنا **ولی اور سرپرست** تسلیم کر لیا ہے۔ اللہ کے مقابلے میں اس کی اپنی کوئی مستقل خواہش نہیں رہتی؛ وہ اپنی چاہت کو اللہ کی مشیت کے تابع کر دیتا ہے اور وہی چاہتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

یہی روحِ ایمان ہے۔

اگر کسی شخص کے اندر اس کیفیت کا کوئی حصہ نہ ہو تو وہ ایمان کا ذائقہ نہیں چکھ سکتا، خواہ نماز، روزہ اور دوسری عبادات میں کتنا ہی مشغول کیوں نہ ہو۔ ہر عبادت اگر انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا کرے تو وہ اسے ایمان کا ذائقہ چکھاتی ہے؛ ورنہ ایمان اس کی روح کے لیے بے ذائقہ رہتا ہے۔

ہر شخص کے ایمان کا درجہ اس کے اندر موجود **حبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ** کے درجے کے مطابق ہے۔ لہٰذا اللہ کی خاطر محبت اور اللہ کی خاطر نفرت ہی درجۂ ایمان کا معیار ہیں۔

اسی لیے جب امام صادقؑ سے پوچھا گیا کہ کیا محبت اور نفرت ایمان کا حصہ ہیں تو آپؑ نے فرمایا:

وَ هَلِ الایمانُ اِلّا الحُبَّ وَ البُغضُ؟(1) !

"کیا ایمان محبت اور نفرت کے سوا بھی کچھ ہے؟"!

(1) اصولِ کافی، ج ۲، ص ۱۲۵، کتاب الایمان والکفر، باب الحب فی اللہ والبغض فی اللہ، حدیث ۵۔

تمام اعمال کی روح، دراصل اس ہستی سے انسان کی محبت یا بیزاری ہے جس کی اطاعت یا نافرمانی کا معاملہ درپیش ہو۔

اطاعت کی روح یہ ہے کہ اسے اللہ کی محبت اور اس کے حکم کی تعمیل کی خاطر انجام دیا جائے۔ عبادات کا **قربۃً الی اللہ** —— یعنی قربِ الٰہی کی نیت سے —— انجام دیا جانا اسی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اس کے مقابلے میں نافرمانی کی روح اللہ سے بیزاری اور اس کی مرضی سے روگردانی ہے۔

پس اعمال کی مثبت یا منفی قدر بالآخر اسی محبت و نفرت کی طرف لوٹتی ہے۔

ائمہؑ کی تعلیمات کے مطابق دینداری کا معیار یہی **دین کی بنیاد پر محبت اور نفرت** ہے۔ اگر انسان کے اندر ایسی محبت اور نفرت موجود نہ ہو تو دین میں اس کا کوئی حقیقی حصہ نہیں۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

كُلُّ مَن لَم يُحِبَّ عَلَى الدّينِ وَ لَم يُبغِض عَلَى الدّينِ فَلا دينَ لَهُ(1) .

"جو شخص دین کی بنیاد پر محبت نہ کرے اور دین کی بنیاد پر نفرت نہ کرے، اس کے لیے کوئی دین نہیں۔"

(1) اصولِ کافی، ج ۲، ص ۱۲۷، کتاب الایمان والکفر، باب الحب فی اللہ والبغض فی اللہ، حدیث ۱۶۔

پس انسان کی دینداری کا درجہ بھی اسی قدر ہے جس قدر اس کی محبت اور نفرت دین کی بنیاد پر قائم ہے۔

ولیِ خدا سے محبت اور دشمنِ خدا سے دشمنی

اب جبکہ یہ حقیقت واضح ہو گئی، ہمیں یہ جاننا ہو گا کہ اللہ کے نزدیک کون محبوب اور کون مبغوض ہے، اور کون سی چیز اسے پسند اور کون سی ناپسند ہے؛ تاکہ انسان یہ پہچان سکے کہ محبت و نفرتِ الٰہی کا محور کیا ہے اور اسی معیار پر اپنے ایمان کو پرکھ سکے۔

گزشتہ حدیث میں رسولِ خداؐ سے مخاطب شخص نے بھی یہی سوال کیا:

"میں کیسے جانوں کہ میری محبت اور نفرت اللہ کی خاطر ہے؟ اللہ کا دوست کون ہے تاکہ میں اس سے دوستی رکھوں؟ اور اس کا دشمن کون ہے تاکہ میں اس سے دشمنی کروں؟"

رسولِ خداؐ نے جواب میں امیر المؤمنین علیؑ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

وَلِيُّ هذا وَلِيُّ اللهِ، فَوالِهِ. وَ عَدُوُّ هذا عَدُوُّ اللهِ، فَعادِهِ. والِ وَلِيَّ هذا، وَ لَو اَنَّهُ قاتِلُ اَبيکَ وَ وَلَدِکَ. وَ عادِ عَدُوَّ هذا، وَ لَو اَنَّهُ اَبُوکَ اَو وَلَدُکَ(2) .

"اس کا دوست اللہ کا دوست ہے، پس اس سے دوستی رکھو؛ اور اس کا دشمن اللہ کا دشمن ہے، پس اس سے دشمنی رکھو۔

اس کے دوست سے دوستی رکھو، خواہ وہ تمہارے باپ یا تمہاری اولاد کا قاتل ہی کیوں نہ ہو؛ اور اس کے دشمن سے دشمنی رکھو، خواہ وہ تمہارا باپ یا تمہاری اولاد ہی کیوں نہ ہو۔"

(2) بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۲۳۶، حدیث ۱، بحوالہ علل الشرائع، عیون اخبار الرضاؑ اور امالی صدوق۔

یہی وہ محور ہے جس کے گرد محبت و نفرتِ الٰہی گردش کرتی ہے۔

لہٰذا انسان امیر المؤمنین علیؑ اور ان کے دوستوں سے اپنی محبت، اور ان کے دشمنوں سے اپنی بیزاری کی میزان کے ذریعے اپنے ایمان کی کیفیت کو پہچان سکتا ہے۔

اہلِ بیتؑ ـــــ بالذات محبوبانِ خدا

جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی تمام محبتیں اور نفرتیں اللہ کے لیے اور اس کی راہ میں ہوں، اسے اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے کہ شیعہ اور سنی دونوں مصادر میں نقل ہونے والی متعدد روایات کے مطابق رسولِ اکرمؐ اللہ کے محبوب ہیں۔ یہی لقب اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپؐ اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہیں، اور اسی بنا پر آپؐ کو خصوصی طور پر **حبیبُ اللہ ـــــ اللہ کا محبوب** کہا گیا ہے۔

آپؐ کے بعد اہلِ بیتؑ ہیں، جو اس فضیلت میں آپؐ سے جدا نہیں۔

جیسا کہ گزشتہ مباحث میں واضح ہوا، یہ چودہ معصوم ہستیاںؑ **برگزیدگانِ الٰہی میں بھی برگزیدہ ترین** ہیں۔ حقیقت میں یہی اللہ کے حقیقی محبوب ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اور شخص یا چیز اللہ کے نزدیک محبوب ہے تو اس کی محبوبیت اہلِ بیتؑ سے نسبت اور تعلق کے سبب ہے۔ اہلِ بیتؑ سے اس نسبت کو الگ کر دیا جائے تو وہ بذاتِ خود اس مقامِ محبوبیت کی حامل نہیں۔

زیارت آلِ یٰسین میں، جو امام مہدیؑ سے منقول ہے، ہم پڑھتے ہیں:

اُشهِدُکَ یا مَولایَ اَنّی اُشهِدُ ... اَنَّ مُحَمَّداً صلی الله علیه و آله و سلم عَبدُهُ وَ رَسُولُهُ؛ لا حَبیبَ اِلّا هُوَ وَ اَهلُهُ(1) .

"اے میرے مولا! میں آپؑ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں گواہی دیتا ہوں... کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں؛ ان کے اور ان کے اہلِ بیتؑ کے سوا کوئی محبوب نہیں۔"

(1) الاحتجاج، طبرسی، ج ۲، ص ۳۱۷۔

اللہ تعالیٰ نے دوسری تمام مخلوقات کو ان ہستیوں سے اپنی محبت کی بنا پر خلق فرمایا ہے۔

یہ حقیقت **حدیثِ کساء** میں ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے:

فَقالَ عَزَّوَجَلَّ: یا مَلائِکَتی وَ یا سُکّانَ سَماواتی، اِنّی ما خَلَقتُ سَماءً مَبنِیَّةً وَ لا اَرضاً مَدحِیَّةً وَ لا قَمَراً مُنیرا وَ لا شَمساً مُضیئَةً وَ لا فَلَکاً یَدُورُ وَ لا فَلَکاً تَسری وَ لا بَحراً یَجری، اِلّا لِمَحَبَّةِ هؤُلاءِ الخَمسَةِ الَّذینَ هُم تَحتَ الکِساءِ. فَقالَ الاَمینُ جَبرئیلُ: یا رَبِّ وَ مَن تَحتَ الکِساء؟ فَقالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: هُم اهل بیت النُبُوَّةِ وَ مَعدِنُ الرِّسالَةِ. وَ هُم فاطِمَةُ وَ اَبُوها وَ بَعلُها وَ بَنُوها(2).

"اللہ عزوجل نے فرمایا: اے میرے فرشتو اور اے میرے آسمانوں کے رہنے والو! میں نے نہ کوئی بلند آسمان پیدا کیا، نہ بچھائی ہوئی زمین، نہ روشن چاند، نہ چمکتا ہوا سورج، نہ گردش کرنے والا فلک، نہ رواں آسمانی مدار اور نہ بہتا ہوا سمندر، مگر ان پانچ ہستیوں کی محبت میں جو کساء کے نیچے ہیں۔

پس امینِ وحی جبرئیلؑ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! کساء کے نیچے کون ہیں؟

اللہ عزوجل نے فرمایا: یہ اہلِ بیتِ نبوت اور معدنِ رسالت ہیں؛ یہ فاطمہؑ، ان کے والدؐ، ان کے شوہرؑ اور ان کے فرزندؑ ہیں۔"

(2) احقاق الحق، ج ۲، ص ۵۵۶، بحوالہ عوالم۔

پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے حقیقی محبوب اہلِ بیتؑ ہیں، اور دوسری مخلوقات ان ہستیوں سے محبت کی بنا پر خلق کی گئی ہیں۔

اسی بنا پر **حبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ** ـــــ یعنی اللہ کی خاطر محبت اور اللہ کی خاطر نفرت ـــــ کا محور، **اہلِ بیتؑ کی خاطر محبت اور ان کی خاطر بیزاری و دشمنی** قرار پاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اسی حقیقت کو رسالتِ رسولؐ کے اجر کے عنوان سے بیان فرمایا ہے:

»قُل لا اَسالُکُم عَلَیهِ اَجراً اِلّا المَوَدَةَ فِی القُربی(1) .«

"کہہ دیجیے: میں تم سے اس رسالت پر کوئی اجر نہیں مانگتا، سوائے قربیٰ کے بارے میں مودّت کے۔"

(1)سورۂ شوریٰ 42:23۔

لفظ **مودّت** ایسی محبت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے عملی اور ظاہری آثار بھی ظاہر ہوں۔ یہ **محبت** سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ محبت کبھی صرف دل کی ایک کیفیت بھی ہو سکتی ہے، خواہ اس کے بیرونی آثار ظاہر ہوں یا نہ ہوں۔

القربیٰ سے مراد اہلِ بیتؑ ہیں، اور اس آیت میں **فی القربیٰ** کی تعبیر اسی طرح ہے جیسے **فی اللہ** کی تعبیر۔

لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ رسولِ خداؐ کی رسالت کا اجر یہ ہے کہ انسان **اپنی محبت اور مودّت کو اہلِ بیتؑ کے محور پر اور ان کی خاطر قائم کرے۔**

اگر **محبت** سے مراد کسی سے دل میں پیار رکھنا ہو تو **مودّت** اس محبت کے اظہار اور عملی تحقق کا نام ہے؛ یعنی ایسی محبت جو دل میں بھی موجود ہو اور انسان کے طرزِ عمل میں بھی ظاہر ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ **فی القربیٰ** کا مفہوم **لِلقربیٰ** سے وسیع تر ہے۔

اگر اجرِ رسالت کو **مودّت لِلقربیٰ** کہا گیا ہوتا تو اس کا مفہوم صرف یہ ہوتا کہ اہلِ بیتؑ سے محبت اور اظہارِ محبت کیا جائے۔ لیکن **فی القربیٰ** ان تمام محبتوں اور مودّتوں کو اپنے اندر سمیٹتا ہے جو **اہلِ بیتؑ کی خاطر اور ان کے محور پر** ظاہر ہونی چاہییں۔ اسی میں ان کے دشمنوں سے بیزاری اور نفرت بھی شامل ہے۔

پس بنیادی حقیقت یہ ہے کہ **ہماری محبتوں کا محور اہلِ بیتؑ ہوں اور ہماری محبت انہی کی خاطر ہو**؛ کیونکہ جو محبت اہلِ بیتؑ کے محور پر قائم ہوتی ہے، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے محور پر قائم محبت ہے۔

مودّت فی القربیٰ — بندگیِ خدا کی روح

پس **حبّ فی اللہ** — یعنی اللہ کی خاطر محبت — جب عملی صورت اختیار کرتی ہے تو بالآخر **حبّ و بغض فی القربیٰ** کی طرف لوٹتی ہے؛ یعنی اہلِ بیتؑ کی خاطر محبت اور اہلِ بیتؑ کی خاطر نفرت۔

اور یہی اللہ کی بندگی کی بنیاد اور اس کی روح ہے۔

دوسرے لفظوں میں، حقیقتاً اللہ کی بندگی وہی شخص کرتا ہے جو اہلِ بیتؑ سے محبت رکھتا ہو، ان کے دشمنوں سے نفرت کرتا ہو، اہلِ بیتؑ کی محبت کی بنا پر ان کے دوستوں سے دوستی رکھتا ہو اور ان سے دشمنی رکھنے والوں سے اسی لیے بیزار ہو کہ وہ اہلِ بیتؑ کے دشمن ہیں۔

اصولی طور پر انسان کی تمام محبتیں اور نفرتیں اہلِ بیتؑ کی خاطر ہونی چاہییں۔ وہ اسی چیز کو پسند کرے جسے اہلِ بیتؑ پسند کرتے ہیں اور اسی چیز سے ناپسندیدگی رکھے جسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔

یہی **حقیقتِ ایمان اور روحِ بندگیِ خدا** ہے۔ جو شخص اللہ کے قرب اور اس کی رضا تک پہنچنے کا راستہ چاہتا ہے، اسے اسی راستے سے گزرنا ہوگا:

»قُل ما اَسالُکُم عَلَیهِ اَجراً اِلّا مَن شاءَ اَن یَتَّخِذَ اِلی رَبِّهِ سَبیلاً(1) .«

"کہہ دیجیے: میں تم سے اس رسالت پر کوئی اجر نہیں مانگتا، سوائے اس کے کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے۔"

(1) سورۂ فرقان 25:57۔

اللہ نے ایسے شخص کے لیے جو راستہ مقرر فرمایا ہے وہ **مودّت فی القربیٰ** ہے۔

لہٰذا اگرچہ یہاں لفظ **اجر** استعمال ہوا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ **مودّت فی القربیٰ** کا فائدہ خود انسان ہی کو پہنچتا ہے۔ اہلِ بیتؑ ہماری اس مودّت کے محتاج نہیں:

»قُل ما سَاَلتُکُم مِن اَجرٍ فَهُوَ لَکُم(2) .«

"کہہ دیجیے: میں نے تم سے جو اجر مانگا ہے، وہ خود تمہارے ہی لیے ہے۔"

(2) سورۂ سبأ 34:47۔

گزشتہ بحث کی روشنی میں اب یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری روایات میں **اہلِ بیتؑ سے محبت** اور ان کے دشمنوں سے نفرت پر اس قدر تاکید کیوں کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں ایک تعبیر یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ کی ولایت اور ان کے دشمنوں سے بیزاری **ایمان کے مضبوط ترین بندھن** ہیں۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

قالَ رَسُولُ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم لِاَصحابِهِ: اَیُّ عُرَی الایمانِ اَوثَقُ؟ فَقالوا: اللهُ وَ رَسُولُهُ اَعلَمُ. وَ قالَ بَعضُهُم: الصَّلاةُ. وَ قالَ بَعضُهُم: الزَّکاةُ. وَ قالَ بَعضُهُم: الصِّیامُ. وَ قالَ بَعضُهُم: اَلحَجُّ وَ العُمرَةُ. وَ قالَ بَعضُهُم: اَلجِهادُ.

فَقالَ رَسُولُ اللهِ: لِکُلٍّ ما قُلتُم فَضلٌ وَ لَیسَ بِهِ. وَ لکِن اَوثَقُ عُرَی الایمانِ: اَلحُبُّ فِی اللهِ وَ البُغضُ فِی اللهِ وَ تَوالی اَولیاءِ اللهِ وَ التَّبَرّی مِن اَعداءِ اللهِ(1) .

رسولِ خداؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

"ایمان کے بندھنوں میں سب سے مضبوط بندھن کون سا ہے؟"

انہوں نے عرض کیا" : **اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔"**

بعض نے کہا" : **نماز۔"**

بعض نے کہا" : **زکوۃ۔"**

بعض نے کہا" : **روزہ۔"**

بعض نے کہا" : **حج اور عمرہ۔"**

اور بعض نے کہا" : **جہاد۔"**

رسولِ خداؐ نے فرمایا:

"تم نے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے، ان سب کی اپنی فضیلت ہے، لیکن ان میں سے کوئی ایمان کا مضبوط ترین بندھن نہیں۔ بلکہ ایمان کے مضبوط ترین بندھن یہ ہیں: اللہ کی خاطر محبت کرنا، اللہ کی خاطر نفرت کرنا، اولیائے خدا سے دوستی رکھنا اور دشمنانِ خدا سے تبرّیٰ و بیزاری اختیار کرنا۔"

(1) اصولِ کافی، ج ۲، ص ۱۲۵، کتاب الایمان والکفر، باب الحب فی اللہ والبغض فی اللہ، حدیث ۶۔

اولیائے خدا وہی ہستیاں ہیں جن کا تعارف اللہ نے حدیثِ کساء میں کرایا ہے، اور اللہ کے دشمن وہ ہیں جو ان ہستیوں کے دشمن ہیں۔

پس اللہ کی خاطر محبت اور نفرت کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس چیز سے محبت کریں جو اولیائے خدا کو محبوب ہے، اور اس چیز کو اپنا دشمن سمجھیں جو ان کے نزدیک مبغوض ہے۔ رسولِ خداؐ فرماتے ہیں:

وِلايةُ عَلِيّ بنِ اَبی طالِبٍ وِلايَةُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ. وَ حُبُّهُ عِبادَةُ اللهِ. وَ اتِّباعُهُ فَريضَةُ اللهِ. وَ اَولِياؤُهُ اَولياءُ اللهِ. وَ اَعداؤُهُ اَعداءُ اللهِ. وَ حَربُهُ حَربُ اللهِ. وَ سِلمُهُ سِلمُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ(2) .

"علی بن ابی طالبؑ کی ولایت، اللہ عزوجل کی ولایت ہے؛ ان سے محبت اللہ کی عبادت ہے؛ ان کی پیروی اللہ کا فرض ہے؛ ان کے دوست اللہ کے دوست ہیں اور ان کے دشمن اللہ کے دشمن ہیں؛ ان سے جنگ، اللہ سے جنگ ہے اور ان سے صلح، اللہ عزوجل سے صلح ہے۔" (2) بحار الانوار، ج۳۸، ص۳۱–۳۲، حدیث ۹، بحوالہ بشارۃ المصطفیٰ۔

اس بنا پر دشمنانِ خدا سے **تبرّیٰ** کا مطلب اہلِ بیتؑ کے دشمنوں سے بیزاری ہے۔ یہ تبرّیٰ، ائمہؑ کی ولایت قبول کرنے کا لازمی نتیجہ ہے اور اسے ولایت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

دشمنانِ خدا سے تبرّیٰ—ایک عبادت

اہلِ بیتؑ کے دشمنوں سے بیزاری بذاتِ خود ایک عبادت اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔

اس حقیقت کو **زیارتِ عاشورا** کے درج ذیل جملوں سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

يا اَباعَبدِاللهِ، اِنّی اَتَقَرَّبُ اِلَی اللهِ وَ اِلی رَسُولِهِ وَ اِلی اَميرِالمُؤمِنينَ وَ اِلی فاطِمَةَ وَ اِلَی الحَسَنِ وَ اِلَيکَ بِمُوالاتِکَ وَ بِالبَراءَةِ مِمَّن قاتَلَکَ وَ نَصَبَ لَکَ الحَرب وَ بِالبَراءَةِ مِمَّن اَسَّسَ اَساسَ الظُّلمِ وَ الجَورِ عَلَيکُم ... . وَ اَتَقَرَّبُ اِلَی اللهِ ثُمَّ اِلَيکُم بِمُوالاتِکُم وَ مُوالاةِ وَلِيِّکُم وَ بِالبَراءَةِ مِن اَعدائِکُم وَ النّاصِبينَ لَکُم الحَربَ وَ بِالبَراءَةِ مِن اَشياعِهِم وَ اَتباعِهِم(1) .

"اے اباعبداللہؑ! میں اللہ، اس کے رسولؐ، امیر المؤمنینؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور آپؑ کا قرب حاصل کرتا ہوں، آپؑ سے اپنی ولایت و دوستی کے ذریعے، اور ان لوگوں سے بیزاری کے ذریعے جنہوں نے آپؑ سے جنگ کی اور آپؑ کے خلاف جنگ برپا کی، اور ان لوگوں سے بیزاری کے ذریعے جنہوں نے آپ اہلِ بیتؑ پر ظلم و جور کی بنیاد قائم کی...

اور میں اللہ کا، پھر آپ اہلِ بیتؑ کا قرب حاصل کرتا ہوں آپؑ کی ولایت و دوستی، آپؑ کے دوستوں کی دوستی، آپؑ کے دشمنوں اور آپؑ کے خلاف جنگ برپا کرنے والوں سے بیزاری، اور ان کے پیروکاروں اور متبعین سے تبرّیٰ کے ذریعے۔"

(1) بحار الانوار، ج ۱۰۱، ص ۲۹۴۔

پس جس طرح ہم ائمہؑ کی ولایت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے ہیں، اسی طرح **ان کے دشمنوں سے براءت و بیزاری** کے ذریعے بھی اس کا قرب حاصل کرتے ہیں۔

زیارتِ عاشورا کے ایک اور حصے میں دشمنانِ اہلِ بیتؑ سے تبرّیٰ کو ایک ایسی گراں قدر نعمت قرار دیا گیا ہے جو اللہ اپنے بندے کو عطا فرماتا ہے:

فَاَسَاَلُ اللهَ الَّذی ... رَزَقَنِی البَرَاءَةَ مِن اَعدائِکُم اَن یَجعَلَنی مَعَکُم فِی الدُّنیا وَ الآخِرَةِ(1) .

"پس میں اس اللہ سے سوال کرتا ہوں جس نے... مجھے آپؑ کے دشمنوں سے بیزاری کی نعمت عطا فرمائی، کہ وہ مجھے دنیا اور آخرت میں آپؑ کے ساتھ قرار دے۔" (1) بحار الانوار، ج ۱۰۱، ص ۲۹۵۔

اس پہلو کے علاوہ، ائمہؑ کے دشمنوں سے **تبرّیٰ کی ضرورت** کو کئی دیگر جہات سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تبرّیٰ — حقیقی دینداری کے تحقق کا وسیلہ

تمہید

صحیح دین اور اللہ کی بندگی کے درست راستے کو پہچاننے کے لیے **اہلِ بیتؑ کے دشمنوں سے بیزاری** ضروری ہے۔

اگر ہم دین کو اللہ کی بندگی کے صحیح طریقے کے طور پر حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو ناگزیر ہے کہ ہم دین کے دشمنوں کو پہچانیں اور یہ بھی جانیں کہ انہوں نے دین کو اس کے اصل راستے سے ہٹانے کے لیے کیا کچھ کیا۔

دین رسولِ خداؐ اور آپؐ کے اہلِ بیتؑ کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے، اور ہمارا فریضہ ہے کہ ان اولیائے الٰہی کی ولایت و سرپرستی قبول کریں اور ان کی رہنمائی میں راہِ بندگی پر قدم رکھیں۔

اسی طرح ہماری یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اہلِ بیتؑ کے دشمنوں کو اس حد تک پہچانیں جس قدر گمراہی کی وادی کو شناخت کرنے اور دینی امور میں لغزش وانحراف سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے۔

در حقیقت اصل ضرورت یہ ہے کہ **دینِ حقیقی سے ہونے والے انحرافات اور کج رویوں کو پہچانا جائے**۔ائمۂ ضلالت اور گمراہی کے پیشواؤں کی شناخت اس لیے ضروری ہے کہ ان کے ذریعے ہم ان بدعتوں اور انحرافات سے آگاہ ہوتے ہیں جو دین میں پیدا کیے گئے۔

امیر المؤمنین علیؑ نے **ذی قار** نامی مقام پر اپنے ایک خطبے میں اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

وَ اعلَمُوا اَنَّکُم لَن تَعرِفُوا الرُّشدَ حَتّی تَعرِفُوا الَّذی تَرَکَهُ وَ لَم تَأخُذُوا بِمیثاقِ الکِتابِ حَتّی تَعرِفُوا الَّذی نَقَضَهُ وَ لَن تَمَسَّکُوا بِهِ حَتّی تَعرِفُوا الَّذی نَبَذَهُ... . وَ لَن تَعرِفُوا التَّقوی حَتّی تَعرِفُوا الَّذی تَعَدّی. فَاِذا عَرَفتُم ذلِکَ، عَرَفتُمُ البِدَعَ وَ التَّکَلُّفَ وَ رَایتُمُ الفِریَةَ عَلَی اللهِ وَ عَلی رَسُولِهِ ... وَ رَاَیتُم کَیفَ هَدَی اللهُ مَن هَدی(2) .

"جان لو! تم راہِ رشد کو ہر گز نہیں پہچان سکتے جب تک اس شخص کو نہ پہچانو جس نے اسے ترک کیا؛ تم کتاب کے عہد وپیمان کو اختیار نہیں کر سکتے جب تک اس شخص کو نہ پہچانو جس نے اسے توڑا؛ اور تم کتاب سے متمسک نہیں ہو سکتے جب تک اس شخص کو نہ پہچانو جس نے اسے پسِ پشت ڈال دیا...

اور تم تقویٰ کو بھی اس وقت تک نہیں پہچان سکتے جب تک اس شخص کو نہ پہچانو جس نے اس کی حدود سے تجاوز کیا۔

جب تم یہ سب پہچان لوگے تو بدعتوں اور دین میں خود ساختہ امور کو بھی پہچان لوگے، اللہ اور اس کے رسولؐ پر باندھے گئے جھوٹ اور افترا کو دیکھ لوگے... اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ نے ان لوگوں کو کس طرح ہدایت دی جنہیں اس نے ہدایت عطا فرمائی۔" (2)الکافی، ج۸، ص ۳۹۰، حدیث ۵۸۶۔

امیر المؤمنینؑ کا یہ کلام واضح کرتا ہے کہ ہدایت کو پہچاننے کے لیے ناگزیر طور پر **گمراہی اور اہلِ گمراہی** کی شناخت بھی ضروری ہے۔ ہمیں بدعت ایجاد کرنے والوں اور ان کی بدعتوں، دونوں کو پہچاننا ہوگا، تاکہ دین اور غیرِ دین کے درمیان صحیح امتیاز قائم کر سکیں۔

امیر المؤمنینؑ ایک اور خطبے میں فرماتے ہیں:

وَ اِنَّما بَدءُ وُقُوعِ الفِتَنِ مِن اَهواءٍ تُتَّبَعُ وَ اَحکامٍ تُبتَدَعُ یُخالَفُ فیها حُکمُ اللهِ یَتَوَّلی فیها رِجالٌ رِجالاً. اَلا اِنَّ الحَقَّ لَو خَلَصَ، لَمیَکُنِ اختِلافٌ. وَ لَو اَنَّ الباطِلَ خَلَصَ، لَم یَخفَ عَلی ذی حِجیً. لکِنَّهُ یُؤخَذُ مِن هذا ضِغثٌ وَ مِن هذا ضِغثٌ فَیُمزَجانِ فَیُجَلَّلانِ مَعاً. فَهُنالِکَ یَستَولِی الشَّیطانُ عَلی اَولِیائِهِ وَ نَجَا الَّذینَ سَبَقَت لَهُم مِنَ اللهِ الحُسنی. اِنّی سَمِعتُ رَسُولَ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم یَقُولُ: کَیفَ اَنتُم اِذا لَبِستَکُم فِتنَةٌ یَربُو فیهَا الصَّغیرُ وَ یَهرُمُ فیهَا الکَبیرُ یَجرِی النّاسُ عَلَیها وَ یَتَّخِذوُنَها سُنَّةً فَاِذا غُیِّرَ مِنها شَیءٌ قیلَ قَد غُیِّرَتِ السُّنَّةُ.

”فتنوں کے پیدا ہونے کی ابتدا ان خواہشات سے ہوتی ہے جن کی پیروی کی جاتی ہے، اور ان خود ساختہ احکام سے جو ایجاد کیے جاتے ہیں اور جن میں حکمِ خدا کی مخالفت کی جاتی ہے؛ اور ان امور میں کچھ لوگ دوسروں کو اپنا سرپرست اور پیشوا بنا لیتے ہیں۔

آگاہ رہو! اگر حق خالص اور بے آمیز ہوتا تو کوئی اختلاف باقی نہ رہتا، اور اگر باطل خالص ہوتا تو کسی صاحبِ عقل پر پوشیدہ نہ رہتا۔ لیکن کچھ حصہ یہاں سے لیا جاتا ہے اور کچھ حصہ وہاں سے، پھر دونوں کو آپس میں ملا دیا جاتا ہے اور یوں دونوں ایک دوسرے میں لپٹ جاتے ہیں۔

ایسے ہی موقع پر شیطان اپنے دوستوں پر غالب آجاتا ہے، جبکہ وہ لوگ نجات پاتے ہیں جن کے لیے پہلے ہی اللہ کی طرف سے نیکی مقدر ہو چکی ہے۔

میں نے رسولِ خداؐ کو فرماتے سنا: تمہارا کیا حال ہوگا جب ایسا فتنہ تمہیں گھیر لے گا جس میں بچے جوان ہو جائیں گے اور بڑے بوڑھے ہو جائیں گے؛ لوگ اسی پر چلتے رہیں گے اور اسے سنت قرار دے دیں گے؛ پھر جب اس میں سے کسی چیز کو تبدیل کیا جائے گا تو کہا جائے گا: سنت بدل دی گئی“!

اس کے بعد امیر المؤمنینؑ وضاحت فرماتے ہیں کہ ایسی بدعتیں کس طرح معاشرے میں مستحکم ہو گئیں۔

سابق حکمرانوں کے ذریعے دین میں دانستہ بدعتوں کا داخل کیا جانا

اس کے بعد امیر المؤمنینؑ نے اپنے گرد موجود اہلِ بیت، شیعوں اور خاص اصحاب کی طرف رخ کر کے فرمایا:

قَد عَمِلَتِ الوُلاةُ قَبلی اَعمالاً خالَفُوا فیها رَسُولَ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم مُتَعَمِّدینَ لِخِلافِهِ، ناقِضینَ لِعَهدِهِ، مُغَیِّرینَ لِسُنَّتِهِ. وَ لَو حَمَلتُ النِاسَ عَلی تَرکِها وَ حَوَّلتُها اِلی مَواضِعِها وَ اِلی ما کانَت فی عَهدِ رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم لِتَفَرَّقَ عَنّی جُندی حَتِی اَبقی وَحدی اَو قَلیلٌ مِن شیعَتِیَ الَّذینَ عَرَفُوا فَضلی وَ فَرضَ اِمامَتی مِن کِتابِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَ سُنَّةِ رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم.

"مجھ سے پہلے کے حکمرانوں نے ایسے اعمال انجام دیے جن میں انہوں نے رسولِ خداؐ کی مخالفت کی؛ جان بوجھ کر آپؐ کے طریقے کے خلاف عمل کیا، آپؐ کے عہد کو توڑا اور آپؐ کی سنت کو بدل دیا۔

اگر میں لوگوں کو ان تمام امور کے ترک کرنے پر مجبور کرتا، انہیں ان کے صحیح مقام پر واپس لے جاتا اور انہیں اسی حالت پر لوٹا دیتا جس پر وہ رسولِ خداؐ کے زمانے میں تھے، تو میرا لشکر مجھ سے منتشر ہو جاتا، یہاں تک کہ میں تنہا رہ جاتا یا میرے ساتھ میرے شیعوں میں سے صرف چند لوگ باقی رہتے؛ وہ لوگ جنہوں نے کتابِ خدا عزوجل اور سنتِ رسولِ خداؐ سے میری فضیلت اور میری امامت کے واجب ہونے کو پہچان لیا تھا۔"

اس کے بعد امیر المؤمنینؑ تقریباً بیس ایسے امور کی مثالیں بیان فرماتے ہیں جنہیں سابق حکمرانوں نے دین میں بدعت کے طور پر رائج کر دیا تھا، لیکن آپؑ حالات کے سبب انہیں تبدیل نہ کر سکے۔

پھر فرماتے ہیں:

وَ اللهِ لَقَد اَمَرتَ النّاسِ اَن لا یَجتَمِعُوا فی شَهرِ رَمَضانَ اِلّا فی فَریضَةٍ وَ اَعلَمتُهُم اَنَّ اجتِماعَهُم فِی النَّوافِلِ بِدعَةٌ، فَتَنادی بَعضُ اَهلِ عَسکَری مِمَّن یُقاتِلُ مَعِیَ: یا اَهلَ الاِسلامِ، غُیِّرَت سُنَّةُ عُمَرَ! یَنهانا عَنِ الصَّلاةِ فی شَهرِ رَمَضانَ تَطَوُّعاً! وَ لَقَد خِفتُ اَن یَثُورُوا فی ناحِیَةِ جانِبِ عسکَری. ما لَقیتُ مِن هذِهِ الأُمَّةِ مِنَ الفِرقَةِ وَ طاعَةِ اَئِمَّةِ الضَّلالَةِ وَ الدُّعاةِ اِلَی النّارِ(1) !

"اللہ کی قسم! میں نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ماہِ رمضان میں فرض نماز کے سوا کسی نماز کے لیے جماعت کی صورت میں جمع نہ ہوں، اور میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ نوافل کے لیے ان کا جماعت کی صورت میں جمع ہونا بدعت ہے۔

لیکن میرے لشکر میں سے، انہی لوگوں میں سے جو میرے ساتھ جنگ کر رہے تھے، بعض نے پکارنا شروع کر دیا: اے اہلِ اسلام! عمر کی سنت بدل دی گئی! علیؑ ہمیں ماہِ رمضان میں مستحب نماز پڑھنے سے روک رہے ہیں!

مجھے یہاں تک اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے لشکر کے کسی حصے میں بغاوت نہ پھوٹ پڑے۔ اس امت کی تفرقہ انگیزی، ائمۂ ضلالت کی اطاعت اور جہنم کی طرف بلانے والوں کی پیروی سے مجھے کیا کچھ برداشت کرنا پڑا ہے"!

(1) الکافی، ج۸، ص۵۸، حدیث ۲۱۔

یہ ان بدعتوں میں سے صرف ایک مثال ہے جن کا امیر المؤمنینؑ کو سامنا کرنا پڑا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے ان بدعتوں کو بدعت کے طور پر نہیں پہچانا بلکہ انہیں "سنت" سمجھ لیا تھا، وہ خود امیر المؤمنینؑ کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور امامِ ہدایتؑ کی مخالفت کرنے لگے۔

ائمۂ ضلالت کی پیروی

امیر المؤمنینؑ کے مذکورہ کلام میں **"ائمۂ ضلالت اور جہنم کی طرف بلانے والوں"** کا ذکر آیا ہے۔

یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس بحث کی بنیاد خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ اصولِ کافی میں ایک باب کا عنوان ہے:

باب أنّ الائمّةَ فی کتابِ اللهِ امامانِ: امامٌ یَدعوا الی اللهِ و امامٌ یَدعُو إلی النّارِ

"کتابِ خدا میں ائمہ دو قسم کے ہیں: ایک امام وہ جو اللہ کی طرف بلاتا ہے اور دوسرا وہ جو آگ کی طرف بلاتا ہے۔"

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ الاَئِمَّةَ فی کِتابِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ اِمامانِ. قالَ اللهُ تَبارَکَ وَ تَعالی:«وَ جَعَلناهُم اَئِمَّةً یَهدُونَ بِأَمرِنا» (2) لا بِاَمرِ النّاسِ؛ یُقَدِّمُونَ اَمرَ اللهِ قَبلَ أَمرِهِم وَ حُکمَ اللهِ قَبلَ حُکمِهِم. قالَ: «وَ جَعَلناهُم اَئِمَّةً یَدعُونَ اِلَی النّارِ»؛ (3) یُقَدِّمُونَ اَمرَهُم قَبلَ اَمرِ اللهِ وَ حُکمَهُم قَبلَ حُکمِ اللهِ وَ یَأخُذُونَ بِاَهوائِهِم خِلافَ ما فی کِتابِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ(1) .

"کتابِ خدا عزوجل میں ائمہ دو قسم کے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

'اور ہم نے انہیں ایسے امام قرار دیا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔(2) '

یعنی لوگوں کے حکم سے نہیں؛ وہ اپنے حکم سے پہلے اللہ کے حکم کو اور اپنے فیصلے سے پہلے اللہ کے فیصلے کو مقدم رکھتے ہیں۔

اور اللہ فرماتا ہے:

'اور ہم نے انہیں ایسے امام قرار دیا جو آگ کی طرف بلاتے ہیں۔(3) '

یہ لوگ اللہ کے حکم سے پہلے اپنے حکم کو، اور اللہ کے فیصلے سے پہلے اپنے فیصلے کو مقدم رکھتے ہیں، اور کتابِ خدا عزوجل کے برخلاف اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔"

(1) اصولِ کافی، ج ۱، ص ۲۱۶، کتاب الحجۃ، باب اَنّ الائمۃ فی کتاب اللہ امامان، حدیث ۲۔

(2) سورۂ انبیاء 21:73۔

(3) سورۂ قصص 28:41۔

یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ اللہ کا **ائمۂ ہدایت کو امام قرار دینا** اور **ائمۂ ضلالت کو امام قرار دینا** ایک ہی معنی میں نہیں ہے۔

ائمۂ ضلالت کو امام قرار دینے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ ان کے اعمال سے راضی ہے یا تشریعی طور پر انہیں ان اعمال کی اجازت دیتا ہے؛ بلکہ یہاں مراد **اذنِ تکوینی** ہے، یعنی اللہ انہیں ان کے افعال انجام دینے سے جبراً نہیں روکتا۔

ایک اور روایت میں امام باقرؑ فرماتے ہیں:

لمّا نَزَلَت هذِهِ الآيَةُ: «يَومَ نَدعُو كُلَّ اُناسٍ بِإمامِهِم» (2) قالَ المُسلِمُونَ: يا رَسُولَ اللهِ، اَلَستَ اِمامَ النِاس كُلِّهِم اَجمَعينَ؟ قال: فَقالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه و آله و سلم: اَنَا رَسُولُ اللهِ اِلَى النّاسِ اَجمَعينَ، وَ لكِن سَيَكُونُ مِن بَعدى اَئِمَّةٌ عَلَى النّاس مِن اَهلِ بَيتى؛ يَقُومُونَ فِي النّاسِ فَيُكَذَّبُونَ وَ يَظلِمُهُم اَئِمَّةُ الكُفرِ وَ الضَّلالِ وَ اَشياعُهُم. فَمَن والاهُم وَ اتَّبَعَهُم وَ صَدَّقَهُم، فَهُوَ مِنّى وَ مَعِيَ وَ سَيَلقانى. اِلّا وَ مَن ظَلَمَهُم وَ كَذَّبَهُم، فَلَيسَ مِنّى وَ لا مَعِيَ وَ اَنا مِنهُ بَرِيءٌ(3) .

"جب یہ آیت نازل ہوئی:

'جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔(2) '

تو مسلمانوں نے عرض کیا: اے رسولِ خداؐ! کیا آپ تمام لوگوں کے امام نہیں ہیں؟

رسولِ خداؐ نے فرمایا:

"میں تمام انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں، لیکن میرے بعد میرے اہلِ بیتؑ میں سے لوگوں پر ائمہ ہوں گے۔ وہ لوگوں کے درمیان قیام کریں گے، مگر انہیں جھٹلایا جائے گا، اور ائمۂ کفر و ضلالت اور ان کے پیروکار ان پر ظلم کریں گے۔ پس جو شخص ان سے ولایت و دوستی رکھے، ان کی پیروی کرے اور ان کی تصدیق کرے، وہ مجھ سے ہے، میرے ساتھ ہے اور مجھ سے ملاقات کرے گا۔ اور آگاہ رہو! جو شخص ان پر ظلم کرے اور انہیں جھٹلائے، وہ نہ مجھ سے ہے، نہ میرے ساتھ ہے، اور میں اس سے بیزار ہوں۔"

(2) سورۂ اسراء 17:71۔

(3) اصولِ کافی، ج ۱، ص ۲۱۵، کتاب الحجۃ، باب اَنّ الائمۃ فی کتاب اللہ امامان، حدیث ۱۔

پس جس طرح راہِ ہدایت کے اپنے ائمہ اور پیشوا ہیں، اسی طرح وادیِ گمراہی کے بھی کچھ پیشوا ہیں جو بالآخر اپنے پیروکاروں کو جہنم کی طرف لے جاتے ہیں۔

ائمۂ کفر — ہر برائی کی جڑ

ائمۂ کفر نے گمراہی کا راستہ کھول کر لوگوں کو راہِ ہدایت پر قدم رکھنے سے روکا اور یوں انہیں ہر قسم کی خیر و بھلائی سے محروم کر دیا۔ انہوں نے دینِ خدا کے ساتھ کیا کیا، اسے سمجھنے کے لیے امام صادقؑ سے منقول ایک دعا کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا کہ ہمارے شیعوں اور دوستوں پر ہمارا یہ حق ہے کہ وہ اس دعا کو پڑھے بغیر اپنی جائے نماز سے نہ اٹھیں۔

اس دعا کے ایک حصے میں ہے:

اَللّٰهُمَّ وَ ضاعِف لَعنَتَکَ وَ بَأسَکَ وَ نَکالَکَ وَ عَذابَکَ عَلَی اللَّذَینِ کَفَرا نِعمَتَکَ وَ خَوَّنا رَسُولَکَ وَ اتَّهَما نَبِیَّکَ وَ بایَناهُ وَ حَلّا عَقدَهُ فی وَصِیِّهِ وَ نَبَذا عَهدَهُ فی خَلیفَتِهِ مِن بَعدِهِ وَ اَدَّعَیا مَقامَهُ وَ غَیَّرا اَحکامَهُ وَ بَدَّلا سُنَّتَهُ وَ قَلَّبا دینَهُ وَ صَغَّرا قَدرَ حُجَجِکَ وَ بَدَءا بِظُلمِهِم وَ طَرَّقا طَرِیقَ الغَدرِ عَلَیهِم وَ الخِلافِ عَن اَمرِهِم وَ القَتلِ لَهُم وَ اِرهاجِ الحُرُوبِ عَلَیهِم وَ مَنعِ خَلیفَتِکَ مِن سَدِّ الثَّلمِ وَ تَقویمِ العِوَجِ وَ تَثقیفِ الاَوَدِ وَ اِمضاءِ الاَحکامِ وَ اِظهارِ دینِ الاِسلامِ وَ اِقامَةِ حُدُودِ القُرآنِ(1) .

"اے اللہ! اپنی لعنت، اپنے قہر، اپنی سزا اور اپنے عذاب کو ان دونوں پر کئی گنا فرما جنہوں نے تیری نعمت کا انکار کیا، تیرے رسولؐ سے خیانت کی، تیرے نبیؐ پر تہمت لگائی، ان سے جدا ہو گئے، ان کے وصیؑ کے بارے میں ان کے قائم کردہ عہد کو توڑ دیا، ان کے بعد ان کے خلیفہؑ کے بارے میں ان کے پیمان کو پسِ پشت ڈال دیا، ان کے مقام کا خود دعویٰ کیا، ان کے احکام کو بدل دیا، ان کی سنت کو تبدیل کر دیا، ان کے دین کو الٹ پلٹ کر دیا، تیری حجتوںؑ کے مقام کو گھٹایا، ان پر ظلم کی ابتدا کی، ان کے خلاف خیانت، ان کے حکم کی مخالفت، ان کے قتل اور ان کے خلاف جنگیں بھڑکانے کا راستہ کھولا، اور تیرے خلیفہؑ کو رخنوں کو پُر کرنے، کجیوں کو درست کرنے، انحرافات کو سیدھا کرنے، احکام نافذ کرنے، دینِ اسلام کو ظاہر کرنے اور قرآن کی حدود قائم کرنے سے روک دیا۔" (1) منہج الدعوات، ص ۳۳۴۔

ائمۂ ضلالت کے اعمال کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ بیتؑ پر ظلم کا دروازہ کھل گیا اور ان کے خلاف خیانت و عداوت کا راستہ ہموار ہو گیا۔ اسی لیے وہ **گمراہی کے پیشوا** ہیں، اور دوسرے لوگ اسی راستے پر ان کے پیچھے چلتے آئے ہیں اور چل رہے ہیں جسے انہوں نے کھولا تھا۔

چنانچہ ہر قسم کے شر، انحراف اور فساد کی جڑ اور اصل بالآخر انہی کی طرف لوٹتی ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

عَدُوُّنا اَصلُ کُلِّ شَرٍّ وَ مِن فُرُوعِهِم کُلُّ قَبیحٍ وَ فاحِشَةٍ(1) .

"ہمارا دشمن ہر شر کی جڑ ہے، اور ہر برائی اور بے حیائی ان کی شاخوں میں سے ہے۔" (1) الکافی، ج ۸، ص ۲۴۲، حدیث ۳۳۶۔

ہر قبیح عمل کا سرچشمہ ائمۂ کفر کی طرف اس لیے لوٹتا ہے کہ انہوں نے اس راستے کو منحرف کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے اپنی بندگی کی غرض سے مقرر فرمایا تھا۔

انہوں نے اہلِ بیتؑ ـــ جو انسانیت کے لیے توحید اور بندگی کے الٰہی معلم تھے ـــ کو گھروں میں محدود کر دیا اور خود ان کی جگہ بیٹھ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ الٰہی معلمین کے ہاتھوں تربیت نہ پا سکے اور مکتبِ اہلِ بیتؑ میں ان کی پرورش نہ ہو سکی۔ یوں ان کے سامنے ہر قسم کے قبیح اور ناپسندیدہ اعمال کے دروازے کھل گئے۔

جس انسان کو ایک الٰہی مربّی کی مدد اور تربیت کی ضرورت ہو، اگر اسے اس نعمت سے محروم کر دیا جائے اور اس کے نتیجے میں وہ مختلف انحرافات اور گناہوں کا شکار ہو جائے تو خود اس شخص کے بعد سب سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اسے اس مربّی کی نعمت سے محروم کیا۔

البتہ اس سے خود اس شخص کے گناہ اور ذمہ داری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، بشرطیکہ وہ **مستضعفین** میں سے نہ ہو۔

اصولی طور پر ان لوگوں سے جو خود کو ائمۂ ہدایتؑ کے دشمنوں کی ولایت کے تحت قرار دیتے ہیں، یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ حقیقی اطاعت اور **ورع** کے حامل بن جائیں گے۔

نیکی وہ پھل ہے جو ائمۂ ہدایتؑ کی ولایت کے مبارک درخت پر اگتا ہے، جبکہ برے اعمال ائمۂ کفر و ضلالت کی ولایت کے ملعون درخت کے تلخ پھل ہیں۔ انسان کا اہلِ بیتؑ سے تعلق جتنا مضبوط ہوگا، نیک اعمال کی طرف اس کا میلان بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

اس کے برعکس، جو شخص ائمۂ ہدایتؑ کی ولایت سے دور ہو کر ان کے دشمنوں ـــــ یعنی ائمۂ کفر و ضلالت ـــــ کی سرپرستی کے تحت آتا جائے گا، وہ اپنے ان سے تعلق اور وابستگی کی شدت کے مطابق برائیوں کے ارتکاب کے لیے زیادہ آمادہ اور نافرمانی کی طرف مائل ہوتا جائے گا۔

یہاں ائمۂ کفر کے بعض ایسے پیروکاروں کے بارے میں ایک نہایت اہم اور دقیق بحث سامنے آتی ہے جو بظاہر اطاعت، نیکی اور تقویٰ کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے نیک اعمال حقیقت میں ان کے اپنے وجود کے درخت پر نہیں اگے، بلکہ وہ **عاریتی اور غیر اصیل** ہیں؛ بالکل ایسے جیسے انڈر وئیر کے درخت پر ایک سیب دکھائی دے۔

وہ سیب حقیقت میں اس درخت کا پھل نہیں۔ وہ کہیں اور پیدا ہوا ہے اور محض اس درخت کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

اس اہم حقیقت کے راز کی وضاحت ایک مفصل اور دقیق بحث کی محتاج ہے، جس میں فی الحال ہم داخل نہیں ہو رہے۔

ہماری موجودہ بحث سے متعلق اہم حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے معلم اور مربّی مقرر فرمائے اور رسولِ اکرمؐ نے ان کا تعارف کرایا۔

لیکن گمراہی کے پیشواؤں نے اس پاک وصاف سرچشمے تک پہنچنے کا راستہ بند کر دیا اور اس کے بجائے لوگوں کے سامنے گدلا پانی رکھ دیا۔ اسی بنا پر لوگوں کے گناہوں کا بوجھ اور ان کے برے اعمال کے نتائج بالواسطہ طور پر ان گمراہی کے پیشواؤں پر بھی عائد ہوتے ہیں۔

شاعر **کمیت** نے امام باقرؑ سے عرض کیا:

"میں نے آپؑ سے ان دونوں کے بارے میں دریافت کیا کہ ان کا حال کیا ہے؟"

امامؑ نے فرمایا:

وَ اللهِ یا کُمَیتُ، ما اُهریقَ مِحجَمَةٌ مِن دَمٍ وَ لا اُخِذَ مالٌ مِن غَیرِ حِلِّهِ وَ لا قُلِبَ حَجَرٌ عَن حَجَرٍ اِلّا ذاکَ فی اَعناقِهِما(1) .

"اللہ کی قسم، اے کمیت! خون کی اتنی مقدار بھی ناحق نہیں بہائی جاتی جتنی ایک حجامت کے برتن میں ہوتی ہے، نہ کوئی مال ناحق لیا جاتا ہے اور نہ کوئی پتھر دوسرے پتھر پر الٹا جاتا ہے، مگر یہ کہ اس کا بوجھ ان دونوں کی گردنوں پر ہے۔"

] (1) ماخذ، جیسا کہ اصل متن میں مذکور ہے۔[

پس جو بھی جرم انجام پاتا ہے اور جو بھی حرام عمل کیا جاتا ہے، اس کے براہِ راست مرتکب کے جواب دہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس گناہ کا ایک بوجھ ائمۂ ضلالت پر بھی عائد ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کو مکتبِ اہلِ بیتؑ میں تربیت پانے اور تقویٰ و پاکیزگی سیکھنے سے محروم کر دیا۔

امام باقرؑ سے منقول ایک اور روایت میں ہے:

ما اُهرِقَت مِحجَمَةُ دَمٍ إلّا وَ کانَ وِزرُها فی اَعناقِهِما اِلی یَومِ القِیامَةِ مِن غَیرِ اَن یَنتَقِصَ مِن وِزرِ العامِلینَ شَیءٌ(2) .

"خون کی اتنی مقدار بھی نہیں بہائی جاتی جتنی ایک حجامت کے برتن میں ہوتی ہے، مگر یہ کہ اس کا گناہ قیامت تک ان دونوں کی گردنوں پر بھی رہتا ہے، جبکہ اصل عمل انجام دینے والوں کے گناہ میں سے کچھ بھی کم نہیں کیا جاتا۔"

] (2)ماخذ، جیسا کہ اصل متن میں مذکور ہے۔[

۲۔ تولّیٰ و تبرّیٰ ــــ اعمال کی قبولیت اور ردّ کی شرط

تمہید

دشمنانِ خدا سے تبرّیٰ کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے ایک اور پہلو جسے پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ **تبرّیٰ، اہلِ بیتؑ سے تولّیٰ کے ساتھ مل کر، تمام اعمال اور عبادات کی قبولیت یا ردّ کی شرط ہے۔**

گزشتہ بحث میں **حبّ فی اللہ** اور **بغض فی اللہ** کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا، اس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ **معرفت اور ولایتِ امامؑ ہر عبادت کی حقیقت اور روح ہیں۔** لہٰذا اگر کوئی شخص تمام عبادات انجام دے، لیکن خاندانِ رسولؐ سے ولایت و محبت اور ان کے دشمنوں سے عداوت و بیزاری نہ رکھتا ہو، تو اس کے اعمال میں عبادت کی حقیقی روح موجود نہیں۔ وہ محض اللہ کی عبادت کی ظاہری صورتیں ہیں۔

اسی لیے ایسے اعمال بارگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوتے، بلکہ مردود قرار پاتے ہیں۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

مَن عَرَفَ الاِمامَ مِن آلِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم وَ یَتَوَلّاہُ ثُمَّ عَمِلَ لِنَفسِہِ بِما شاءَ مِن عَمَلِ الخَیرِ، قُبِلَ مِنہُ ذلِکَ وَضُوعِفَ لَہُ اَضعافاً کَثیرَۃً فَانتَفَعَ بِاَعمالِ الخَیرِ مَعَ المَعرِفَۃِ ... وَ کَذلِکَ لا یَقبَلُ اللہُ مِنَ العِبادِ الاَعمالَ الصّالِحَۃِ الَّتی یَعمَلُونَھا اِذا تَوَلَّوُا الاِمامَ الجائِرَ الَّذی لَیسَ مِنَ اللہِ تَعالی.

"جو شخص آلِ محمدؐ میں سے امامؑ کو پہچانے، ان کی ولایت قبول کرے، اور پھر اپنے لیے جو چاہے نیک عمل انجام دے، اس کا وہ عمل قبول کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ یوں معرفت کے ساتھ وہ اپنے نیک اعمال سے فائدہ اٹھاتا ہے... اور اسی طرح اللہ اپنے بندوں کے ان نیک اعمال کو قبول نہیں کرتا جو وہ اس حال میں انجام دیتے ہیں کہ انہوں نے ایسے ظالم امام کی ولایت قبول کر رکھی ہو جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر نہیں ہے۔"

عبداللہ بن ابی یعفور نے امامؑ سے عرض کیا:

''کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

مَن جاءَ بِالحَسَنَةِ فَلَهُ خَيرٌ مِنها وَ هُم مِن فَزَعٍ يَومَئِذٍ آمِنُونَ

'جو شخص نیکی لے کر آئے گا، اس کے لیے اس سے بہتر بدلہ ہوگا، اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔'

(سورۂ نمل 27:89)

پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے ائمۂ جور کی ولایت قبول کی ہو، اسے اس کا نیک عمل کوئی فائدہ نہ پہنچائے؟''

ابو عبداللہ، امام صادقؑ نے فرمایا:

''کیا تم جانتے ہو کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جس حسنہ کا ذکر فرمایا ہے، وہ کیا ہے؟

وہ امامؑ کی معرفت اور ان کی اطاعت ہے۔

اور اللہ عزوجل نے فرمایا:

وَ مَن جاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّت وُجُوهُهُم فِي النّار هَل تُجزَونَ اِلّا ما كُنتُم تَعمَلُونَ

'اور جو برائی لے کر آئیں گے، انہیں منہ کے بل آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ کیا تمہیں اس کے سوا کسی چیز کا بدلہ دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے تھے؟' (سورۂ نمل 27:90)

اللہ تعالیٰ نے سیئہ سے مراد اس امامؑ کا انکار لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر ہے۔''

پھر امام صادقؑ نے فرمایا:

مَن جاءَ يَومَ القِيامَةِ بِوِلايَةِ اِمامٍ جائرٍ لَيسَ مِنَ اللهِ وَ جاءَهُ مُنكِراً لِحَقِّنا، جاحِداً لِوِلايَتِنا، اَكَبَّهُ اللهُ تَعالى يَومَ القِيامَةِ فِي النّار.

''جو شخص قیامت کے دن ایسے ظالم امام کی ولایت لے کر آئے جو اللہ کی جانب سے نہیں ہے، اور ہمارے حق کا منکر اور ہماری ولایت کا جحود کرنے والا بن کر اللہ کے حضور حاضر ہو، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے منہ کے بل آگ میں ڈال دے گا۔(3) ''

پس دینداری کا بنیادی معیار اور اس کی اصل حقیقت **اہلِ بیتؑ کی ولایت کو قبول کرنا** ہے۔ اس کے بغیر کوئی عمل انسان کے لیے سود مند نہیں ہو سکتا۔

اب اگر کوئی شخص ائمۂ ہدایتؑ کو پہچاننے کے باوجود ان کی مخالفت کا راستہ اختیار کرے اور ان کے ساتھ بغض و عداوت رکھے، تو وہ دین کے راستے سے مکمل طور پر خارج ہو چکا ہے۔ جب تک وہ اہلِ بیتؑ کے ساتھ دشمنی اور بغض رکھتا ہے، اس کے نیک اعمال اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔

ایسا شخص در حقیقت اللہ کی بندگی کے راستے میں داخل ہی نہیں ہوا، بلکہ اس نے بندگی اور اطاعتِ الٰہی کے اصل محور کی مخالفت کی ہے۔ لہٰذا اگر وہ بظاہر کوئی نیک عمل بھی انجام دے تو حقیقت میں اس نے عبادتِ خدا کو ایک ایسی چیز بنا دیا ہے جس کے ساتھ وہ گویا استہزا اور تمسخر کر رہا ہے۔ اسی بنا پر امام باقرؑ سے منقول ہے:

سَواءٌ عَلی مَن خالَفَ هذَا الاَمرَ، صَلّی اَو زَنی.

"جو شخص اس امر [ولایت] کی مخالفت کرے، اس کے لیے برابر ہے کہ وہ نماز پڑھے یا زنا کرے۔(1)"

اور امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ النّاصِبَ لَنا اَهلَ البَیتِ لا یُبالی صامَ اَم صَلّی، زَنی اَم سَرِقَ. اَنَّهُ فِی النّارِ. اِنَّهُ فِی النّار.

"بے شک جو شخص ہم اہلِ بیتؑ سے دشمنی رکھتا ہے، اس کے لیے کوئی فرق نہیں کہ وہ روزہ رکھے یا نماز پڑھے، زنا کرے یا چوری کرے۔ بے شک وہ آگ میں ہے، بے شک وہ آگ میں ہے۔(2)"

دینداری کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ کی بندگی کے راستے پر قائم رہے، اور یہ صرف ائمہؑ کی ولایت و امامت قبول کرنے اور ان کے دشمنوں سے تبرّیٰ اختیار کرنے کے ذریعے متحقق ہوتی ہے۔ یہی چیز کسی عمل کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔

لہٰذا جس شخص نے ولایت کو قبول نہیں کیا، اس کے اعمال اسے نجات نہیں دے سکتے۔ اس خاص اعتبار سے کہ انجامِ کار وہ آگ میں ہو گا، اس کے نیک اعمال اور گناہ دونوں اس کی نجات کا سبب نہ بننے میں یکساں ہیں۔

البتہ گناہ کبھی گناہ ہونا نہیں چھوڑتا، اور گناہوں کا ارتکاب ایسے شخص کے عذاب میں اضافہ کرے گا۔ لیکن اس کے نیک اعمال، چونکہ اسے کامیابی اور ابدی سعادت تک نہیں پہنچاتے، اس خاص پہلو سے اس کے برے اعمال سے مختلف نہیں ہیں۔

پس ہر عبادت کی روح اہل بیتؑ سے تولّیٰ اور ان کے دشمنوں سے تبرّیٰ ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اعمال کی ظاہری صورت اور ساخت بھی اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔ایسا ہر گز نہیں سمجھنا چاہیے کہ چونکہ ائمہؑ کی ولایت اور معرفت تمام اعمال کی روح ہے،اس لیے ہم صرف اس روح پر اکتفا کر سکتے ہیں اور اعمال کی ظاہری ہیئت اور ساخت کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔

یہ طرزِ فکر سراسر غلط ہے۔

جس طرح عمل کی روح ایک مخصوص حقیقت کا تقاضا کرتی ہے،اسی طرح اس کی ظاہری صورت اور عملی ساخت بھی عین اسی طرح انجام پانا ضروری ہے جس طرح اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔اس معاملے میں معمولی سی کوتاہی بھی روا نہیں۔

خود ائمہؑ کے ظاہری حضور کے زمانے میں بھی بعض ایسے لوگ موجود تھے جو ولایت اور معرفت کے بارے میں ائمہؑ کی شدید تاکید سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے اور ان کی طرف ناقص اور تحریف شدہ باتیں منسوب کرتے تھے۔

ائمہؑ نے ایسی باتوں کے خلاف سخت ردِّ عمل ظاہر کیا اور منحرف لوگوں کو اپنے کلمات کا غلط مفہوم اخذ کرنے یا ان میں تحریف کرنے کی اجازت نہیں دی۔

مثلاً ایک مرتبہ امام صادقؑ کو خبر دی گئی کہ **ابوالخطاب** نامی شخص آپؑ سے یہ بات نقل کر رہا ہے:

اِذا عَرَفتَ الحَقَّ فَاعمَل ما شِئتَ.

"جب تم حق کو پہچان لو تو پھر جو چاہو کرو۔" امامؑ نے فرمایا:

لَعَنَ اللهُ اَبَا الخَطّابِ! وَ اللهِ ما قُلتَ لَهُ هکَذا. وَ لکِنّی قُلتُ لَهُ: اِذا عَرَفتَ الحَقَّ فَاعمَل ما شِئتَ مِن خَیرٍ یُقبَل مِنکَ.

"اللہ ابوالخطاب پر لعنت کرے! اللہ کی قسم، میں نے اس سے یہ بات اس طرح نہیں کہی تھی، بلکہ میں نے اس سے کہا تھا: جب تم حق کو پہچان لو تو پھر جو نیک عمل چاہو انجام دو، وہ تم سے قبول کیا جائے گا۔(1)"

یہاں **حق کی معرفت** سے مراد ائمہؑ کی امامت اور ولایت کے امر کو قبول کرنا ہے، جو ایمان کا معیار اور میزان ہے۔

جو شخص ان کی معرفت رکھتا ہے، اس نے در حقیقت اعمال کی قبولیت کی بنیادی شرط پوری کر دی ہے۔ اس کے بعد وہ جو بھی نیک عمل انجام دے گا، وہ اس سے قبول کیا جائے گا۔ نیک عمل وہ ہے جس کا ظاہر اور باطن دونوں اس امر کے مطابق ہوں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اور ایسا عمل اسی شخص سے قبول ہوتا ہے جو ایمان رکھتا ہو۔

ایمان اور عملِ صالح—سعادت کی دو لازمی شرطیں

پس مجموعی طور پر اعمال کی قبولیت کی دو شرطیں ہیں:

پہلی : عمل اسی طریقے کے مطابق انجام دیا جائے جسے اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔

دوسری : عمل انجام دینے والا صاحبِ ایمان ہو اور ائمہؑ کی معرفت رکھتا ہو۔

عمل کی قبولیت کے لیے یہ دونوں شرطیں ضروری ہیں۔

اگر کوئی عمل اپنی ذات میں نیک ہو، مثلاً نماز، لیکن اسے انجام دینے والا ولایت اور معرفت سے محروم ہو تو اس نماز کا انجام دینا اسے فائدہ نہیں پہنچاتا؛ گویا اس نے نماز ادا ہی نہیں کی۔

جس طرح وضو کے بغیر نماز پڑھنے والے نے حقیقتاً صحیح نماز ادا نہیں کی، اسی طرح اگر امامؑ کا منکر چند ایسے ظاہری اعمال انجام دے جو نماز کی شکل رکھتے ہوں تو اس نے حقیقت میں اس عبادت کو انجام نہیں دیا جسے شرعاً نماز کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، ائمہؑ کی ولایت اور معرفت ہر عبادت کی روح اور ایمان کی حقیقت ہیں۔ ان کے بغیر کوئی نیک اور شائستہ عمل انسان کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اسی لیے امام صادقؑ، ابوالخطاب کی بات کی تردید جاری رکھتے ہوئے، فرماتے ہیں:

اِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ یَقولُ: «مَن عَمِلَ صالِحاً مِن ذَکَرٍ اَو اُنثی وَ هُوَ مُؤمِنٌ فَاُولئِکَ یَدخُلُونَ الجَنَّةَ یُرزَقُونَ فیها بِغَیرِ حِسابٍ». وَ یَقُولُ تَبارَکَ وَ تَعالی: «مَن عَمِلَ صالِحاً مِن ذَکَرٍ اَو اُنثی وَ هُوَ مُؤمِنٌ فَلَنُحیِیَنَّهُ حَیاةً طَیِّبَةً.«

"اللہ عزوجل فرماتا ہے: 'جو شخص نیک عمل کرے، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مؤمن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں انہیں بے حساب رزق دیا جائے گا۔' (سورۂ غافر 40:40)

اور اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

'جو شخص نیک عمل کرے، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مؤمن ہو، تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔'

(سورۂ نحل 16:97)

عملِ صالح وہ عمل ہے جو فی نفسہٖ نیک اور پسندیدہ ہو۔ لیکن عمل کرنے والے کی اپنی حیثیت بھی اس بات میں فیصلہ کن کردار رکھتی ہے کہ وہ عمل اسے فائدہ پہنچائے گا اور بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو گا یا نہیں۔

اگر عمل کرنے والا مؤمن ہو تو اس کا عمل قبول ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ مؤمن نہ ہو تو وہ عمل اس کی آخری نجات اور ابدی سعادت کے اعتبار سے اسے فائدہ نہیں پہنچاتا، اگرچہ ممکن ہے دنیا میں اس عمل کے اچھے اور مفید آثار ظاہر ہوں، یا حتیٰ کہ آخرت میں اس کے عذاب میں کسی حد تک تخفیف کا سبب بنے۔

لیکن سنتِ الٰہی کے مطابق ایسا عمل اسے ابدی سعادت تک نہیں پہنچاتا۔

در حقیقت **ظاہری اسلام اور ایمان** کے درمیان فرق کا خلاصہ بھی اسی حقیقت میں کیا جا سکتا ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اَلاِسلامُ هُوَ الظاهِرُ الَّذی عَلَیهِ النّاسُ: شَهادَةُ اَن لا اِلهَ اِلّا اللهُ وَحدَهُ لا شَریکَ لَهُ وَ اَنَّ مُحَمَّداً عَبدُهُ وَ رَسولُهُ وَ اِقامَ الصَّلاةَ وَ ایتاءُ الزَّکاةَ وَ حَجُّ البَیتَ وَ صِیامُ شَهرِ رَمَضانَ. فَهذَا الاِسلامُ. وَ الایمانُ مَعرِفَةُ هذَا الاَمرِ مَعَ هذا. فَاِن اَقَرَّ بِها وَ لَم یَعرِف هَذَا الاَمرَ، کانَ مُسلِماً وَ کانَ ضالّاً.

"اسلام وہ ظاہری حالت ہے جس پر لوگ قائم ہیں: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں؛ اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں؛ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، بیت اللہ کا حج کرنا اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنا۔ پس یہ اسلام ہے۔

اور ایمان یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کے ساتھ اس امر [امامت و ولایت] کی معرفت بھی ہو۔

پس اگر کوئی شخص ان امور کا اقرار کرے لیکن اس امر کی معرفت نہ رکھے تو وہ مسلمان ہے، مگر گمراہ ہے۔(2) "

ایمان کے بغیر اسلام محض ایک ظاہری صورت ہے۔ کوئی عمل حقیقی معنوں میں اسی وقت عبادتِ خدا بنتا ہے جب وہ انسان کے قلبی ایمان اور پروردگارِ متعال کے سامنے اس کی حقیقی تسلیم سے پیدا ہوا اور اسی میں جڑ رکھتا ہو۔

روایات کی تعبیر کے مطابق، مؤمن وہ ہے جس کے اعمال اس کے یقین اور باطنی اعتقاد کی عکاسی کرتے ہوں۔ عبادت کی قدر و قیمت در حقیقت اسی باطنی یقین سے وابستہ ہے۔

لیکن جب یہ ایمان اور یقین موجود نہ ہو تو عمل ایک بے حقیقت ظاہری صورت بن جاتا ہے اور اپنی حقیقی قدر کھو دیتا ہے۔

پس ممکن ہے کوئی شخص مسلمان ہو اور دنیا میں اسلام کے فقہی و ظاہری احکام اس پر جاری ہوں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ گمراہی میں ہو۔ کیونکہ **ہدایت کا تحقق ایمان سے ہوتا ہے، محض ایمان سے خالی ظاہری اسلام سے نہیں۔**

تمام اعمال میں ولیِ خدا کی رہنمائی

امام باقرؑ سے منقول ایک روایت میں اسلام کی بنیادیں پانچ چیزیں بیان ہوئی ہیں : **نماز، زکوۃ، حج، روزہ اور ولایت۔**

امامؑ ان چار بنیادوں کے مقابلے میں ولایت کا مقام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ذِروَةُ الاَمرِ وَ سَنامُهُ وَ مِفتاحُهُ وَ بابُ الاَشياءِ وَ رِضَا الرَّحمنُ الطَّاعَةُ لِلاِمامِ بَعدَ مِعرِفَتِهِ. اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُولُ: «مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَد اَطاعَ اللهَ وَ مَن تَوَلّى فَما اَرسَلناکَ عَلَيهِم حَفيظاً». اَما لَو اَنَّ رَجُلاً قامَ لَيلَهُ وَ صامَ نَهارَهُ وَ تَصَدَّقَ بِجَميعِ مالِهِ وَ حَجَّ جَميعَ دَهرِهِ وَ لَم يَعرِف وِلايَةَ وَلِيِّ اللهِ فَيُوالِيهِ وَ يَكُونَ جَميعُ اَعمالِهِ بِدَلالَتِهِ اِلَيهِ، ما كانَ لَهُ عَلَى اللهِ جَلَّ وَ عَزَّ حَقٌّ فى ثَوابِهِ وَ لا كانَ مِن اَهلِ الايمانِ.

"اس امر کی بلندی، اس کی چوٹی، اس کی کنجی، تمام چیزوں کا دروازہ اور رحمان کی رضا کا ذریعہ یہ ہے کہ امامؑ کی معرفت حاصل کرنے کے بعد ان کی اطاعت کی جائے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے:

'جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی؛ اور جو منہ موڑ لے تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔'

(سورۂ نساء 4:80)

آگاہ رہو! اگر کوئی شخص اپنی تمام راتیں عبادت میں گزارے، تمام دن روزے رکھے، اپنا سارا مال صدقہ کر دے اور پوری زندگی حج کرتا رہے، لیکن ولیِ خدا کی ولایت کو نہ پہچانے تاکہ اس سے ولایت و دوستی رکھے اور اس کے تمام اعمال اس ولی کی رہنمائی اور دلالت کے مطابق انجام پائیں، تو ایسے شخص کے لیے اللہ جلّ و عزّ کے ذمہ ان اعمال پر کسی ثواب کا کوئی حق نہیں، اور نہ وہ اہلِ ایمان میں سے ہے۔(2) "

اللہ یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کے تمام اعمال ان ہستیوں کی ہدایت اور رہنمائی میں انجام پائیں جنہیں خود اس نے مؤمنین کا **ولی، سرپرست اور صاحبِ اختیار** مقرر فرمایا ہے۔ جب انسان ان کی ولایت قبول کر لے تو پھر اسے اپنے تمام اعمال، بلا استثنا، ان کی ولایت اور سرپرستی کے تحت قرار دینا ہوگا۔ اس دائرے سے کوئی چیز خارج نہیں۔ انسان کے اعضاء و جوارح کے اعمال ہوں، قلب کے افعال ہوں یا اس کے افکار و خیالات ـــــ سب کو ائمہؑ کی ولایت اور ہدایت کے زیرِ سایہ آنا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں انسان حقیقی معنوں میں اللہ کا بندہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

اگر وہ صرف ان امور میں ائمہؑ کی طرف رجوع کرے جو اس کی اپنی پسند کے مطابق ہوں، لیکن جہاں ان کی ہدایت اس کی خواہش کے برخلاف ہو وہاں اپنی رائے، پسند اور تشخیص کی پیروی کرے، تو وہ خالصتاً اللہ کا بندہ نہیں رہا۔ بلکہ اس نے اپنی بندگی میں اپنی ذات، اپنی رائے اور اپنے فیصلے کو اللہ کے مقابل ایک شریک کی حیثیت دے دی۔

لہٰذا ایسا شخص مؤمن نہیں، اور مؤمنین کے لیے وعدہ کیے گئے اجر و ثواب کا مستحق بھی نہیں۔

مستضعفین کے نیک اعمال موجبِ استحقاقِ ثواب نہیں

امام باقرؑ اپنے مذکورہ کلام کے تسلسل میں انہی لوگوں کے بارے میں ایک جملہ ارشاد فرماتے ہیں جسے بعض منحرف افکار رکھنے والوں نے غلط طور پر سمجھا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

اَولئکَ المُحسِنُ مِنهُم یُدخِلُهُ اللهُ الجَنَّةَ بِفَضلِ رَحمَتِهِ.

"ان میں سے جو نیکوکار ہوں گے، اللہ انہیں اپنے فضلِ رحمت سے جنت میں داخل کرے گا۔(1) "

مرحوم علامہ مجلسیؒ اس عبارت کی تشریح میں دو احتمال بیان کرتے ہیں، جن میں سے ایک کو زیادہ ظاہر قرار دیتے ہیں۔(2)

ان کے نزدیک زیادہ ظاہر معنی یہ ہے کہ یہاں لفظ **"اولئک "** سے مراد ولایت کو قبول نہ کرنے والوں میں سے **مستضعفین** ہیں۔ یعنی ایسے افراد جو اپنی کسی کوتاہی یا تقصیر کے بغیر ائمہؑ کی معرفت کی نعمت سے محروم رہ گئے۔ جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصے میں بیان ہوا، یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کا معاملہ **"مُرْجَؤُونَ لِأَمْرِ الله "** ہے؛ یعنی ان کا آخری فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔

امام باقرؑ کے ارشاد کے مطابق ان کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر وہ ظلم و جرم کے مرتکب نہ ہوں بلکہ نیک اور اچھے اعمال انجام دینے والے ہوں، تو اللہ انہیں اپنے **فضلِ رحمت** سے جنت میں داخل فرمائے گا۔

یہ تعبیر کہ **"اپنے فضلِ رحمت سے"** — بِفَضلِ رَحمَتِهِ —اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ایسے لوگوں کا جنت میں داخل ہونا کسی ایسے خاص وعدۂ الٰہی کی بنا پر نہیں جس کے وہ مستحق قرار پائے ہوں۔

کیونکہ اس سے فوراً پہلے امامؑ فرما چکے ہیں:

ما كانَ لَهُ عَلَى اللهِ جَلَّ وَ عَزَّ حَقٌّ فی ثَوابِهِ.

"اس کے لیے اللہ جلّ وعزّ کے ذمہ اپنے اعمال کے ثواب کا کوئی حق نہیں ہے۔"

اہلِ ایمان اللہ کے وعدے کی بنا پر جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں، لیکن نیک اعمال انجام دینے والے مستضعفین کے ساتھ پروردگار نے ایسا کوئی وعدہ نہیں فرمایا۔

لہٰذا اگر وہ جنت میں داخل بھی کیے جائیں تو ان کا داخلہ اہلِ ایمان کے جنت میں داخلے کی مانند نہیں ہوگا۔

البتہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مؤمنین سے اللہ کا وعدۂ ثواب بھی خود اس کے فضل ہی کا نتیجہ ہے؛ کیونکہ محض اپنے پروردگار کی اطاعت کی بنا پر کوئی شخص بذاتِ خود اللہ پر کسی اجر کا حق نہیں رکھتا۔ لیکن جب اللہ نے خود اجر کا وعدہ فرما دیا تو اس وعدے کے بعد اہلِ ایمان کو اپنے پروردگار کے حضور ایک حق حاصل ہو جاتا ہے۔

لیکن غیر مؤمنین، خواہ نیکوکار ہوں یا گناہ گار، اللہ پر ایسا کوئی حق نہیں رکھتے۔

لہٰذا اگر نیک غیر مؤمنین جنت میں داخل کیے جائیں تو یہ ان پر اللہ کے ایک **مزید فضل و کرم** کی بنا پر ہوگا، نہ اس لیے کہ کسی وعدۂ الٰہی کے تحت انہوں نے اپنے لیے کوئی حق پیدا کر لیا تھا۔

امامؑ کی دو تعبیرات ''— بِفَضلِ رَحمَتِہِ ''اور ''ما کانَ لَہُ عَلَی اللہِ... حَقٌّ فی ثَوابِہِ — ''سے ایک اور نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے: نیک مستضعفین کا جنت میں داخل ہونا اس بات کے مساوی نہیں کہ ان کے اعمال بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو گئے تھے۔

لہٰذا اگر ان کے مستضعف ہونے اور کسی تقصیر کے مرتکب نہ ہونے کی بنا پر انہیں **معذور** بھی قرار دیا جائے تو اس معذوریت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے اعمال پر **مأجور** بھی ہوں۔

کسی شخص کو صحیح معنوں میں **مأجور** اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب اس کا عمل اللہ تعالیٰ کی مطلوبہ صورت کے مطابق ہو اور وہ اس بنا پر وعدۂ الٰہیِ ثواب کے دائرے میں آ جائے۔

جبکہ امام باقرؑ کے صریح ارشاد کے مطابق اس گروہ کے لیے اللہ کے ذمہ کسی ثواب کا حق نہیں ہے۔

زیادہ دقیق تعبیر میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا جنت میں داخل ہونا ان کے نیک اعمال کا **اجر و ثواب** نہیں ہے۔

اللہ نے اعمال کی قبولیت کے لیے کچھ شرائط مقرر فرمائی ہیں، جن میں سب سے اہم **ایمان** ہے۔ چونکہ یہ لوگ ایمان کے حامل نہیں، اس لیے وہ قبولیتِ اعمال اور ثواب کے بارے میں اللہ کے وعدے کے دائرے میں شامل نہیں ہوتے۔

پس اگر ان کے نیک اعمال کے باوجود انہیں جنت میں داخل نہ کیا جاتا، تب بھی ان پر کوئی ظلم نہ ہوتا، کیونکہ اللہ کے ذمہ ان کا کوئی حق نہیں تھا۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ انہیں **مأجور**، یعنی اپنے اعمال پر مستحقِ اجر، قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح اسلامی فقہ کی فنی اصطلاح میں ان مستضعفین کے نیک اعمال کو **مُجزی** بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ **مُجزی عمل** اس عمل کو کہتے ہیں جو تکلیفِ الٰہی کے مطابق انجام پائے اور اسی بنا پر انسان کے ذمہ عائد شرعی ذمہ داری کو ساقط کر دے۔ ان لوگوں نے اپنی حقیقی تکالیفِ الٰہی کو پہچانا ہی نہیں۔ البتہ چونکہ وہ مستضعف ہیں، اس لیے ان تکالیف پر عمل نہ کرنے میں معذور ہیں۔

لیکن ان کا معذور ہونا اس بات کے معنی میں نہیں کہ ان کے انجام دیے ہوئے نیک اعمال **مُجزی** بھی ہیں، یعنی انہوں نے ان کے ذریعے اپنی حقیقی تکلیفِ الٰہی کو ادا کر دیا ہے۔

ان توضیحات کے بعد امام باقرؑ کی مذکورہ روایت کے بارے میں درج ذیل عبارت لکھنے والے کی لاعلمی ـــــ یا اگر اسے لاعلمی نہ کہا جائے تو اس کا دانستہ تعصب ـــــ بخوبی واضح ہو جاتا ہے:

"ہم دیکھتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ ان لوگوں کو بھی اہلِ جنت قرار دیتے ہیں جنہوں نے اسلام کے احکام کو اس امام کے علاوہ کسی دوسرے راستے سے سمجھا جسے شیعہ حجتِ خدا مانتے ہیں، اور پھر ان احکام پر عمل کیا؛ بشرطیکہ وہ محسن ہوں اور ظالم نہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کے اعمال واقعی حکمِ خدا کے خلاف بھی ہوں، تب بھی وہ اعمال مُجزی اور موجبِ اجر ہیں۔(1) "

اسی بنیادی غلطی کی وجہ سے ـــــ خواہ اس سے دانستہ طور پر سرزد ہوئی ہو یا نادانستہ ـــــ یہ مصنف امام باقرؑ کے کلام کی تفسیر میں ایک اور سنگین غلطی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"معرفتِ امام کی حیثیت طریقیت کی ہے، موضوعیت کی نہیں؛ کیونکہ معرفتِ امام صرف احکامِ دین کو جاننے کا ایک ذریعہ ہے۔ برخلافِ ایمان باللہ اور ایمان بالمعاد کے، جو اپنی مستقل اور ذاتی موضوعیت رکھتے ہیں۔(2) "

انتہائی تعجب کی بات ہے کہ وہ امامؑ کے صریح کلام سے عین اس کے برعکس نتیجہ اخذ کرتا ہے۔

امامؑ صاف طور پر فرما رہے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھے، روزے رکھے، زکوٰۃ دے اور حج کرے، لیکن یہ سب کچھ **ولیِ خدا کی ولایت کے بغیر** انجام دے، تو اس کے لیے ان اعمال پر کسی ثواب کا کوئی حق نہیں۔

اس سے زیادہ واضح تعبیر اور کیا ہو سکتی ہے جو یہ ثابت کرے کہ **معرفتِ امامؑ بذاتِ خود موضوعیت رکھتی ہے** اور محض احکامِ دین تک پہنچنے کا ایک ذریعہ نہیں؟

اگر اس مصنف کے پیشِ نظر کوئی اور غرض نہ ہوتی تو کیا وہ اس قدر واضح اور صریح حقیقت کو نہ سمجھ پاتا؟

حوالہ جات

1. الکافی، ج۸، ص۱۰۳، حدیث ۷۵۔
2. بحار الانوار، ج۸۵، ص۲۶۴، بحوالہ بلد الامین۔
3. بحار الانوار، ج۲۷، ص۱۷۰، حدیث ۱۱، بحوالہ امالیِ شیخ طوسی۔
4. عقاب الاعمال، ص۴۵۲، حدیث ۱۷۔
5. عقاب الاعمال، ص۴۵۲، حدیث ۱۸۔
6. بحار الانوار، ج۲۷، ص۱۷۳، حدیث ۱۸، بحوالہ معانی الاخبار۔
7. الکافی، ج۲، ص۲۴، کتاب الایمان والکفر، باب **''اسلام خون کی حفاظت کرتا ہے''...**، حدیث ۴۔
8. الکافی، ج۲، ص۱۹، کتاب الایمان والکفر، باب **''دعائم الاسلام''**، حدیث ۵۔
9. مرآۃ العقول، ج۷، ص۱۰۸۔
10. نعمت اللہ صالحہ نجف آبادی، مجموعۂ مقالات، **''مقالۂ وحدتِ اسلامی''**، ص۱۷۷۔
11. نعمت اللہ صالحہ نجف آبادی، مجموعۂ مقالات، **''مقالۂ وحدتِ اسلامی''**، ص۱۷۶۔

ولایتِ اہلِ بیتؑ ـــــ دنیا اور اس سے پہلے مخلوقات کے امتحان کا ذریعہ

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہوئی کہ **ایمان کی بنیاد معرفتِ امامؑ اور ان کی ولایت کو قبول کرنا ہے۔**

یہ ایک قطعی سنتِ الٰہی ہے جو تمام مخلوقات میں جاری رہی ہے اور اب بھی جاری ہے۔ اللہ نے جتنے آسمانوں اور زمینوں کو خلق فرمایا، ان سب کے باشندوں پر یہ سنت جاری ہے۔ یہ صرف نظامِ شمسی کی اس زمین پر رہنے والے انسانوں سے مخصوص نہیں، اور نہ ہی صرف امتِ خاتم الانبیاءؐ تک محدود ہے۔

بلکہ انسان کی دنیوی خلقت سے پہلے بھی، جس وقت اہلِ بیتؑ کے نورِ وجود کی تخلیق ہوئی، اسی وقت سے یہ سنت جاری تھی۔

معراج سے متعلق ایک روایت میں رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

لَیلَةَ اُسرِیَ بی اِلَی الجَلیلِ جَلَّ جَلالُهُ، اَوحی اِلَیَّ: ... یا مُحَمَّدُ، اِنّی خَلَقتُکَ وَ خَلَقتُ عَلِیّاً وَ فاطِمَةَ وَ الحَسَنَ وَ الحُسَینَ وَ الاَئِمَّةَ مِن وُلدِهِ مِن سِنخِ نورٍ مِن نُوری. وَ عَرَضتُ وِلایَتَکُم عَلی اَهلِ السَّمواتِ وَ اَهلِ الاَرَضینَ. فَمَن قَبِلَها کانَ عِندی مِنَ المُؤمِنینَ. وَ مَن جَحَدَها کانَ عِندی مِنَ الکافِرینَ.

یا مُحَمَّدُ، لَو اَنَّ عَبداً مِن عَبیدی عَبَدَنی حَتّی یَنقَطِعَ وَ یَصیرَ کَالشَّنِّ البالی، ثُمَّ اَتانی جاحِداً لِوِلایَتِکُم، ما غَفَرتُ لَهُ حَتّی یُقِرَّ بِوِلایَتِکُم(1) .

"جس رات مجھے صاحبِ جلال ـــــ جلّ جلالہ ـــــ کی بارگاہ کی طرف لے جایا گیا، اس نے میری طرف وحی فرمائی:

اے محمدؐ! میں نے آپ کو خلق کیا، اور علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور حسینؑ کی نسل سے ائمہؑ کو اپنے نور سے ایک سنخ نور سے خلق کیا۔ پھر میں نے تم سب کی ولایت کو اہلِ آسمان اور اہلِ زمین کے سامنے پیش کیا۔ جس نے اسے قبول کیا، وہ میرے نزدیک مؤمن قرار پایا، اور جس نے اس کا جحود و انکار کیا، وہ میرے نزدیک کافروں میں سے قرار پایا۔

اے محمدؐ! اگر میرے بندوں میں سے کوئی بندہ میری اتنی عبادت کرے کہ اس کا بدن بالکل فرسودہ ہو کر پرانی مشک کی مانند ہو جائے، پھر وہ میرے پاس اس حال میں آئے کہ تمہاری ولایت کا منکر ہو، تو میں اسے اس وقت تک نہیں بخشوں گا جب تک وہ تمہاری ولایت کا اقرار نہ کرے۔"

(1) بحار الانوار، ج 27، ص 200، حدیث 67، بحوالۂ مناقب محمد بن احمد بن شاذان۔

پس حقیقت یہ ہے کہ **ایمان کا معیار اہلِ بیتؑ کی ولایت کا اقرار و قبول ہے۔**

انسانوں کے اس دنیوی عالم میں آنے سے پہلے بھی اللہ نے انہیں اس آزادی اور اختیار کے ذریعے آزمایا جو اس نے انہیں عطا کیا تھا، اور اس امتحان کا موضوع **ولایتِ اہلِ بیتؑ** تھی۔ جس طرح اس دنیا میں بھی یہی ولایت امتحانِ الٰہی کا ذریعہ ہے، اسی طرح ان مقدس ہستیوں کی ولایت کی علامت ان سے محبت ہے۔

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

لَو اَنَّ عَبداً عَبَدَاللهَ بَینَ الصَّفا وَ المَروَةِ أَلفَ عامٍ ثُمَّ اَلفَ عامٍ ثُمَّ اَلفَ عامٍ حَتّی یَصیرَ کَالشَّنِّ البالی، ثُمَّ لَم یُدرِک مَحَبَّتَنا، کَبَّهُ اللهُ عَلی مِنخَرَیهِ فِی النّارِ. ثُمَّ تَلا: «قُل لا اَسالُکُم عَلَیهِ اَجراً اِلَّا المَوَدَّةَ فِی القُربی(1) .«

"اگر کوئی بندہ صفا و مروہ کے درمیان ایک ہزار سال، پھر ایک ہزار سال، پھر ایک ہزار سال اللہ کی عبادت کرے، یہاں تک کہ پرانی اور فرسودہ مشک کی مانند ہو جائے، لیکن ہماری، اہلِ بیتؑ کی محبت کو نہ پائے، تو اللہ اسے منہ کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔"

پھر رسول اللہؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

قُل لا اَسالُکُم عَلَیهِ اَجراً اِلَّا المَوَدَّةَ فِی القُربی

"کہہ دیجیے: میں تم سے اس رسالت پر کوئی اجر نہیں مانگتا، سوائے اپنے قرابت داروں سے مودّت کے۔"

(سورۂ شوریٰ 42:23)

(1) مجمع البیان، سورۂ شوریٰ، آیت 23 کی تفسیر۔

معرفتِ امامؑ — ہر عبادت کی ابتدا اور انتہا

بہر حال، تمام عبادات کی بنیاد اور روح **اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ولایت** ہے۔

اگر بندگانِ خدا نے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسری عبادات کو پہچانا اور سیکھا ہے تو یہ خاندانِ رسولؐ کی معرفت کی برکت سے ہے۔ اگر یہ مقدس ہستیاں نہ ہوتیں تو کوئی شخص نماز، روزہ اور دیگر عبادات کو صحیح طور پر نہ جان سکتا۔

اور اگر ان عبادات سے ان کے حقیقی اور مطلوبہ آثار حاصل ہونے ہوں تو ضروری ہے کہ وہ عبادت گزار کو اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ولایت میں پہلے سے زیادہ مضبوط اور ثابت قدم بنائیں۔

اسی بناپر کہا جاسکتا ہے کہ **ہر عبادت کی ابتدا بھی رسولِ خداؐ اور ائمہؑ کی معرفت سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا بھی اسی معرفت پر ہوتی ہے۔**

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

ما مِن شَیءٍ بَعدَ المَعرِفَةِ یَعدِلُ هذِهِ الصَّلاةَ. وَ لا بَعدَ المَعرِفَةِ وَ الصَّلاةِ شَیءٌ یَعدِلُ الزَّکاةَ. وَ لا بَعدَ ذلِکَ شَیءٌ یَعدِلُ الصَّومَ. وَ لا بَعدَ ذلِکَ شَیءٌ یَعدِلُ الحَجَّ. وَ فاتِحَةُ ذلِکَ کُلِّهِ مَعرِفَتُنا. وَ خاتِمَتُهُ مَعرِفَتُنا(2) .

"معرفت کے بعد اہمیت اور قدر میں کوئی چیز اس نماز کے برابر نہیں۔اور معرفت اور نماز کے بعد کوئی چیز زکوۃ کے برابر نہیں۔اس کے بعد کوئی چیز روزے کے برابر نہیں،اور اس کے بعد کوئی چیز حج کے برابر نہیں۔

اور ان سب کی ابتدا ہماری معرفت ہے اور ان سب کی انتہا بھی ہماری معرفت ہے۔(2) "

معرفت کی اصل اور بنیاد **اللہ تعالیٰ کی معرفت** ہے،اور یہی اس کی بندگی کی روح اور حقیقت ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے، معرفتِ خدا کا لازمی تقاضا رسولِ خداؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ کی معرفت ہے۔لہٰذا کسی بھی عبادت کو انجام دینے سے پہلے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ چودہ معصومینؑ کی ولایت کے سامنے تسلیم ہو،اور پھر عبادات کا طریقہ انہی سے حاصل کرے۔

پس **معرفتِ امامؑ کا مرتبہ ہر عبادت سے مقدم ہے۔**

دوسری طرف، ہر عبادت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ انسان کی معرفتِ خدا میں اضافہ ہو،اور معرفتِ خدا میں یہ اضافہ اہلِ بیتؑ کی معرفت میں مزید گہرائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔اس طرح **معرفتِ امامؑ تمام عبادات کا جوہر اور نچوڑ ہے۔**چونکہ وہ تمام عبادات کی روح ہے،اس لیے کسی عبادت سے جدا نہیں ہوسکتی۔

تمام حالات میں ولایت کا واجب ہونا

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری تمام عبادات بعض حالات میں انسان سے ساقط ہو سکتی ہیں، لیکن **ولایتِ اہلِ بیتؑ کا** معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ولایت قلب سے متعلق ایک امر ہے اور کسی حالت میں اس کا وجوب ساقط نہیں ہوتا۔

ابو حمزہ ثمالی، امام باقرؑ سے روایت کرتے ہیں:

بُنِیَ الاِسلامُ عَلی خَمسٍ: اِقامُ الصَّلاةِ وَ ایتاءُ الزَّکاةِ وَ حَجُّ البَیتِ وَ صَومُ شَهرِ رَمَضانَ وَ الوِلایَةُ لَنا اَهلَ البَیتِ. فَجُعِلَ فی اَربَعٍ مِنها رُخصَةٌ، وَ لَم یَجعَل فِی الوِلایَةِ رُخصَةٌ. مَن لَم یَکُن لَهُ مالٌ، لَم یَکُن عَلَیهِ الزَّکاةُ. وَ مَن لَم یَکُن عِندَهُ مالٌ، فَلَیسَ عَلَیهِ حَجٌّ. وَ مَن کانَ مَریضاً، صَلّی قاعِداً، وَ اَفطَرَ شَهرَ رَمضانَ. وَ الوِلایةُ صَحیحاً کانَ اَو مَریضاً، اَو ذا مالٍ اَو لا مالَ لَهُ، فَهِیَ لازِمَةٌ [واجِبَةٌ](1) .

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا، ماہِ رمضان کے روزے رکھنا، اور ہم اہلِ بیتؑ کی ولایت۔ ان میں سے چار امور میں رخصت رکھی گئی ہے، لیکن ولایت میں کوئی رخصت نہیں رکھی گئی۔

جس کے پاس مال نہ ہو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ جس کے پاس استطاعت نہ ہو اس پر حج نہیں۔ جو بیمار ہو وہ بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے اور ماہِ رمضان میں روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن ولایت ـــــ انسان صحت مند ہو یا بیمار، صاحبِ مال ہو یا مال نہ رکھتا ہو ـــــ ہر حال میں اس پر لازم [واجب] ہے۔(1) "

الخصال، باب الخمسۃ، حدیث 21۔

نماز دین کی سب سے اہم عملی شاخ ہے، لیکن بعض حالات میں عورتوں سے مکمل طور پر ساقط ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ بعد میں اس کی قضا بھی لازم نہیں ہوتی۔

بیماری کی حالت میں نماز میں قیام ساقط ہو سکتا ہے، اور اگر کوئی شخص بیٹھ کر بھی نماز ادا نہ کر سکے تو اس کی تکلیف مزید آسان ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ نماز اشاروں اور علامتوں، بلکہ اس کے اجزاء کے قلبی تصور اور نیت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

اسی طرح دین کے دیگر فروع، جیسے حج، زکوٰۃ اور روزہ بھی مخصوص حالات میں ساقط ہو جاتے ہیں۔

لیکن ایک حقیقت ایسی ہے جس میں کسی شخص کے لیے، کسی حالت میں بھی رخصت نہیں رکھی گئی، اور وہ **ولایتِ اہلِ بیتؑ** ہے۔ جب تک انسان زندہ اور مکلّف ہے، اس قلبی امر کے بارے میں اس کی ذمہ داری ساقط نہیں ہوتی۔

البتہ یہ اہلِ بیتؑ کی ولایت کو قبول کرنے کے حوالے سے انسان پر عائد ہونے والی **کم سے کم ذمہ داری** ہے۔ اس قلبی عقیدے کا اظہار بھی مختلف حالات میں مختلف صورتوں کے ساتھ واجب ہو سکتا ہے۔

معرفت اور انکارِ امامؑ ـــــ ایمان و کفر کا معیار

تمہید

اہلِ بیتؑ کی معرفت و ولایت کی اہمیت، اور تمام اعمال و عبادات کی روح اور بنیاد ہونے کے پیشِ نظر، ان کی معرفت کے ہونے یا نہ ہونے کو **ایمان اور کفر کا معیار** قرار دیا جا سکتا ہے۔ روایات میں اس حقیقت پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

نَحنَ الَّذینَ فَرَضَ اللهُ طاعَتَنا. لا یَسَعُ النّاسُ اِلّا مَعرِفَتَنا. وَ لا یُعذَرُ النّاسَ بِجَهالَتِنا. مَن عَرَفَنا کانَ مُؤمِناً. وَ مَن اَنکَرَنا کانَ کافِراً. وَ مَن لَم یَعرِفنا وَ لَم یَنکِرنا، کانَ ضالّاً حَتّی یَرجِعَ اِلَی الهُدَی الَّذِی افتَرَضَ اللهُ عَلَیهِ مِن طاعَتِنَا الواجِبَةِ. فَاِن یَمُت عَلی ضَلالَتِهِ، یَفعَلُ اللهُ بِهِ ما یَشاءُ(1) .

"ہم وہ ہیں جن کی اطاعت اللہ نے واجب قرار دی ہے۔ لوگوں کے لیے ہماری معرفت کے بغیر کوئی گنجائش نہیں، اور ہماری معرفت سے جہالت کی بنا پر لوگوں کو معذور نہیں سمجھا جائے گا۔

جس نے ہمیں پہچانا وہ مؤمن ہے، اور جس نے ہمارا انکار کیا وہ کافر ہے۔

اور جس نے نہ ہمیں پہچانا اور نہ ہمارا انکار کیا، وہ گمراہ ہے، یہاں تک کہ اس ہدایت کی طرف پلٹ آئے جسے اللہ نے اس پر واجب قرار دیا ہے، یعنی ہماری واجب اطاعت۔

اور اگر وہ اپنی گمراہی ہی پر مر جائے تو اللہ اس کے ساتھ جو چاہے گا، کرے گا۔(1) "

الکافی، ج 1، ص 187، کتاب الحجۃ، باب فرض طاعۃ الائمۃؑ، حدیث 11۔

معرفتِ امامؑ کا مطلب یہ ہے کہ امامؑ کو پہچاننے کے بعد **ان کے حق کو قبول کیا جائے اور اسے ادا کیا جائے۔**

اسی بناپر معرفت، **انکار** کے مقابل قرار پاتی ہے۔

جب معرفت کا ترجمہ محض ''جاننا'' یا ''پہچاننا'' کیا جاتا ہے تو یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہاں مراد امامؑ کے حق کے بارے میں صرف معلومات حاصل کرنا یا ذہنی طور پر اس سے آگاہ ہونا نہیں ہے۔

بلکہ معرفت سے مراد **اس حق کو دل سے قبول کرنا اور اس کے سامنے تسلیم ہونا** ہے، جسے ایمان اور اعتقاد سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ پس **عارفِ امامؑ** وہ شخص ہے جو امامؑ کو امام کی حیثیت سے قبول کرے اور ان کے سامنے تسلیم ہو۔

اسی طرح امامؑ کا انکار یہ ہے کہ انسان ان کے حق کو جان لینے کے بعد اس کے سامنے تسلیم نہ ہو اور اسے قبول کرنے سے انکار کردے۔

مستضعف یا گمراہ شخص

اس بناپر وہ لوگ جنہیں ائمہؑ، ان کے مقام یا ان کے منصبِ الٰہی کے بارے میں سرے سے کوئی علم و آگاہی حاصل نہیں، اور اس لاعلمی میں ان کی اپنی کوئی تقصیر بھی نہیں، اصطلاحاً **مستضعف یا ضالّ** کہلاتے ہیں۔

یعنی وہ لوگ جو صحیح راستے کی طرف ہدایت نہیں پاسکے۔

البتہ اللہ پر یہ لازم نہیں تھا کہ وہ اپنے ہر بندے کو ائمہؑ کی ولایت کے صراطِ مستقیم سے لازماً آشنا کرے۔

ایسے افراد کے بارے میں، جس حد تک ان پر حجت تمام ہوئی ہو، مؤاخذہ اور سزا کی کوئی بنیاد ہو سکتی ہے؛ تاہم ان کے آخری انجام کا فیصلہ امرِ الٰہی کے سپرد ہے۔

اللہ چاہے تو ان کے ساتھ اپنے عدل کے مطابق معاملہ کرے اور چاہے تو اپنے فضل کے مطابق۔ بہر حال ان کا معاملہ اسی کے اختیار میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

البتہ ایک بات قطعی ہے کہ **اللہ ان پر ظلم نہیں کرے گا۔**

اس اعتبار سے بارگاہِ الٰہی میں انسان تین گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

مؤمنین، کافرین اور مستضعفین۔

منکر امامؑ — کافر بھی اور مشرک بھی

اس تقسیم کا معیار امامؑ کے بارے میں **معرفت، انکار اور عدمِ معرفت** ہے۔ حقیقت میں یہی امر اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بھی ایمان اور کفر کا معیار بنتا ہے۔

اللہ نے امامؑ کے وجود کو ایمان، کفر، استضعاف اور شرک کے درمیان ایک نشانی اور امتیازی معیار قرار دیا ہے۔

امام باقرؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ نَصَبَ عَلِيّاً عليه السّلام عَلَماً بَينَهُ وَ بَينَ خَلقِهِ. فَمَن عَرَفَهُ كانَ مُؤمِناً. وَ مَن اَنكَرَهُ كانَ كافِراً. وَ مَن جَهِلَهُ كانَ ضالّاً. وَ مَن نَصَبَ مَعَهُ شَيئاً كانَ مُشرِكاً. وَ مَن جاءَ بِوِلايَتِهِ دَخَلَ الجَنَّةَ. وَ مَن جاءَ بِعَداوَتِهِ دَخَلَ النّارَ(1) .

"بے شک اللہ عزوجل نے علیؑ کو اپنے اور اپنی مخلوق کے درمیان ایک علَم اور نشانی قرار دیا ہے۔

پس جس نے انہیں پہچانا وہ مؤمن ہے، جس نے ان کا انکار کیا وہ کافر ہے، جو ان سے جاہل رہا وہ گمراہ ہے، اور جس نے ان کے ساتھ [ان کے اللہ کی جانب سے مقرر کردہ مقام میں] کسی اور کو شریک ٹھہرایا وہ مشرک ہے۔

اور جو ان کی ولایت کے ساتھ آئے گا وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جو ان کی دشمنی کے ساتھ آئے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا۔(1) "

اللہ کے ساتھ شرک کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اس راستہ بندگی کے مقابلے میں، جسے اللہ نے خود اپنی عبادت کے لیے مقرر فرمایا ہے، اپنی طرف سے کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لے۔

اللہ تعالیٰ نے ائمہؑ کی معرفت کو اپنی بندگی کا واحد راستہ قرار دیا ہے، اور وہ اسی شخص کی بندگی کو قبول کرتا ہے جو اس مقرر کردہ راستے سے اس کی عبادت کرے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص ائمہؑ کے اللہ کی طرف سے عطا کردہ مقامات میں کسی دوسرے شخص یا اشخاص کو ان کے ساتھ شریک قرار دے، تو حقیقت میں اس نے اللہ کے مقرر کردہ صراطِ مستقیم کے علاوہ بندگی کا ایک دوسرا راستہ اختیار کیا اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرایا۔

ایسا شخص حقیقت میں **مشرک** ہے۔

اگرچہ ظاہر میں وہ مسلمان ہو اور بعض دنیوی مصالح کی بنا پر اس دنیا میں اس پر اسلام کے ظاہری و فقہی احکام جاری ہوں، لیکن یہ دنیوی فقہی احکام اس کی باطنی حقیقت اور آخری انجام کو تبدیل نہیں کرتے۔

اس طرح منکر امامؑ ایک اعتبار سے **کافر** اور دوسرے اعتبار سے **مشرک** ہے۔

لہٰذا جس طرح معرفتِ امامؑ **توحید تک پہنچنے کا راستہ بھی ہے اور توحید کی علامت و ثمرہ بھی**، اسی طرح امامؑ سے دشمنی **شرک تک پہنچنے کا راستہ بھی ہے اور شرک کی علامت و ثمرہ بھی۔**

ائمۂ کفر — اپنے پیروکاروں کے بت

اسی بنا پر اہلِ بیتؑ کے مقابل کھڑے ہونے والے پیشوایانِ ضلالت کو **بت** سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ وہ بندوں کو راہِ توحید سے منحرف کرتے ہیں۔

ابو حمزہ ثمالی، امام باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

يا اَباحَمزَةَ، اِنَّما يَعبُدُ اللهَ مَن عَرَفَ اللهَ. وَ اَمّا مَن لا يَعرِفُ اللهَ، كَاَنَّما يَعبُدُ غَيرَهُ هكَذا ضالّاً.

قُلتُ: اَصلَحَكَ اللهُ؛ وَ ما مَعرِفَةُ اللهِ؟

قالَ: يُصَدِّقُ اللهَ وَ يُصَدِّقُ مُحَمَّداً رَسُولُ اللهَ صلى الله عليه و آله و سلم فى مُوالاةِ عَلِيٍّ عليه السّلام وَ الاِئتِمامِ بِهِ وَ بِاَئِمَّةِ الهُدى مِن بَعدِهِ وَ البَراءَةِ اِلَى اللهِ مِن عَدُوِّهِم. وَ كَذلِكَ عِرفانُ اللهِ.

قالَ: قُلتَ: اَصلَحَکَ اللهُ؛ أَیُّ شَیءٍ اِذا عَمِلتُهُ اَنَا استَکمَلتُ حَقیقَةَ الایمانِ؟

قالَ: تُوالی اَولیاءَ اللهِ، وَ تُعادی اَعداءَ اللهِ، وَ تَکُونُ مَعَ الصّادِقینَ کَما اَمَرَتَ اللهُ.

قالَ: قُلتُ: وَ مَن اَولیاءُ اللهِ؟

فَقالَ: اَولیاءُ اللهِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم وَ عَلِیٌّ وَ الحَسَنُ وَ الحُسینُ وَ عَلِیُّ بنُ الحُسینِ علیهم السّلام، ثُمَّ انتَهَی الاَمرُ اِلَینا، ثُمَّ ابنی جَعفَرٌ. وَ أَومَأَ اِلی جَعفَرٍ وَ هُوَ جالِسٌ. فَمَن والی هؤُلاءِ، فَقَد والی اَولیاءَ اللهِ وَ کانَ مَعَ الصّادِقینَ کَما اَمَرَهُ اللهُ.

قُلتَ: وَ مَن اَعداءُ اللهِ اَصلَحَکَ اللهُ؟

قالَ: الاَوثانُ الاَربَعَةُ. قالَ: قُلتُ: مَن هُم؟ قالَ: أَبُو الفَصیلِ وَ رُمَعُ وَ نَعثَلُ وَ مُعاوِیَةُ وَ مَن دانَ دینَهُم. فَمَن عادی هؤُلاءِ، فَقَد عادی اَعداءَ اللهِ(1) .

''اے ابو حمزہ! حقیقت میں اللہ کی عبادت وہی کرتا ہے جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو۔ اور جو اللہ کی معرفت نہیں رکھتا، وہ گویا اس کے غیر کی عبادت کرتا ہے اور اسی طرح گمراہی میں بھٹکتا رہتا ہے۔''

میں نے عرض کیا: ''اللہ آپ کے امر کو درست رکھے، معرفتِ خدا کیا ہے؟''

آپؑ نے فرمایا'' : **اللہ کی تصدیق کرنا، اور محمد رسول اللہؐ کی اس امر میں تصدیق کرنا کہ علیؑ سے ولایت و دوستی رکھی جائے، انہیں امام مان کر ان کی پیروی کی جائے، ان کے بعد ائمۂ ہدایتؑ کی اقتدا کی جائے، اور ان کے دشمنوں سے اللہ کی بارگاہ میں براءت و بیزاری کا اظہار کیا جائے۔ یہی معرفتِ خدا ہے۔''**

میں نے عرض کیا: ''اللہ آپ کے امر کو درست رکھے، وہ کون سا عمل ہے جسے انجام دوں تو حقیقتِ ایمان میرے لیے کامل ہو جائے؟ ''آپؑ نے فرمایا'' : **اولیائے خدا سے ولایت و دوستی رکھو، دشمنانِ خدا سے دشمنی رکھو، اور صادقین کے ساتھ رہو، جیسا کہ اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔''**

میں نے عرض کیا: ''اولیائے خدا کون ہیں؟''

آپؑ نے فرمایا:

"اولیائے خدا محمد رسول اللہؐ، علیؑ، حسنؑ، حسینؑ اور علی بن الحسینؑ ہیں۔ پھر یہ امر ہم تک پہنچا اور اس کے بعد میرے فرزند جعفرؑ تک پہنچے گا۔"

یہ فرماتے ہوئے آپؑ نے جعفرؑ کی طرف اشارہ فرمایا، جو وہاں تشریف فرما تھے۔

پھر فرمایا" **: جو ان ہستیوں سے ولایت و دوستی رکھے، اس نے اولیائے خدا سے ولایت رکھی اور وہ صادقین کے ساتھ ہے، جیسا کہ اللہ نے اسے حکم دیا ہے۔"**

میں نے عرض کیا: "اللہ آپ کے امر کو درست رکھے، دشمنانِ خدا کون ہیں؟"

آپؑ نے فرمایا" **: چار بت۔"**

میں نے عرض کیا: "وہ کون ہیں؟"

آپؑ نے فرمایا" **: ابو الفصیل، رُمع، نعثل اور معاویہ، اور وہ لوگ جو ان کے دین و طریقے کی پیروی کریں۔ پس جو ان سے دشمنی رکھے، اس نے دشمنانِ خدا سے دشمنی رکھی۔(1) "**

(1) تفسیر العیاشی، ج2، ص116؛ بحار الانوار، ج27، ص57، حدیث16۔

مخلوق کی عبادت کرنے کا مفہوم

ائمہؑ نے واضح فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت کرے تو حقیقت میں اس نے **اس مخلوق کی عبادت کی ہے۔**

امام صادقؑ سے روایت ہے:

لَیسَتِ العِبادَةُ هِیَ السُّجُودَ وَ لَا الرُّکُوعَ. وَ اِنَّما هِیَ طاعَةُ الرِّجالِ. مَن اَطاعَ مَخلُوقاً فی مَعصِیَةِ الخالِقِ، فَقَد عَبَدَهُ(1) .

"عبادت صرف سجدہ اور رکوع کا نام نہیں، بلکہ [اس مفہوم میں] لوگوں کی اطاعت بھی عبادت ہے۔ جو شخص خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت کرے، اس نے حقیقت میں اس کی عبادت کی۔(1) "

(1) تفسیر علی بن ابراہیم قمی، ج2، ص29۔

اسی طرح اس آیتِ کریمہ کے بارے میں:

اِتَّخَذُوا اَحبارَهُم وَ رُهبانَهُم اَرباباً مِن دُونِ اللهِ وَ المَسيحَ بنَ مَريمَ وَ ما اُمِرُوا اِلّا لِيَعبُدُوا اِلهاً واحِداً لا اِلهَ اِلّا هُوَ سُبحانَهُ وَ تَعالى عَمّا يُشرِكُونَ(1) .

"انہوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور راہبوں کو، اور مسیح ابنِ مریم کو اپنا رب بنالیا، حالانکہ انہیں صرف ایک معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جنہیں یہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔"

(سورۂ توبہ 9:31)

اہلِ بیتؑ سے منقول متعدد روایات میں واضح کیا گیا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے علماء اور راہبوں کی عبادت اس طرح نہیں کی تھی کہ وہ حقیقتاً اُن کے سامنے سجدہ یا رکوع کرتے تھے۔

منکرینِ ولایت کا غیر شعوری شرک

حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ پیشوا لوگوں کو کھلے طور پر اپنی عبادت کی دعوت دیتے تو کوئی شخص ان کی یہ دعوت قبول نہ کرتا۔ بلکہ انہوں نے اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو لوگوں کے لیے حرام اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیا؛ یعنی دین میں بدعتیں داخل کیں۔ لوگوں نے ان احکام میں ان کی پیروی کی اور اس طرح، **خود اس حقیقت کو سمجھے بغیر**، غیرِ خدا کی عبادت اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔

ابو بصیر، امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے اسی آیت کے بارے میں فرمایا:

أَما وَاللهِ ما دَعَوهُم اِلى عِبادَةِ اَنفُسِهِم، وَ لَو دَعَوهُم لَما اَجابوهُم، وَ لكِن اَحَلُّوا لَهُم حَراماً وَ حَرَّمُوا لَهُم حَلالاً فَعَبَدُوهُم مِن حَيثُ لا يَشعُرُونَ(2) .

"آگاہ رہو! اللہ کی قسم، انہوں نے لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی تھی؛ اگر وہ انہیں اپنی عبادت کی دعوت دیتے تو لوگ ان کی بات قبول نہ کرتے۔

بلکہ انہوں نے لوگوں کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا، تو لوگوں نے اس طرح ان کی عبادت کی کہ انہیں خود اس کا شعور بھی نہ تھا۔(2) "

(1) قرآن کریم، سورۂ توبہ 9:31۔

(2) الکافی، ج2، ص398، کتاب الایمان والکفر، باب الشرک، حدیث 7۔

اس بحث میں خاص طور پر قابلِ توجہ تعبیر "مِن حَیثُ لا یَشعُرُونَ" ـــ **"اس حال میں کہ انہیں اس کا شعور بھی نہ تھا"** ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص عبادت میں شرک کا مرتکب ہو اور غیرِ خدا کی عبادت میں مبتلا ہو جائے تو ضروری نہیں کہ اسے شعوری طور پر یہ علم بھی ہو کہ وہ ایسا کر رہا ہے۔

ایک طرف وہ جانتا ہے کہ اسے کسی بدعت گزار کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ لہٰذا اس پہلو سے اس پر حجت تمام ہو چکی ہے اور اپنی کوتاہی کے سبب وہ جواب دہ ہے۔

دوسری طرف ممکن ہے اسے یہ شعور نہ ہو کہ اسی بدعت گزار کی پیروی نے اسے **مشرک** بنا دیا ہے۔

لیکن اس حقیقت سے اس کی لاعلمی اصل واقعیت کو تبدیل نہیں کرتی۔ وہ حقیقتاً شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے، اگرچہ اسے خود اس بات کا ادراک نہ ہو۔

اسی بنا پر اہلِ بیتؑ کے وہ دشمن جن کی ان کے پیروکار اطاعت کرتے ہیں، حقیقت میں انہی پیروکاروں کے **معبود** بن جاتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا ہر وہ چیز جسے معبود بنا لیا جائے، حقیقت میں ایک **بت** ہے۔

لہٰذا ایسے پیروکار حقیقت کے اعتبار سے **بت پرستی** میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہؑ کی اصطلاح اور روایات میں ائمۂ کفر کے بارے میں **وَثَن، صَنَم، لات، عُزّیٰ، جِبت اور طاغوت** جیسی تعبیرات استعمال ہوئی ہیں۔(1)(2)(3)

حصہ دوم، باب سوم

دینداری میں تولّیٰ اور تبرّیٰ کا کردار

ولایت اور براءت کے آثار ولوازم

تمہید

ولایت اور براءت، شجرۂ توحید کی دو عظیم شاخیں ہیں۔ ولایت کی شاخ پر جو پھل لگتا ہے وہ **اولیائے خدا سے محبت** ہے، اور براءت کی شاخ کا پھل **دشمنانِ خدا سے بغض وبیزاری** ہے۔

یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص اہلِ بیتؑ کی حقیقی ولایت رکھتا ہو، لیکن ان کے دشمنوں سے براءت وبیزاری سے محروم ہو۔

کسی شخص نے امام صادقؑ سے عرض کیا: ''فلاں شخص آپ کی ولایت تو رکھتا ہے، لیکن آپ کے دشمنوں سے براءت کے معاملے میں کمزور ہے۔''

امامؑ نے فرمایا:

هَيهاتَ! كَذَبَ مَنِ ادَّعى مَحَبَّتَنا وَ لَم يَتَبَرَّأ مِن عَدُوِّنا.

''ہر گز نہیں! جھوٹا ہے وہ شخص جو ہماری محبت کا دعویٰ کرے، لیکن ہمارے دشمن سے براءت نہ رکھے۔''

بحار الانوار، ج27، ص58، حدیث18، بحوالۂ السرائر۔

آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کسی سے محبت کرے، لیکن اس کے دشمن کے بارے میں بے تعلق اور غیر جانب دار رہے؟!

ولایت اور براءت، اور ان کے ثمرات یعنی محبت اور بغض، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود ایمان کا خلاصہ ہی اسی محبت اور بغض میں ہے:

وَ هَلِ الایمانُ اِلّا الحُبَّ وَ البُغضُ؟

"کیا ایمان محبت اور بغض کے سوا بھی کوئی چیز ہے؟"

اصول الکافی، ج2، ص125، کتاب الایمان والکفر، باب الحب فی اللہ والبغض فی اللہ، حدیث 5۔

اہلِ بیتؑ پر صلوات بھیجنے کی اہمیت

اہلِ بیتؑ سے ہماری محبت بعض اعمال کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ان میں سے ایک **محمدؐ وآلِ محمدؐ پر صلوات بھیجنا** ہے۔روایات میں اس عمل پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

ما فِی المیزانِ شَیءٌ اَثقَلُ مِنَ الصَّلاۃِ عَلی مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ.

"میزانِ اعمال میں محمدؐ وآلِ محمدؐ پر صلوات سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہے۔"

اصول الکافی، ج2، ص494، کتاب الدعاء، باب الصلاۃ علی النبیؐ، حدیث 15۔

البتہ رسولِ خداؐ پر صلوات ہمیشہ ان کے اہلِ بیتؑ پر صلوات کے ساتھ ہونی چاہیے۔یہی **کامل صلوات** ہے۔

ایک مرتبہ امام باقرؑ نے ایک شخص کو خانۂ کعبہ کے پردے سے لپٹے ہوئے یہ کہتے سنا:

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ.

"اے اللہ! محمدؐ پر صلوات نازل فرما۔"

امامؑ نے اس سے فرمایا:

یا عَبدَاللہِ، لا تُبتِرھا. لا تَظلِمنا حَقَّنا. قُل: اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وَ اَھلِ بَیتِہِ.

"اے بندۂ خدا! صلوات کو ناقص نہ کرو اور ہمارے حق کے بارے میں ہم پر ظلم نہ کرو۔یوں کہو: اے اللہ! محمدؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ پر صلوات نازل فرما۔"

اصول الکافی، ج2، ص495، کتاب الدعاء، باب الصلاۃ علی النبیؐ، حدیث 21۔

صلوات کی اہمیت اس حد تک ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا:

مَن ذُکِرتُ عِندَهُ فَنَسِیَ الصَّلاةَ عَلَیَّ، خَطِئَ بِهِ طَرِیقَ الجَنَّة.

"جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر صلوات بھیجنا بھول جائے، وہ جنت کی راہ سے بھٹک گیا۔"

اصول الکافی، ج2، ص495، کتاب الدعاء، باب الصلاۃ علی النبیؐ، حدیث 19۔

دشمنانِ خدا پر اللہ کی لعنت

جس طرح صلوات اہلِ بیتؑ سے محبت کی ایک علامت ہے، اسی طرح ان کے دشمنوں سے بغض کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان ان پر **اللہ کی لعنت** طلب کرے۔

عربی زبان میں **لعن** کی تعریف «**الإبعاد والطرد من الخیر**» سے کی گئی ہے، یعنی کسی کو خیر سے دور اور محروم کرنا۔ اسی طرح **لعنت** کا ایک مفہوم «**الدعاء علیه**» یعنی کسی کے خلاف دعا کرنا بھی بیان ہوا ہے۔

پس جس طرح صلوات کسی کے لیے خیر، رحمت اور برکت کی دعا ہے، اسی طرح لعنت کسی کے خلاف دعا اور اس بات کی درخواست ہے کہ وہ دنیا و آخرت کی خیر سے دور رہے۔

اور جب اللہ کسی پر لعنت فرماتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اللہ کی رحمت، برکت اور خیر سے دور کر دیا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ رسولِ خداؐ کو اذیت پہنچانے والوں پر اللہ نے لعنت فرمائی ہے:

اِنَّ الَّذینَ یُؤذُونَ اللهَ وَ رَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِی الدُّنیا وَ الآخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُم عَذاباً مُهیناً.

"بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں، اللہ نے دنیا اور آخرت میں ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

(سورۂ احزاب 33:57)

دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت

یہاں قرآن اور معتبر حدیثی مآخذ، حتیٰ اہلِ سنت کے مصادر سے بھی، اس بات کو ثابت کیا جاسکتا ہے کہ دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کرنا جائز، بلکہ لازم ہے۔

اختصار کی خاطر یہاں صرف چند نمونے ذکر کیے جاتے ہیں۔ مزید تفصیل کے خواہش مند حضرات ان کتابوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جن میں اس موضوع پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں مرحوم محقق کرکی کی کتاب **نفحات اللاہوت فی لعن الجبت والطاغوت** قابلِ ذکر ہے، جس کا اسی نام سے فارسی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اسی موضوع پر شیخ جواد کربلائی کی رسالہ **تولّیٰ و تبرّیٰ** بھی موجود ہے۔

معروف کتاب فضائل الخمسہ میں ایک باب اس عنوان سے ہے:

"رسولِ خداؐ کا فرمان: فاطمہؑ میرا حصہ ہیں؛ جس نے انہیں غضب ناک کیا اس نے مجھے غضب ناک کیا۔"

مصنف نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ترمذی اور سنن ابی داؤد جیسے اہلِ سنت کے معتبر مصادر سے روایات نقل کی ہیں، جن سب کا مفہوم یہ ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: جس نے فاطمہ زہراؑ کو اذیت پہنچائی اور ناراض کیا، اس نے خود رسول اللہؐ کو اذیت پہنچائی اور ناراض کیا۔

مثلاً صحیح بخاری میں منقول ہے:

هِيَ فاطِمَةُ بَضعَةٌ مِنّی ... يُؤذينی ما آذاها.

"فاطمہؑ میرے وجود کا ایک حصہ ہیں... جو چیز انہیں اذیت پہنچاتی ہے وہ مجھے اذیت پہنچاتی ہے۔"

صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ذبّ الرجل عن ابنتہ؛ بحوالہ فضائل الخمسہ، ج 3، ص 184۔

اسی مفہوم کی روایت صحیح مسلم اور صحیح ترمذی میں بھی نقل ہوئی ہے۔

اب ابن قتیبہ کی کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں منقول واقعے پر غور کیجیے۔

جب ابو بکر اور عمر، حضرت فاطمہ زہراؑ کی بیماری کے دوران ان سے ملاقات کے لیے آئے تو آپؑ نے ان دونوں سے فرمایا:

نَشَدتُکُما اللهَ، سَمِعتُم قَولَ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم: رِضا فاطِمَةَ مِن رِضایَ. وَ سَخَطُ فاطِمَةَ مِن سَخَطی. فَمَن أَحَبَّ فاطِمَةَ ابنَتی، فَقَد اَحَبَّنی. وَ مَن اَرضا فاطِمَةَ، فَقَد اَرضانی. وَ مَن اَسخَطَ فاطِمَةَ، فَقَد اَسخَطَنی.

"میں تم دونوں کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتی ہوں: کیا تم نے رسولِ خداؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ فاطمہؑ کی رضا میری رضا ہے اور فاطمہؑ کا غضب میرا غضب ہے؟ جس نے میری بیٹی فاطمہؑ سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی؛ جس نے فاطمہؑ کو راضی کیا، اس نے مجھے راضی کیا؛ اور جس نے فاطمہؑ کو ناراض کیا، اس نے مجھے ناراض کیا؟"

دونوں نے جواب دیا: "ہاں، ہم نے یہ بات رسولِ خداؐ سے سنی تھی۔"

اس کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ نے فرمایا:

فَاِنّی اُشهِدُ اللهَ وَ مَلائِکَتَهُ اَنَّکُما اَسخَطتُمانی فَما اَرضَیتُمانی. وَ لَئِن لَقیتُ النَّبِیَّ، لَاَشکُوَنَّکُما اِلَیه.

"پس میں اللہ اور اس کے فرشتوں کو گواہ بناتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ناراض کیا اور مجھے راضی نہیں کیا۔ اور اگر میں رسولِ خداؐ سے ملاقات کروں گی تو یقیناً تم دونوں کی شکایت ان سے کروں گی۔"

ابو بکر رونے لگے تو حضرت فاطمہ زہراؑ نے فرمایا:

وَ اللهِ لَاَدعُوَنَّ اللهَ عَلَیکَ فی کُلِّ صَلاةٍ اُصَلّیها.

"اللہ کی قسم! میں ہر نماز میں جو میں پڑھوں گی، تمہارے خلاف اللہ سے دعا کروں گی۔"

الامامۃ والسیاسۃ، ص14۔

نوٹ: زیرِ ترجمہ اصل متن نے یہ واقعہ ابن قتیبہ کی کتاب الامامۃ والسیاسۃ کے حوالے سے نقل کیا ہے؛ یہاں ماخذ کی نسبت اسی طرح برقرار رکھی گئی ہے جس طرح اصل متن میں دی گئی ہے۔

اصل متن کے حواشی:

1. صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ذبّ الرجل عن ابنتہ؛ بحوالۂ فضائل الخمسہ، ج3، ص184۔
2. الامامۃ والسیاسۃ، ص14۔

3. محقق کرکی، نفحات اللاہوت فی لعن الجبت والطاغوت؛ شیخ جواد کربلائی، رسالۂ تولّیٰ و تبرّیٰ۔

4. فضائل الخمسہ، ج3، ص184۔

صحیح بخاری میں یہ بھی نقل ہوا ہے:

فَغَضِبَت فاطِمَةُ بَنتُ رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم فَهَجَرَت اَبابَکرٍ فَلَم تَزَل مُهاجَرَتُهُ حَتّی تُوُفِّیَت.

"پس فاطمہؑ بنتِ رسول اللہؐ ابو بکر سے ناراض ہوئیں اور ان سے قطع تعلق کر لیا، اور وفات تک اسی حالت پر رہیں۔"

صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب فرض الخمس، ج2، ص186۔

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر ہے:

فَوَجَدَت فاطِمَةُ عَلی اَبی بَکرٍ فی ذلِکَ فَهَجَرَتهُ فَلَم تُکَلِّمهُ حَتّی تُوُفِّیَت.

"فاطمہؑ اس معاملے میں ابو بکر سے ناراض ہوئیں، ان سے قطع تعلق کر لیا اور اپنی وفات تک ان سے گفتگو نہیں کی۔"

صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر، ج3، ص55۔

پس ان مذکورہ اہلِ سنت مصادر کے مطابق، اہلِ بیتؑ کے حقوق غصب کرنے والوں نے حضرت فاطمہ زہراؑ کو اذیت پہنچائی اور ناراض کیا۔ اور انہی مصادر میں منقول رسولِ خداؐ کے فرمان کے مطابق فاطمہ زہراؑ کو اذیت دینا رسولِ خداؐ کو اذیت دینا ہے، جبکہ قرآنِ کریم اعلان کرتا ہے کہ رسولِ خداؐ کو اذیت پہنچانے والے اللہ کی لعنت کے مستحق ہیں۔

رسولِ خداؐ نے حضرت فاطمہ زہراؑ پر ظلم کرنے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے حضرت فاطمہ زہراؑ کے بارے میں فرمایا:

اللّهُمَّ العَن مَن ظَلَمَها.

"اے اللہ! جو فاطمہؑ پر ظلم کرے، اس پر لعنت فرما۔"

امالی الصدوق، مجلس 24، حدیث 2، ص69–70۔

ائمہؑ بھی دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کے پابند تھے۔

مثلاً الکافی میں نقل ہوا ہے:

سَمِعنا اَبا عَبدِاللهِ علیه السّلام وَ هُوَ یَلعَنُ فی دُبُرِ کُلِّ مَکتُوبَةٍ اَربَعَةً مِنَ الرِّجالِ وَ اَربَعاً مِنَ النِّساءِ، فُلانٌ وَ فُلانٌ وَ فُلانٌ وَ مُعاوِیَةُ. وَ یُسَمّیهِم. وَ فُلانَةُ وَ فُلانَةُ وَ هِندٌ وَ اُمُّ الحَکَمِ اُختُ مُعاوِیَةَ.

"ہم نے امام صادقؑ کو سنا کہ آپ ہر واجب نماز کے بعد چار مردوں اور چار عورتوں پر لعنت فرماتے تھے: فلاں، فلاں، فلاں اور معاویہ ــــ اور آپ ان کے نام لیتے تھے ــــ اور فلاں عورت، فلاں عورت، ہند اور معاویہ کی بہن امّ الحکم۔"

الکافی، ج 3، ص 342۔

پس لعنت کرنا ائمہؑ کا ایک معمول تھا اور انہوں نے اپنے پیروکاروں کو بھی اس کی تعلیم دی ہے۔

زیارتِ عاشورا، جس کی تلاوت پر بہت تاکید کی گئی ہے، اس میں بھی متعدد مقامات پر دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کی گئی ہے۔

چنانچہ ہم پڑھتے ہیں:

اللّهُمَّ العَن اَوَّلَ ظالِمٍ ظَلَمَ حَقَّ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ ... . اللّهُمَّ خُصَّ اَنتَ اَوَّلَ ظالِمٍ بِاللَّعنِ مِنّی وَ ابدَأ بِهِ اَوَّلاً ثُمَّ الثّانِیَ ثُمَّ الثّالِثَ ثُمَّ الرّابِعَ. اللّهُمَّ العَن یَزیدَ بنَ مُعاوِیَةَ خامِساً وَ العَن عُبَیدَاللهِ بنَ زیادٍ وَ ابنَ مَرجانَةَ وَ عُمَرَ بنَ سَعدٍ وَ شِمراً وَ آلَ اَبی سُفیانَ وَ آلَ زِیادٍ وَ آلَ مَروانَ اِلی یَومِ القِیامَةِ.

"اے اللہ! اس پہلے ظالم پر لعنت فرما جس نے محمدؐ و آلِ محمدؐ کے حق پر ظلم کیا... اے اللہ! میری طرف سے اپنی لعنت کے لیے پہلے ظالم کو خصوصیت کے ساتھ قرار دے اور سب سے پہلے اسی سے آغاز فرما، پھر دوسرے پر، پھر تیسرے پر، پھر چوتھے پر۔ اے اللہ! پانچویں نمبر پر یزید بن معاویہ پر لعنت فرما، اور عبید اللہ بن زیاد، ابن مرجانہ، عمر بن سعد، شمر، آلِ ابی سفیان، آلِ زیاد اور آلِ مروان پر قیامت تک لعنت فرما۔"

بحار الانوار، ج 101، ص 296، حدیث 1، بحوالہ کامل الزیارات۔

یہاں مختصراً اس نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ اگر آلِ ابی سفیان، آلِ زیاد اور آلِ مروان کو بھی لعنت میں شامل کیا گیا ہے تو اس کی بیان کردہ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے اعمال پر راضی اور خوش تھے۔

اسی زیارت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَ هذا یَومٌ فَرِحَت بِهِ آلُ زیادٍ وَ آلُ مَروانَ بِقَتلِهِمُ الحُسَینَ صَلَواتُ اللهِ عَلَیهِ.

"اور یہ وہ دن ہے جس میں آلِ زیاد اور آلِ مروان، حسینؑ کے قتل پر خوش ہوئے۔"

جو شخص کسی قوم کے عمل سے راضی ہو، وہ اس کے عمل میں شریک شمار ہوتا ہے۔

امام رضاؑ سے منقول ہے:

ذُرّیّاتُ قَتَلَةِ الحُسَینِ علیه السّلام یَرضَونَ بِاَفعالِ آبائِهِم وَ یَفتَخِرُونَ بِها. وَ مَن رَضِیَ شَیئاً کانَ کَمَن اَتاهُ. وَ لَو اَنَّ رَجُلاً قُتِلَ بِالمَشرِقِ فَرَضِیَ بِقَتلِهِ رَجُلٌ فِی المَغرِبِ، لَکانَ الرّاضی عِندَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ شَریکَ القاتِلِ.

"قاتلانِ حسینؑ کی نسلیں اپنے آباء کے اعمال سے راضی ہیں اور ان پر فخر کرتی ہیں۔ اور جو کسی کام سے راضی ہو وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے خود وہ کام انجام دیا ہو۔ اگر مشرق میں کسی شخص کو قتل کیا جائے اور مغرب میں رہنے والا کوئی شخص اس قتل پر راضی ہو تو اللہ عزوجل کے نزدیک وہ راضی ہونے والا بھی قاتل کا شریک ہوگا۔"

عیون اخبار الرضاؑ، ج 1، ص 273۔

دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کے ذریعے اہلِ بیتؑ کی نصرت

ایک اور نکتہ جو دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کی اہمیت کو مزید واضح کرتا ہے، یہ ہے کہ اسے **اہلِ بیتؑ کی نصرت کی ایک صورت** قرار دیا گیا ہے۔

کسی شخص نے امام صادقؑ سے عرض کیا:

یَابنَ رَسُولِ اللهِ اَنّی عاجِزٌ بِبَدَنی عَن نُصرَتِکُم وَ لَستُ اَملِکُ اِلّا البَراءَةَ مِن اَعدائِکُم وَ اللَّعنَ. فَکَیفَ حالی؟

"اے فرزندِ رسولِ خداؐ! میں جسمانی طور پر آپ کی نصرت سے عاجز ہوں اور آپ کے دشمنوں سے براءت اور ان پر لعنت کے سوا میرے پاس کوئی اور وسیلہ نہیں۔ پس میری حالت کیا ہوگی؟"

امام صادقؑ نے فرمایا:

حَدَّثَنی اَبی عَن اَبیهِ عَن جَدِّهِ عَن رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم اَنَّهُ قالَ: مَن ضَعُفَ عَن نُصرَتِنا اَهلَ البَیتِ فَلَعَنَ فی خَلَواتِهِ اَعداءَنا، بَلَّغَ اللهُ صَوتَهُ جَمیعَ الاَملاکِ مِنَ الثَّری اِلَی العَرشِ. فَکُلَّما لَعَنَ هذَا الرَّجُلُ اَعداءَنا لَعناً، ساعَدُوهُ وَ لَعَنُوا مَن یَلعَنُهُ ثُمَّ ثَنَّوا فَقالُوا: اللّهُمَّ صَلِّ عَلی عَبدِکَ هذا الَّذی قَد بَذَلَ ما فی وُسعِهِ وَ لَو قَدَرَ عَلی اَکثَرَ مِنهُ لَفَعَلَ. فَاِذا النِّداءُ مِن قِبَلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: قَد اَجَبتُ دُعاءَکُم وَ سَمِعتُ نِداءَکُم وَ صَلَّیتُ عَلی رُوحِهِ فِی الاَرواحِ وَ جَعَلتُهُ عِندی مِنَ المُصطَفَینَ الاَخیارِ.

"میرے والد نے اپنے والد سے، انہوں نے اپنے جد سے اور انہوں نے رسولِ خداؐ سے روایت کی کہ آپؐ نے فرمایا: جو شخص ہم اہلِ بیتؑ کی نصرت کرنے سے عاجز ہو، لیکن اپنی تنہائی میں ہمارے دشمنوں پر لعنت کرے، اللہ اس کی آواز زمین کی تہوں سے عرش تک تمام ملائکہ تک پہنچا دیتا ہے۔

جب بھی یہ شخص ہمارے دشمنوں پر لعنت کرتا ہے تو وہ فرشتے بھی اس کا ساتھ دیتے ہیں اور جس پر وہ لعنت کرتا ہے اس پر لعنت کرتے ہیں۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر عرض کرتے ہیں: اے اللہ! اپنے اس بندے پر رحمت و درود نازل فرما جس نے اپنی استطاعت کے مطابق جو کچھ کر سکتا تھا، کیا؛ اور اگر اس سے زیادہ کی قدرت رکھتا تو وہ بھی ضرور انجام دیتا۔

پھر اللہ عزوجل کی طرف سے ندا آتی ہے: میں نے تمہاری دعا قبول کی، تمہاری پکار سنی، ارواح کے درمیان اس کی روح پر اپنی رحمت نازل کی اور اسے اپنے نزدیک برگزیدہ نیک بندوں میں قرار دیا۔"

بحار الانوار، ج 27، ص 222، حدیث 11، بحوالۂ تفسیر امام حسن عسکریؑ۔

گزشتہ مطالب کی روشنی میں، دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کرنا **براءت کے آثار و لوازم** میں سے ہے۔

اس عمل کو زندہ رکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دشمنانِ خدا کی شناخت باقی رہتی ہے۔ اس طرح آنے والی نسلیں دشمنانِ خدا کو پہچان کر اور ان سے براءت اختیار کر کے دین کے راستے سے منحرف ہونے سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، اسی ذریعے سے وہ اللہ اور اہلِ بیتؑ کا قرب بھی حاصل کرتی ہیں۔

تمہید

گزشتہ بحث سے ایک نہایت اہم نتیجہ سامنے آتا ہے : **کسی چیز کے حق یا باطل ہونے کو اہلِ بیتؑ کی رضا یا سخط کے ذریعے پہچانا جاسکتا ہے۔** اس کی وجہ یہ ہے کہ حق کبھی اہلِ بیتؑ سے جدا نہیں ہوتا اور اہلِ بیتؑ بھی کبھی حق سے جدا نہیں ہوتے۔ بلکہ کسی امر کے حق ہونے کی علامت یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ اس سے راضی ہوں۔

رسولِ خداؐ سے یہ حدیث شیعہ اور سنی دونوں مصادر میں نقل ہوئی ہے:

اَلحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ. وَ عَلِیٌّ مَعَ الحَقِّ. لا یَفتَرِقانِ حَتّی یَرِدا عَلَیَّ الحَوضَ.

"حق علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ حق کے ساتھ ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوض پر میرے پاس وارد ہوں گے۔"

بحار الانوار، ج38، ص26–40، جہاں اس حدیث کے شیعہ اور سنی مصادر بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

ان روایات میں اہم نکتہ یہ ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ کو **حق اور حقیقت کا معیار** قرار دیا گیا ہے۔

مطلب یہ نہیں کہ حق کو پہلے کسی ایسے خارجی معیار کے ذریعے پہچانا جائے جو امیر المؤمنینؑ سے مستقل ہو، اور پھر یہ کہا جائے کہ امیر المؤمنینؑ کبھی اس معیار سے منحرف نہیں ہوتے۔

بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے : **کسی چیز کا حق ہونا امیر المؤمنینؑ کی رضا سے پہچانا جاتا ہے اور اس کا باطل ہونا آپؑ کے سخط و نارضایتی سے معلوم ہوتا ہے۔**

اہلِ سنت کے مصادر میں بھی ایک روایت نقل ہوئی ہے:

رَحِمَ اللهُ عَلِیّاً. اللّهُمَّ اَدِرِ الحَقَّ مَعَهُ حَیثُ دارَ.

"اللہ علیؑ پر رحمت فرمائے۔ اے اللہ! حق کو علیؑ کے ساتھ اسی طرف پھیر دے جدھر وہ پھریں۔"

بحار الانوار، ج38، ص38، حدیث14، بحوالہ الطرائف، جس میں صحیح بخاری کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

پس بنیادی طور پر حق و باطل کی شناخت کا معیار **اہل بیتؑ کی رضا اور سخط** ہے۔

زیارتِ آلِ یٰسین میں ہم پڑھتے ہیں:

فَالحَقُّ ما رَضيتُمُوهُ. وَ الباطِلُ ما سَخِطتُمُوهُ. وَ المَعروفُ ما اَمَرتُم بِهِ. وَ المُنكَرُ ما نَهَيتُم عَنهُ.

"پس حق وہ ہے جس سے آپ راضی ہوں، اور باطل وہ ہے جس سے آپ ناراض ہوں؛ معروف وہ ہے جس کا آپ نے حکم دیا، اور منکر وہ ہے جس سے آپ نے منع فرمایا۔"

الاحتجاج، طبرسی، ج2، ص317۔

اللہ کی رضا اور سخط کا مفہوم

رضا اور سخط ایسے مفاہیم ہیں جو اپنے معمول کے معنی میں مخلوقات پر صادق آتے ہیں۔ ہمیں یہ حق نہیں کہ مخلوق کے بارے میں ان الفاظ سے جو معنی سمجھتے ہیں، بعینہٖ وہی معنی اللہ کی طرف منسوب کر دیں۔

جب ایسی تعبیرات اللہ کے لیے استعمال ہوتی ہیں تو ان کا مفہوم ایسا نہیں ہو سکتا جو ذاتِ الٰہی میں کسی کیفیت، حالت، تبدیلی یا محدودیت کا تقاضا کرے۔

لہٰذا جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کسی چیز سے راضی ہے اور کسی دوسری چیز سے ناراض، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ انسانوں کی طرح خوش یا ناراض ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ **اللہ نے ایک امر پر ثواب اور دوسرے پر عذاب مقرر فرمایا ہے۔**

لیکن ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ اللہ کی رضا کس چیز سے متعلق ہے اور اس کا سخط کس چیز سے؟

یہ بات ان **اولیائے خدا کی رضا اور سخط** کے ذریعے معلوم ہوتی ہے جنہیں اللہ نے خود برگزیدہ فرمایا ہے۔

کسی شخص نے اس آیت کے بارے میں سوال کیا:

فَلَمّا آسَفُونَا انتَقَمنا مِنهُم.

"پس جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔"

(سورۂ زخرف 43:55)

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ لا یَأسَفُ کَاَسَفِنا. وَ لکِنَّهُ خَلَقَ اَولیاءَ لِنَفسِهِ یَأسَفونَ وَ یَرضَونَ وَ هُم مَخلُوقُونَ مَربُوبُونَ، فَجَعَلَ رِضاهُم رِضا نَفسِهِ وَ سَخَطَهُم سَخَطَ نَفسِهِ. لِاَنَّهُ جَعَلَهُمُ الدُّعاةَ اِلَیهِ وَ الاَدِلّاءَ عَلَیهِ. فَلِذلِکَ صارُوا کَذلِکَ. وَ لَیسَ اَنَّ ذلِکَ یَصِلُ اِلَی اللهِ کَما یَصِلُ اِلی خَلقِهِ، لکِن هذا مَعنی ما قالَ مِن ذلِکَ.

"بے شک اللہ عزوجل ہماری طرح رنجیدہ اور غضب ناک نہیں ہوتا۔ بلکہ اس نے اپنے لیے ایسے اولیاء خلق فرمائے ہیں جو راضی بھی ہوتے ہیں اور ناراض بھی، جبکہ وہ خود مخلوق اور اس کے پروردہ ہیں۔ پھر اللہ نے ان کی رضا کو اپنی رضا اور ان کے سخط کو اپنا سخط قرار دیا، کیونکہ اس نے انہیں اپنی طرف دعوت دینے والے اور اپنی طرف رہنمائی کرنے والے قرار دیا ہے۔ اسی لیے انہیں یہ مقام حاصل ہوا۔

اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ کوئی کیفیت اللہ تک اسی طرح پہنچتی ہے جیسے اس کی مخلوق تک پہنچتی ہے؛ بلکہ اللہ کے ان ارشادات کا مفہوم یہی ہے جو میں نے تمہارے لیے بیان کیا۔"

پھر امامؑ نے اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اللہ کے ان ارشادات کی طرف اشارہ فرمایا:

"جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرے، اس نے مجھ سے علانیہ جنگ کا اعلان کیا اور مجھے جنگ کی دعوت دی۔"

اور فرمایا" : **جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"**

اور فرمایا" : **جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، وہ در حقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں؛ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔"**

پھر امامؑ نے واضح فرمایا کہ یہ تمام تعبیرات اور ان جیسی دوسری تعبیرات اسی مفہوم میں ہیں جس کی آپؑ نے وضاحت فرمائی؛ رضا، غضب اور اس قسم کی تمام صفات کے بارے میں بھی یہی اصول جاری ہے۔

اصول الکافی، ج 1، ص 144، کتاب التوحید، باب النوادر، حدیث 6۔

اللہ اس بات سے کہیں بلند و برتر ہے کہ اس کی طرف مخلوقات کی صفات ان کے مخلوقاتی معنی میں منسوب کی جائیں۔ جو مفہوم بھی مخلوق سے اخذ کیا جائے وہ اپنی اصل میں محدود اور ناقص ہے، خواہ اس سے بعض حدود و قیود ہٹانے کی کوشش ہی کیوں نہ کی جائے؛ جبکہ اللہ ہر نقص اور محدودیت سے منزّہ ہے۔

لہٰذا ایسی صفات کو ان کے مخلوقاتی معنی میں اللہ کی طرف نسبت دینا لازماً ذاتِ مقدسِ الٰہی کو مخلوق سے تشبیہ دینے کا باعث ہو گا۔ اسی بنا پر جب قرآن یا روایات میں مخلوقات سے متعلق صفات اللہ کی طرف منسوب ہوتی ہیں تو ان کا مفہوم وہی ہے جو مذکورہ روایت میں بیان ہوا ہے۔

خلاصہ یہ کہ :

اولیائے خدا اس کی رضا اور سخط کے مظاہر ہیں۔

جس چیز سے وہ راضی ہیں، وہ وہی چیز ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب مقرر فرمایا ہے؛ اور جس چیز سے وہ ناراض ہیں، وہ ایسی چیز ہے جو عذابِ الٰہی اور جہنم کا سبب بنتی ہے۔

ان کے قلوب **مشیتِ الٰہی کے محل** ہیں، اور ان کے دلوں میں اللہ کی مشیت کے خلاف کسی چیز کی کوئی جگہ نہیں۔

اسی لیے کسی شخص کے جنت یا جہنم میں جانے کا معیار بھی ان کی رضا اور سخط قرار پاتا ہے۔

ان کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہے۔

ان سے بیعت، اللہ سے بیعت ہے۔

انہیں اذیت پہنچانا، اللہ کو اذیت پہنچانا ہے۔

ان سے جنگ، اللہ سے جنگ ہے۔

ان سے محبت، اللہ سے محبت ہے۔

اور اسی طرح دیگر امور بھی۔

مختصر یہ کہ یہی وہ مقدس ہستیاں ہیں جو حقیقتاً **خلیفۃ اللہ** کہلانے کی سزاوار ہیں، جیسا کہ اس عنوان کے بارے میں پہلے تفصیل گزر چکی ہے۔

تکوین و تشریع کی بنیاد ـــ محبتِ اہلِ بیتؑ

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کی خلقت کا محور و اساس ـــ خواہ **تکوین** کے اعتبار سے ہو یا **تشریع** کے اعتبار سے ـــ اہلِ بیتؑ کی محبت قرار پائی ہے۔

رسولِ خداؐ کے واقعۂ معراج سے متعلق ایک روایت میں ہے:

قالَ لِیَ الجَلیلُ جَلَّ جَلالُهُ: یا مُحَمَّدُ، مَن تُحِبُّ مِن خَلقی؟ قُلتُ: اُحِبُّ الَّذی تُحِبُّهُ اَنتَ یا رَبّی. فَقالَ لی جَلَّ جَلالُهُ: فَاَحِبَّ عَلِیّاً. فَاِنّی اُحِبُّهُ وَ اُحِبُّ مَن یُحِبُّهُ وَ اُحِبُّ مَن اَحَبَّ مَن یُحِبُّهُ. ...

"صاحبِ جلال ـــ جلّ جلالہ ـــ نے مجھ سے فرمایا: اے محمدؐ! میری مخلوق میں سے آپ کس سے محبت کرتے ہیں؟

میں نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں اس سے محبت کرتا ہوں جس سے تو محبت کرتا ہے۔

اللہ جلّ جلالہ نے فرمایا: پس علیؑ سے محبت کرو، کیونکہ میں ان سے محبت کرتا ہوں، اس سے بھی محبت کرتا ہوں جو علیؑ سے محبت کرے، اور اس سے بھی محبت کرتا ہوں جو علیؑ سے محبت کرنے والے سے محبت کرے"...

پھر اللہ نے فرمایا:

یا مُحَمَّدُ، اِنّی اَطَّلَعتُ عَلی قُلُوبِ عِبادی فَوَجَدتُ عَلِیّاً اَنصَحَ خَلقی لَکَ وَ اَطوَعَهُم لَکَ. فَاتَّخِذهُ اَخاً وَ خَلیفَةً وَ وَصِیّاً. وَ زَوِّجهُ ابنَتَکَ. فَاِنّی سَاَهَبُ لَهُما غُلامَینِ طَیِّبَینِ طاهِرَینِ تَقِیَّینِ نَقِیَّینِ. فَبی حَلَفتُ وَ عَلی نَفسی حَتَمتُ اَنَّهُ لا یَتَوَلّی عَلِیّاً وَ زَوجَتَهُ وَ ذُرِّیَّتَهُما اَحَدٌ مِن خَلقی اِلّا رَفَعتُ لِواءَهُ اِلی قائِمَةِ عَرشی وَ جَنَّتی وَ بُحبُوحَةِ کَرامَتی وَ سَقَیتُهُ مِن حَظیرَةِ قُدسی. وَ لا یُعادیهِم اَحَدٌ اَو یَعدِلُ عَن وِلایَتِهِم. یا مُحَمَّدُ. اِلّا سَلَبتُهُ وُدّی وَ باعَدتُهُ مِن قُربی وَ ضاعَفتُ عَلَیهِ عَذابی وَ لَعنَتی.

”اے محمدؐ! میں نے اپنے بندوں کے دلوں پر نظر فرمائی تو علیؑ کو اپنی مخلوق میں آپ کے لیے سب سے زیادہ خیر خواہ اور آپ کا سب سے زیادہ اطاعت گزار پایا۔ پس انہیں اپنا بھائی، خلیفہ اور وصی بنایئے اور اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیجیے۔ میں ان دونوں کو دو پاکیزہ، طاہر، متقی اور پاک فرزند عطا کروں گا۔

مجھے اپنی ذات کی قسم! میں نے اپنے اوپر یہ لازم قرار دیا ہے کہ میری مخلوق میں سے جو شخص علیؑ، ان کی زوجہ اور ان دونوں کی ذریت کی ولایت قبول کرے گا، میں اس کا عَلَم اپنے عرش کے پایے، اپنی جنت اور اپنی خاص کرامت کے مرکز تک بلند کروں گا اور اسے اپنے حریمِ قدس سے سیراب کروں گا۔

اور اے محمدؐ! جو شخص ان سے دشمنی کرے یا ان کی ولایت سے روگردانی کرے، میں اسے اپنی محبت سے محروم کر دوں گا، اپنے قرب سے دور کر دوں گا اور اس پر اپنے عذاب اور لعنت کو بڑھا دوں گا۔“

پھر اللہ نے فرمایا:

یا مُحَمَّدُ، اِنَّکَ رَسُولی اِلی جَمیعِ خَلقی. وَ اِنَّ عَلِیّاً وَلِیّی وَ اَمیرُالمُؤمِنینَ. وَ عَلی ذلِکَ اَخَذتُ میثاقَ مَلائِکَتی وَ اَنبیائی وَ جَمیعِ خَلقی وَ هُم اَرواحٌ مِن قَبلِ اَن اَخلُقَ خَلقاً فی سَمائی وَ اَرضی، مَحَبَّةً مِنّی لَکَ . یا مُحَمَّدُ . وَ لِعَلِیٍّ وَ لِوَلَدِکُما وَ لِمَن اَحَبَّکُما وَ کانَ مِن شیعَتِکُما وَ لِذلِکَ خَلَقتُهُ مِن طینَتِکُما.

”اے محمدؐ! آپ میری تمام مخلوق کی طرف میرے رسول ہیں اور علیؑ میرے ولی اور امیر المؤمنین ہیں۔

میں نے اسی امر پر اپنے فرشتوں، اپنے انبیاء اور اپنی تمام مخلوقات سے اس وقت میثاق لیا تھا جب وہ ابھی ارواح کی صورت میں تھے، اس سے پہلے کہ میں اپنے آسمان اور زمین میں کسی مخلوق کو پیدا کرتا۔

اور یہ سب اے محمدؐ! آپ سے، علیؑ سے، آپ دونوں کی اولاد سے، آپ دونوں سے محبت کرنے والوں اور آپ دونوں کے شیعوں سے میری محبت کے سبب تھا۔ اسی لیے میں نے انہیں آپ دونوں کی طینت سے خلق کیا۔“

پھر اللہ نے فرمایا:

یا مُحَمَّدُ ... اِنّی جَعَلتُکُم مِحنَةً لِخَلقی اَمتَحِنُ بِکُم جَمیعَ عِبادی وَ خَلقی فی سَمائی وَ اَرضی وَ ما فیهِما لِاُکَمِّلَ الثَّوابَ لِمَن اَطاعَنی فیکُم وَ اُحِلَّ عَذابی وَ لَعنَتی عَلی مَن خالَفَنی فیکُم وَ عَصانی. وَ بِکُم اُمَیِّزُ الخَبیثَ مِنَ الطَّیِّبِ.

"اے محمدؐ!... میں نے تمہیں اپنی مخلوق کے لیے وسیلۂ امتحان قرار دیا ہے۔ تمہارے ذریعے میں اپنے تمام بندوں اور آسمانوں وزمین اور ان میں موجود اپنی تمام مخلوقات کو آزماتا ہوں، تاکہ جو تمہارے بارے میں میری اطاعت کرے اس کے ثواب کو کامل کردوں، اور جو تمہارے معاملے میں میری مخالفت اور نافرمانی کرے اس پر اپنا عذاب اور لعنت نافذ کردوں۔ اور تمہارے ذریعے میں خبیث کو طیب سے جدا کرتا ہوں۔"

اس کے بعد فرمایا:

یا مُحَمَّدُ، وَ عِزَّتی وَ جَلالی، لَولاکَ ما خَلَقتُ آدَمَ. وَ لَولا عَلِیٌّ ما خَلَقتُ الجَنَّةَ. لِاَنّی بِکُم اَجزِی العِبادَ یَومَ المَعادِ بِالثَّوابِ وَ العِقابِ ... فَلا یَدخُلُ الجَنَّةَ لَکُما عَدُوٌّ. وَ لا یَدخُلُ النّارَ لَکُما وَلِیٌّ. وَ بِذلِکَ اَقسَمتُ عَلی نَفسی.

"اے محمدؐ! مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم، اگر آپ نہ ہوتے تو میں آدمؑ کو خلق نہ کرتا، اور اگر علیؑ نہ ہوتے تو میں جنت کو خلق نہ کرتا۔ کیونکہ قیامت کے دن تمہارے ذریعے ہی میں اپنے بندوں کو ثواب اور عذاب کی جزا دوں گا... پس تم دونوں کا کوئی دشمن جنت میں داخل نہ ہوگا، اور تم دونوں کا کوئی ولی جہنم میں داخل نہ ہوگا۔ اور میں نے اس امر کو اپنی ذات پر قسم کے ساتھ مقرر فرمایا ہے۔" بحارالانوار، ج18، ص399–400، حدیث 101، بحوالۂ کشف الیقین۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ خاندانِ نبوت اور اہلِ بیتِ وحیؑ سے **محبت اور بغض ہی وہ محور ہیں جن کے گرد محبت وغضبِ الٰہی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔**

قیامت کے دن بھی یہی محبت اور بغض اللہ کی طرف سے ثواب اور عذاب کے تعلق کا معیار قرار پائیں گے۔

گزشتہ مباحث کی روشنی میں اب امام صادقؑ کی اس روایت کا مفہوم بآسانی سمجھا جاسکتا ہے:

لِکُلِّ شَیءٍ اَساسٌ. وَ اَساسُ الاِسلامِ حُبُّنا اَهلَ البَیتِ.

"ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے، اور اسلام کی بنیاد ہم اہلِ بیتؑ کی محبت ہے۔"

اصول الکافی، ج2، ص46، کتاب الایمان والکفر، باب نسبۃ الاسلام، حدیث 2۔

اہلِ بیتؑ سے محبت و بغض کے مطابق جنت و جہنم کے درجات

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ دشمنانِ اہلِ بیتؑ سے بغض، اہلِ بیتؑ سے محبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جنت کے درجات اور جہنم کے درکات بھی اہلِ بیتؑ سے محبت اور ان کے دشمنوں سے بغض کے مراتب کے مطابق تشکیل پاتے ہیں۔ رسولِ خداؐ فرماتے ہیں:

فِی الجَنَّةِ ثَلاثُ دَرَجاتٍ. وَ فِی النّارِ ثَلاثُ دَرَکاتٍ. فَاَعلی دَرَجاتِ الجَنَّةِ لِمَن اَحَبَّنا بِقَلبِهِ وَ نَصَرَنا بِلِسانِهِ وَ یَدِهِ. وَ فِی الدَّرَجَةِ الثّانِیَةِ مَن اَحَبَّنا بِقَلبِهِ وَ نَصَرَنا بِلِسانِهِ. وَ فِی الدَّرَجَةِ الثّالِثَةِ مَن اَحَبَّنا بِقَلبِهِ .وَ فِی اَسفَلِ الدَّرَکِ مِنَ النّارِ مَن اَبغَضَنا بِقَلبِهِ وَ اَعانَ عَلَینا بِلِسانِهِ وَ یَدِهِ. وَ فِی الدَّرَکِ الثّانِیَةِ مِنَ النّارِ مَن اَبغَضَنا بِقَلبِهِ وَ اَعانَ عَلَینا بِلِسانِهِ. وَ فِی الدَّرَکِ الثّالِثَةِ مِنَ النّارِ مَن اَبغَضَنا بِقَلبِهِ.

"جنت میں تین درجے ہیں اور جہنم میں تین درکات۔ جنت کا سب سے بلند درجہ اس شخص کے لیے ہے جو دل سے ہم سے محبت کرے، زبان سے ہماری نصرت کرے اور اپنے ہاتھ اور قدرت سے بھی ہماری مدد کرے۔ دوسرا درجہ اس شخص کے لیے ہے جو دل سے ہم سے محبت کرے اور زبان سے ہماری نصرت کرے۔ اور تیسرا درجہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے دل سے ہم سے محبت کرے۔ اور جہنم کے سب سے نچلے درک میں وہ شخص ہوگا جو دل میں ہم سے بغض رکھے اور اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے ہمارے خلاف مدد کرے۔ جہنم کے دوسرے درک میں وہ شخص ہوگا جو دل میں ہم سے بغض رکھے اور زبان سے ہمارے خلاف مدد کرے۔ اور تیسرے درک میں وہ شخص ہوگا جو دل میں ہم سے بغض رکھے۔"

بحار الانوار، ج27، ص93، حدیث 53، بحوالۂ المحاسن، برقی۔

اس روایت میں **"ہاتھ"** انسان کی قدرت، توانائی، وسائل اور عملی صلاحیتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو شخص اپنی طاقت، امکانات اور وسائل کو اہلِ بیتؑ کی نصرت میں استعمال کرتا ہے، وہ ان سے محبت اور وابستگی کے بلند ترین درجے پر فائز ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، جو شخص اپنی قوت، امکانات اور وسائل کو اہلِ بیتؑ کی مخالفت میں استعمال کرے، وہ ان کے شدید ترین دشمنوں میں شمار ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے جہنم کے پست ترین درکات کا مستحق قرار پاتا ہے۔

پس **ولایت اور براءت محض دل کی دو کیفیات نہیں ہیں**۔ان کی حقیقت دل، زبان اور انسان کی عملی قوت و امکانات کے استعمال میں ظاہر ہوتی ہے۔

اہلِ بیتؑ سے محبت اپنی تکمیل **ان کی ولایت و نصرت** میں پاتی ہے، اور ان کی ولایت لازماً ان لوگوں سے **براءت و بیزاری** کا تقاضا کرتی ہے جو ان کے مقابل کھڑے ہوں۔

حصہ دوم، باب سوم

دینداری میں تولّیٰ اور تبرّیٰ کا کردار

ولایت اور براءت کے آثار و لوازم

تمہید

ولایت اور براءت، شجرۂ توحید کی دو عظیم شاخیں ہیں۔ولایت کی شاخ کا ثمر **اولیائے خدا سے محبت** ہے، جبکہ براءت کی شاخ کا ثمر **دشمنانِ خدا سے بغض و بیزاری** ہے۔

یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص اہلِ بیتؑ کی حقیقی ولایت رکھتا ہو، لیکن ان کے دشمنوں سے براءت و بیزاری نہ رکھتا ہو۔

کسی شخص نے امام صادقؑ سے عرض کیا: ''فلاں شخص آپ کی ولایت تو رکھتا ہے، لیکن آپ کے دشمنوں سے براءت اختیار کرنے میں کمزور ہے۔'' امامؑ نے فرمایا:

هَيهاتَ! كَذَبَ مَنِ ادَّعى مَحَبَّتَنا وَ لَم يَتَبَرَّأ مِن عَدُوِّنا.

''ہر گز نہیں! جھوٹا ہے وہ شخص جو ہماری محبت کا دعویٰ کرے، لیکن ہمارے دشمن سے براءت اختیار نہ کرے۔''

(بحار الانوار، ج27، ص58، حدیث18، بحوالۂ السرائر)

آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کسی سے محبت کرے اور اس کے دشمن کے بارے میں بے تعلق اور بے پروا رہے؟!

ولایت اور براءت، اور ان کے ثمرات یعنی محبت اور بغض، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ بلکہ خود ایمان کی حقیقت بھی اسی محبت اور بغض میں سمٹ آتی ہے:

وَ هَلِ الایمانُ اِلّا الحُبَّ وَ البُغضُ؟

''کیا ایمان محبت اور بغض کے سوا بھی کچھ ہے؟''

)اصول الکافی، ج2، ص125، کتاب الایمان والکفر، باب الحب فی اللہ والبغض فی اللہ، حدیث 5۔(

اہلِ بیتؑ پر صلوات بھیجنے کی اہمیت

اہلِ بیتؑ سے ہماری محبت مختلف اعمال کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے، جن میں سے ایک **محمدؐ و آلِ محمدؐ پر صلوات بھیجنا** ہے۔

روایات میں اس عمل پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

ما فِی المیزانِ شَیءٌ اَثقَلُ مِنَ الصَّلاةِ عَلی مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ.

''میزانِ اعمال میں محمدؐ و آلِ محمدؑ پر صلوات سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہے۔''

)اصول الکافی، ج2، ص494، کتاب الدعاء، باب الصلاۃ علی النبیؐ، حدیث 15۔(

البتہ رسولِ خداؐ پر صلوات ہمیشہ ان کے اہلِ بیتؑ پر صلوات کے ساتھ ہونی چاہیے۔ یہی **کامل صلوات** ہے۔

ایک مرتبہ امام باقرؑ نے ایک شخص کو خانۂ کعبہ کے پردے سے لپٹے ہوئے یہ کہتے سنا:

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ.

''اے اللہ! محمدؐ پر صلوات نازل فرما۔''

امامؑ نے اس سے فرمایا:

یا عَبدَاللهِ، لا تُبتِرها. لا تَظلِمنا حَقَّنا. قُل: اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وَ اَهلِ بَیتِهِ.

''اے بندۂ خدا! اسے ناقص نہ کرو۔ ہمارے حق کے بارے میں ہم پر ظلم نہ کرو۔ یوں کہو: اے اللہ! محمدؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ پر صلوات نازل فرما۔''

)اصول الکافی، ج2، ص495، کتاب الدعاء، باب الصلاۃ علی النبیؐ، حدیث 21۔(

صلوات کی اہمیت اس حد تک ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا:

مَن ذُکِرتُ عِندَهُ فَنَسِیَ الصَّلاةَ عَلَیَّ، خَطِئَ بِهِ طَرِیقَ الجَنَّة.

''جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر صلوات بھیجنا بھول جائے، وہ جنت کی راہ سے بھٹک گیا۔''

(اصول الکافی، ج2، ص495، کتاب الدعاء، باب الصلاۃ علی النبیؐ، حدیث 19۔)

دشمنانِ خدا پر اللہ کی لعنت

جس طرح صلوات اہلِ بیتؑ سے محبت کی ایک علامت ہے، اسی طرح ان کے دشمنوں سے بغض کی ایک علامت ان پر **اللہ کی لعنت طلب کرنا** ہے۔

عربی زبان میں **لعن** کی تعریف **الإبعاد والطرد من الخیر** سے کی گئی ہے، یعنی ''خیر سے دور اور محروم کرنا۔'' اسی طرح **لعنت** کا ایک معنی **الدعاء علیہ** یعنی کسی کے خلاف دعا کرنا بھی بیان ہوا ہے۔

پس جس طرح صلوات کسی کے لیے خیر، رحمت اور برکت کی دعا ہے، اسی طرح لعنت کسی کے خلاف دعا اور اس بات کی درخواست ہے کہ وہ دنیا و آخرت کی خیر سے دور کر دیا جائے۔

جب اللہ کسی شخص پر لعنت فرماتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی رحمت، برکت اور خیر سے دور کر دیتا ہے۔

قرآنِ کریم صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ رسولِ خداؐ کو اذیت پہنچانے والوں پر اللہ نے لعنت فرمائی ہے:

اِنَّ الَّذینَ یُؤذُونَ اللهَ وَ رَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِی الدُّنیا وَ الآخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُم عَذاباً مُهیناً.

''بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں، اللہ نے دنیا اور آخرت میں ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

(قرآن، 33:57)

دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت

یہاں قرآن اور معتبر حدیثی مآخذ، حتیٰ اہلِ سنت کے مصادر سے بھی، اس بات کو ثابت کیا جاسکتا ہے کہ دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کرنا جائز، بلکہ لازم ہے۔

اختصار کی خاطر ہم صرف چند نمونے ذکر کرتے ہیں اور تفصیل کے خواہش مند حضرات کو ان کتابوں کی طرف رجوع دیتے ہیں جن میں اس موضوع پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ ان میں مرحوم محقق کرکی کی کتاب نفحات اللاہوت فی لعن الجبت والطاغوت قابل ذکر ہے، جس کا اسی نام سے فارسی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اسی موضوع پر شیخ جواد کربلائی کی رسالۂ تولّیٰ و تبرّیٰ بھی موجود ہے۔ معروف کتاب فضائل الخمسہ میں ایک باب اس عنوان سے ہے:

"رسولِ خداؐ کا فرمان: فاطمہؑ میرا حصہ ہیں؛ جس نے انہیں غضب ناک کیا، اس نے مجھے غضب ناک کیا۔"

مصنف نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ترمذی اور سنن ابی داؤد جیسے اہلِ سنت کے معتبر مصادر سے روایات نقل کی ہیں، جن سب کا مفہوم یہ ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: جس نے فاطمہ زہراؑ کو اذیت پہنچائی اور ناراض کیا، اس نے خود رسولِ خداؐ کو اذیت پہنچائی اور ناراض کیا۔

مثلاً صحیح بخاری میں منقول ہے:

هِيَ فاطِمَةُ بَضعَةٌ مِنّی ... يُؤذينی ما آذاها.

"فاطمہؑ میرے وجود کا ایک حصہ ہیں... جو چیز انہیں اذیت پہنچاتی ہے، وہ مجھے اذیت پہنچاتی ہے۔"

(صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ذبّ الرجل عن ابنته؛ بحوالۂ فضائل الخمسہ، ج 3، ص 184۔)

اسی مفہوم کی روایت صحیح مسلم اور صحیح ترمذی میں بھی نقل ہوئی ہے۔

اب ابن قتیبہ کی کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں منقول واقعے پر غور کیجیے۔

جب ابو بکر اور عمر، حضرت فاطمہ زہراؑ کی بیماری کے دوران ان سے ملاقات کے لیے آئے تو آپؑ نے ان دونوں سے فرمایا:

نَشَدتُکُما اللهَ، سَمِعتُم قَولَ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم: رِضا فاطِمَةَ مِن رِضایَ. وَ سَخَطُ فاطِمَةَ مِن سَخَطی. فَمَن أَحَبَّ فاطِمَةَ ابنَتی، فَقَد اَحَبَّنی. وَ مَن اَرضا فاطِمَةَ، فَقَد اَرضانی. وَ مَن اَسخَطَ فاطِمَةَ، فَقَد اَسخَطَنی.

''میں تم دونوں کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتی ہوں: کیا تم نے رسولِ خداؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ فاطمہؑ کی رضا میری رضا ہے اور فاطمہؑ کا سخط میرا سخط ہے؟ جس نے میری بیٹی فاطمہؑ سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی؛ جس نے فاطمہؑ کو راضی کیا، اس نے مجھے راضی کیا؛ اور جس نے فاطمہؑ کو ناراض کیا، اس نے مجھے ناراض کیا؟''

دونوں نے جواب دیا: ''ہاں، ہم نے یہ بات رسولِ خداؐ سے سنی تھی۔''

حضرت فاطمہ زہراؑ نے پھر فرمایا:

فَاِنّی اُشهِدُ اللهَ وَ مَلائِکَتَهُ اَنَّکُما اَسخَطتُمانی فَما اَرضَیتُمانی. وَ لَئِن لَقیتُ النَّبِیَّ، لَاَشکُوَنَّکُما اِلَیه.

''پس میں اللہ اور اس کے فرشتوں کو گواہ بناتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ناراض کیا اور مجھے راضی نہیں کیا۔ اور اگر میں رسولِ خداؐ سے ملاقات کروں گی تو یقیناً تم دونوں کی شکایت ان سے کروں گی۔''

ابو بکر رونے لگے تو حضرت فاطمہ زہراؑ نے فرمایا:

وَ اللهِ لَاَدعُوَنَّ اللهَ عَلَیکَ فی کُلِّ صَلاةٍ اُصَلّیها.

''اللہ کی قسم! میں اپنی ہر نماز میں تمہارے خلاف اللہ سے دعا کروں گی۔''

)الامامۃ والسیاسۃ، ص14۔(

نوٹ: اصل فراہم کردہ متن نے اس واقعے کو ابن قتیبہ کی کتاب الامامۃ والسیاسۃ کی طرف منسوب کیا ہے؛ ترجمے میں ماخذ کی یہی نسبت برقرار رکھی گئی ہے۔

اصل متن کے حواشی:

1. صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ذبّ الرجل عن ابنتہ؛ بحوالۂ فضائل الخمسہ، ج3، ص184۔
2. الامامۃ والسیاسۃ، ص14۔

3. محقق کرکی، نفحات اللاہوت فی لعن الجبت والطاغوت؛ شیخ جواد کربلائی، رسالۂ تولّیٰ و تبرّیٰ۔

4. فضائل الخمسہ، ج3، ص184۔

صحیح بخاری میں یہ بھی نقل ہوا ہے:

فَغَضِبَت فاطِمَةُ بَنتُ رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم فَهَجَرَت اَبابَکرٍ فَلَم تَزَل مُهاجَرَتُهُ حَتّی تُوُفِّیَت.

''فاطمہؑ بنتِ رسول اللہؐ ابو بکر سے ناراض ہوئیں اور ان سے قطع تعلق کر لیا، اور وفات تک اسی حالت پر رہیں۔''

) صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب فرض الخمس، ج2، ص186۔(

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر ہے:

فَوَجَدَت فاطِمَةُ عَلی اَبی بَکرٍ فی ذلِکَ فَهَجَرَتهُ فَلَم تُکَلِّمهُ حَتّی تُوُفِّیَت.

''فاطمہؑ اس معاملے میں ابو بکر سے ناراض ہوئیں، ان سے قطع تعلق کر لیا اور اپنی وفات تک ان سے گفتگو نہیں کی۔''

) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر، ج3، ص55۔(

پس مذکورہ اہلِ سنت مصادر کے مطابق، اہلِ بیتؑ کے حقوق غصب کرنے والوں نے حضرت فاطمہ زہراؑ کو اذیت پہنچائی اور ناراض کیا۔ اور انہی مصادر میں منقول رسولِ خداؐ کے فرمان کے مطابق فاطمہ زہراؑ کو اذیت پہنچانا رسولِ خداؐ کو اذیت پہنچانا ہے، جبکہ قرآنِ کریم اعلان کرتا ہے کہ رسولِ خداؐ کو اذیت پہنچانے والے اللہ کی لعنت کے مستحق ہیں۔

رسولِ خداؐ نے حضرت فاطمہ زہراؑ پر ظلم کرنے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے حضرت فاطمہ زہراؑ کے بارے میں فرمایا:

اللّهُمَّ العَن مَن ظَلَمَها.

''اے اللہ! جو فاطمہؑ پر ظلم کرے، اس پر لعنت فرما۔''

)امالی الصدوق، مجلس 24، حدیث 2، ص69–70۔(

ائمہؑ خود بھی دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت فرماتے تھے۔

مثلاً الکافی میں نقل ہوا ہے:

سَمِعنا اَبا عَبدِاللهِ علیه السّلام وَ هُوَ یَلعَنُ فی دُبُرِ کُلِّ مَکتُوبَةٍ اَربَعَةً مِنَ الرِّجالِ وَ اَربَعاً مِنَ النِّساءِ، فُلانٌ وَ فُلانٌ وَ فُلانٌ وَ مُعاوِیَةُ. وَیُسَمّیهِم. وَ فُلانَةُ وَ فُلانَةُ وَ هِندٌ وَ اُمُّ الحَکَمِ اُختُ مُعاوِیَةَ.

''ہم نے امام صادقؑ کو سنا کہ آپ ہر واجب نماز کے بعد چار مردوں اور چار عورتوں پر لعنت فرماتے تھے: فلاں، فلاں، فلاں اور معاویہ ــــ اور آپ ان کے نام لیتے تھے ــــ اور فلاں عورت، فلاں عورت، ہند اور معاویہ کی بہن امّ الحکم۔''

(الکافی، ج3، ص342۔)

پس لعنت کرنا ائمہؑ کے معمولات میں شامل تھا اور انہوں نے اپنے پیروکاروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔

زیارتِ عاشورا، جس کی تلاوت پر بہت تاکید کی گئی ہے، اس میں بھی متعدد مقامات پر دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کی گئی ہے۔

چنانچہ ہم پڑھتے ہیں:

اللّهُمَّ العَن اَوَّلَ ظالِمٍ ظَلَمَ حَقَّ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ ... . اللّهُمَّ خُصَّ اَنتَ اَوَّلَ ظالِمٍ بِاللَّعنِ مِنّی وَ ابدَأ بِهِ اَوَّلاً ثُمَّ الثّانِیَ ثُمَّ الثّالِثَ ثُمَّ الرّابِعَ. اللّهُمَّ العَن یَزیدَ بنَ مُعاوِیَةَ خامِساً وَ العَن عُبَیدَاللهِ بنَ زیادٍ وَ ابنَ مَرجانَةَ وَ عُمَرَ بنَ سَعدٍ وَ شِمراً وَ آلَ اَبی سُفیانَ وَ آلَ زِیادٍ وَ آلَ مَروانَ اِلی یَومِ القِیامَةِ.

''اے اللہ! اس پہلے ظالم پر لعنت فرما جس نے محمدؐ و آلِ محمدؑ کے حق پر ظلم کیا... اے اللہ! میری طرف سے اپنی لعنت کے لیے پہلے ظالم کو خصوصیت کے ساتھ قرار دے اور سب سے پہلے اسی سے آغاز فرما، پھر دوسرے پر، پھر تیسرے پر، پھر چوتھے پر۔ اے اللہ! پانچویں نمبر پر یزید بن معاویہ پر لعنت فرما، اور عبید اللہ بن زیاد، ابن مرجانہ، عمر بن سعد، شمر، آلِ ابی سفیان، آلِ زیاد اور آلِ مروان پر قیامت تک لعنت فرما۔''

(بحار الانوار، ج101، ص296، حدیث 1، بحوالہ کامل الزیارات۔)

یہاں مختصراً اس نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ اگر آلِ ابی سفیان، آلِ زیاد اور آلِ مروان کو بھی لعنت میں شامل کیا گیا ہے تو اس کی بیان کردہ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے اعمال سے راضی اور ان پر خوش تھے۔

اسی زیارت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَ هذا یَومٌ فَرِحَت بِهِ آلُ زیادٍ وَ آلُ مَروانَ بِقَتلِهِمُ الحُسَینَ صَلَواتُ اللهِ عَلَیهِ.

''اور یہ وہ دن ہے جس میں آلِ زیاد اور آلِ مروان، حسینؑ کے قتل پر خوش ہوئے۔''

جو شخص کسی قوم کے عمل سے راضی ہو، وہ اس کے عمل میں شریک شمار ہوتا ہے۔

امام رضاؑ سے منقول ہے:

ذُرّیّاتُ قَتَلَةِ الحُسَینِ علیه السّلام یَرضَونَ بِاَفعالِ آبائِهِم وَ یَفتَخِرُونَ بِها. وَ مَن رَضِیَ شَیئاً کانَ کَمَن اَتاهُ. وَ لَو اَنَّ رَجُلاً قُتِلَ بِالمَشرِقِ فَرَضِیَ بِقَتلِهِ رَجُلٌ فِی المَغرِبِ، لَکانَ الرّاضی عِندَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ شَریکَ القاتِلِ.

''قاتلانِ حسینؑ کی نسلیں اپنے آباء کے اعمال سے راضی ہیں اور ان پر فخر کرتی ہیں۔ اور جو کسی کام سے راضی ہو، وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے خود اسے انجام دیا ہو۔ اگر مشرق میں کسی شخص کو قتل کیا جائے اور مغرب میں رہنے والا کوئی شخص اس قتل پر راضی ہو تو اللہ عزوجل کے نزدیک وہ راضی ہونے والا بھی قاتل کا شریک ہوگا۔''

(عیون اخبار الرضاؑ، ج 1، ص 273۔)

دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کے ذریعے اہلِ بیتؑ کی نصرت

ایک اور نکتہ جو دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کی اہمیت کو مزید واضح کرتا ہے، یہ ہے کہ اسے **اہلِ بیتؑ کی نصرت کی ایک صورت** قرار دیا گیا ہے۔

کسی شخص نے امام صادقؑ سے عرض کیا:

یَابنَ رَسُولِ اللهِ اَنّی عاجِزٌ بِبَدَنی عَن نُصرَتِکُم وَ لَستُ اَملِکُ اِلّا البَرَاءَةَ مِن اَعدائِکُم وَ اللَّعنَ. فَکَیفَ حالی؟

''اے فرزندِ رسولِ خداؐ! میں جسمانی طور پر آپ کی نصرت سے عاجز ہوں اور آپ کے دشمنوں سے براءت اور ان پر لعنت کے سوا میرے پاس کوئی اور وسیلہ نہیں۔ پس میری حالت کیا ہوگی؟'' امام صادقؑ نے فرمایا:

حَدَّثَنی اَبی عَن اَبیهِ عَن جَدِّهِ عَن رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم اَنَّهُ قالَ: مَن ضَعُفَ عَن نُصرَتِنا اَهلَ البَیتِ فَلَعَنَ فی خَلَواتِهِ اَعداءَنا، بَلَّغَ اللهُ صَوتَهُ جَمیعَ الاَملاکِ مِنَ الثَّری اِلَی العَرشِ. فَکُلَّما لَعَنَ هذَا الرَّجُلُ اَعداءَنا لَعناً، ساعَدُوهُ وَ لَعَنُوا مَن یَلعَنُهُ ثُمَّ ثَنَّوا فَقالُوا: اللّهُمَّ صَلِّ عَلی عَبدِکَ هذا الَّذی قَد بَذَلَ ما فی وُسعِهِ وَ لَو قَدَرَ عَلی اَکثَرَ مِنهُ لَفَعَلَ. فَاِذا النِّداءُ مِن قِبَلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: قَد اَجَبتُ دُعاءَکُم وَ سَمِعتُ نِداءَکُم وَ صَلَّیتُ عَلی رُوحِهِ فِی الاَرواحِ وَ جَعَلتُهُ عِندی مِنَ المُصطَفَینَ الاَخیارِ.

''میرے والد نے اپنے والد سے، انہوں نے اپنے جد سے اور انہوں نے رسولِ خداؐ سے روایت کی کہ آپؐ نے فرمایا: جو شخص ہم اہلِ بیتؑ کی نصرت کرنے سے عاجز ہو، لیکن اپنی تنہائی میں ہمارے دشمنوں پر لعنت کرے، اللہ اس کی آواز زمین کی تہوں سے عرش تک تمام ملائکہ تک پہنچا دیتا ہے۔

جب بھی یہ شخص ہمارے دشمنوں پر لعنت کرتا ہے تو وہ فرشتے بھی اس کا ساتھ دیتے ہیں اور جس پر وہ لعنت کرتا ہے اس پر لعنت کرتے ہیں۔ پھر وہ عرض کرتے ہیں: اے اللہ! اپنے اس بندے پر رحمت و درود نازل فرما جس نے اپنی استطاعت کے مطابق جو کچھ کر سکتا تھا، کیا؛ اور اگر اس سے زیادہ کی قدرت رکھتا تو وہ بھی ضرور انجام دیتا۔

پھر اللہ عزوجل کی طرف سے ندا آتی ہے: میں نے تمہاری دعا قبول کی، تمہاری پکار سنی، ارواح کے درمیان اس کی روح پر اپنی رحمت نازل کی اور اسے اپنے نزدیک برگزیدہ نیک بندوں میں قرار دیا۔''

)بحار الانوار، ج27، ص222، حدیث 11، بحوالۂ تفسیر امام حسن عسکریؑ۔(

گزشتہ مطالب کی روشنی میں دشمنانِ اہلِ بیتؑ پر لعنت کرنا **براءت کے آثار و لوازم** میں سے ہے۔

اس عمل کو زندہ رکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دشمنانِ خدا کی شناخت باقی رہتی ہے۔ اس طرح آنے والی نسلیں دشمنانِ خدا کو پہچان کر اور ان سے براءت اختیار کر کے دین کے راستے سے منحرف ہونے سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، اسی ذریعے سے وہ اللہ اور اہلِ بیتؑ کا قرب بھی حاصل کرتی ہیں۔

تمہید

گزشتہ بحث کی روشنی میں ایک نہایت اہم نتیجہ سامنے آتا ہے : **کسی چیز کے حق یا باطل ہونے کو اہلِ بیتؑ کی رضا یا سخط کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے۔**

اس کی وجہ یہ ہے کہ حق کبھی اہلِ بیتؑ سے جدا نہیں ہوتا اور اہلِ بیتؑ بھی کبھی حق سے جدا نہیں ہوتے۔ بلکہ کسی امر کے حق ہونے کی علامت یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ اس سے راضی ہوں۔

رسولِ خداؐ سے یہ حدیث شیعہ اور سنی دونوں مصادر میں نقل ہوئی ہے:

اَلحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ. وَ عَلِیٌّ مَعَ الحَقِّ. لا یَفتَرِقانِ حَتّی یَرِدا عَلَیَّ الحَوضَ.

"حق علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ حق کے ساتھ ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوض پر میرے پاس وارد ہوں گے۔"

(بحار الانوار، ج 38، ص 26–40، جہاں اس روایت کے شیعہ و سنی مصادر ذکر کیے گئے ہیں۔)

ان روایات میں اہم نکتہ یہ ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ کو **حق اور حقیقت کا معیار** قرار دیا گیا ہے۔

مطلب یہ نہیں کہ حق کو پہلے کسی ایسے خارجی معیار کے ذریعے متعین کیا جائے جو امیر المؤمنینؑ سے مستقل ہو، اور اس کے بعد یہ کہا جائے کہ امیر المؤمنینؑ کبھی اس معیار سے منحرف نہیں ہوتے۔

بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے : **کسی چیز کا حق ہونا امیر المؤمنینؑ کی رضا کے ذریعے پہچانا جاتا ہے، اور اس کا باطل ہونا آپؑ کے سخط و نارضایتی سے معلوم ہوتا ہے۔**

اہلِ سنت کے مصادر میں بھی ایک روایت نقل ہوئی ہے:

رَحِمَ اللهُ عَلِیّاً. اللّهُمَّ اَدِرِ الحَقَّ مَعَهُ حَیثُ دارَ.

"اللہ علیؑ پر رحمت فرمائے۔ اے اللہ! حق کو علیؑ کے ساتھ اسی طرف پھیر دے جدھر وہ پھریں۔"

(بحار الانوار، ج 38، ص 38، حدیث 14، بحوالہ الطرائف، جس میں صحیح بخاری کی طرف نسبت دی گئی ہے۔)

پس بنیادی طور پر حق و باطل کی شناخت کا معیار **اہلِ بیتؑ کی رضا اور سخط** ہے۔

زیارتِ آلِ یٰسین میں ہم پڑھتے ہیں:

فَالحَقُّ ما رَضیتُمُوهُ. وَ الباطِلُ ما سَخِطتُمُوهُ. وَ المَعروفُ ما اَمَرتُم بِهِ. وَ المُنکَرُ ما نَهَیتُم عَنهُ.

"پس حق وہ ہے جس سے آپ راضی ہوں، اور باطل وہ ہے جس سے آپ ناراض ہوں؛ معروف وہ ہے جس کا آپ نے حکم دیا، اور منکر وہ ہے جس سے آپ نے منع فرمایا۔) "الاحتجاج، طبرسی، ج2، ص317۔(

رضا و سخطِ الٰہی کا مفہوم

رضا اور سخط ایسے مفاہیم ہیں جو اپنے معروف اور مخلوقاتی معنی میں مخلوقات پر صادق آتے ہیں۔ ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ مخلوق کے بارے میں ان الفاظ سے جو معنی سمجھتے ہیں، بعینہٖ وہی معنی اللہ کی طرف منسوب کر دیں۔

لہٰذا جب اس قسم کی تعبیرات اللہ کے لیے استعمال ہوتی ہیں تو ان کا مفہوم ذاتِ الٰہی میں کسی کیفیت، حالت، تبدیلی یا محدودیت کا ہونا نہیں ہو سکتا۔

پس جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کسی چیز سے راضی ہے اور کسی دوسری چیز سے ناراض، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ انسانوں کی طرح خوش یا ناراض ہوتا ہے؛ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ **اللہ نے ایک امر پر ثواب اور دوسرے پر عذاب مقرر فرمایا ہے۔**

لیکن ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ اللہ کی رضا کس چیز سے متعلق ہے اور اس کا سخط کس چیز سے؟

یہ بات ان **اولیائے خدا کی رضا اور سخط** کے ذریعے معلوم ہوتی ہے جنہیں اللہ نے خود برگزیدہ فرمایا ہے۔

کسی شخص نے اس آیت کے بارے میں سوال کیا:

فَلَمّا آسَفُونَا انتَقَمنا مِنهُم.

"پس جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔) "قرآن، 43:55(

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ لا یأسَفُ کَاَسَفِنا. وَ لکِنَّهُ خَلَقَ اَولیاءَ لِنَفسِهِ یأسَفونَ وَ یَرضَونَ وَ هُم مَخلُوقُونَ مَربُوبُونَ، فَجَعَلَ رِضاهُم رِضا نَفسِهِ وَ سَخَطَهُم سَخَطَ نَفسِهِ. لِاَنَّهُ جَعَلَهُمُ الدُّعاةَ اِلَیهِ وَ الاَدِلّاءَ عَلَیهِ. فَلِذلِکَ صارُوا کَذلِکَ. وَ لَیسَ اَنَّ ذلِکَ یَصِلُ اِلَی اللهِ کَما یَصِلُ اِلی خَلقِهِ، لکِن هذا مَعنی ما قالَ مِن ذلِکَ.

"بے شک اللہ عزوجل ہماری طرح رنجیدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس نے اپنے لیے ایسے اولیاء پیدا فرمائے ہیں جو راضی بھی ہوتے ہیں اور ناراض بھی، جبکہ وہ خود مخلوق اور اس کے پروردہ ہیں۔ پس اللہ نے ان کی رضا کو اپنی رضا اور ان کے سخط کو اپنا سخط قرار دیا، کیونکہ اس نے انہیں اپنی طرف دعوت دینے والے اور اپنی طرف رہنمائی کرنے والے قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر انہیں یہ مقام حاصل ہوا۔

اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ کوئی کیفیت اللہ تک اسی طرح پہنچتی ہے جیسے اس کی مخلوق تک پہنچتی ہے؛ بلکہ اللہ کے اس قسم کے ارشادات کا مفہوم یہی ہے جو میں نے تمہارے لیے بیان کیا۔ "پھر امامؑ نے فرمایا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے:

"جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرے، اس نے مجھ سے علانیہ جنگ کا اعلان کیا اور مجھے جنگ کی دعوت دی۔"

اور فرمایا" : **جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"**

اور فرمایا" : **بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں؛ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔"**

امامؑ نے واضح فرمایا کہ یہ تمام تعبیرات اور ان جیسی دوسری تعبیرات اسی معنی میں ہیں جس کی آپؑ نے وضاحت فرمائی؛ رضا، غضب اور اس نوع کی تمام تعبیرات کا معاملہ بھی یہی ہے۔

)اصول الکافی، ج 1، ص 144، کتاب التوحید، باب النوادر، حدیث 6۔(

اللہ اس بات سے کہیں بلند و برتر ہے کہ مخلوقات کی صفات ان کے مخلوقاتی معنی میں اس کی طرف منسوب کی جائیں۔ مخلوق سے اخذ کیا جانے والا ہر مفہوم اپنی اصل میں محدود اور ناقص ہے، خواہ اس سے مختلف حدود و قیود ہٹانے کی کوشش ہی کیوں نہ کی جائے؛ جبکہ اللہ ہر نقص اور محدودیت سے منزّہ ہے۔

لہٰذا ایسی صفات کو ان کے مخلوقاتی معنی میں اللہ کی طرف نسبت دینا، ذاتِ مقدسِ الٰہی کو مخلوق سے تشبیہ دینے کا سبب بنے گا۔ اسی بنا پر جب قرآن یا روایات میں مخلوقات سے متعلق ایسی صفات اللہ کی طرف منسوب ہوتی ہیں تو ان کا مفہوم وہی ہے جو مذکورہ روایت میں بیان ہوا ہے۔

خلاصہ یہ کہ:

اولیائے خدا، اس کی رضا اور سخط کے مظاہر ہیں۔

جس چیز سے وہ راضی ہیں، وہ وہی چیز ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب مقرر فرمایا ہے؛ اور جس چیز سے وہ ناراض ہیں، وہ ایسی چیز ہے جو عذابِ الٰہی اور جہنم کا سبب بنتی ہے۔

ان کے قلوب **مشیتِ الٰہی کے محل** ہیں، اور ان کے دلوں میں اللہ کی مشیت کے خلاف کسی چیز کی کوئی جگہ نہیں۔

اسی لیے کسی شخص کے جنت یا جہنم میں جانے کا معیار بھی ان کی رضا اور سخط قرار پاتا ہے۔

ان کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہے۔ ان سے بیعت، اللہ سے بیعت ہے۔ انہیں اذیت پہنچانا، اللہ کو اذیت پہنچانا ہے۔ ان سے جنگ، اللہ سے جنگ ہے۔ ان سے محبت، اللہ سے محبت ہے۔

اور اسی طرح دیگر امور بھی۔ مختصر یہ کہ یہی وہ مقدس ہستیاں ہیں جو حقیقتاً **خلیفۃ اللہ** کہلانے کی سزاوار ہیں، جیسا کہ اس عنوان کے بارے میں پہلے تفصیل گزر چکی ہے۔

تکوین و تشریع کی بنیاد —— محبتِ اہلِ بیتؑ

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کی خلقت کا محور و اساس —— خواہ **تکوین** کے اعتبار سے ہو یا **تشریع** کے اعتبار سے —— اہلِ بیتؑ کی محبت قرار پائی ہے۔

رسولِ خداؐ کے واقعۂ معراج سے متعلق ایک روایت میں ہے:

قالَ لِیَ الجَلیلُ جَلَّ جَلالُهُ: یا مُحَمَّدُ، مَن تُحِبُّ مِن خَلقی؟ قُلتُ: اُحِبُّ الَّذی تُحِبُّهُ اَنتَ یا رَبّی. فَقالَ لی جَلَّ جَلالُهُ: فَاَحِبَّ عَلِیّاً. فَاِنّی اُحِبُّهُ وَ اُحِبُّ مَن یُحِبُّهُ وَ اُحِبُّ مَن اَحَبَّ مَن یُحِبُّهُ. ...

''صاحبِ جلال — جلّ جلالہ — نے مجھ سے فرمایا: اے محمدؐ! میری مخلوق میں سے آپ کس سے محبت کرتے ہیں؟

میں نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں اس سے محبت کرتا ہوں جس سے تو محبت کرتا ہے۔

اللہ جلّ جلالہ نے فرمایا: پس علیؑ سے محبت کرو، کیونکہ میں ان سے محبت کرتا ہوں، اس سے بھی محبت کرتا ہوں جو علیؑ سے محبت کرے، اور اس سے بھی محبت کرتا ہوں جو علیؑ سے محبت کرنے والے سے محبت کرے''...

پھر اللہ نے فرمایا:

یا مُحَمَّدُ، اِنّی اَطَّلَعتُ عَلی قُلُوبِ عِبادی فَوَجَدتُ عَلِیّاً اَنصَحَ خَلقی لَکَ وَ اَطوَعَهُم لَکَ. فَاتَّخِذهُ اَخاً وَ خَلیفَةً وَ وَصِیّاً. وَ زَوِّجهُ ابنَتَکَ. فَاِنّی سَاَهَبُ لَهُما غُلامَینِ طَیِّبَینِ طاهِرَینِ تَقِیَّینِ نَقِیَّینِ. فَبی حَلَفتُ وَ عَلی نَفسی حَتَمتُ اَنَّهُ لا یَتَوَلّی عَلِیّاً وَ زَوجَتَهُ وَ ذُرِّیَّتَهُما اَحَدٌ مِن خَلقی اِلّا رَفَعتُ لِواءَهُ اِلی قائِمَةِ عَرشی وَ جَنَّتی وَ بُحبُوحَةِ کَرامَتی وَ سَقَیتُهُ مِن حَظیرَةِ قُدسی. وَ لا یُعادیهِم اَحَدٌ اَو یَعدِلُ عَن وِلایَتِهِم. یا مُحَمَّدُ. اِلّا سَلَبتُهُ وُدّی وَ باعَدتُهُ مِن قُربی وَ ضاعَفتُ عَلَیهِ عَذابی وَ لَعنَتی.

''اے محمدؐ! میں نے اپنے بندوں کے دلوں پر نظر فرمائی تو علیؑ کو اپنی مخلوق میں آپ کے لیے سب سے زیادہ خیر خواہ اور آپ کا سب سے زیادہ اطاعت گزار پایا۔ پس انہیں اپنا بھائی، خلیفہ اور وصی بنایئے اور اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دیجیے۔ میں ان دونوں کو دو پاکیزہ، طاہر، متقی اور پاک فرزند عطا کروں گا۔

مجھے اپنی ذات کی قسم! میں نے اپنے اوپر یہ لازم قرار دیا ہے کہ میری مخلوق میں سے جو شخص علیؑ، ان کی زوجہ اور ان دونوں کی ذریت کی ولایت قبول کرے گا، میں اس کا علَم اپنے عرش کے پایے، اپنی جنت اور اپنی خاص کرامت کے مرکز تک بلند کروں گا اور اسے اپنے حریمِ قدس سے سیراب کروں گا۔

اور اے محمدؐ! جو شخص ان سے دشمنی کرے یا ان کی ولایت سے روگردانی کرے، میں اسے اپنی محبت سے محروم کر دوں گا، اپنے قرب سے دور کر دوں گا اور اس پر اپنے عذاب اور لعنت کو بڑھا دوں گا۔''

پھر اللہ نے فرمایا:

یا مُحَمَّدُ، اِنَّکَ رَسُولی اِلی جَمیعِ خَلقی. وَ اِنَّ عَلِیّاً وَلِیّی وَ اَمیرُالمُؤمِنینَ. وَ عَلی ذلِکَ اَخَذتُ میثاقَ مَلائِکَتی وَ اَنبِیائی وَ جَمیعِ خَلقی وَ هُم اَرواحٌ مِن قَبلِ اَن اَخلُقَ خَلقاً فی سَمائی وَ اَرضی، مَحَبَّةً مِنّی لَکَ . یا مُحَمَّدُ . وَ لِعَلِیٍّ وَ لِوَلَدِکُما وَ لِمَن اَحَبَّکُما وَ کانَ مِن شیعَتِکُما وَ لِذلِکَ خَلَقتُهُ مِن طینَتِکُما.

''اے محمدؐ! آپ میری تمام مخلوق کی طرف میرے رسول ہیں اور علیؑ میرے ولی اور امیر المؤمنین ہیں۔

میں نے اسی امر پر اپنے فرشتوں، اپنے انبیاء اور اپنی تمام مخلوقات سے اس وقت میثاق لیا تھا جب وہ ابھی ارواح کی صورت میں تھے، اس سے پہلے کہ میں اپنے آسمان اور زمین میں کسی مخلوق کو پیدا کرتا۔

اور یہ سب اے محمدؐ! آپ سے، علیؑ سے، آپ دونوں کی اولاد سے، آپ دونوں سے محبت کرنے والوں اور آپ دونوں کے شیعوں سے میری محبت کے سبب تھا۔ اسی لیے میں نے انہیں آپ دونوں کی طینت سے خلق کیا۔''

پھر اللہ نے فرمایا:

یا مُحَمَّدُ ... اِنّی جَعَلتُکُم مِحنَةً لِخَلقی اَمتَحِنُ بِکُم جَمیعَ عِبادی وَ خَلقی فی سَمائی وَ اَرضی وَ ما فیهِما لِاُکَمِّلَ الثَّوابَ لِمَن اَطاعَنی فیکُم وَ اُحِلَّ عَذابی وَ لَعنَتی عَلی مَن خالَفَنی فیکُم وَ عَصانی. وَ بِکُم اُمَیِّزُ الخَبیثَ مِنَ الطَّیِّبِ.

''اے محمدؐ!... میں نے تمہیں اپنی مخلوق کے لیے **وسیلۂ امتحان** قرار دیا ہے۔ تمہارے ذریعے میں اپنے تمام بندوں اور آسمانوں و زمین اور ان میں موجود اپنی تمام مخلوقات کو آزماتا ہوں، تاکہ جو تمہارے بارے میں میری اطاعت کرے اس کے ثواب کو کامل کر دوں، اور جو تمہارے معاملے میں میری مخالفت اور نافرمانی کرے اس پر اپنا عذاب اور لعنت نافذ کر دوں۔ اور تمہارے ذریعے میں خبیث کو طیب سے جدا کرتا ہوں۔''

اس کے بعد فرمایا:

یا مُحَمَّدُ، وَ عِزَّتی وَ جَلالی، لَولاکَ ما خَلَقتُ آدَمَ. وَ لَولا عَلِیٌّ ما خَلَقتُ الجَنَّةَ. لِاَنّی بِکُم اَجزِی العِبادَ یَومَ المَعادِ بِالثَّوابِ وَ العِقابِ ... فَلا یَدخُلُ الجَنَّةَ لَکُما عَدُوٌّ. وَ لا یَدخُلُ النّارَ لَکُما وَلِیٌّ. وَ بِذلِکَ اَقسَمتُ عَلی نَفسی.

''اے محمدؐ! مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم! اگر آپ نہ ہوتے تو میں آدمؑ کو خلق نہ کرتا، اور اگر علیؑ نہ ہوتے تو میں جنت کو خلق نہ کرتا۔

کیونکہ قیامت کے دن تمہارے ذریعے ہی میں اپنے بندوں کو ثواب اور عذاب کی جزا دوں گا...

پس تم دونوں کا کوئی دشمن جنت میں داخل نہ ہوگا، اور تم دونوں کا کوئی ولی جہنم میں داخل نہ ہوگا۔ اور میں نے اس امر پر اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔) ''بحار الانوار، ج18، ص399–400، حدیث 101، بحوالۂ کشف الیقین۔(

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ خاندانِ نبوت اور اہلِ بیتِ وحیؑ سے **محبت اور بغض وہ محور ہیں جن کے گرد محبت وغضبِ الٰہی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔** قیامت کے دن بھی یہی محبت اور بغض اللہ کی طرف سے ثواب اور عذاب کے تعلق کا معیار قرار پائیں گے۔

گزشتہ مباحث کی روشنی میں اب امام صادقؑ کی اس روایت کا مفہوم بآسانی سمجھا جاسکتا ہے:

لِکُلِّ شَیءٍ اَساسٌ. وَ اَساسُ الاِسلامِ حُبُّنا اَهلَ البَیتِ.

''ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے، اور اسلام کی بنیاد ہم اہلِ بیتؑ کی محبت ہے۔''

)اصول الکافی، ج2، ص46، کتاب الایمان والکفر، باب نسبۃ الاسلام، حدیث 2۔(

اہلِ بیتؑ سے محبت وبغض کے مطابق جنت وجہنم کے درجات

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ دشمنانِ اہلِ بیتؑ سے بغض، اہلِ بیتؑ سے محبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جنت کے درجات اور جہنم کے درکات بھی اہلِ بیتؑ سے محبت اور ان کے دشمنوں سے بغض کے مراتب کے مطابق تشکیل پاتے ہیں۔

رسولِ خداؐ فرماتے ہیں:

فِی الجَنَّةِ ثَلاثُ دَرَجاتٍ. وَ فِی النّارِ ثَلاثُ دَرَکاتٍ. فَاَعلی دَرَجاتِ الجَنَّةِ لِمَن اَحَبَّنا بِقَلبِهِ وَ نَصَرَنا بِلِسانِهِ وَ یَدِهِ. وَ فِی الدَّرَجَةِ الثّانِیَةِ مَن اَحَبَّنا بِقَلبِهِ وَ نَصَرَنا بِلِسانِهِ. وَ فِی الدَّرَجَةِ الثّالِثَةِ مَن اَحَبَّنا بِقَلبِهِ .وَ فِی اَسفَلِ الدَّرَکِ مِنَ النّارِ مَن اَبغَضَنا بِقَلبِهِ وَ اَعانَ عَلَینا بِلِسانِهِ وَ یَدِهِ. وَ فِی الدَّرَکِ الثّانِیَةِ مِنَ النّارِ مَن اَبغَضَنا بِقَلبِهِ وَ اَعانَ عَلَینا بِلِسانِهِ. وَ فِی الدَّرَکِ الثّالِثَةِ مِنَ النّارِ مَن اَبغَضَنا بِقَلبِهِ.

''جنت میں تین درجے ہیں اور جہنم میں تین درکات۔

جنت کا سب سے بلند درجہ اس شخص کے لیے ہے جو دل سے ہم سے محبت کرے اور اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے ہماری نصرت کرے۔ دوسرا درجہ اس شخص کے لیے ہے جو دل سے ہم سے محبت کرے اور اپنی زبان سے ہماری نصرت کرے۔ تیسرا درجہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے دل سے ہم سے محبت کرے۔ اور جہنم کے سب سے نچلے درک میں وہ شخص ہو گا جو دل میں ہم سے بغض رکھے اور اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے ہمارے خلاف مدد کرے۔ جہنم کے دوسرے درک میں وہ شخص ہو گا جو دل میں ہم سے بغض رکھے اور اپنی زبان سے ہمارے خلاف مدد کرے۔ اور تیسرے درک میں وہ شخص ہو گا جو دل میں ہم سے بغض رکھے۔) ''بحار الانوار، ج 27، ص 93، حدیث 53، بحوالہ المحاسن، برقی۔(

اس روایت میں **''ہاتھ ''** سے مراد انسان کی قدرت، توانائی، وسائل اور عملی صلاحیتیں ہیں۔

جو شخص اپنی قوت، امکانات اور وسائل کو اہلِ بیتؑ کی نصرت میں استعمال کرتا ہے، وہ ان سے دوستی اور وابستگی کے بلند ترین درجے پر فائز ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، جو شخص اپنی قوت، امکانات اور وسائل کو اہلِ بیتؑ کی مخالفت میں استعمال کرتا ہے، وہ ان کے شدید ترین دشمنوں میں شمار ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے جہنم کے پست ترین درکات کا مستحق قرار پاتا ہے۔

پس **ولایت اور براءت محض دل کی دو کیفیات نہیں ہیں۔** ان کی حقیقت دل، زبان اور انسان کی عملی قوت و امکانات کے استعمال میں ظاہر ہوتی ہے۔

اہلِ بیتؑ سے محبت اپنی تکمیل ان کی ولایت، اطاعت اور نصرت میں پاتی ہے، اور ان کی ولایت لازماً ان لوگوں سے براءت و بیزاری کا تقاضا کرتی ہے جو ان کے مقابل کھڑے ہوں۔

اہلِ ایمان کی ولایت کے ذریعے نجات

معرفتِ اہلِ بیتؑ — انسان کی قدر و قیمت کا معیار

تمہید

حصۂ اوّل میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دین کی حیثیت سے **اسلام کی حقیقت، اللہ تعالیٰ کے حضور قلبی ایمان اور تسلیم و سرِ اطاعت خم کرنے سے عبارت ہے۔**

اب جبکہ ہم یہ جان چکے ہیں کہ ایمان کی حقیقت اور اسلام کی روح، **اہلِ بیتؑ کی ولایت کو قبول کرنے اور ان کے دشمنوں سے براءت اختیار کرنے میں ہے**، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں دین، **اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ان کے سامنے تسلیم** سے عبارت ہے؛ اور یہ تسلیم لازماً ان کے دشمنوں سے براءت و بیزاری کا تقاضا کرتی ہے۔

اسی بنا پر اس آیتِ کریمہ:

اِنَّ الدّینَ عِندَ اللهِ الاِسلامُ

"بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔"

(قرآن، 3:19)

کے ذیل میں امام باقرؑ نے فرمایا:

اَلتَّسلیمُ لِعَلِیِّ بنِ اَبی طالِبٍ علیه السّلام بِالوِلایَةِ.

"[اسلام سے مراد] علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کو قبول کرتے ہوئے ان کے سامنے تسلیم ہونا ہے۔"

(تفسیر البرہان، ج 1، ص 274۔)

دینداری یعنی ائمہؑ کی ولایت کے سامنے تسلیم

امیر المؤمنینؑ کے سامنے تسلیم ہونا، حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے تسلیم ہونا ہے۔ ائمہؑ کی اطاعت، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے جدا نہیں ہو سکتی؛ بلکہ اللہ کے سامنے حقیقی تسلیم و اطاعت صرف **اہلِ بیتؑ کی ولایت کے سامنے تسلیم ہونے** کے ذریعے ہی تحقق پاتی ہے۔

اس بنا پر دین کی حقیقت بالآخر **اہلِ بیتؑ کی ولایت کو قبول کرنے** میں سمٹ آتی ہے۔ یہی دین کی بنیاد اور اس کی اصل حقیقت ہے، جبکہ دین کی تعریف میں ذکر ہونے والے دیگر امور اس بنیادی حقیقت کی نسبت ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

تمام نیک اعمال، خواہ واجب ہوں یا مستحب، دین کی شاخیں ہیں۔ اگر انہیں صحیح طور پر انجام دیا جائے تو وہ انسان کے اندر اللہ اور اہلِ بیتؑ کے سامنے تسلیم کی کیفیت کو مزید گہرا اور مستحکم کرتے ہیں۔

پس حقیقی دینداری دراصل **اللہ کے سامنے تسلیم و بندگی کی روح** کا نام ہے، جبکہ ظاہری اعمال اس روح کے آثار و نتائج ہیں۔ اعمال کی قدر و قیمت بھی اسی روح اور حقیقت پر منحصر ہے جو ان کے اندر موجود ہونی چاہیے۔ اگر ان میں دین کی یہ حقیقت موجود نہ ہو تو ان کے ظاہری افعال محض بے روح صورتیں رہ جاتے ہیں، جن کی کوئی حقیقی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

دیندار شخص کے گناہ اور بے دین شخص کی نیکی کا تقابل

تقابل کے اعتبار سے، ایسا دیندار شخص جس کے تمام اعمال اچھے اور قابلِ تعریف نہ ہوں، اس شخص سے بہتر اور زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے جو دین سے محروم ہو، اگرچہ بظاہر اس کے بعض اعمال اچھے اور پسندیدہ دکھائی دیتے ہوں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے شخص کے اندر **حقیقتِ دین** کا ایک حصہ موجود ہے، جبکہ دوسرے شخص کے اعمال، بظاہر نیک ہونے کے باوجود، صرف نیکی کی ظاہری صورت رکھتے ہیں؛ ان کے پسِ پشت اللہ کے سامنے بندگی اور تسلیم کی وہ روح موجود نہیں ہوتی۔

ظاہری طور پر اچھے اعمال کے ذریعے اللہ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اصل اہمیت **معرفت اور قلبی تسلیم** کی ہے، اور تمام اعمال کو اسی معرفت سے جنم لینا چاہیے۔ جب اعمال معرفت سے پیدا ہوتے ہیں تو ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کی باطنی معرفت مزید بڑھتی اور مستحکم ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ معرفت موجود نہ ہو تو ان اعمال کی کوئی حقیقی قدر باقی نہیں رہتی اور وہ بارگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوتے۔

اسی لیے امیر المؤمنینؑ نے ہمیں متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

اَیُّھَا النّاسُ! دینَکُم! دینَکُم! تَمَسَّکُوا بِهِ. وَ لا یَزِیلَنَّکُم وَ لا یُرَدَّنَّکُم اَحَدٌ عَنهُ. لِاَنَّ السَّیِّئَةَ فیهِ خَیرٌ مِنَ الحَسَنَةِ فی غَیرِهِ. لِاَنَّ السَّیِّئَةَ فیهِ تُغفَرُ وَ الحَسَنَةُ فی غَیرِهِ لا تُقبَلُ.

''اے لوگو! اپنے دین کی حفاظت کرو! اپنے دین کی حفاظت کرو! اسے مضبوطی سے تھامے رکھو۔ کوئی شخص تمہیں اس سے ہٹا نہ دے اور نہ ہی تمہیں اس سے پھیر دے۔

کیونکہ دین کے اندر رہتے ہوئے سرزد ہونے والی برائی، دین سے باہر رہ کر انجام دی جانے والی نیکی سے بہتر ہے؛ اس لیے کہ دین کے اندر سرزد ہونے والی برائی بخش دی جاتی ہے، جبکہ دین سے باہر انجام دی جانے والی نیکی قبول نہیں ہوتی۔''

(معانی الاخبار، ص185–186۔)

حَسَنَہ اس عمل کو کہا جاتا ہے جو اپنی ذات میں اچھا اور قابلِ تعریف ہو، اس سے قطعِ نظر کہ اسے انجام دینے والے کی نیت کیا ہے۔ اسی طرح **سَیِّئة** اس عمل کو کہا جاتا ہے جو اپنی ذات میں برا اور قابلِ مذمت ہو، خواہ اسے انجام دینے والے کی اندرونی نیت کچھ بھی ہو۔ دیندار شخص وہ ہے جو اللہ کی بندگی کے راستے پر گامزن ہو اور جس کے نیک اعمال اپنے پروردگار کی ربوبیت کے سامنے تسلیم و اطاعت کی روح کے مظہر ہوں۔

اگر ایسا شخص کسی سیّئہ اور گناہ کا مرتکب ہو جائے تو حقیقت میں اس نے اپنے فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے۔ اللہ نے اپنے فضل و رحمت سے ایسے گناہ کے لیے مغفرت اور بخشش کا وعدہ فرمایا ہے۔

ایسا شخص اپنی **ایمانی و دینی شخصیت** کے اعتبار سے اللہ کا محبوب ہوتا ہے، اگرچہ اس سے سرزد ہونے والا گناہ بارگاہِ الٰہی میں مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔

اس کے برعکس، وہ شخص جو دین سے محروم ہے، چونکہ اس نے اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا اور اس کی بندگی کے دروازے سے داخل نہیں ہوا، اس لیے وہ اپنی اس دینی محرومی کے اعتبار سے اللہ کی رضا سے دور ہے۔ اگر وہ کوئی اچھا عمل بھی انجام دے تو چونکہ وہ عمل اللہ کے سامنے تسلیم و بندگی سے پیدا نہیں ہوا، اس لیے بارگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوتا اور وہ حقیقی قدر و قیمت حاصل نہیں کرتا جو عملِ عبودیت کو حاصل ہوتی ہے۔

لہٰذا دیندار شخص کا گناہ **اپنی ذاتی حقیقت اور قباحت کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اپنے آخری انجام کے اعتبار سے** بے دین شخص کی نیکی سے بہتر قرار پاتا ہے۔ پہلے شخص کا گناہ اللہ کی بخشش کا مستحق ہو سکتا ہے، جبکہ دوسرے شخص کے اعمال، حقیقتاً اللہ کی اطاعت کے راستے میں انجام نہ پانے کی وجہ سے، قبولیت حاصل نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ انسان سے **بندگی** چاہتا ہے، اور یہ بندگی بالآخر **اہلِ بیتؑ کی ولایت کو قبول کرنے** میں متجلی ہوتی ہے۔

عبادات اور نیک اعمال اسی وقت حقیقی قدر و قیمت حاصل کرتے ہیں جب وہ اس راستے پر انجام پائیں۔ بصورتِ دیگر کوئی نیکی انسان کے لیے ایسا پائیدار فائدہ نہیں رکھتی جو اسے حقیقی سعادت تک پہنچا سکے۔

پس انسان کی حقیقی دینی شخصیت کی بنیاد محض اس کے اعمالِ عبادت نہیں، بلکہ اس کی **معرفت اور ولایت** ہے۔

اسی لیے اہلِ معرفت اپنی ایمانی و دینی شخصیت کے اعتبار سے اللہ کے محبوب ہوتے ہیں، اگرچہ ان کے برے اعمال کے بارے میں انہیں مغفرت کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ نے ان کے لیے بخشش کی راہیں قرار دی ہیں۔

اس کے برخلاف ولایت کا انکار کرنے والے اپنی اس محرومی کی وجہ سے رضائے الٰہی سے دور ہوتے ہیں، اور ان کے اچھے اعمال ان کی اس شخصیت کو، جو نورِ ایمان سے محروم ہے، تبدیل نہیں کر دیتے۔

انسان کی دینی شخصیت اور اس کے اعمال میں فرق

انسان کا آخری انجام —— سعادت یا شقاوت —— اس کے ایمان یا کفر پر منحصر ہے۔

اگر ایمان و دینداری کے اعتبار سے کسی شخص کی **دینی شخصیت** بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو تو وہ اہلِ نجات میں سے ہے، اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ ہلاکت کا شکار ہو گا۔ نیک اعمال انسان کے لیے اسی وقت فائدہ مند ہوتے ہیں جب خود انسان نیکی کے راستے پر قائم ہو۔ جب نیک اعمال اللہ کی بندگی کے راستے پر انجام پاتے ہیں تو اللہ انہیں قبول فرماتا ہے، اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان نے اہلِ بیتؑ کی ولایت قبول کی ہو۔ بصورتِ دیگر وہ اعمال اس راستے پر انجام نہیں پاتے جسے اللہ نے اپنی بندگی کے لیے مقرر فرمایا ہے، لہٰذا وہ قبول نہیں ہوتے۔

البتہ اہلِ ولایت سے سرزد ہونے والے گناہ ان کی روحانی اور باطنی شخصیت پر منفی اثر ڈالتے ہیں، بلکہ ممکن ہے کہ گناہوں کا تسلسل انہیں بندگی کے راستے سے ہی خارج کر دے۔ لیکن اگر معاملہ یہاں تک نہ پہنچے ـــــ یعنی مؤمن اپنے ایمان سے محروم نہ ہو ـــــ تو **اللہ کی ولایت اور سرپرستی کا دستِ کرم** اسے گناہ کی تاریکیوں میں ہمیشہ باقی نہیں رہنے دے گا۔ بالآخر اللہ اسے ان تاریکیوں سے نکال کر **توبہ اور مغفرتِ الٰہی کے نور** کی طرف لے آئے گا۔

البتہ یہ خصوصی ولایت اہلِ ایمان کے لیے ہے؛ یعنی ان لوگوں کے لیے جنہوں نے رسولِ خداؐ اور آپؐ کی پاکیزہ عترتؑ کی ولایت قبول کر کے خود کو ان عظیم ہستیوں کی ولایت و سرپرستی میں دے دیا ہے۔

عبداللہ بن ابی یعفور کہتے ہیں:

میں نے امام صادقؑ سے عرض کیا: ''میرا لوگوں سے بہت زیادہ میل جول اور لین دین رہتا ہے۔ مجھے ان لوگوں پر بڑا تعجب ہوتا ہے جو آپ کی ولایت نہیں رکھتے اور فلاں اور فلاں کو اپنا پیشوا مانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود امانت دار، سچے اور وعدے کے پابند ہوتے ہیں۔

دوسری طرف بعض ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے آپ کی ولایت قبول کی ہے، مگر ان میں وہ امانت داری، راست گوئی اور وفائے عہد نظر نہیں آتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟'' یہ سن کر امامؑ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، غصے کے عالم میں میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: **لا دینَ لِمَن دانَ اللهَ بِوِلایَةِ اِمامٍ جائِرٍ لَیسَ مِنَ اللهِ. وَ لا عَتَبَ عَلی مَن دانَ بِوِلایَةِ اِمامٍ عادِلٍ مِنَ اللهِ.**

''اس شخص کا کوئی دین نہیں جو ایسے ظالم امام کی ولایت کے ذریعے اللہ کی بندگی کرے جو اللہ کی جانب سے مقرر نہیں ہے؛ اور اس شخص پر کوئی ملامت نہیں جو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ عادل امام کی ولایت کے ذریعے اللہ کی بندگی کرے۔''

میں نے عرض کیا: ''ان کا کوئی دین نہیں، اور ان لوگوں پر کوئی ملامت نہیں؟'' امامؑ نے فرمایا: ''ہاں! ان کا کوئی دین نہیں، اور ان لوگوں پر کوئی ملامت نہیں۔'' پھر فرمایا:

اَلا تَسمَعُ لِقَولِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: «اللهُ وَلِیُّ الَّذینَ آمَنُوا یُخرِجُهُم مِنَ الظُّلُماتِ اِلَی النُّورِ»؟ یَعنی مِن ظُلُماتِ الذُّنُوبِ اِلَی نُورِ التَّوبَةِ وَ المَغفِرَةِ؛ لِوِلایَتِهِم کُلَّ اِمامٍ عادِلٍ مِنَ اللهِ. وَ قالَ: «وَ الَّذینَ کَفَرُوا اَولِیاؤُهُمُ الطّاغُوتُ یُخرِجُونَهُم مِنَ النُّورِ اِلَی الظُّلُماتِ». اِنَّما عَنی بِهذا اَنَّهُم کانُوا عَلی نُورِ الاِسلامِ، فَلَمّا اَن تَوَلَّوا کُلَّ اِمامٍ جائِرٍ لَیسَ مِنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ، خَرَجُوا بِوِلایَتِهِم اِیّاهُ مِن نُورِ الاِسلامِ اِلی ظُلُماتِ الکُفرِ فَاَوجَبَ اللهُ لَهُمُ النّارَ مَعَ الکُفّارِ. «فَاُولئِکَ اَصحابُ النّارِ هُم فیها خالِدُونَ.«

''کیا تم اللہ عزوجل کا یہ فرمان نہیں سنتے:

'اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے؛ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔'

یعنی گناہوں کی تاریکیوں سے توبہ اور مغفرت کے نور کی طرف؛ اور یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہر عادل امام کی ولایت قبول کی ہے۔

اور اللہ نے فرمایا:

'اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا، ان کے اولیاء طاغوت ہیں، جو انہیں نور سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔'

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اسلام کے نور پر تھے، لیکن جب انہوں نے ایسے ظالم امام کی ولایت اختیار کی جو اللہ عزوجل کی طرف سے مقرر نہیں تھا، تو اس کی ولایت قبول کرنے کے سبب وہ اسلام کے نور سے نکل کر کفر کی تاریکیوں میں چلے گئے۔ پس اللہ نے ان کے لیے کافروں کے ساتھ آگ کو لازم قرار دیا:

'یہی لوگ اہلِ آتش ہیں اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔''

)الکافی، ج 1، ص 375، کتاب الحجۃ، باب فی من دان اللہ عزوجل بغیر امام من اللہ جل جلالہ، حدیث 3؛ قرآن، 2:257۔(

یہ روایت صراحت کے ساتھ ان لوگوں کی بے دینی کو بیان کرتی ہے جو ولایت کا انکار کرتے ہیں، خواہ ان کے پاس بظاہر اچھے اعمال ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے برعکس، روایت یہ بھی واضح کرتی ہے کہ **اہلِ ولایت کی دینی شخصیت بذاتِ خود موردِ ملامت نہیں**؛ البتہ ان کے گناہ یقیناً قابلِ مذمت ہیں۔

دوسرے لفظوں میں، جب تک وہ ایمان پر قائم ہیں، ان کی دینی شخصیت اپنی قدر و قیمت برقرار رکھتی ہے۔

ان کے ناپسندیدہ اعمال اور بری صفات کی مذمت کی جائے گی، لیکن ان کی ولایت اور ایمان کی مذمت نہیں کی جاسکتی۔

اہلِ معرفت اپنی ایمانی شخصیت کے اعتبار سے نیک ہیں، اگرچہ ان کے بعض اعمال برے ہو سکتے ہیں۔

اس کے برعکس، منکرین اپنی دینی محرومی کے اعتبار سے برے ہیں، اگرچہ ان کے بعض اعمال اچھے ہو سکتے ہیں۔

یعنی ان کے اچھے عمل کی، اچھا ہونے کی حیثیت سے، تحسین کی جاسکتی ہے؛ لیکن ان کی دینی روش کی مذمت ہو گی، کیونکہ وہ اللہ کی مقرر کردہ راہِ بندگی پر گامزن نہیں ہیں۔

ائمہؑ کی ولایت کی برکت سے اہلِ ایمان کی نجات

گناہوں کی تاریکی

اہلِ ایمان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر گناہوں کی وجہ سے ان کا نامۂ اعمال سیاہ بھی ہو جائے تو اللہ انہیں ان کے حال پر نہیں چھوڑے گا، بلکہ ان کی پاکیزگی کے لیے اسباب فراہم فرمائے گا:

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذینَ آمَنُوا یُخرِجُهُم مِنَ الظُّلُماتِ اِلَی النُّورِ.

''اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے؛ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔''

(قرآن، 2:257)

امام صادقؑ نے یہاں **''تاریکیوں''** سے مراد گناہوں کی تاریکیاں بیان فرمائی ہیں۔ آپؑ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا:

یَعنی مِن ظُلُماتِ الذُّنُوبِ اِلَی نُورِ التَّوبَةِ وَ المَغفِرَةِ.

''یعنی گناہوں کی تاریکیوں سے توبہ اور مغفرت کے نور کی طرف۔''

حقیقت یہ ہے کہ گناہ انسان کے قلب و روح کو آلودہ اور تاریک کر دیتے ہیں۔

اسی امام صادقؑ سے روایت ہے:

اِذا اَذنَبَ الرَّجُلُ خَرَجَ فی قَلبِهِ نُکتَةٌ سَوداءُ فَاِن تابَ انمَحَت وَ اِن زادَ زادَت حَتّی تَغلِبَ عَلی قَلبِهِ فَلا یُفلِحُ بَعدَها اَبَداً.

''جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو وہ مٹ جاتا ہے، لیکن اگر وہ گناہوں میں اضافہ کرتا رہے تو وہ سیاہی بھی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ پورے دل پر غالب آ جاتی ہے؛ پھر اس کے بعد وہ کبھی فلاح نہیں پاتا۔''

(اصول الکافی، ج 2، ص 271، کتاب الایمان والکفر، باب الذنوب، حدیث 13۔)

گناہ انسانی دل کو سیاہ اور تاریک بناتے ہیں۔ اگر انسان توبہ نہ کرے اور گناہوں کا سلسلہ جاری رکھے تو بالآخر یہ تاریکی پورے دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور سعادت کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انسان اپنا ایمان کھو بیٹھتا ہے اور بے دینی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

امام محمد باقرؑ نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

ما مِن عَبدٍ اِلّا وَ فی قَلبِهِ نُکتَةٌ بَیضاءُ. فَاِذا اَذنَبَ ذَنباً، خَرَجَ فِی النُّکتَةِ نُکتَةٌ سَوداءُ. فَاِن تابَ، ذَهَبَ ذلِکَ السَّوادُ. وَ اِن تَمادی فِی الذُّنُوبِ، زادَ ذلِکَ السَّوادُ حَتّی یُغَطِّیَ البَیاضَ. فَاِذا غُطِّیَ البَیاضُ، لَم یَرجِع صاحِبُهُ اِلی خَیرٍ اَبَداً. وَ هُوَ قَولُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: «کَلّا بَل رانَ عَلی قُلُوبِهِم ما کانُوا یَکسِبُونَ.«

”کوئی بندہ ایسا نہیں جس کے دل میں ایک سفید نقطہ نہ ہو۔

جب وہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس سفید نقطے پر ایک سیاہ نقطہ نمودار ہو جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو وہ سیاہی دور ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر وہ گناہوں پر اصرار اور مداومت کرتا رہے تو وہ سیاہی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ سفیدی کو مکمل طور پر ڈھانپ لیتی ہے۔ اور جب سفیدی پوری طرح ڈھک جائے تو ایسا شخص پھر کبھی خیر کی طرف واپس نہیں آتا۔

یہی اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

»كَلّا بَل رانَ عَلى قُلُوبِهِم ما كانُوا يَكسِبُونَ«

‘ہر گز نہیں! بلکہ جو کچھ وہ کماتے رہے، اسی نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے۔’”

(قرآن، 14:83؛ اصول الکافی، ج2، ص273، کتاب الایمان والکفر، باب الذنوب، حدیث 20۔)

پس ہر گناہ اپنی نوعیت اور درجے کے مطابق انسانی دل کو کسی نہ کسی حد تک آلودہ اور تاریک کر دیتا ہے۔ اگر انسان توبہ نہ کرے اور گناہوں پر قائم رہے تو بالآخر یہ تاریکی پورے دل کو گھیر لیتی ہے اور اس کی سعادت کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔

اہلِ جنت کی پاکیزگی

ہم یہ جان چکے ہیں کہ ہر گناہ اپنے درجے کے مطابق انسانی دل کو تاریک کر دیتا ہے، اور **آلودہ دل رکھنے والا انسان جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔**

لہٰذا جب تک گناہوں سے پیدا ہونے والی آلودگی کے آثار انسان کے دل سے دور نہ ہو جائیں، وہ بالآخر عاقبتِ خیر اور دخولِ جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

الذُّنُوبُ كُلُّها شَديدَةٌ. وَ اَشَدُّها ما نَبَتَ عَلَيهِ اللَّحمُ وَ الدَّمُ. لِاَنَّهُ اِمّا مَرحُومٌ وَ اِمّا مُعَذَّبٌ. وَ الجَنَّةُ لا يَدخُلُها اِلّا طَيِّبٌ.

''تمام گناہ سخت ہیں، اور ان میں سب سے زیادہ سخت وہ گناہ ہیں جن پر انسان کا گوشت اور خون پروان چڑھے؛ کیونکہ ایسا شخص یا تو موردِ رحمت قرار پائے گا یا عذاب میں مبتلا ہوگا، اور جنت میں صرف پاکیزہ شخص ہی داخل ہوگا۔''

)اصول الکافی، ج2، ص270، کتاب الایمان والکفر، باب الذنوب، حدیث 7۔(

اس نورانی روایت میں چند بنیادی نکات کی طرف تاکید کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے۔

اوّل: تمام گناہ سنگین ہیں

تمام گناہ بلا استثناء سنگین ہیں۔

گناہ کی سنگینی اس کی قباحت اور اس پر مرتب ہونے والے عذاب کی شدت کی وجہ سے ہے۔ پروردگار کی نافرمانی، خواہ کسی بھی صورت اور کسی بھی درجے میں ہو، نہایت قبیح امر ہے۔

اگر انسان گناہ کی حقیقی قباحت کو سمجھ لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ ایک گناہ کا ارتکاب بھی انسان کو اللہ کے عذاب کا مستحق بنا دیتا ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض گناہوں کو **کبیرہ** اور بعض کو **صغیرہ** کہا جاتا ہے، لیکن یہ تقسیم گناہوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تقابل کے اعتبار سے ہے۔

ورنہ ہر گناہ اپنی ذات میں ـــــ دوسرے گناہوں کے ساتھ تقابل سے قطعِ نظر ـــــ نہایت قبیح ہے، کیونکہ وہ پروردگارِ کریم و رحیم کی نافرمانی ہے اور اسی بنا پر انسان کو عذاب کا مستحق بناتا ہے۔

دوم: وہ گناہ جن پر گوشت اور خون پروان چڑھے

تمام گناہوں میں وہ گناہ زیادہ سخت اور سنگین ہیں جن پر انسان کا **گوشت اور خون پروان چڑھتا ہے۔**

اگر کسی شخص کی روزی حرام ذرائع سے حاصل ہوتی ہو، یا وہ اپنے واجب مالی حقوق ـــــ مثلاً **خمس** ـــــ ادا نہ کرتا ہو، یا اس کے مال میں **مظالم العباد، یعنی دوسرے لوگوں کے حقوق** شامل ہوں، تو ان تمام صورتوں میں اس کی پرورش حرام مال سے ہو رہی ہے اور اس کا گوشت و خون حرام پر پروان چڑھ رہا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی گناہ یا متعدد گناہوں پر مسلسل اصرار کرے اور طویل عرصے تک ان میں مبتلا رہے تو یہ بھی اس مفہوم کا ایک مصداق ہے کہ اس کا گوشت اور خون حرام پر پروان چڑھ رہا ہے۔

امام باقرؑ کے فرمان کے مطابق ایسے گناہ زیادہ شدید ہیں، کیونکہ وہ انسان کی روحانی آلودگی پر زیادہ گہرا اور پائیدار اثر ڈالتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، وہ دوسرے گناہوں کی نسبت انسان کے قلب کو زیادہ تاریک اور آلودہ کر دیتے ہیں۔

سوم: گناہوں کے آثار سے پاک ہونے کے دو راستے

انسان کے لیے گناہوں کے برے آثار سے پاک ہونے کی دو صورتیں ہیں:

یا اللہ گناہگار کو معاف فرمادے اور اسے اپنی رحمت کے دامن میں لے لے، یا پھر انسان مختلف قسم کے عذاب اور تکالیف سے گزر کر ان گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو۔

گناہ جتنے زیادہ اور سنگین ہوں، ان کے آثار کا ازالہ بھی اتنا ہی دشوار ہو گا؛ اور اسی مناسبت سے انسان کو درپیش عذاب بھی زیادہ سخت ہو سکتا ہے۔

البتہ جس مقدار میں اللہ انسان کے گناہوں کو معاف اور بخش دیتا ہے، اسی مقدار میں ان گناہوں سے متعلق عذاب بھی اس سے دور ہو جاتا ہے۔

چہارم: جنت صرف پاکیزہ لوگوں کے لیے ہے

گناہگار انسان کے لیے مغفرت یا تطہیر ضروری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ **گناہوں کی آلودگی سے پاک ہوئے بغیر کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔**

اللہ نے جنت کو پاکیزہ لوگوں کے لیے مخصوص فرمایا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص گناہوں کی آلودگی اپنے ساتھ لیے ہوئے جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔

اس نورانی روایت سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ابدی سعادت تک پہنچنے کے لیے انسان کو **گناہوں کی تاریکی سے نکل کر مغفرتِ الٰہی کے نور میں داخل ہونا ضروری ہے۔**

یہ تبدیلی دو طریقوں سے ممکن ہے:

ایک راستہ بندے کے لیے خوشگوار، آسان اور مطلوب ہے، جبکہ دوسرا راستہ ناگوار اور دشوار ہے۔

انسان کے لیے سب سے بہترین اور پسندیدہ صورت یہ ہے کہ اللہ اپنے فضل و رحمت سے اس کے تمام گناہوں کو معاف فرمادے اور اسے کسی گناہ کے سبب عذاب سے گزرنا نہ پڑے۔

لیکن اگر ایسا نہ ہو تو جنت تک پہنچنے کا باقی رہ جانے والا راستہ یہی ہے کہ انسان اللہ کی جانب سے مقرر کردہ مختلف عذابوں اور تطہیری مراحل سے گزر کر گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو جائے۔

مؤمن اور کافر کی موت کی مختلف صورتیں

امام صادقؑ سے سوال کیا گیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی ایک کافر کی موت بہت آسانی سے واقع ہو جاتی ہے اور بعض مؤمنین بھی آسانی سے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، جبکہ دوسری طرف بعض مؤمنین اور کفار دونوں کو موت کے وقت شدید سختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں سوال یہ تھا کہ کیا ایمان اور کفر بذاتِ خود موت کی آسانی یا سختی کا سبب ہیں؟ امام صادقؑ نے جواب میں فرمایا:

ما کانَ مِن راحَةٍ لِلمُؤمِنِ هُناکَ فَهُوَ عاجِلُ ثَوابِهِ. وَ ما کانَ مِن شَديدَةٍ، فَتَمحيصُهُ مِن ذُنُوبِهِ لِيَرِدَ الآخِرَةَ نَقِيّاً مُستَحِقّاً لِثَوابِ الاَبَدِ لا مانِعَ لَهُ دُونَهُ. وَ ما کانَ مِن سُهُولَةٍ هُناکَ عَلَى الکافِرِ، فَلِيُوَفّى اَجرَ حَسناتِهِ فِي الدُّنيا لِيَرِدَ الآخِرَةَ وَ لَيسَ لَهُ اِلّا ما يُوجِبُ عَلَيهِ العَذابَ. وَ ما کانَ مِن شِدَّةٍ عَلَى الکافِرِ هُناکَ، فَهُوَ ابتِداءُ عَذابِ اللهِ لَهُ بَعدَ نَفادِ حَسَناتِهِ. ذلِکُم بِاَنَّ اللهَ عَدلٌ لا يَجُورُ.

"مؤمن کو وہاں [موت کے وقت] جو آسودگی اور راحت نصیب ہوتی ہے، وہ اس کے ثواب کا ایک حصہ ہے جو اسے جلد عطا کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر اسے کوئی سختی پیش آئے تو وہ اس کے گناہوں سے پاک کرنے کا ذریعہ ہے، تاکہ وہ آخرت میں پاکیزہ ہو کر وارد ہو اور ابدی ثواب کا مستحق بنے، اور اس ثواب تک پہنچنے میں کوئی چیز اس کے لیے مانع باقی نہ رہے۔

اور کافر کو وہاں جو آسانی حاصل ہوتی ہے، وہ اس لیے ہے کہ اس کے نیک اعمال کا اجر اسی دنیا میں پورا کر دیا جائے، تاکہ جب وہ آخرت میں پہنچے تو اس کے لیے صرف وہی اعمال باقی رہیں جو اسے عذاب کا مستحق بناتے ہیں۔

اور کافر کو وہاں جو سختی پیش آتی ہے، وہ اس کے نیک اعمال کا بدلہ ختم ہو جانے کے بعد اس پر اللہ کے عذاب کا آغاز ہے۔

یہ سب اس لیے ہے کہ اللہ عادل ہے اور کسی پر ظلم نہیں کرتا۔"

)بحار الانوار، ج6، ص153، حدیث6، بحوالہ عیون اخبار الرضاؑ۔(

پس مؤمن کو موت کے وقت حاصل ہونے والی آسانی اس بات کا ایک مصداق ہے کہ اسے اپنے اعمال کا کچھ ثواب پہلے ہی عطا کر دیا گیا، جبکہ موت کے وقت پیش آنے والی سختی اس کے گناہوں سے **تطہیر** کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس طرح وہ آخرت میں پاک و پاکیزہ ہو کر داخل ہوتا ہے اور اس کے ابدی ثواب کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔

اس کے برخلاف، اگر کسی کافر کی موت آسانی سے واقع ہو تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے اچھے اعمال کا پورا بدلہ اسی دنیا میں اسے دے دیا جائے۔ پھر جب وہ آخرت میں پہنچے تو اس کے لیے صرف وہ اعمال باقی رہیں جو عذاب کا موجب ہیں۔ اور اگر کافر کو موت کے وقت سختی کا سامنا ہو تو وہ دراصل اس وقت اس پر عذابِ الٰہی کا آغاز ہے جب اس کے نیک اعمال کا بدلہ پہلے ہی پورا ہو چکا ہو۔

یہ تمام صورتیں اس حقیقت پر قائم ہیں کہ **اللہ عادل ہے اور کسی پر ظلم نہیں کرتا۔**

اسی بنا پر گناہ کرنے والے مؤمنین اپنے غلط اعمال کے بعض نتائج موت سے پہلے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسے کفار جنہوں نے اچھے اعمال انجام دیے ہوں، ان اعمال کا بدلہ انہیں اسی دنیا میں موت سے پہلے مل سکتا ہے۔ اگر ان کی نیکیاں زیادہ ہوں تو ممکن ہے کہ موت کی آسانی کے ذریعے ان نیکیوں کا باقی ماندہ بدلہ بھی پورا کر دیا جائے۔

لیکن جن کفار کو ان کے نیک اعمال کا پورا بدلہ موت سے پہلے ہی مل چکا ہو، ان کے لیے ایسی کوئی نیکی باقی نہیں رہتی جس کے بدلے ان کی موت آسان کر دی جائے۔ لہٰذا جان نکلتے وقت انہیں سختی کا سامنا ہو سکتا ہے۔

پس مؤمن اور کافر، دونوں کی موت آسان بھی ہو سکتی ہے اور سخت بھی، اور اس سلسلے میں ان کے نیک و بد اعمال کا اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا ایمان یا کفر کو تنہا اور براہِ راست موت کی آسانی یا سختی کا سبب نہیں سمجھنا چاہیے؛ بلکہ انسان کے اعمال بھی اس بات میں بنیادی کردار رکھتے ہیں کہ وہ موت کے مرحلے سے کس طرح گزرتا ہے۔

عالمِ برزخ (قبر) میں تطہیر

اب تک گناہگار مؤمنین کے گناہوں کی آلودگی سے پاک ہونے کے چار طریقوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان میں سے دو قسم کی تطہیر موت سے پہلے اسی دنیا میں واقع ہوتی ہے، جبکہ دو صورتیں قیامت کے مراحل سے متعلق ہیں۔

ان کے علاوہ تطہیر کی ایک اور صورت باقی رہتی ہے، جو موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کے عالم میں واقع ہوتی ہے۔ اسی کو **عالمِ قبر یا عالمِ برزخ** کہا جاتا ہے۔

رسولِ خداؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

فَإِن بَقِيَ شَيءٌ أُتِيَ بِهِ وَ لَمّا يُلحَد فَيُوضَعُ فَيَتَفَرَّقُونَ عَنهُ فَيُطَهَّرُ.

"پھر اگر [اس کے گناہوں کی آلودگی میں سے] کچھ باقی رہ جائے تو اسے لایا جاتا ہے، ابھی اسے قبر میں دفن بھی نہیں کیا گیا ہوتا؛ پھر اسے قبر میں رکھا جاتا ہے اور جب لوگ اسے چھوڑ کر منتشر ہو جاتے ہیں تو اسے پاک کیا جاتا ہے۔"

(بحار الانوار، ج 68، ص 154، حدیث 11، بحوالہ تفسیر امام حسن عسکریؑ)

جب انسان دنیا سے رخصت ہوتا ہے، اگر دنیا کی سختیوں کے ذریعے پہلے ہی مکمل طور پر پاک نہ ہو چکا ہو تو اس کی برزخی تطہیر اور سزاؤں کا آغاز دفن ہونے سے پہلے بھی ہو سکتا ہے۔ دفن کیے جانے کے بعد یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے، یہاں تک کہ قیامت کے آغاز سے پہلے وہ اپنے گناہوں کی آلودگی سے مکمل طور پر پاک ہو جائے، یا کم از کم اس آلودگی کا کچھ حصہ قیامت سے پہلے ہی دور کر دیا جائے۔

عذابِ برزخ کی دو مثالیں

اس موضوع سے متعلق قرآنی آیات اور روایات کا ذکر کرنے سے پہلے، دفن سے قبل عذابِ برزخ کے بارے میں دو واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔

پہلا واقعہ جلیل القدر عالم اور عظیم محدث مرحوم شیخ عباس قمیؒ نے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ایک روز میں نجفِ اشرف کے وادی السلام میں قبور کی زیارت اور ارواحِ مؤمنین کی زیارت کے لیے گیا ہوا تھا۔ اچانک جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے کچھ فاصلے پر مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی اونٹ کو گرم لوہے سے داغا جا رہا ہو۔ وہ اس قدر دردناک انداز میں چیخ اور کراہ رہا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی فریاد سے وادی السلام کی پوری زمین لرز رہی ہو۔ میں جلدی سے اس طرف بڑھا تاکہ اس اونٹ کو نجات دلاؤں۔ لیکن جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہاں کوئی اونٹ نہیں تھا، بلکہ ایک میت کو دفن کرنے کے لیے لایا گیا تھا اور وہ ہولناک چیخیں اسی میت سے آ رہی تھیں۔

مگر اسے دفن کرنے والے لوگ ان آوازوں سے بالکل بے خبر تھے اور نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے۔)'' معادشناسی، ج 1، ص 137–138۔(

دوسرا واقعہ نجفِ اشرف کے ایک عظیم عالم، مرحوم آیت اللہ سید جمال الدین گلپایگانیؒ سے متعلق ہے۔ جوانی کے زمانے میں آپ اصفہان میں زیرِ تعلیم تھے اور مرحوم آیت اللہ العظمیٰ حاج آقا حسین بروجردیؒ کے ہم درس اور مباحثہ کے ساتھی تھے۔ ان سے نقل کیا گیا ہے:

''جوانی کے زمانے میں جب میں اصفہان میں تھا، اخلاق اور سیر و سلوک کے دو بزرگ اساتذہ، مرحوم آخوند کاشیؒ اور جہانگیر خانؒ، میرے استاد اور مربی تھے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ جمعرات اور جمعہ کی راتوں میں اصفہان سے باہر **تختِ فولاد** کے قبرستان جایا کروں، وہاں کچھ وقت موت اور عالمِ ارواح کے بارے میں غور و فکر کروں، کچھ عبادت انجام دوں اور صبح واپس آ جاؤں۔

میرا معمول یہ تھا کہ جمعرات اور جمعہ کی رات وہاں جاتا، ایک دو گھنٹے قبروں اور مقبروں کے درمیان چلتے ہوئے غور و فکر کرتا، پھر چند گھنٹے آرام کرتا۔ اس کے بعد اٹھ کر نمازِ شب اور مناجات میں مشغول ہوتا، نمازِ صبح ادا کرتا اور پھر اصفہان واپس آجاتا۔

سردیوں کی ایک رات سخت سردی تھی اور برف باری ہو رہی تھی۔ میں اصفہان سے نکلا اور عالمِ ارواح اور اس عالم کے رہنے والوں کے بارے میں غور و فکر کرنے کے لیے تختِ فولاد پہنچا۔ وہاں ایک حجرے میں داخل ہوا اور ارادہ کیا کہ اپنا بقچہ کھول کر چند لقمے کھالوں، پھر تقریباً آدھی رات تک سو جاؤں اور اس کے بعد اٹھ کر ان عبادات میں مشغول ہو جاؤں جن کی مجھے ہدایت کی گئی تھی۔

اسی وقت مقبرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مقبرے کے مالک کے کسی رشتہ دار کی میت اصفہان سے لائی گئی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ میت رات بھر وہیں رہے، مقبرے کا قرآن خواں اس کے پاس قرآن پڑھتا رہے، اور صبح آکر اسے دفن کر دیں۔ وہ میت وہاں رکھ کر چلے گئے اور قرآن خواں اس کے پاس بیٹھ کر تلاوت کرنے لگا۔

میں نے ابھی اپنا بقچہ کھولا ہی تھا اور کھانا کھانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا **عذاب کے فرشتے آئے اور اس میت کو عذاب دینے لگے** —— یہ خود اس بزرگ کے الفاظ ہیں۔

وہ اس کے سر پر آگ کے گرز اس شدت سے مار رہے تھے کہ ان سے شعلے آسمان کی طرف بلند ہو رہے تھے۔ مردے کی ایسی چیخیں بلند ہو رہی تھیں گویا پورا وسیع قبرستان لرز رہا ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے کون سا گناہ کیا تھا....

لیکن قرآن پڑھنے والا شخص اس پورے منظر سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ اطمینان سے میت کے پاس بیٹھا قرآن کی تلاوت میں مصروف رہا۔

یہ منظر مجھ پر اس قدر گراں گزرا کہ میرا پورا جسم کانپنے لگا اور چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے مقبرے کے نگہبان کو اشارہ کیا کہ دروازہ کھول دے، میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ وہ میری بات نہ سمجھ سکا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی مگر میری زبان بند ہو چکی تھی اور حرکت نہیں کر رہی تھی۔

بالآخر بڑی مشکل سے میں اسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ دروازے کی کنڈی کھول دے کیونکہ میں وہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: "آقا! سخت سردی ہے، زمین برف سے ڈھکی ہوئی ہے اور راستے میں بھیڑیے ہیں، وہ آپ کو پھاڑ ڈالیں گے۔" میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں یہاں کسی صورت ٹھہر نہیں سکتا، مگر وہ میری کیفیت نہ سمجھ سکا۔ آخر کار میں خود کو گھسیٹتے ہوئے دروازے تک لے گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میں باہر نکل آیا۔

اگرچہ اصفہان کا فاصلہ بہت زیادہ نہ تھا، لیکن میں انتہائی دشواری سے وہاں پہنچا اور راستے میں کئی مرتبہ زمین پر گر پڑا۔ جب اپنے کمرے میں پہنچا تو پورا ایک ہفتہ بیمار رہا۔ مرحوم آخوند کاشیؒ اور جہانگیر خانؒ میرے کمرے میں آتے، میری دل جوئی کرتے اور دوا دیتے۔ جہانگیر خانؒ تو میرے لیے کباب بھی تیار کرتے اور اصرار کر کے مجھے کھلاتے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ میری کچھ قوت بحال ہوئی۔" (معاد شناسی، ج 1، ص 140–142۔)

برزخ میں اپنے شیعوں کے بارے میں ائمہؑ کی تشویش

اہلِ بیتؑ سے منقول روایات کے مطابق اہلِ ایمان کے بارے میں ان کی خاص تشویش **قبر اور عالمِ برزخ** کی حالت سے متعلق ہے۔

ایک راوی نقل کرتا ہے کہ امام باقرؑ نے فرمایا:

وَ اللهِ اَتَخَوَّفُ عَلَیکُم فِی البَرزَخِ.

"خدا کی قسم! مجھے تمہارے بارے میں برزخ کا خوف ہے۔"

آپؑ سے پوچھا گیا: "برزخ کیا ہے؟"

امامؑ نے فرمایا:

اَلقَبرُ مُنذُ حینَ مَوتِهِ اِلی یَومِ القِیامَةِ.

"قبر؛ انسان کی موت کے لمحے سے لے کر قیامت کے دن تک۔"

)الکافی، ج3، ص242، حدیث 3۔(

امامؑ کا اپنے شیعوں کے برزخ کے بارے میں تشویش کا اظہار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اہلِ ایمان کے گناہوں کے آثار و نتائج بالخصوص عالمِ قبر میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔

چونکہ قیامت کا عذاب زیادہ شدید اور دشوار ہے، اس لیے اللہ نے یہ چاہا ہے کہ اہلِ ایمان اپنے گناہوں کے بعض نتائج برزخ ہی میں برداشت کر کے پاک ہو جائیں، تاکہ قیامت کے دن انہیں عذابِ الٰہی کا نسبتاً کم سامنا کرنا پڑے۔

مزید یہ کہ عالمِ برزخ میں اہلِ بیتؑ کی شفاعت اس وسعت کے ساتھ جاری نہیں ہوتی جس طرح قیامت کے دن ہو گی۔ اگرچہ اللہ نے انہیں برزخ میں بھی وسیع شفاعت کی قدرت اور اجازت عطا فرمائی ہے، لیکن خود ان کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر میں وہ اہلِ ولایت کی اسی عمومی انداز اور اسی وسعت کے ساتھ دستگیری نہیں فرماتے جس طرح قیامت کے دن فرمائیں گے۔ اسی لیے انہوں نے مؤمنین کو برزخ میں گناہوں کے نتیجے میں پیش آنے والے عذاب کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے متنبہ فرمایا ہے۔

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

وَ اللهِ ما اَخافُ عَلَیکُم اِلّا البَرزَخَ. فَاَمّا اِذا صارَ الاَمرُ اِلَینا، فَنَحنُ اَولی بِکُم.

"خدا کی قسم! مجھے تمہارے بارے میں صرف برزخ کا خوف ہے؛ لیکن جب معاملہ ہمارے پاس آجائے گا تو ہم تمہارے زیادہ حق دار ہوں گے۔") بحار الانوار، ج6، ص214، حدیث 2، بحوالہ تفسیر قمی۔(

امامؑ کے فرمان »**اِذا صارَ الاَمرُ اِلَینا**" — «جب معاملہ ہمارے پاس آجائے گا"— کا مطلب یہ نہیں کہ ائمہؑ عالمِ برزخ میں اپنے شیعوں کے حالات کی دیکھ بھال یا ان کے امور میں تصرف کی قدرت نہیں رکھتے۔

کسی بھی عالم میں اپنی ولایت کے اعمال سے وہ عاجز نہیں ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ **نظامِ الٰہی اور ائمہؑ کی مشیت — جو مشیتِ الٰہی کے ساتھ مکمل ہم آہنگ ہے — عمومی طور پر یہی ہے کہ اہلِ ایمان عالمِ برزخ میں اپنے نیک و بد اعمال کے نتائج سے گزریں۔**

عالمِ برزخ میں اہلِ بیتؑ کی شفاعت

برزخ میں انسان کا اپنے گناہوں کے آثار و نتائج سے گزرنا ایک **عمومی قاعدہ** ہے جسے خود ائمہؑ نے بیان فرمایا ہے۔ لہٰذا عالمِ برزخ میں اہلِ بیتؑ کی شفاعت کو اس عمومی قاعدے سے ایک **استثنائی صورت** کے طور پر سمجھنا چاہیے۔

برزخ میں اہلِ بیتؑ کی شفاعت اور دستگیری کی ایک مثال مرحوم ملا ابوالحسن مازندرانیؒ سے منقول درج ذیل واقعہ ہے:

"میرا ایک عالم اور صالح دوست تھا جس کا نام ملا جعفر تھا۔ وہ عالمِ صالح ملا محمد حسین کے فرزند تھے، مازندران سے تعلق رکھتے اور وہیں رہتے تھے۔

جس سال ہیضے کی ایک شدید وبا پھیلی اور بہت سے لوگ اس کا شکار ہو گئے، ملا جعفر کے شہر کے بہت سے لوگ ان سے پہلے وفات پا گئے اور اپنی املاک کے سلسلے میں انہیں وصی مقرر کر گئے۔ انہوں نے وہ تمام اموال اپنی تحویل میں لے لیے، لیکن ابھی ان اموال کو ان کے شرعی مصارف میں تقسیم نہیں کر پائے تھے کہ خود بھی ہیضے میں مبتلا ہو کر وفات پا گئے، اور وہ تمام اموال ضائع ہو گئے۔

ملا ابوالحسن کہتے ہیں:

ایک سال مجھے مقدس مشاہد کی زیارت اور ہمارے مولا ابوعبداللہ الحسینؑ کے روضۂ اقدس کے جوار میں قیام کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایک رات خواب میں میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کی گردن میں لوہے کی زنجیر پڑی ہوئی تھی اور اس زنجیر سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دو آدمیوں نے زنجیر کے دونوں سرے پکڑ رکھے تھے۔ اس شخص کی زبان منہ سے باہر نکلی ہوئی اور سینے تک لٹک رہی تھی۔ اس نے دور سے مجھے دیکھا تو اپنے آپ کو میری طرف کھینچنے لگا۔ جب قریب آیا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ ملا جعفر ہیں۔ مجھے سخت تعجب ہوا۔

جیسے ہی انہوں نے مجھ سے کچھ کہنے اور مدد طلب کرنے کی کوشش کی، ان دونوں نے زنجیر کو پیچھے کی طرف کھینچا اور انہیں دور لے گئے، چنانچہ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔

دوسری مرتبہ وہ میرے قریب آئے، مگر پھر اسی طرح انہیں پیچھے کھینچ لیا گیا۔ تیسری مرتبہ بھی وہ میرے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوئے لیکن پھر کچھ کہنے کا موقع نہ مل سکا۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھ پر شدید خوف اور اضطراب طاری ہو گیا۔ میں زور سے چیخا اور میری آنکھ کھل گئی۔

میرے پاس ایک عالم سو رہے تھے۔ میری چیخ سے وہ بھی بیدار ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنا خواب سنایا۔ اس وقت مناجات کا وقت تھا اور حرم و صحن کے دروازے کھولے جا رہے تھے۔

میں نے کہا: ' چلیے حرمِ مطہر چلتے ہیں۔ زیارت کے بعد ملا جعفر کے لیے استغفار کریں۔ اگر میرا خواب سچا ہے تو شاید اللہ ان پر رحم فرمائے۔ ' ہم اٹھے اور ایسا ہی کیا۔

اس واقعے کے بعد تقریباً بیس سال گزر گئے اور مجھے ملا جعفر کی حالت کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی۔ میرا خیال تھا کہ خواب میں ان کی جو حالت میں نے دیکھی تھی وہ وبا کے زمانے میں لوگوں کے اموال سے متعلق کسی کوتاہی کے سبب تھی۔

پھر اللہ نے مجھے اپنے گھر کے حج کی سعادت عطا فرمائی۔ مناسکِ حج مکمل کرنے کے بعد جب ہم مدینہ واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے تو میں سخت بیمار ہو گیا اور چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی۔

جب ہم مدینہ پہنچے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ' مجھے غسل دو، میرے کپڑے تبدیل کرو اور مجھے رسولِ خداؐ کے حرمِ مطہر میں لے چلو۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں موت مجھے مہلت نہ دے اور میں اس سعادت سے محروم نہ رہ جاؤں۔ '

انہوں نے میری خواہش پوری کی۔

جیسے ہی میں روضۂ مبارک میں داخل ہوا، بے ہوش ہو گیا۔ انہوں نے مجھے ایک گوشے میں لٹا دیا اور اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ جب مجھے ہوش آیا تو انہوں نے مجھے اٹھایا اور ضریحِ مقدس کے قریب لے گئے۔ زیارت کے بعد مجھے ضریحِ مبارک کے پیچھے، صدیقۂ طاہرہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر کے قریب لے گئے، جو مقاماتِ زیارت میں سے ہے۔ میں وہاں بیٹھ گیا اور جس قدر ممکن تھا زیارت پڑھی۔ حضرت زہراؑ سے شفا طلب کی اور عرض کیا:

'ہم تک بہت سی روایات پہنچی ہیں کہ آپؑ اپنے فرزند حسینؑ سے کس قدر محبت فرماتی ہیں۔ میں ان کے روضۂ مبارک کے جوار میں رہتا ہوں۔ میں آپؑ سے انہی کے حق کا واسطہ دے کر شفا طلب کرتا ہوں۔'

پھر میں رسولِ خداؐ کی طرف متوجہ ہوا، اپنی حاجات آپؐ کے حضور پیش کیں اور اپنے ان دوستوں کے لیے شفاعت کی درخواست کی جو دنیا سے رخصت ہو کر زیرِ خاک جا چکے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے ان کے نام لیے۔

جب ملا جعفر کا نام آیا تو مجھے وہ پرانا خواب یاد آ گیا۔ میری کیفیت بالکل بدل گئی۔ میں نے نہایت گریہ وزاری اور عاجزی کے ساتھ رسولِ خداؐ سے درخواست کی کہ ملا جعفر کے لیے مغفرت طلب فرمائیں اور ان کی شفاعت فرمائیں۔

میں نے عرض کیا: 'بیس سال پہلے میں نے انہیں خواب میں نہایت دردناک حالت میں دیکھا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ خوابِ صادق تھا یا پریشان خواب۔'

میں نے ان کے لیے جس قدر ہو سکا دعا، تضرع اور التجا کی۔ اس کے بعد مجھے اپنے اندر ایک عجیب ہلکا پن اور راحت محسوس ہوئی۔ میں اٹھا اور گھر واپس آ گیا۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کی برکت سے میری بیماری اور کمزوری کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔

پھر میں مدینہ سے روانہ ہوا۔ اُحد —— مدینہ سے باہر واقع مشہور پہاڑ اور ہمارے سفر کی پہلی منزل —— پر ہم ایک دن ٹھہرے۔ میں نے شہدائے اُحد کی زیارت کی، پھر ایک گوشے میں لیٹ گیا اور سو گیا۔

خواب میں دیکھا کہ ملا جعفر میری طرف آ رہے ہیں۔ ان کا چہرہ خوش و خرم تھا۔ انہوں نے سفید لباس پہن رکھا تھا، سر پر عمامہ تھا جس کا ایک سرا ٹھوڑی کے نیچے سے گزرا ہوا تھا، اور ہاتھ میں عصا تھا۔

میرے قریب پہنچے تو سلام کیا اور کہا: 'آپ نے بھائی اور دوست ہونے کا حق خوب ادا کیا! دوست کو اپنے دوست کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس تمام مدت میں میں سختی، شدت، رنج اور مصیبت میں گرفتار رہا؛ لیکن ابھی آپ رسولِ خداؐ کے حرمِ مقدس میں اپنی جگہ سے اٹھے بھی نہیں تھے کہ مجھے عذاب سے نجات دے دی گئی۔

دو تین روز پہلے مجھے حمام لے گئے اور تمام آلودگیوں اور گندگیوں سے پاک کیا۔ رسولِ خداؐ نے میرے لیے یہ لباس بھیجا اور صدیقۂ طاہرہ حضرت فاطمہؑ نے یہ عبا مجھے عطا فرمائی۔

الحمدللہ! اب میری حالت اچھی ہو گئی ہے اور میرا انجام بخیر ہوا۔ اب میں آپ کو رخصت کرنے اور خوش خبری دینے آیا ہوں۔ مطمئن رہیے، آپ بخیریت اپنے گھر پہنچ جائیں گے اور آپ کے تمام اہلِ خانہ خیریت اور سلامتی سے ہیں۔'

میں شکر اور خوشی کی کیفیت میں خواب سے بیدار ہوا۔''

)مردگان باما سخن می گویند، ص 49–53، بحوالہ دار السلام، میرزا حسین نوریؒ۔(

یہ واقعہ اور اس جیسے دوسرے واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ رسولِ خداؐ اور اہلِ بیتؑ کی اللہ کی عطا کردہ قدرت و ولایت **عالمِ برزخ میں بھی مؤثر ہے، جس طرح دنیا اور قیامت میں ہے۔** جب مشیتِ الٰہی کے مطابق وہ ارادہ فرمائیں تو اپنے دوستوں کی دستگیری کر سکتے ہیں۔

البتہ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، برزخ میں ان کا عمومی طریقہ یہ نہیں کہ ہر مورد میں اس انداز سے مداخلت فرمائیں۔ اس عطا کردہ قدرت کا استعمال بعض خاص اور استثنائی حالات میں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل خواب بھی قابلِ توجہ ہے:

''حاج علاء الدین ایلخانی نے مصنف کو بھیجے گئے ایک نوٹ میں لکھا:

'جمعرات کی ایک رات مجھے حضرت عبد العظیمؑ کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ زیارت کے بعد جب میں حضرت عبد العظیمؑ کے صحنِ مقدس میں تھا تو میری نظر روضۂ مبارک کے ایوان کے سامنے نصب ایک بڑے سائبان پر پڑی۔ اس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

مجھے مرحوم حاج جعفر یاد آ گئے، کیونکہ اس سائبان کا خرچ انہوں نے **قربۃً إلی اللہ**، یعنی قربِ الٰہی کی نیت سے ادا کیا تھا۔ میں نے ان کی طرف سے زیارت کی اور سورۂ فاتحہ پڑھی، پھر گھر واپس آ گیا۔

اسی رات میں نے انہیں خواب میں دیکھا۔ میں ایک ایسے کمرے میں بیٹھا تھا جو کسی مذہبی مجلس کی جگہ معلوم ہوتا تھا، جہاں لوگ آ کر بیٹھ رہے تھے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ حاج جعفر دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے بدن پر انتہائی گندے اور پھٹے ہوئے کپڑے تھے۔

انہیں دیکھتے ہی مجھے یاد آیا کہ وہ تو وفات پا چکے ہیں۔ میں نے کہا: ''حاج جعفر! آپ کے کپڑے اتنے گندے اور پھٹے ہوئے کیوں ہیں؟''

انہوں نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر کہا: ''فلاں! خدا کے لیے میری مدد کرو! میں سخت مصیبت میں ہوں۔ جب تک میں لوگوں کے حقوق اور حسابات ادا نہیں کر دیتا، یہ لوگ مجھے کسی صورت نہیں چھوڑیں گے۔ میرے بیٹے مسعود سے ملو اور اس سے کہو کہ لوگوں کے حسابات چکا دے تاکہ مجھے یہاں سے نجات مل سکے۔''

میں نے اس طرح جواب دیا جیسے کسی زندہ شخص سے بات کر رہا ہوں: ''میں مسعود سے ملا تھا اور اس سے کہا تھا کہ میرا حساب بھی صاف کر دے اور آپ کے قرض بھی ادا کر دے۔ اس نے کہا کہ جب وراثت کی کارروائی مکمل ہو جائے گی تو میں والد صاحب کے قرض ادا کر دوں گا''....

اچانک حاج جعفر نے میری بات کاٹ کر کہا:

''اس سے کہنا کہ **یہاں وراثت کی کارروائی کو نہیں مانتے**''!

میں نے ان سے کہا:

''جایئے اور حضرت فاطمہ زہراؑ کا دامن تھام لیجیے۔''

کیونکہ دنیا میں انہیں حضرت زہراؑ اور ائمۂ طاہرینؑ سے بہت زیادہ محبت تھی۔

انہوں نے جواب دیا:

''کیا تم سمجھتے ہو کہ حضرت زہراؑ کوئی عام خاتون ہیں کہ میں بس جا کر ان کا دامن پکڑ لوں؟ کیا میں انہیں دیکھ بھی سکتا ہوں کہ ان سے مدد طلب کروں؟ اللہ کا مقام کس قدر بلند ہے! اور حضرت فاطمہ زہراؑ کا مقام اللہ کے مقام کے تحت کس قدر عظیم ہے''!

پھر انہوں نے کہا: ''میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں: **جب حقوق الناس کا معاملہ ہو تو اللہ کسی کی سفارش نہیں سنتا**''!

اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

اگلی صبح میں نے ان کے بیٹے مسعود کو فون کیا اور اس سے کہا کہ لوگوں کے واجب الادا حقوق ادا کرے۔ میرے تعاون سے اس کے والد کے قرضوں کا ایک حصہ ادا کر دیا گیا۔

اس خواب کے ایک سال بعد پھر ایک جمعرات کی رات میں نے حاج جعفر کو خواب میں دیکھا۔

اس مرتبہ انہوں نے نہایت عمدہ سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ ان کا چہرہ اور ظاہری حالت صاف ستھری تھی اور وہ دبلے ہو گئے تھے؛ جبکہ پہلے وہ بہت موٹے اور ناپسندیدہ حالت میں نظر آتے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا: ''فلاں! اللہ تمہیں جزائے خیر دے! تم نے میری بہت بڑی مدد کی۔''''(مردگان باما سخن می گویند، ص70–72۔)

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اہلِ بیتؑ تک رسائی نصیب ہو جائے اور مشیتِ الٰہی کے تحت وہ اس کی شفاعت کا ارادہ فرمائیں تو وہ عالمِ برزخ کے کسی بھی عذاب سے نجات پا سکتا ہے۔

لیکن چونکہ اللہ نے اسے عمومی قانون قرار نہیں دیا، اور اہلِ بیتؑ کبھی مشیتِ الٰہی کے برخلاف کوئی ارادہ نہیں فرماتے، اس لیے عالمِ برزخ میں گناہگار شیعوں کی اکثریت کو اپنے پیشواؤں کی ایسی براہِ راست دستگیری حاصل نہیں ہوتی۔ مرحوم ملا جعفر مازندرانیؒ جیسے واقعات کو اسی لیے **استثنائی موارد** سمجھنا چاہیے۔

البتہ قیامت کی صورت اس سے مختلف ہو گی۔ وہاں اہلِ بیتؑ کی شفاعت اہلِ ایمان کے لیے نہایت وسیع اور ہمہ گیر صورت اختیار کرے گی۔

اس کے باوجود، قیامت میں بھی یہ معین نہیں کیا گیا کہ ہر شخص کو شفاعت **کس مرحلے پر** حاصل ہو گی اور اس شفاعت کی **مقدار اور وسعت** کتنی ہو گی۔ کسی کو معلوم نہیں کہ قیامت کے طویل اور دشوار مراحل میں کس وقت اور کس حد تک اسے شفاعت نصیب ہو گی۔

یہاں تک کہ ممکن ہے بعض افراد تک شفاعت اس وقت پہنچے جب وہ جہنم کے عذاب میں **لاکھوں سال** گزار چکے ہوں۔

اس موضوع کی مزید تفصیل آئندہ مباحث میں بیان ہو گی۔

مؤمنین کے لیے فشارِ قبر

بہر حال، موت کے بعد اہلِ ایمان کو اپنے ہر گناہ کے آثار کا سامنا کرنا ہو گا اور مناسب مرحلے پر اپنے اعمال کے نتائج سے گزرنا ہو گا۔ اس کی ایک مثال رسولِ خداؐ کے صحابی **سعد بن معاذ** کا واقعہ ہے۔

جب رسولِ خداؐ کو سعد کی وفات کی خبر ملی تو آپؐ نے حکم دیا کہ انہیں غسل دیا جائے، اور خود ان کے غسل و کفن کے موقع پر تشریف فرما رہے۔ پھر آپؐ ان کے جنازے کے ساتھ اس حال میں روانہ ہوئے کہ پاؤں مبارک برہنہ تھے اور ردا کندھوں پر نہیں تھی۔

جنازے کے دوران رسولِ خداؐ کبھی جنازے کے دائیں جانب کو تھامتے اور کبھی بائیں جانب کو، یہاں تک کہ سعد کو قبر تک پہنچایا گیا۔ رسولِ خداؐ خود قبر میں اترے اور سعد کے جسم کو قبر میں رکھا۔ پھر فرمایا: ''مجھے پتھر اور مٹی دو۔''

آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے قبر پر رکھی گئی اینٹوں کے درمیان موجود خلا کو پُر کیا اور فرمایا:

إنّی لَاَعلَمُ أنَّهُ سَبیلی وَ یَصِلُ البِلی اِلَیهِ. وَ لکِنَّ اللهَ یُحِبُّ عَبداً اِذا عَمِلَ عَمَلاً اَحکَمَهُ.

''میں جانتا ہوں کہ [سعد کا جسم] بوسیدہ ہو جائے گا اور آخر کار فنا و فرسودگی اس تک پہنچے گی، لیکن اللہ اس بندے کو پسند کرتا ہے جو کوئی کام کرے تو اسے مضبوط اور درست طریقے سے انجام دے۔''

یعنی انسان اپنے کام کو لاپروائی، بے توجہی اور سطحی انداز سے انجام نہ دے، بلکہ اسے صحیح، محکم اور مکمل طور پر انجام دے۔

تدفین کے بعد سعد کی والدہ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا:

''اے سعد! تمہیں جنت مبارک ہو''!

رسولِ خداؐ نے ان سے فرمایا:

یا اُمَّ سَعدٍ، مَه! لا تَجزِمی عَلی رَبِّکِ. فَاِنَّ سَعداً قَد اَصابَتهُ ضَمَّةٌ.

''اے سعد کی ماں! ٹھہرو! اپنے پروردگار کے بارے میں اس قدر قطعی فیصلہ نہ کرو، کیونکہ سعد کو فشارِ قبر پہنچا ہے۔''

بعض روایات میں رسولِ خداؐ کے الفاظ اس طرح نقل ہوئے ہیں:

یا امَّ سعد، لا تَحتِمی علی الله.

دونوں تعبیرات کا مفہوم ایک ہی ہے۔

)بحار الانوار، ج6، ص261، حدیث102، بحوالہ الکافی۔(

اس کے بعد رسولِ خداؐ جنازے سے واپس تشریف لے گئے اور لوگ بھی آپؐ کے ساتھ لوٹے۔ انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہؐ! آج ہم نے آپ کو سعد کے لیے ایسے امور انجام دیتے دیکھا جو اس سے پہلے کسی دوسرے کے لیے نہیں دیکھے۔ آپ ان کے جنازے کے ساتھ برہنہ پا اور ردا کے بغیر چلے''!

رسولِ خداؐ نے فرمایا:

اِنَّ المَلائِکَةَ کانَت بِلا رِداءٍ وَ لا حِذاءٍ، فَتَأَسَّیتُ بِها.

''فرشتے بھی ردا اور جوتوں کے بغیر تھے، لہٰذا میں نے ان کی پیروی کی۔''

لوگوں نے عرض کیا: ''ہم نے یہ بھی دیکھا کہ آپؐ کبھی جنازے کے دائیں جانب کو تھامتے اور کبھی بائیں جانب کو۔''

آپؐ نے فرمایا:

کانَت یَدی فی یَدِ جَبرئیلَ آخُذُ حَیثُ یَأخُذُ.

''میرا ہاتھ جبرئیل کے ہاتھ میں تھا؛ وہ جہاں سے تھامتے تھے، میں بھی وہیں سے تھامتا تھا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعد کے جنازے میں جبرئیلِ امین سمیت بہت بڑی تعداد میں فرشتوں نے شرکت کی تھی۔

امام صادقؑ سے منقول ایک دوسری روایت کے مطابق سعد کے جنازے میں **ستر ہزار فرشتوں** نے شرکت کی۔

)بحار الانوار، ج6، ص261، حدیث102، بحوالہ الکافی۔(

لوگوں نے تعجب سے رسولِ خداؐ سے عرض کیا: ''آپؐ نے ان کے غسل کا حکم دیا، ان پر نمازِ جنازہ پڑھی، خود انہیں قبر میں اتارا اور دفن فرمایا، لیکن ان سب کے باوجود آپؐ نے فرمایا کہ سعد کو فشارِ قبر پیش آیا؟''!

رسولِ خداؐ نے فرمایا:

نَعَم؛ اِنَّهُ کانَ فی خَلقِهِ مَعَ اَهلِهِ سُوءٌ.

''ہاں؛ کیونکہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اس کے اخلاق و برتاؤ میں کچھ سختی تھی۔''

)بحار الانوار، ج6، ص220، حدیث14، بحوالہ علل الشرائع اور امالی صدوق۔(

یہ ایک مؤمن کے نادرست اعمال کے نتیجے میں عالمِ برزخ میں ملنے والی سزا کی واضح مثال ہے۔ سعد بن معاذ کے بلند مقام کے باوجود وہ اپنے عمل کے اس نتیجے سے مستثنیٰ نہ ہوئے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ رسولِ خداؐ اور فرشتگانِ الٰہی کی ان کے جنازے میں شرکت، بلکہ خود رسولِ خداؐ کا انہیں قبر میں اتارنا اور تدفین مکمل کرنا بھی اس برزخی سزا کے واقع ہونے میں مانع نہ بن سکا۔

فشارِ قبر عالمِ برزخ کی ان شدید سزاؤں میں سے ہے جو گناہگار مؤمن کو دفن ہونے کے فوراً بعد پیش آسکتی ہیں۔

رسولِ خداؐ سے روایت ہے:

ضَغطَةُ القَبرِ لِلمُؤمِنِ کَفّارَةٌ لَمّا کانَ مِنهُ مِن تَضییعِ النِّعَمِ.

''مؤمن کے لیے فشارِ قبر ان نعمتوں کو ضائع کرنے کا کفارہ ہے جن کی اس نے ناقدری کی تھی۔''

)بحار الانوار، ج6، ص221، حدیث16، بحوالہ ثواب الاعمال اور امالی صدوق۔(

اللہ کی نعمتوں کو ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان انہیں اس طریقے سے استعمال نہ کرے جس کا اللہ نے حکم دیا اور جسے پسند فرمایا ہے، یا اس سے بھی بڑھ کر، انہی نعمتوں کو اپنے پروردگار کی نافرمانی میں استعمال کرے۔

ایسی ناشکری اور نعمتوں کی ناقدری کا ایک برزخی نتیجہ **فشارِ قبر** ہے۔

افسوس کہ نعمت ہائے الٰہی سے غفلت اور ان کی ناقدری اہلِ ایمان میں بھی عام ہے۔ اسی لیے جب ابو بصیر نے امام صادقؑ سے پوچھا کہ کیا مؤمنین میں کوئی شخص فشارِ قبر سے بچ بھی جاتا ہے تو امامؑ نے فرمایا:

نَعوذُ بِاللهِ مِنها. ما اَقَلَّ مَن یَفلِتُ مِن ضَغطَةِ القَبرِ!

''ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں اس سے! کتنے کم لوگ ہیں جو فشارِ قبر سے نجات پاتے ہیں''!

)بحار الانوار، ج6، ص261، حدیث102، بحوالہ الکافی۔(

عالمِ برزخ میں آگ کے ذریعے عذاب

فشارِ قبر کے علاوہ عالمِ برزخ میں اہلِ ایمان کو عذاب کی دوسری صورتیں بھی پیش آسکتی ہیں۔

اس کی ایک مثال مرحوم حاج حسین جلوہ دار ششتری سے متعلق واقعہ ہے۔ کتاب مردگان باما سخن می گویند کے مصنف نقل کرتے ہیں: ''آقا سید محمد طباطبائی ششتری، جو مرحوم سید محمد امام ششتری کے داماد تھے، نے مجھے لکھا:

مرحوم حاجی علیر ضا صغر اچی ششتری، جنہوں نے تقریباً ایک سو دس سال عمر پائی اور کوئی بیس سال پہلے وفات پائی، شوشتر کے معروف لوگوں میں سے تھے۔ وہ بیان کرتے تھے:

'میرے دادا ابتدا میں معمار تھے اور بعد میں استادِ معمار بن گئے تھے۔ بچپن میں انہیں مجھ سے بہت محبت تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ تعمیراتی کاموں پر لے جاتے اور میں نے انہی کی نگرانی میں یہ ہنر سیکھا۔

جب میری عمر سترہ سال ہوئی تو میں قلعہ تل میں ایک ماہر معمار بن چکا تھا۔ قلعہ تل، ایذہ کے علاقے میں مالمیر کے قریب واقع ہے۔ وہاں ایک مال دار خان، جو ایک قبیلے کا سردار تھا، شوشتر آیا اور میرے دادا سے کہا: ''ہمیں ایک معمار دے دیجیے جسے میں اپنے گاؤں قلعہ تل لے جاؤں تاکہ ہمارے لیے حمام تعمیر کرے۔''

میرے دادا نے میرا تعارف کرایا۔ میں خان کے ساتھ قلعہ تل چلا گیا۔ چھ ماہ تک ہم نے اینٹیں بنانے اور لگانے کا کام کیا۔ حمام تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور صرف چند معمولی کام باقی رہ گئے تھے۔

اسی دوران شوشتر سے ایک شخص آیا اور مجھ سے کہا: ''علیر ضا! تمہارے دادا کا انتقال ہو گیا ہے، بلکہ ان کے چہلم کو بھی گزرے ہوئے کچھ وقت ہو گیا ہے۔'' مجھے شدید صدمہ پہنچا کیونکہ مجھے اپنے دادا سے بہت محبت تھی۔ میں خان کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے شوشتر واپس جانا ہے۔ اس نے کہا: ''پہلے اپنا کام مکمل کرو، پھر چلے جانا۔''

میں نے اس کی بات پر توجہ نہ دی اور آدھی رات کو ایک ایسے قافلے کے ساتھ روانہ ہو گیا جو شوشتر جا رہا تھا۔

شوشتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ واقعی میرے دادا وفات پا چکے تھے۔ میں شوشتر کے امامِ جمعہ آقا سید محمد کے پاس گیا اور پوچھا: ''آقا! کیا آپ کوئی ایسی دعا جانتے ہیں جس کے ذریعے انسان کسی وفات یافتہ شخص کو خواب میں دیکھ سکے؟''

انہوں نے مجھے مرحوم ملا عباس شباب کے پاس بھیجا اور کہا: ''ملا عباس کے پاس جاؤ، ان کے پاس ایسی دعا ہے۔''

میں ملا عباس شباب کے پاس گیا۔ انہوں نے میرے لیے ایک دعا لکھی اور طریقہ بتایا۔ فرمایا:

''رات کو سونے سے پہلے وضو کرو، دو رکعت نماز پڑھو، اس دعا کو اپنے سر کے نیچے رکھو اور سو جاؤ۔''

میں نے ان کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ جیسے ہی سویا، خواب میں ایک گرم و سوزاں بیابان اور خشک صحرا دیکھا۔ وہاں ایک شخص آگ میں معلق تھا اور شعلوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ وہ میرے دادا ہیں!

میں نے کہا'': دادا جان! آپ کی نماز، روزہ اور دوسرے اعمال تو اچھے تھے، پھر آپ اس حالت میں کیوں ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا: ''تم ٹھیک کہتے ہو۔''

پھر کچھ فاصلے پر موجود ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''یہ سب اس شخص کی وجہ سے ہوا ہے۔''

میں اس شخص کے قریب گیا تو دیکھا کہ اسے الٹا لٹکایا گیا ہے؛ سر زمین کی طرف اور پاؤں اوپر ہیں اور وہ آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا ہے۔

میں نے پوچھا: ''آپ کا واقعہ کیا ہے؟''

اس نے کہا: ''میں حاج حسین جلوہ دار ہوں۔ ہمارے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا:

ہمارا خاندان بڑا تھا اور گھر چھوٹا تھا۔ ہمارے گھر کے ساتھ ایک بڑی زمین تھی جو دو لڑکیوں کو اپنے والد سے وراثت میں ملی تھی۔ میں نے طویل عرصے تک ان دونوں لڑکیوں سے درخواست کی کہ اپنی زمین کا کچھ حصہ مجھے فروخت کر دیں تاکہ میں اسے اپنے گھر میں شامل کر لوں، کیونکہ ہمارا خاندان بڑا تھا اور جگہ کم پڑتی تھی۔

انہوں نے کہا: 'ہم اپنے والد کی میراث نہیں بیچیں گی۔'

ایک دن تمہارے دادا ہمارے گھر میں تعمیراتی کام کر رہے تھے۔ ہم نے ان لڑکیوں سے کہا:

'چونکہ معمار یہاں موجود ہے، ہمیں اجازت دے دو کہ درمیان کی دیوار گرا کر اسے کچھ آگے کر دیں۔'

انہوں نے کہا: 'ہم راضی نہیں ہیں۔'

اس کے بعد ہم مقامی خان کے پاس گئے اور کہا: 'آپ آ کر انہیں سمجھایئے۔'

خان آیا اور انہیں بلا کر کہا: 'فلاں! یہاں آؤ، فلاں! یہاں آؤ۔ اپنے گھر کا کچھ حصہ اس شخص کو فروخت کر دو۔'

انہوں نے کہا: 'خان صاحب! ہم اپنے والد کی میراث نہیں بیچیں گی۔'

خان نے کہا: 'فضول باتیں مت کرو! تمہارا ابا ہو'!

پھر ہماری طرف رخ کر کے کہا: 'جاؤ، زمین پر قبضہ کر لو۔'

خان کے حکم پر ہم نے درمیان کی دیوار گرا دی اور ان کی زمین کا کچھ حصہ اپنے گھر میں شامل کر لیا۔

اب میں یہاں گرفتار ہوں اور تمہارے دادا وہاں گرفتار ہیں۔

میری تم سے ایک درخواست ہے، شاید اس کے ذریعے ہماری نجات کا کوئی راستہ نکل آئے۔

میرے گھر جاؤ۔ وہ مسجد شیخ علی کے ساتھ والی گلی میں ہے۔ گلی میں داخل ہو کر بائیں طرف چلتے رہنا یہاں تک کہ آخر میں پہنچ جاؤ۔ وہاں ایک بڑا دوپٹ والا دروازہ ہے؛ وہی ہمارا گھر ہے۔

گھر کے دالان میں داخل ہونے کے بعد ایک سیڑھی ہے۔ اس سے اوپر جاؤ۔ وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں دو پرانے دروازوں کی جگہیں اینٹوں سے بند کی گئی ہیں۔ دوسری بند کی ہوئی جگہ کے پیچھے ایک چھوٹا سا برتن ہے جس میں **ستائیس لیرے، یعنی سونے کے سکے** رکھے ہیں۔ ان کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں۔

ان سکوں کو [اس حق کی ادائیگی میں] دے دینا تاکہ شاید ہمیں اس بیابان سے نجات مل جائے۔ میرے بڑے بیٹے کا نام محمد علی ہے۔''

حاج علیرضا کہتے ہیں: میں خواب سے بیدار ہو گیا۔ صبح کی پہلی اذان کے وقت اٹھا، نمازِ فجر پڑھی اور خواب میں دی گئی نشانیوں اور ہدایات کے مطابق روانہ ہو گیا۔

اگرچہ میں موکھی محلے سے تھا اور کبھی اشکفتی محلے نہیں گیا تھا اور وہاں کی گلیوں کو بھی اچھی طرح نہیں جانتا تھا، لیکن خواب میں بتائے ہوئے راستے پر چلتے چلتے مسجد شیخ علی تک پہنچ گیا۔

اس گلی میں داخل ہوا جس کی نشانی دی گئی تھی اور آخر تک پہنچا۔ وہاں وہی بڑا صحن کا دروازہ موجود تھا جس کی تفصیل خواب میں بتائی گئی تھی۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔

میں نے پوچھا: ''آپ کا نام کیا ہے؟''

اس نے کہا: ''محمد علی۔''

میں نے کہا: ''مجھے آپ سے تقریباً ایک گھنٹے بات کرنی ہے۔''

اس نے کہا: ''پہلے مجھے نمازِ صبح پڑھ لینے دیجیے، کہیں قضا نہ ہو جائے۔''

طلوعِ آفتاب قریب تھا۔ اس نے نماز پڑھی اور واپس آیا۔

میں نے کہا: ''آپ کے والد حاج علی عالمِ برزخ میں سختی میں مبتلا ہیں۔ آپ کو ان کی مدد کے لیے کچھ کرنا ہو گا۔''

اس نے کہا: ''میں جانتا ہوں کہ ہمارے صحن کا کچھ حصہ غصب کر کے ناجائز طور پر لیا گیا تھا۔ میرے والد کی وفات کے بعد ہر وارث اپنا حصہ لے کر الگ ہو گیا۔ میں تنہا اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتا، کیونکہ مجھے ان دونوں خواتین کا حق ادا کرنا ہو گا اور میرے پاس اتنی استطاعت نہیں ہے۔''

میں نے کہا: ''آپ کے والد نے میرے لیے ایک پیغام دیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دالان کے پاس ایک سیڑھی ہے۔ اس کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں دو فرضی دروازے باریک اینٹوں سے بند کیے گئے ہیں۔ دوسرے بند دروازے کے پیچھے انہوں نے ستائیس عثمانی لیرے چھپا رکھے ہیں جن کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں۔

انہوں نے کہا تھا: 'میں نے انہیں کسی ہنگامی ضرورت کے لیے رکھا تھا کہ اگر کبھی میرے پاس رقم نہ رہے تو انہیں استعمال کروں گا۔ ایسی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی، اس لیے وہ سکے وہیں رہ گئے اور کسی کو ان کا علم نہیں۔'''

میں نے محمد علی سے کہا: ''ہتھوڑا لائیے، میں آپ کو وہ جگہ بتاتا ہوں جہاں دیوار توڑنی ہے۔ البتہ چونکہ گھر آپ کا ہے، اسے کھولنے کا اختیار بھی آپ ہی کو ہے۔''

وہ ہتھوڑا لے آیا۔

میں نے کہا: ''آپ کے والد نے مجھے یہی جگہ دکھائی تھی۔ اس باریک دیوار کو توڑیے۔''

اس نے دیوار توڑی تو وہی چھوٹا سا برتن نکل آیا اور اس کے اندر ٹھیک **ستائیس لیرے** موجود تھے۔

ہم دونوں وہ سکے لے کر مرحوم حاج شیخ جعفر ششتری کی حسینیہ گئے۔ وہاں ان کے فرزند آقا شیخ محمد علی موجود تھے۔ ہم نے پورا واقعہ ان کے سامنے بیان کیا۔

مرحوم شیخ نے ان دونوں خواتین کو بلوایا اور تمام لیرے ان کے سامنے رکھ کر فرمایا:

''جتنے چاہو لے لو اور مرحوم کو اس ذمہ داری سے بری کر دو۔''

ان خواتین نے سات لیرے لے لیے اور کہا: ''باقی ان کے لیے خوش گوار اور حلال ہو''!

اسی رات حاج حسین کو خواب میں دیکھا گیا۔ انہوں نے کہا:

''اللہ تمہیں جزائے خیر دے! تم نے ہمیں اس بیابان سے نجات دلا دی۔''''

(مردگان با ما سخن می گویند، ص144–147۔)

یہ بھی عذابِ برزخ کی ایک مثال ہے۔ اس واقعے سے جہاں حساب و جزائے الٰہی کی باریک بینی اور دقت ظاہر ہوتی ہے، وہیں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جب اللہ کا فضل کسی شخص کے شاملِ حال ہو جائے تو عالمِ برزخ ہی میں اس کے عذاب کو دور کرنے کے اسباب فراہم ہو سکتے ہیں۔

عالمِ برزخ میں انسانوں کی مختلف حالتیں

اگر ہم عالمِ برزخ میں انسانوں کی حالتوں کو تقسیم کرنا چاہیں تو امام جوادؑ سے منقول ایک روایت نہایت قابلِ توجہ ہے۔

آپؑ اپنے آبائے طاہرینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ کسی شخص نے امیر المؤمنین علیؑ سے عرض کیا:

صِف لَنَا المَوتَ

''ہمارے لیے موت [اور موت کے بعد کی حالت] کو بیان فرمایئے۔''

امیر المؤمنینؑ نے فرمایا:

عَلَى الخَبيرِ سَقَطتُم. هُوَ اَحَدُ ثَلاثَةِ اُمُورٍ يَرِدُ عَلَيهِ: إمّا بِشارَةٌ بِنَعيمِ الاَبَدِ؛ وَ إمّا بِشارَةٌ بِعَذابِ الأَبَدِ؛ وَ إمّا تَحزينٌ وَ تَهويلٌ وَ اَمرُهُ مُبهَمٌ لا يَدرى مِن اَيِّ الفِرَقِ هُوَ.

''تم ایک ایسے شخص کے پاس آئے ہو جو اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہے۔ موت کے وقت انسان کو تین میں سے ایک حالت پیش آتی ہے: یا اسے ابدی نعمت و آسائش کی بشارت ملتی ہے؛

یا اسے ابدی عذاب کی خبر دی جاتی ہے؛

اور یا اسے غم، خوف اور ہولناک کیفیت پیش آتی ہے جبکہ اس کا معاملہ مبہم رہتا ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس گروہ میں شمار ہو گا۔''

پھر امامؑ نے وضاحت فرمائی:

فَاَمّا وَلِيُّنَا المُطيعُ لِاَمرِنا، فَهُوَ المُبَشَّرُ بِنَعيمِ الاَبَدِ. وَ اَمّا عَدُوُّنَا المُخالِفُ عَلَينا، فَهُوَ المُبَشَّرُ بِعَذابِ الاَبَدِ. وَ اَمَّا المُبهَمُ اَمرُهَ الَّذى لا يَدرى ما حالُهُ، فَهُوَ المُؤمِنُ المُسرِفُ عَلى نَفسِهِ لا يَدرى ما يَؤُولُ اِلَيهِ حالُهُ يَأتيهِ الخَبَرُ مُبهَماً مَخُوفاً ثُمَّ لَن يُسَوّيَهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ بِاَعدائِنا لكِن يُخرِجُهُ مِنَ النّارِ بِشَفاعَتِنا.

''پس ہمارا وہ دوست جو ہمارے امر کا فرمانبردار ہے، اسے ابدی نعمت کی بشارت دی جاتی ہے۔

اور ہمارا وہ دشمن جو ہماری مخالفت کرتا ہے، اسے ابدی عذاب کی خبر دی جاتی ہے۔

لیکن وہ شخص جس کا معاملہ مبہم ہے اور اسے معلوم نہیں کہ اس کی حالت کیا ہو گی، وہ ایسا مؤمن ہے جس نے گناہوں کے ذریعے اپنے اوپر زیادتی کی ہے۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ آخر کار اس کا انجام کہاں پہنچے گا۔ اسے جو خبر ملتی ہے وہ مبہم اور خوفناک ہوتی ہے۔

لیکن اللہ عزوجل اسے ہمارے دشمنوں کے برابر ہرگز قرار نہیں دے گا [کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہے]، بلکہ بالآخر ہماری شفاعت کے ذریعے اسے آگ سے نکال دے گا۔''

اس کے بعد امامؑ نے سخت تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

فَاعمَلُوا وَ اَطیعُوا وَ لا تَتَّکِلُوا وَ لا تَستَصغِرُوا عُقُوبَةَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ. فَاِنَّ مِنَ الْمُسرِفینَ مَن لا تَلحَقُهُ شَفاعَتُنا اِلّا بَعدَ عَذابِ ثَلاثِمائَةِ اَلفِ سَنَةٍ.

''پس عمل کرو اور اطاعت کرو! [صرف ہماری شفاعت پر] تکیہ کر کے بے عمل نہ ہو جاؤ، اور اللہ عزوجل کے عذاب کو معمولی نہ سمجھو؛ کیونکہ اپنے اوپر زیادتی کرنے والوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن تک ہماری شفاعت **تین لاکھ سال کے عذاب کے بعد** پہنچے گی''!) معانی الاخبار، ص288، حدیث 2۔(

یہ شریف روایت ان مؤمنین کے درمیان واضح فرق بیان کرتی ہے جو عملِ صالح انجام دیتے اور تقوائے الٰہی کی رعایت کرتے ہیں، اور ان مؤمنین کے درمیان جو گناہوں پر اصرار کرتے ہیں۔

صرف وہ لوگ جو ائمہؑ کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں، موت کے وقت ابدی نعمت کی بشارت پاتے ہیں۔ لیکن گناہگار مؤمنین ممکن ہے ایک مدت تک خوف، اضطراب اور اپنے انجام کے بارے میں بے یقینی کی کیفیت میں رہیں، یہاں تک کہ ان کا معاملہ بالآخر طے ہو جائے۔

یہاں تک ممکن ہے کہ بعض افراد **تین لاکھ سال** تک عذاب برداشت کریں اور اس کے بعد اپنے ایمان کی برکت سے اہلِ بیتؑ کی شفاعت سے بہرہ مند ہوں۔

لہٰذا جیسا کہ خود روایت نے تاکید کی ہے، اہلِ ایمان کو محض اپنے ایمان اور ولایت کی وجہ سے مطمئن ہو کر بے فکر نہیں ہو جانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے اعمال اور واجبات سے غافل ہو جائیں اور عمل کے بغیر آخرت کی سعادت کی توقع رکھنے لگیں۔

عذابِ الٰہی کا ایک سال، ایک مہینہ، ایک دن بلکہ **ایک گھنٹہ بھی** انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے، چہ جائیکہ تین لاکھ سال!

پس محض اس امید پر عملِ صالح سے بے پروا نہیں ہوا جا سکتا کہ اہلِ بیتؑ کی شفاعت اور دستگیری بہر حال ہمیں حاصل ہو جائے گی، کیونکہ کسی کو معلوم نہیں کہ یہ فضلِ الٰہی **کس وقت** اس تک پہنچے گا۔

تطہیر اور شفاعت کی مختلف صورتیں

رسولِ خداؐ کے اس فرمان کی بنیاد پر، جسے آپؐ کے فرزندِ گرامی امام حسن عسکریؑ نے نقل فرمایا ہے، اب تک اہلِ ایمان کے گناہوں کی آلودگی سے پاک ہونے کی **پانچ صورتیں** ہمارے سامنے آچکی ہیں۔

اس شریف روایت میں مؤمن کی روحانی آلودگی کی شدت کے اعتبار سے تطہیر کے مختلف مراحل بیان کیے گئے ہیں۔

پہلا مرحلہ ان لوگوں سے متعلق ہے جن کی آلودگی دوسروں کی نسبت کم ہے۔ عذاب کی سب سے ہلکی صورت دنیا کی آزمائشیں، مصیبتیں اور سختیاں ہیں، جو تطہیر کا پہلا مرحلہ بنتی ہیں۔

اس کے بعد دوسرے مرحلے میں **سکراتِ موت اور روح کے بدن سے جدا ہونے کی سختیاں** گناہگار مؤمن کی تطہیر کا ذریعہ بنتی ہیں۔ تیسرا مرحلہ **عالمِ برزخ کے مختلف عذاب** ہیں۔

اگر کسی شخص کے گناہوں کی آلودگی اتنی زیادہ ہو کہ پہلے تین مراحل، یعنی دنیا سے لے کر برزخ تک، اس کی مکمل تطہیر کے لیے کافی نہ ہوں تو معاملہ قیامت اور اس کے ہولناک مراحل تک پہنچ جاتا ہے۔

روایت کے اگلے حصے میں تطہیر کے چوتھے اور پانچویں مرحلے کو یوں بیان کیا گیا ہے:

فَإِن كانَ ذُنُوبُهُ اَعظَمَ وَ اَكثَرَ، طُهِّرَ مِنها بِشَدائِدَ عَرَصاتِ يَومِ القِيامَةِ. فَإِن كانَت اَكثَرَ وَ اَعظَمَ، طُهِّرَ مِنها فِي الطَّبَقِ الاَعلى مِن جَهَنَّمَ.

"پھر اگر اس کے گناہ زیادہ بڑے اور زیادہ تعداد میں ہوں تو اسے قیامت کے میدانوں کی سختیوں کے ذریعے ان سے پاک کیا جائے گا۔ اور اگر اس کے گناہ اس سے بھی زیادہ اور سنگین ہوں تو اسے جہنم کے بالائی طبقے میں عذاب کے ذریعے پاک کیا جائے گا۔") بحار الانوار، ج 68، ص 154، حدیث 11، بحوالہ تفسیر امام حسن عسکریؑ۔(

روایت آگے اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ پانچواں مرحلہ ان اہلِ ایمان سے متعلق ہے جو نہایت سنگین گناہوں کے مرتکب ہوئے ہوں اور اسی لیے انہیں شدید ترین تطہیری عذاب سے گزرنا پڑے۔ اس روایت کے اس حصے کو ہم پہلے نقل کر کے اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

ان پانچ مراحل میں سے ہر مرحلے ـــ دنیا کے دو مراحل، برزخ کا ایک مرحلہ اور قیامت کے دو مراحل ـــ کے اندر بھی مزید مختلف صورتیں اور درجات تصور کیے جا سکتے ہیں، لیکن یہاں ان کی تفصیل ضروری نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ تطہیر کی یہ صورتیں ایک دوسرے سے مانع نہیں ہیں۔ ایک ہی گناہگار شخص کے لیے ان میں سے کئی مراحل پیش آ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کسی شخص کے بعض گناہوں کی آلودگی دنیا کی مصیبتوں کے ذریعے دور ہو جائے، بعض کی برزخ کے عذاب سے، اور بعض کی آخرت کے عذاب سے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شخص کے تمام گناہوں کی تطہیر صرف دنیا ہی میں ہو جائے، یا صرف برزخ میں، یا قیامت کے مراحل میں۔

فضلِ الٰہی اور اہلِ بیتؑ کی شفاعت بھی ان میں سے کسی بھی مرحلے میں شاملِ حال ہو سکتی ہے۔

ممکن ہے انسان کے بعض گناہ دنیا ہی میں بخش دیے جائیں، بعض برزخ میں، اور بعض قیامت کے دن۔ اسی طرح اہلِ بیتؑ کی شفاعت کسی گناہگار مؤمن کو ان میں سے کسی بھی عالم میں حاصل ہو سکتی ہے۔

شفاعت دنیا میں بھی ہو سکتی ہے، برزخ میں بھی اور قیامت میں بھی۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہوا، پروردگار کی مشیت ـــ جو اہلِ بیتؑ کی مشیت بھی ہے ـــ کے مطابق برزخ میں گناہگار مؤمنین کے لیے وسیع اور عمومی شفاعت اصل قاعدہ نہیں ہے۔

بلکہ عمومی اور غالب قانون یہ ہے کہ اہلِ ایمان عالمِ برزخ میں اپنی اطاعت اور معصیت کے نتائج و آثار کا سامنا کریں۔

بہر حال کسی مؤمن کو یہ معلوم نہیں کہ وہ اپنے گناہوں کی آلودگی سے **کب اور کہاں** نجات پائے گا: دنیا میں، برزخ میں یا قیامت کے دن؟ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کس نوعیت کا عذاب اس کی تطہیر کا ذریعہ بنے گا۔

اسی طرح اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے کون سے گناہ اہلِ بیتؑ کی شفاعت کے ذریعے بخشے جائیں گے اور کون سے کسی دوسرے فضلِ الٰہی کے ذریعے معاف ہوں گے۔

اسی وجہ سے اہلِ ایمان زندگی کے آخری لمحے تک اس بارے میں خوف اور بے یقینی کی کیفیت میں رہتے ہیں کہ اللہ ان کے ساتھ آخر کار کس طرح معاملہ فرمائے گا۔

ہر گناہ کے سلسلے میں انسان کے دل میں دو کیفیتیں ہمیشہ باقی رہنی چاہییں : **اللہ کی بخشش اور رحمت کی امید، اور اس کے عذاب و مؤاخذے کا خوف** —— خواہ وہ دنیا میں ہو، برزخ میں یا قیامت کے دن۔

جیسا کہ امیر المؤمنین علیؑ نے فرمایا، امتِ رسولؐ کے گناہگار مؤمنین کا انجام خود ان کے لیے مبہم اور خوف و اضطراب کے ساتھ وابستہ رہتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر اہلِ بیتؑ کی شفاعت انہیں پہنچتی ہے۔

حقیقی شیعہ کون ہیں؟

ایک شخص نے اپنی زوجہ کو حضرت فاطمہ زہراؑ کی خدمت میں بھیجا تا کہ وہ دریافت کرے کہ آیا وہ اہلِ بیتؑ کے شیعوں میں شمار ہوتا ہے یا نہیں۔

حضرت فاطمہ زہراؑ نے اس خاتون سے فرمایا:

قُولی لَهُ: اِن کُنتَ تَعمَلُ بِما اَمَرناکَ وَ تَنتَهی عَمّا زَجَرناکَ عَنهُ، فَاَنتَ مِن شیعَتِنا. وَ اِلّا فَلا.

"اس سے کہو: اگر تم ان امور پر عمل کرتے ہو جن کا ہم نے تمہیں حکم دیا ہے، اور ان چیزوں سے باز رہتے ہو جن سے ہم نے تمہیں منع کیا ہے، تو تم ہمارے شیعوں میں سے ہو؛ ورنہ نہیں۔"

جب خاتون نے حضرت زہراؑ کا جواب اپنے شوہر تک پہنچایا تو وہ شدید پریشان ہو گیا اور کہنے لگا:

"ہائے افسوس! ایسا کون ہے جس سے گناہ اور خطا سرزد نہ ہوتی ہو؟ پھر تو میں ہمیشہ جہنم میں رہوں گا، کیونکہ جو ان کے شیعوں میں سے نہ ہو وہ کبھی آگ سے باہر نہیں آئے گا"!

وہ خاتون دوبارہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے شوہر کی بات بیان کی۔

حضرتؑ نے فرمایا:

قُولی لَهُ: لَیسَ هکَذا. شیعَتُنا مِن خِیارِ اَهلِ الجَنَّةِ. وَ کُلُّ مُحِبّینا وَ مُوالی اَولِیائَنا وَ مُعادی اَعدائَنا وَ المُسَلِّمُ بِقَلبِهِ وَ لِسانِهِ لَنا، لَیسُوا مِن شیعَتِنا اِذا خالَفُوا اَوامِرَنا وَ نَواهینا فی سائِرِ المُوبِقاتِ. وَ هُم مَعَ

ذلِکَ فی الجَنَّةِ وَ لکِن بَعدَ ما یَطَهَّروُنَ مِن ذُنُوبِهِم بِالبَلایا وَ الرَّزایا اَو فی عَرَصاتِ القِیامَةِ بِاَنواعِ شَدائِدِها اَو فِی الطَّبَقِ الاَعلی مِن جَهَنَّمَ بِعَذابِها اِلی اَن نَستَنقِذَهُم بِحُبِّنا مِنها وَ نَنقُلَهُم اِلی حَضرَتِنا.

''اس سے کہو: ایسا نہیں ہے جیسا تم نے سمجھا ہے۔ **ہمارے شیعہ اہلِ جنت کے برگزیدہ لوگوں میں سے ہیں۔**

البتہ ہمارے تمام محب، ہمارے دوستوں سے ولایت و دوستی رکھنے والے، ہمارے دشمنوں سے دشمنی رکھنے والے، اور دل و زبان سے ہمارے سامنے تسلیم ہونے والے—اگر وہ مہلک گناہوں کے سلسلے میں ہمارے اوامر و نواہی کی مخالفت کریں تو وہ ہمارے [حقیقی] شیعوں میں شمار نہیں ہوتے۔

اس کے باوجود وہ بالآخر اہلِ جنت میں ہوں گے، لیکن اس وقت جب انہیں اپنے گناہوں سے پاک کر دیا جائے: یا دنیا کی بلاؤں اور مصیبتوں کے ذریعے، یا قیامت کے میدانوں کی مختلف سختیوں کے ذریعے، یا جہنم کے بالائی طبقے میں عذاب کے ذریعے؛ یہاں تک کہ ہم اپنی محبت کی برکت سے انہیں وہاں سے نجات دلائیں اور اپنے حضور لے آئیں۔''

(بحار الانوار، ج68، ص155، حدیث 11، بحوالہ تفسیر امام حسن عسکریؑ)

لوگوں کے گناہوں کی آلودگی سے پاک ہونے کی صورتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے، وہ ان کے گناہوں کی مقدار اور شدت کے مطابق ہے۔ اگر کسی شخص کے گناہ کم ہوں تو ممکن ہے اسی دنیا میں اس کی تطہیر اور پاکیزگی ہو جائے اور معاملہ قیامت کے عذاب تک مؤخر نہ ہو، کیونکہ قیامت کا عذاب دنیا کی بلاؤں اور سختیوں سے کہیں زیادہ شدید اور دشوار ہے۔

لیکن اگر انسان نے بہت زیادہ گناہ کیے ہوں اور ان کے سبب شدید روحانی آلودگی پیدا کر لی ہو تو ممکن ہے اس کی تطہیر قیامت بلکہ جہنم کے عذاب تک مؤخر ہو جائے۔

اہلِ ایمان کی نجات کا یقینی مرحلہ

گزشتہ مباحث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے اس وعدے کے مطابق:

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذینَ آمَنُوا یُخرِجُهُم مِنَ الظُّلُماتِ اِلَی النُّورِ

''اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے؛ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔''

تمام اہلِ ایمان کو بالآخر ان کے گناہوں کی تاریکیوں سے نکال کر مغفرتِ الٰہی کے نور میں داخل کر دیا جائے گا۔

یہ امر مختلف صورتوں اور مختلف مراحل میں واقع ہو سکتا ہے: دنیا میں، عالمِ برزخ میں، یا زیادہ سے زیادہ قیامت کے دن۔

تمام اہلِ ایمان کے درمیان یقینی اور مشترک امر یہ ہے کہ **بالآخر وہ جنت میں داخل ہوں گے اور گناہوں کے ذریعے اپنے اندر پیدا کی ہوئی آلودگی سے پاک کر دیئے جائیں گے۔**

اسی کو ہم **عاقبت بخیر** کہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی معنوں میں سعادت و نجات پانے والے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں، اہلِ ایمان عذابِ الٰہی میں ہمیشہ باقی نہیں رہیں گے۔ اگر ان میں سے بعض کی تطہیر کے لیے جہنم میں داخل ہونا بھی ضروری ہو جائے تو ان کا عذاب ابدی نہیں ہو گا۔ ایک مدت ـــــ جو بعض کے لیے تین لاکھ سال تک بھی ہو سکتی ہے ـــــ گزرنے کے بعد بالآخر انہیں وہاں سے نکال لیا جائے گا۔

لہٰذا مؤمنین **اہلِ جہنم** نہیں ہیں اور حقیقی معنی میں انہیں جہنم سے تعلق رکھنے والے لوگ نہیں کہا جا سکتا۔

اہلِ جہنم وہ ہیں جو ہمیشہ وہاں رہیں گے اور کبھی اس سے باہر نہیں آئیں گے۔

سنگین اور بڑے گناہوں سے آلودہ مؤمن کے لیے جہنم کا عذاب **تطہیر کا ذریعہ** بنتا ہے، لیکن حقیقی اہلِ جہنم کے لیے اس عذاب میں تطہیر کا یہ اثر نہیں ہوتا۔

وہ اہلِ شقاوت ہیں اور ہمیشہ غضبِ الٰہی کے مستحق رہتے ہیں۔

پس جہنم کا عذاب ہر شخص اور ہر صورت میں تطہیر کا کام نہیں کرتا۔ **تطہیر کا یہ اثر صرف اہلِ ایمان کے لیے ہے۔**

اور یہ امتیاز انہیں صرف ان کی **ولایت** کی برکت سے حاصل ہوتا ہے۔

آیۂ شریفہ: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا

''اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے''

میں اللہ نے اپنے آپ کو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں کا **ولی** قرار دیا ہے۔

ائمہؑ کی ولایت و سرپرستی کو قبول کرنے کے سبب ہی انہیں ایسا نیک انجام نصیب ہوتا ہے۔

جو شخص ان کی ولایت کو قبول کرتا ہے، اس نے حقیقت میں اپنے آپ کو ان کی سرپرستی کے زیرِ سایہ قرار دیا اور اپنا معاملہ ان کے سپرد کر دیا۔ وہ اپنی ولایت کے تقاضے کے مطابق ان لوگوں کو آخر کار بے سہارا نہیں چھوڑتے جو ان کے دامنِ ولایت میں پناہ لے چکے ہوں۔ بالآخر وہ ان کی دستگیری فرماتے ہیں، خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ لیکن جو لوگ دائرۂ ایمان سے باہر ہیں انہیں ایسی پناہ حاصل نہیں ہوتی۔ درحقیقت انہوں نے اس **ولایتِ الٰہی** کو قبول نہیں کیا جو رسولِ خداؐ اور آپؐ کے اہلِ بیتِ اطہارؑ کی ولایت و سرپرستی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

اگرچہ وہ ظاہری اسلام رکھتے ہوں—اور ظاہری اسلام بھی بذاتِ خود اللہ کی طرف سے ایک نور اور ہدایت ہے—لیکن اللہ نے جن ہستیوں کو مسلمانوں کا ولی اور امام مقرر کیا، ان کی مخالفت کر کے اور ایسے ظالم پیشواؤں کی امامت قبول کر کے جنہیں اللہ نے مقرر نہیں کیا تھا، انہوں نے اس امر کے سامنے تسلیم اختیار نہیں کی جسے اللہ نے ان پر واجب قرار دیا تھا۔

چنانچہ اللہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور انہیں اپنی اس **خصوصی ولایت و سرپرستی** سے بہرہ مند نہیں فرماتا۔

نتیجتاً وہ شیطان کے فریب کے سامنے بے سہارا ہو جاتے ہیں، نورِ اسلام سے نکل کر کفر کی تاریکیوں میں جا پڑتے ہیں اور اس طرح دائمی عذابِ الٰہی کے مستحق بن جاتے ہیں۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لا يَستَحيي اَن يُعَذِّبَ اُمَّةً دانَت بِإمامٍ لَيسَ مِنَ اللّٰهِ وَ اِن كانَت فى اَعمالِها بَرَّةٌ تَقِيَّةً. وَ اِنَّ اللّٰهَ لَيَستَحيي اَن يُعَذِّبَ اُمَّةً دانَت بِإمامٍ مِنَ اللّٰهِ وَ اِن كانَت فى اَعمالِها ظالِمَةً مُسيئَةً.

”اللہ اس امت کو عذاب دینے سے نہیں رکتا جو ایسے امام کے ذریعے اس کی بندگی کرے جو اللہ کی طرف سے مقرر نہ ہو، اگرچہ وہ امت اپنے اعمال میں نیکوکار اور پرہیزگار ہی کیوں نہ ہو۔

اور اللہ اس امت کو [دائمی] عذاب دینے سے اجتناب فرماتا ہے جو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ امام کے ذریعے اس کی بندگی کرے، اگرچہ وہ اپنے اعمال میں ظلم و بدعملی کی مرتکب ہوئی ہو۔“

(اصول الکافی، ج 1، ص 376، کتاب الحجۃ، باب: جو شخص اللہ کی طرف سے مقرر کردہ امام کے علاوہ کسی دوسرے امام کے ذریعے اللہ کی بندگی کرے، حدیث 5۔)

حیااور شرم اپنے حقیقی اور انسانی مفہوم میں مخلوقات کی صفات ہیں اور انہیں اسی معنی میں اللہ کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ جب اس قسم کی تعبیرات اللہ کے بارے میں استعمال ہوتی ہیں تو ان سے وہ مناسب اثر اور لازمہ مراد ہوتا ہے جو مقامِ الٰہی کے شایانِ شان ہو۔ مثلاً انسان جب کسی کام سے حیا کرتا ہے تو اسے انجام دینے سے باز رہتا ہے۔ اسی مناسبت سے اللہ نے بعض امور کے بارے میں اپنی ایک ایسی قطعی مشیت مقرر فرمائی ہے جس کے بر خلاف وہ عمل نہیں کرتا۔

بعض روایات میں ـــــ جن میں مذکورہ بالا روایت بھی شامل ہے ـــــ اسی **قطعی اور تخلف ناپذیر مشیتِ الٰہی** کو ''حیا'' کی تعبیر سے بیان کیا گیا ہے۔ اس بنا پر سنتِ ثابتۂ الٰہی یہ ہے کہ اللہ اہلِ ولایت کو ـــــ یعنی ان لوگوں کو جو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ امام کی امامت قبول کر کے اس کی بندگی کرتے ہیں ـــــ **دائمی عذاب میں ہر گز باقی نہیں رکھے گا؛ بالآخر انہیں بخش دیا جائے گا۔** لیکن اس کے مقابل گروہ کو یہ نجاتِ نہائی حاصل نہیں ہو گی۔

مذکورہ روایت میں بیان ہونے والے ''عذاب'' کو ہم نے **دائمی عذاب** کے معنی میں اس لیے لیا ہے کہ اس موضوع سے متعلق تمام روایات کو ایک ساتھ سامنے رکھا جائے۔

بہت سی روایات میں اہلِ ولایت سے عذاب کی مطلق نفی نہیں کی گئی، بلکہ انسان کے گناہوں اور روحانی آلودگی کی مقدار کے مطابق برزخ یا قیامت میں عذاب کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

لہٰذا جن روایات سے بظاہر عذاب کی مطلق نفی محسوس ہوتی ہے، انہیں ان دوسری روایات کی روشنی میں سمجھنا ہو گا جو عارضی اور محدود عذاب کو ثابت کرتی ہیں۔

پس اہلِ ولایت سے جس عذاب کی یقینی طور پر نفی کی گئی ہے وہ **عذابِ ابدی** ہے۔

رسولِ خداؐ کی رضا اور اہلِ ایمان کی نجاتِ نہائی

اہلِ ایمان کی آخری نجات اس وعدۂ الٰہی سے بھی سمجھی جاسکتی ہے جو اللہ نے اپنے حبیب رسولِ اکرمؐ سے فرمایا:

وَ لَسَوفَ یُعطیکَ رَبُّکَ فَتَرضی

”اور عنقریب آپ کا پروردگار آپ کو اتنا عطا کرے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔“)قرآن، 93:5(

ائمۂ اہلِ بیتؑ کی روایات کے مطابق اللہ کی جانب سے رسولِ خداؐ کو عطا ہونے والی عظیم نعمتوں میں اہلِ ایمان کے حق میں **شفاعتِ کبریٰ** کا حق بھی شامل ہے۔

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: **رِضا جدّی أَن لا یَبقی فِی النّارِ مُوَحِّدٌ.**

”میرے جدّ رسولِ خداؐ کی رضا یہ ہے کہ کوئی موحّد آگ میں باقی نہ رہے۔“

ائمۂ اہلِ بیتؑ کی اصطلاح اور اس کتاب کی سابقہ مباحث میں بیان شدہ اصول کے مطابق یہاں **موحّد** سے مراد وہ شخص ہے جو امامؑ کی حقیقی معرفت بھی رکھتا ہو۔

جو شخص اللہ کو خدا تو مانتا ہو لیکن خاتم الانبیاء رسولِ اکرمؐ کی نبوت کو قبول نہ کرے، یا ائمۂ اہلِ بیتؑ کی امامت پر ایمان نہ رکھتا ہو، وہ اس اصطلاحی معنی میں کامل توحید کا حامل شمار نہیں ہوتا۔

پس رسولِ خداؐ کی رضا یہ ہے کہ وہ تمام افراد جو حقیقتاً ائمہؑ کی ولایت پر ایمان رکھتے ہیں، بالآخر جہنم سے نجات حاصل کریں۔

روایت کے الفاظ:

لا یَبقی ــــ ”باقی نہ رہے“

میں بھی ایک نہایت اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے بعض اہلِ ایمان پہلے جہنم میں داخل ہوں اور پھر رسولِ خداؐ کی شفاعت کے ذریعے وہاں سے نکالے جائیں۔

لہٰذا یہ وعدہ ان کی **نجاتِ نہائی اور آخری انجام** سے متعلق ہے؛ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نجات کے اس آخری مرحلے تک پہنچنے سے پہلے وہ ہر قسم کے عذاب، مؤاخذے اور تطہیر کے مراحل سے لازماً محفوظ رہیں گے۔

موت کے وقت ایمان

اہلِ ایمان کے بارے میں اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے، اسے صحیح اور دقیق طور پر سمجھنے کے لیے ایک نہایت اہم اور باریک نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے۔ موجودہ بحث میں **مؤمن** سے مراد وہ شخص ہے جو **موت کے وقت ائمہؑ کی ولایت وامامت پر ایمان رکھتا ہو اور ایمان ہی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو**۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کوئی شخص موت سے پہلے مؤمن ہو، لیکن جب اس کی موت کا وقت آئے تو وہ ایمان سے محروم ہو چکا ہو۔

ایمانِ مستقر اور ایمانِ مستودع

قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ایمان دو طرح کا ہو سکتا ہے : **ایمانِ مستقر** اور **ایمانِ مستودع**۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

»وَ هُوَ الَّذی اَنشَأَکُم مِن نَفسٍ واحِدَةٍ فَمُستَقَرٌّ وَ مُستَودَعٌ.«

”اور وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا؛ پھر ایک کے لیے قرار واستقرار ہے اور دوسرے کے لیے عارضی طور پر سپرد کیا جانا۔“

(قرآن، 6:98)

ائمۂ اہلِ بیتؑ کی روایات میں **مستقر** اور **مستودع** کو اہلِ ایمان کی دو قسموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

المُستَقَرُّ مَا استَقَرَّ الایمانُ فی قَلبِهِ فَلا یُنزَعُ مِنهُ اَبَداً. وَ المُستَودَعُ الَّذی یُستَودَعُ الایمانَ زَماناً ثُمَّ یُسلَبُهُ. وَ قَد کانَ الزُّبَیرُ مِنهُم.

''مستقر وہ ہے جس کے دل میں ایمان مضبوطی کے ساتھ قرار پاچکا ہو اور پھر کبھی اس سے سلب نہ کیا جائے۔ اور مستودع وہ ہے جس کے پاس ایک مدت تک ایمان بطور امانت رکھا جائے، پھر اس سے واپس لے لیا جائے۔ زبیر بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔'') بحار الانوار، ج 69، ص 222، حدیث 8، بحوالہ تفسیر عیاشی۔(

پس مجموعی طور پر لوگوں کا ایمان دو قسموں میں تقسیم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا ایمان ان کے دل میں راسخ، ثابت اور پائیدار ہوتا ہے، جبکہ بعض کا ایمان محض عارضی طور پر ان کے سپرد کیا گیا ہوتا ہے۔

اس دوسری قسم کے ایمان کے لیے **مُعار** یعنی ''عاریتاً دیا ہوا'' یا ''ادھار دیا ہوا ایمان'' کی تعبیر بھی استعمال ہوئی ہے۔ دونوں تعبیرات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ایسا ایمان عارضی اور غیر مستحکم ہوتا ہے۔

)بحار الانوار، ج 69، ص 222، حدیث 7، بحوالہ قرب الاسناد؛ نیز ص 223، حدیث 13، بحوالہ تفسیر عیاشی۔(

ایسے عاریتی ایمان کی ایک مثال **زبیر بن عوام** کی ہے، جو رسولِ خداؐ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان کے سلسلے میں ان کا ابتدائی سابقہ نمایاں تھا اور واقعۂ سقیفہ کے زمانے میں انہوں نے امیر المؤمنین علیؑ کا بھرپور دفاع بھی کیا، لیکن بالآخر ان سے ایمان سلب ہو گیا اور وہ ایمان کے بغیر دنیا سے رخصت ہوئے۔

زبیر کے ابتدائی ایمان کے بارے میں امام صادقؑ نے فرمایا:

لَقَد مَشَی الزُّبَیرُ فی ضَوءِ الایمانِ وَ نُورِهِ حینَ قُبِضَ رَسُولُ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم حَتّی مَشی بِالسَّیفِ وَ هُوَ یَقُولُ: لا نُبایعُ اِلّا عَلِیّاً.

''جب رسولِ خداؐ کی وفات ہوئی تو زبیر ایمان کی روشنی اور اس کے نور میں چل رہا تھا، یہاں تک کہ وہ تلوار لے کر نکلا اور کہتا تھا: ہم علیؑ کے سوا کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔'') بحار الانوار، ج 69، ص 223، حدیث 10، بحوالہ تفسیر عیاشی۔(

پس واضح ہے کہ رسولِ خداؐ کی وفات کے وقت زبیر منافق نہیں تھا، بلکہ وہ مؤمن تھا اور سلمان، ابوذر اور مقداد کے ساتھ ان چار افراد میں شمار ہوتا تھا جو امیر المؤمنین علیؑ کی امامت و جانشینی کے دفاع میں ثابت قدم رہے۔

لیکن یہی شخص آخر کار اس مقام تک پہنچ گیا کہ امیر المؤمنین علیؑ کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا اور دوسروں کو بھی آپؑ کے خلاف لڑنے پر ابھارا۔ بالآخر اس نے اپنا ایمان کھو دیا اور حالتِ کفر میں دنیا سے رخصت ہوا۔

ایسادردناک انجام ہر اس شخص کے لیے ممکن ہے جس کا ایمان محض **عاریتی** ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ کس کا ایمان مستقر ہے اور کس کا مستودع؟

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ جَبَلَ النَبِیّینَ عَلی نُبُوَّتِھِم فَلا یَرتَدُّونَ اَبَداً. وَ جَبَلَ الاَوصیاءَ عَلی وَصایاھُم فَلا یَرتَدُّونَ اَبَداً. وَ جَبَلَ بَعضَ المُؤمِنینَ عَلَی الایمانِ فَلا یَرتَدُّونَ اَبَداً.. وِ مِنھُم مِن اُعیرَ الایمانَ عارِیَةً، فَاِذا ھُوَ دَعا وَ اَلَحَّ فِی الدُّعاءِ، ماتَ عَلَی الایمانِ.

''اللہ نے انبیاء کو ان کی نبوت پر ایسا قرار دیا ہے کہ وہ کبھی اس سے نہیں پلٹتے، اور اوصیاء کو ان کی وصایت پر ایسا قرار دیا ہے کہ وہ کبھی اس سے نہیں پلٹتے۔ اسی طرح بعض مؤمنین کو ایمان پر ایسا قرار دیا ہے کہ وہ کبھی ایمان سے نہیں پلٹتے۔ لیکن ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنہیں ایمان عاریتاً دیا گیا ہے۔ پس اگر ایسا شخص دعا کرے اور دعا میں مسلسل اصرار والحاح کرتا رہے تو وہ ایمان ہی پر دنیا سے رخصت ہو گا۔'')اصول الکافی، ج2، ص419، کتاب الایمان والکفر، باب المعارین، حدیث 5۔(

چونکہ انبیاء اور ان کے اوصیاء لوگوں پر اللہ کی حجت ہیں اور اللہ انہی کے ذریعے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے، اس لیے اللہ نے انہیں خطا اور انحراف سے محفوظ رکھا ہے۔ ان کے ایمان کے ساتھ ساتھ ان کی نبوت یا وصایت کی بھی ضمانت دی گئی ہے۔ لہٰذا نہ پیغامِ الٰہی پہنچانے میں ان کے انحراف کا کوئی امکان ہے اور نہ اس وصایت میں جو اللہ نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔ ان دونوں گروہوں کی حیثیت واضح ہے۔

باقی اہلِ ایمان میں بھی بعض افراد ایسے ہیں جن کے ایمان کی پائیداری کی ضمانت اللہ کی طرف سے ہے، لیکن یہ ضمانت ہر شخص کے لیے نہیں۔ پس انبیاء اور اوصیاء کے علاوہ عام اہلِ ایمان دو گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں: ایک وہ جن کا ایمان **مستقر** ہے، اور دوسرے وہ جن کا ایمان **مستودع** ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا ایمان موت کے لمحے تک ان کے ساتھ باقی رہے، انہیں سب سے پہلے اپنا دین اور اپنے اعتقادات **کتابِ خدا اور سنت** ہی سے اخذ کرنے چاہییں۔ دین حاصل کرنے

میں انہیں ایسے شخصی رجحانات کی طرف نہیں جانا چاہیے جو بظاہر عقلی معلوم ہوں، نہ محض آبائی و تقلیدی عقائد پر اعتماد کرنا چاہیے، اور نہ ایسی تاویلات کو دین میں داخل کرنا چاہیے جن کی کوئی مضبوط اور معتبر بنیاد نہ ہو۔

ایمانِ مستقر کے حصول میں توفیقِ الٰہی

عظیم شیعہ محدث اور بے مثال کتاب الکافی کے مؤلف مرحوم علامہ کلینیؒ نے اپنی گراں قدر کتاب کے مقدمے میں اسی موضوع سے متعلق امامؑ سے ایک روایت نقل کی ہے:

مَن اَخَذَ دینَهُ کِتابِ اللهِ وَ سُنَّةِ نَبِیِّهِ صَلَواتُ اللهّ عَلَیه وَ آلِهِ، زالَتِ الجِبالُ قَبلَ اَن یَزُولَ. وَ مَن اَخَذَ دینَهُ مِن اَفواهِ الرِّجالِ، رَدَّتهُ الرِّجالُ.

''جو شخص اپنا دین کتابِ خدا اور اس کے نبیؐ کی سنت سے حاصل کرے، اس کے اپنے دین سے ہٹنے سے پہلے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔ لیکن جو اپنا دین لوگوں کے منہ سے حاصل کرے، وہی لوگ اسے اس کے دین سے پھیر دیں گے۔''

)مقدمۂ الکافی، ص 7۔(

''لوگوں کے منہ سے دین لینے'' کا مطلب یہ ہے کہ انسان دلیل و حجت کے بغیر ایسی شخصیات کی پیروی اور تقلید کرے جن کے اپنے عقائد مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہوں، خواہ وہ عقل اور عقلانیت کے نام پر کتنی ہی زیادہ گفتگو کیوں نہ کرتے ہوں۔ جس طرح انسان نے اپنا دین ایسے لوگوں سے حاصل کیا ہے، اسی طرح انہی کے ذریعے وہ اپنا دین کھو بھی سکتا ہے۔

مرحوم علامہ کلینیؒ اس شریف روایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مَن اَرادَ اللهُ تَوفیقَهُ وَ اَن یَکُونَ ایمانَهُ ثابِتاً مُستَقِرّاً، سَبَّبَ لَهُ الاَسبابُ الَّتی تُؤَدِّیهِ اِلی اَن یأخُذَ دینَهُ مِن کِتابِ اللهِ وَ سُنَةِ نَبِیِّهِ صَلَواتُ اللهِ عَلَیهِ وَ آلِهِ بِعِلمٍ وَ یَقینٍ وَ بَصیرَةٍ. فَذاکَ اَثبَتُ فی دینِهِ مِنَ الجِبالِ الرَّواسی. وَ مَن اَرادَ اللهُ خِذلانَهُ وَ اَن یَکُونَ دینُهُ مُعاراً مُستَودَعاً، سَبَّبَ لَهُ اَسبابَ الاِستِحسانِ وِ التَّقلیدِ وَ التَّأویلِ مّن غَیرِ عِلمٍ وَ بَصیرَةٍ.

''اللہ جس شخص کو توفیق دینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا ایمان ثابت اور مستقر رہے، اس کے لیے ایسے اسباب مہیا فرماتا ہے جو اسے اس مقام تک پہنچاتے ہیں کہ وہ اپنا دین کتابِ خدا اور اپنے نبیؐ کی سنت سے **علم، یقین اور بصیرت** کے ساتھ حاصل کرے۔ ایسا شخص اپنے دین میں مضبوط و استوار پہاڑوں سے بھی زیادہ ثابت قدم ہوتا ہے۔

اور اللہ جس شخص کو خذلان میں چھوڑنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا دین عاریتی اور مستودع رہے، اس کے لیے ایسے اسباب پیش آتے ہیں جن کے نتیجے میں وہ علم و بصیرت کے بغیر شخصی پسند و استحسان، تقلید اور تاویل کا راستہ اختیار کرتا ہے۔''

)مقدمۃ الکافی، ص 8۔(

توفیق بھی اللہ کی طرف سے ہے اور **خذلان** بھی۔

علامہ **کلینیؒ** کے بیان کے مطابق اگر کسی شخص کو توفیقِ الٰہی نصیب ہو جائے تو اللہ اس کے لیے ایسے اسباب فراہم فرماتا ہے کہ وہ دین کے معاملے میں صحیح عقل، قرآن، سنتِ رسولؐ اور آپؐ کی پاک عترت کے سوا کسی اور چیز کو بنیاد نہ بنائے۔

ہر رائے اور ہر شخصی پسند کو محض اس لیے اہمیت نہ دے کہ اسے ''عقل کا فیصلہ'' کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ نہ اپنے آپ کو اور نہ کسی دوسرے شخص کو یہ حق دے کہ وہ اپنی ذاتی رائے اور نظریے کو دین میں داخل کرے۔ شخصیات کی اندھی تقلید نہ کرے اور نہ کسی کو یہ اجازت دے کہ منقول دینی دلائل پر ایسی تاویلات مسلط کرے جن کی خود نقل و نص میں کوئی معتبر بنیاد موجود نہ ہو، یا صریح دینی نصوص سے روگردانی کرے۔

اگر انسان ان امور میں لغزش کا شکار ہو جائے تو وہ **خذلانِ الٰہی** کے خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے، یعنی اس خاص مدد و توفیقِ الٰہی سے محروم ہو کر اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

پس انسان کے دین کے استحکام کا ایک بنیادی عامل اس کے اعتقادی مبانی کی مضبوطی ہے، اور یہ مضبوطی قرآن و حدیث سے گہری، سنجیدہ اور بصیرت مندانہ وابستگی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ایمان کے استحکام کا ایک اور نہایت اہم عامل **اپنے اعمال کی نگرانی اور احکامِ دین کی عملی پابندی** ہے۔

اس عامل کی اہمیت اس قدر ہے کہ روایات میں اسے وہ نمایاں عملی علامت قرار دیا گیا ہے جس کے ذریعے ایمانِ مستقر اور ایمانِ مستودع کے درمیان فرق پہچانا جا سکتا ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ الحَسرَةَ وَ النَّدامَةَ وَ الوَیلَ کُلَّهُ لِمَن لَم یَنتَفِع بِما اَبصَرَهُ وَ لَم یَدرِ مَا الاَمرُ الَّذی هُوَ عَلَیهِ مُقیمٌ اَنَفعٌ لَهُ اَم ضَرٌّ.

”تمام حسرت، ندامت اور ہلاکت اس شخص کے لیے ہے جس نے اس حقیقت سے فائدہ نہ اٹھایا جسے اس نے پہچان لیا تھا، اور اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ جس روش پر وہ قائم ہے وہ اس کے لیے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ۔“

راوی نے عرض کیا:

فَبِمَ یُعرَفُ النّاجی مِن هؤلاءِ جُعِلتُ فِداکَ؟

”میں آپ پر قربان! ان لوگوں میں سے نجات پانے والے کو کس علامت سے پہچانا جائے؟“

امامؑ نے فرمایا:

مَن کانَ فِعلُهُ لِقَولِهِ مُوافِقاً فَاَثبِتَ لَهُ الشَّهادَةُ بِالنَّجاةِ. وَ مَن لَم یَکُن فِعلُهُ لِقَولِهِ مُوافِقاً، فَاِنَّما ذلِکَ مُستَودَعٌ.

”جس شخص کا عمل اس کے قول [اور عقیدے] کے مطابق ہو، اس کے لیے نجات کی گواہی ثبت کرو۔ لیکن جس کا عمل اس کے قول [اور عقیدے] کے مطابق نہ ہو، اس کا ایمان صرف مستودع ہے۔“

(اصول الکافی، ج2، ص419، کتاب الایمان والکفر، باب ایمانِ عاریتی کی علامت، حدیث 1۔)

یہ شریف روایت جس قدر تنبیہ آمیز ہے، اسی قدر سبق آموز بھی ہے۔

اہلِ ایمان کو چاہیے کہ اللہ نے انہیں جس عظیم نعمت سے نوازا ہے، اس کی قدر پہچانیں۔ اس نعمت کی حقیقی قدر دانی یہ ہے کہ **ایمان اور ولایتِ اہلِ بیتؑ کی نعمت سے صحیح اور بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔**

اگر کوئی مؤمن اس بے مثال نعمت سے فائدہ نہ اٹھائے تو ممکن ہے آخر کار اس کے حصے میں حسرت، ندامت اور عذاب کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔

یہاں **بصیرت** اور **تفقّہ فی الدین** کی نعمت نہایت بنیادی کردار ادا کرتی ہے، کیونکہ انہی کے ذریعے انسان سیکھتا ہے کہ ایمان کی نعمت سے صحیح فائدہ کیسے اٹھایا جائے۔ مؤمن کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اپنے ایمان سے زیادہ سے زیادہ روحانی فائدہ کس طرح حاصل کرے۔

اس روایت میں جس نکتے پر خاص تاکید کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان **اپنے ایمان اور اپنے اقرار کے مطابق عمل کرے۔**

عربی لفظ **قول** عقیدے اور زبان سے ادا کیے گئے کلام دونوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ قول ہے جو حقیقی عقیدے سے پیدا ہو اور اسی کی ترجمانی کرے۔

پس اگر کوئی شخص یہ عقیدہ اور اقرار رکھتا ہے کہ ائمہؑ اللہ کی طرف سے سخن کہتے ہیں اور ان کی تعلیمات انسان کو ابدی سعادت تک پہنچاتی ہیں تو اس کا عمل بھی اسی عقیدے کے مطابق ہونا چاہیے۔

اگر اس کے اعمال اس کے عقیدے کے مطابق ہوں تو اسے نجات پانے والوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اس کا ایمان ابھی **عاریتی اور مستودع** ہے اور ممکن ہے موت کا لمحہ آنے سے پہلے ہی اس سے سلب ہو جائے۔

مرحوم علامہ مجلسیؒ اس شریف روایت کے آخری جملے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

»وَ مَن لَم یَکُن فِعلُهُ لِقَولِهِ مُوافِقاً» اَی بِاَن یَکُونَ قَولُهُ حَقّاً وَ فِعلُهُ باطِلاً کَما هُوَ شَأنُ اَکثَرِ الخَلقِ «فَاِنَّما ذلِکَ مُستَودَعٌ» ایمانُهُ غَیرُ ثابِتٍ فیهِ. فَیَحتَمِلُ اَن یَبقی عَلَی الحَقِّ وَ یَثبُتَ لَهُ الایمانُ وَ تَحصُلَ لَهُ النَّجاةُ وَ اَن یَزُولَ عَنِ الحَقِّ وَ یَعُودَ اِلَی الشِّقاوَةِ وَ یَستَحِقَّ الوَیلَ وَ الحَسرَةَ وَ النَّدامَةَ.

"""اور جس کا عمل اس کے قول کے مطابق نہ ہو، یعنی اس کا قول اور عقیدہ حق ہو لیکن اس کا عمل باطل ہو، جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے۔

'تو اس کا ایمان صرف مستودع ہے، یعنی اس کے اندر ایمان ثابت و مستحکم نہیں ہوا۔ لہٰذا دونوں امکانات موجود ہیں: ممکن ہے وہ حق پر باقی رہے، اس کا ایمان ثابت و مستقر ہو جائے اور اسے نجات حاصل ہو جائے؛ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ حق سے ہٹ جائے، دوبارہ شقاوت کی طرف پلٹ جائے اور ہلاکت، حسرت اور ندامت کا مستحق بنے۔"

)بحار الانوار، ج69، ص219، حدیث2 کے ذیل میں۔(

جیسا کہ مرحوم علامہ مجلسیؒ نے فرمایا، بہت سے اہلِ ایمان عملی زندگی میں اس راستے پر نہیں چلتے جس کا وہ زبان سے اقرار اور دل سے اعتقاد رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ ان افراد میں شامل ہیں جن کا ایمان **عاریتی** ہے۔ اسی وجہ سے ان کے انجام کے بارے میں سنجیدہ تشویش کا مقام ہے۔

ایک ہی دن میں ایمان سلب ہو سکتا ہے

یہ معاملہ اس قدر نازک ہے کہ انسان ایک ہی دن میں اپنا راستہ بدل سکتا ہے: صبح ایمان پر ہو اور شام تک کفر میں داخل ہو جائے، یا صبح کفر کی حالت میں ہو اور شام تک ایمان لے آئے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ العَبدَ یُصبِحُ مُؤمِناً وَ یُمسی کافِراً، وَ یُصبِحُ کافِراً وَ یُمسی مُؤمِناً. وَ قَومُ یُعارُونَ الایمانَ ثُمَّ یُسلَبُونَهُ وَ یُسَمَّونَ المُعارینَ.

"بندہ صبح مؤمن ہوتا ہے اور شام کو کافر ہو جاتا ہے، اور کبھی صبح کافر ہوتا ہے اور شام کو مؤمن ہو جاتا ہے۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں ایمان عاریتاً دیا جاتا ہے، پھر ان سے سلب کر لیا جاتا ہے۔ انہیں **مُعارین** کہا جاتا ہے، یعنی وہ لوگ جنہیں ایمان بطور عاریت دیا گیا ہو۔"

)اصول الکافی، ج2، ص418، کتاب الایمان والکفر، باب المعارین، حدیث 2۔(

لہٰذا جن لوگوں کو ولایت کا بیش قیمت گوہر اور امامت کا اکسیر عطا ہوا ہے، انہیں انتہائی ہوشیاری اور مراقبت کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ گناہوں کے ارتکاب کے ذریعے وہ خود کو اس بے مثال نعمتِ الٰہی کے سلب ہو جانے کا مستحق بنالیں۔ اور اس قسم کی سزا کے لیے ضروری نہیں کہ ایک طویل زمانہ گزرے؛ ممکن ہے یہ تبدیلی **ایک ہی دن، بلکہ ایک ہی ساعت میں** واقع ہو جائے۔

تمام مؤمنین اسی دنیا میں جنت میں ہیں

امام صادقؑ نے اس حقیقت کو کس قدر خوب صورت انداز میں بیان فرمایا!

آپؑ کی مجلس میں ایک شخص نے عرض کیا:

اَسالُ اللهَ الجَنَّةَ.

''میں اللہ سے جنت کا سوال کرتا ہوں۔''

امامؑ نے فرمایا:

اَنتُم فِی الجَنَّةِ. فَاسالُوا اللهَ اَن لا یُخرِجَکُم مِنها.

''تم تو جنت میں ہو؛ پس اللہ سے دعا کرو کہ وہ تمہیں اس سے باہر نہ نکالے۔''

انہوں نے عرض کیا:

جُعِلنا فِداکَ نَحنُ فِی الدُّنیا!

''ہم آپ پر قربان! ہم تو ابھی دنیا میں ہیں''!

امامؑ نے فرمایا:

اَلَستُم تُقِرُّونَ بِامامَتِنا؟

''کیا تم ہماری امامت کا اقرار نہیں کرتے؟''

انہوں نے عرض کیا: ''کیوں نہیں۔''

امامؑ نے فرمایا:

هذا مَعنَى الجَنَّةِ الَّذى مَن اَقَرَّ بِهِ كانَ فِى الجَنَّةِ. فَاسأَلُوا اللهَ اَن لا يَسلُبَكُم.

''یہ امامت ہی اس جنت کا معنی ہے؛ جو اس کا اقرار رکھتا ہے وہ جنت میں ہے۔ پس اللہ سے دعا کرو کہ وہ اسے تم سے سلب نہ کرے۔'') بحار الانوار، ج68، ص102، حدیث 11، بحوالہ المحاسن، برقی۔(

واقعی، ائمہؑ کی امامت و ولایت پر ایمان اور اس کا اقرار خود ایک جنت ہے، کیونکہ بالآخر یہی نعمت انسان کو جنتِ آخرت تک پہنچاتی ہے۔

لہٰذا جس شخص کو یہ بے قیمت نعمت نصیب ہوئی ہو، اسے دعا، تضرع اور بارگاہِ الٰہی میں عاجزی کے ساتھ ساتھ انتہائی ہوشیاری اور مراقبت کے ذریعے اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اپنے برے اعمال کے سبب خود کو اس نعمت سے محرومی کا مستحق نہیں بنانا چاہیے۔ پس اس طریقے کے علاوہ جسے پہلے علامہ کلینیؒ سے الکافی کے مقدمے میں نقل کیا گیا، اس بے مثال نعمت کی حفاظت کے دو اور نہایت اہم اسباب ہیں:

ایک، مسلسل اور اصرار کے ساتھ یہ دعا کرنا کہ ایمان موت کے لمحے تک باقی رہے؛ اور دوسرا، ورع یعنی گناہ سے انتہائی احتیاط اور پرہیز کے ذریعے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنا۔

موت تک ایمان کی حفاظت کے لیے دعائیں

دین و ایمان کی حفاظت کے لیے بہت سی دعائیں اور اعمال نقل ہوئے ہیں۔ یہاں ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔ ''اے ہمارے پروردگار! ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو منحرف نہ فرما''

اس موضوع سے متعلق قرآنِ کریم کی نہایت خوب صورت دعا یہ ہے:

»رَبَّنا لا تُزِغ قُلُوبَنا بَعدَ اِذ هَدَيتَنا وَ هَب لَنا مِن لَدُنکَ رَحمَةً اِنَّکَ اَنتَ الوَهّابُ.«

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو منحرف نہ فرما، اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما؛ بے شک تو ہی بہت عطا فرمانے والا ہے۔'' (قرآن، 8:3)

لفظ **زَیغ** کے معنی حق سے منحرف ہونے اور اس سے پھر جانے کے ہیں۔

قرآنِ کریم میں خود اس دعا کی تعلیم دیا جانا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اگر اللہ کی رحمت انسان کے شاملِ حال نہ رہے تو اس کا دل ایمان اور حق سے منحرف ہو کر گمراہی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

اس آیۂ شریفہ کے ذیل میں امام صادقؑ نے فرمایا:

اَکثِرُوا مِن اَن تَقُولُوا: «رَبَّنا لا تُزِغ قُلُوبَنا بَعدَ اِذ هَدَیتَنا». وَ لا تَأمَنُوا الزَّیغَ.

''کثرت سے کہا کرو :**رَبَّنا لا تُزِغ قُلُوبَنا بَعدَ اِذ هَدَیتَنا** ——اے ہمارے پروردگار! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو منحرف نہ فرما——اور کبھی اپنے آپ کو انحراف سے محفوظ و بے خطر نہ سمجھو۔'' (تفسیر عیاشی، ج1، ص164، حدیث 9۔)

2۔ ہر واجب نماز کے بعد ایک دعا

اسی مقصد کے لیے ایک اور دعا واجب نمازوں کے تعقیبات میں نقل ہوئی ہے۔

محمد بن سلیمان دیلمی نے امامؑ سے عرض کیا: ''میں آپ پر قربان! آپ کے شیعہ کہتے ہیں کہ ایک ایمان مستقر ہوتا ہے اور ایک ایمان مستودع۔ مجھے کوئی ایسی چیز تعلیم فرمایئے جسے پڑھوں تو میرا ایمان کامل ہو جائے اور مجھ سے سلب نہ ہو۔''

امامؑ نے فرمایا:

قُل فی دُبُرِ کُلِّ صَلاةٍ فَریضَةٍ. رَضیتُ بِاللهِ رَبّاً وَ بِمُحَمَّدٍ نَبِیّاً وَ بِالقُرآنِ کِتاباً وَ بِالکَعبَةِ قِبلَةً وَ بِعَلِیٍّ وَلِیّاً وَ اِماماً وَ بِالحَسَنِ وَ الحُسَینِ وَ الاَئِمَّةِ صَلَواتُ اللهِ عَلَیهِم. اللّهُمَّ اِنّی رَضیتُ بِهِم اَئِمَّةً، فَارضَنی لَهُم. اِنَّکَ عَلی کُلِّ شَیءٍ قَدیرٌ.

''ہر واجب نماز کے بعد کہو:

میں اللہ کے رب ہونے پر راضی ہوں، محمدؐ کے نبی ہونے پر، قرآن کے اپنی کتاب ہونے پر، کعبہ کے قبلہ ہونے پر، علیؑ کے اپنے ولی اور امام ہونے پر، اور حسنؑ، حسینؑ اور تمام ائمہؑ — جن پر اللہ کی صلوات ہو — کے اپنے امام ہونے پر راضی ہوں۔ اے اللہ! میں نے انہیں اپنے ائمہ کے طور پر قبول کیا ہے؛ پس مجھے ان کے لیے پسندیدہ اور مقبول قرار دے۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔") تہذیب الاحکام، ج2، ص109، حدیث180۔(

3۔ نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کے بعد ایک ذکر

اسی مقصد کے لیے ایک اور دعا نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کے تعقیبات میں نقل ہوئی ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

مَن قالَ فی دُبُرِ صَلاةِ الفَجرِ وَ دُبُرِ صَلاةِ المَغرِبِ سَبعَ مَرّاتٍ: «بِسمِ اللهِ الرَّحمنِ الرَّحیم لا حَولَ وَ لا قُوَّةَ اِلّا بِاللهِ العَلِیِّ العَظیمِ» دَفَعَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ عَنهُ سَبعینَ نَوعاً مِن اَنواعِ البَلاءِ ... وَ اِن کانَ شَقِیّاً، مُحِیَ مِنَ الشَّقاءِ وَ کُتِبَ مِنَ السُّعَداءِ.

"جو شخص نمازِ فجر کے بعد اور نمازِ مغرب کے بعد سات مرتبہ کہے:

بِسمِ اللهِ الرَّحمنِ الرَّحیم لا حَولَ وَ لا قُوَّةَ اِلّا بِاللهِ العَلِیِّ العَظیمِ

اللہ عزوجل اس سے ستر قسم کی بلائیں دور فرمائے گا... اور اگر وہ اہلِ شقاوت میں لکھا ہوا ہو تو اس کا نام شقاوت والوں میں سے مٹا کر اسے اہلِ سعادت میں لکھ دیا جائے گا۔"

)اصول الکافی، ج2، ص531، کتاب الدعاء، باب صبح و شام کہے جانے والے اذکار، حدیث25۔(

اس شریف ذکر پر مداومت انسان کو شقاوت سے نکال کر سعادت کی طرف لے جا سکتی ہے۔

انسان کی حقیقی اور آخری سعادت یا شقاوت موت کے وقت واضح ہوتی ہے۔ اگر وہ ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو تو سعادت مند ہے، اور اگر ایسا نہ ہو تو شقاوت میں گرفتار ہے۔

امیر المؤمنین علیؑ سے روایت ہے:

حَقیقَةُ السَّعادَةِ اَن یَختِمَ الرَّجُلُ عَمَلَهُ بِالسَّعادَةِ. وَ حَقیقَةُ الشَّقاء اَن یَختِمَ المَرءُ عَمَلَهُ بِالشَّقاءِ.

”حقیقی سعادت یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا اختتام سعادت پر ہو، اور حقیقی شقاوت یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا اختتام شقاوت پر ہو۔“) بحار الانوار، ج 5، ص 154، حدیث 5، بحوالہ الخصال۔(

پس انسان کی آخری سعادت یا شقاوت کا معیار **اس کا انجام اور وہ حالت ہے جس میں اسے موت آتی ہے۔**

اسی لیے انسان کو ہمیشہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اس کی زندگی اور اس کے اعمال کا اختتام خیر و سعادت پر ہو۔

4۔ ”مجھے عاریتی ایمان والوں میں قرار نہ دینا“

اسی مقصد کے لیے امام ہادیؑ سے ایک اور دعا نقل ہوئی ہے:

اَکثِر مِن اَن تَقُولَ: «اللّهُمَّ لا تَجعَلنی مِنَ المُعارینَ وَ لا تُخرِجنی مِنَ التَّقصیرِ».

”کثرت سے یہ دعا کیا کرو: اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں قرار نہ دے جن کا ایمان عاریتی ہے، اور مجھے اپنے آپ کو تیری بندگی میں کوتاہ سمجھنے کی حالت سے باہر نہ نکال۔“

)اصول الکافی، ج 2، ص 73، کتاب الایمان والکفر، باب اعتراف بالتقصیر، حدیث 4۔(

دعا کے دوسرے حصے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے فضل و عنایت سے انسان عبادت میں اپنی تمام کوشش اور جد و جہد کے باوجود ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے پروردگار کا حق ادا کرنے میں **قاصر اور کوتاہ** سمجھے۔ کبھی یہ خیال نہ کرے کہ اس نے اللہ کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہے۔

اس شریف دعا میں ہم صراحت کے ساتھ اللہ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے ایمان کو **ثابت، پائیدار اور مستقر** قرار دے۔

5۔ روزِ غدیر کی دعا

اس سلسلے کی ایک اور مثال وہ دعا ہے جو امام صادقؑ سے روزِ غدیر کے اعمال میں نقل ہوئی ہے۔

اگرچہ یہ شریف دعا خصوصاً زیرِ بحث موضوع ہی کے لیے وارد نہیں ہوئی، لیکن چونکہ اسے **روزِ غدیر** میں پڑھا جاتا ہے—وہ دن جس میں عہدِ ولایت و ایمان کی تجدید کی جاتی ہے—اس لیے یہاں اس کا ذکر مناسب ہے۔

اس دعا کے آخری حصے میں ہم پڑھتے ہیں:

اللّٰهُمَّ اِنّی اَسالُکَ ... اِن تُبارِکَ لَنا فی یَومِنا هذا ... وَ تَمُنَّ عَلَینا بِنِعمَتِکَ وَ تَجعَلَهُ عِندَنا مُستَقِرّاً ثابِتاً وَ لا تَسلُبَنا اَبَداً وَ لا تَجعَلَهُ عِندَنا مُستَودَعاً. فَاِنَّکَ قُلتَ: «فَمُستَقَرٌّ وَ مُستَودَعٌ». فَاجعَلهُ مُستَقِرّاً ثابِتاً.

''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں... کہ ہمارے لیے آج کے اس دن کو بابرکت قرار دے... اور اپنی اس نعمت سے ہم پر احسان فرما، اور اسے [امامت وولایت کو] ہمارے اندر **مستقر اور ثابت** قرار دے؛ اسے ہم سے کبھی سلب نہ فرما اور ہمارے پاس اسے محض **مستودع اور عارضی امانت** نہ بنا۔

کیونکہ تو نے خود فرمایا ہے:

»**فَمُستَقَرٌّ وَ مُستَودَعٌ**«

'پس ایک مستقر ہے اور ایک مستودع۔'

لہٰذا اسے ہمارے اندر مستقر اور ثابت قرار دے۔) ''قرآن، 6:98(

)بحار الانوار، ج98، ص307، حدیث 2، بحوالہ اقبال الاعمال۔(

مذکورہ دعاؤں اور اعمال کے علاوہ بھی مختلف مواقع کے لیے اس موضوع سے متعلق بہت سے اعمال اور دعائیں نقل ہوئی ہیں۔ اختصار کی خاطر ہم یہاں ان سب کو نقل نہیں کرتے۔

مزید تفصیل کے خواہش مند سید مجتبیٰ بحرینی کی گراں قدر کتاب باپسرم در سکرات، صفحات 134 تا 160 کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

باب پنجم: ایمان اور عمل کا باہمی تعلق

اب ہم **ایمان اور عمل کے باہمی تعلق** پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں ''عمل'' سے مراد **اطاعت اور معصیت** ہے، یعنی شریعت کے احکام کی پیروی کرنا یا ان کی نافرمانی کرنا۔

ورع کے ذریعے ایمان کی حفاظت

دین و ایمان کی حفاظت اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے جس تیسرے عامل پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، وہ **ورع** کی رعایت ہے۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

اِتَّقُوا اللهَ وَ صُونُوا دِينَكُم بِالوَرَعِ.

''اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور ورع کے ذریعے اپنے دین کی حفاظت کرو۔''

(اصول الکافی، ج2، ص76، کتاب الایمان والکفر، باب الورع، حدیث 2۔)

ورع کا مطلب یہ ہے کہ انسان یقینی حرام سے ایک محفوظ فاصلہ قائم رکھے۔ وہ اپنی عملی روش اس طرح اختیار کرے کہ اسے اطمینان رہے کہ وہ اللہ کی حرام کردہ چیز میں مبتلا نہیں ہوگا۔

یہ مقصد صرف اس حد تک فقہی احکام کی پابندی سے حاصل نہیں ہوتا کہ انسان واجب کو انجام دے اور حرام سے بچے۔ **فقہ** احکامِ الٰہی اور ان کی حدود کو بیان کرتی ہے۔ اس کے ذریعے حلال و حرام، واجب و مستحب اور دیگر شرعی احکام کی حدیں واضح ہوتی ہیں۔ جب کسی چیز کو ''حرام'' قرار دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ لیکن **ورع** اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایسی **عقلی احتیاط** کا نام ہے جس کے ذریعے انسان یہ اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ حرام میں مبتلا ہی نہ ہو۔ کبھی یہ احتیاط خود **حکم** کے بارے میں ہوتی ہے اور کبھی کسی معین مورد پر اس حکم کے **انطباق** کے بارے میں۔

حکم کے سلسلے میں احتیاط کی صورت مثلاً وہاں پیش آتی ہے جہاں شرعی دلائل کسی فقیہ کے لیے کسی چیز کی حرمت پر اس قدر اطمینان بخش نہ ہوں کہ وہ اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دے سکے۔ ایسی صورت میں ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ان امور سے بھی اجتناب کرے جن کا حکم یقینی طور پر معلوم نہیں اور جن کے حرام ہونے کا احتمال موجود ہے۔

کبھی خود شرعی حکم بالکل واضح ہوتا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی خاص مورد اس حکم کے تحت آتا ہے یا نہیں۔ یہاں بھی ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مشتبہ موارد سے پرہیز کرے۔ جن امور کی حرمت یقینی طور پر معلوم نہ ہو، انہیں **شبہات** یا **مشتبہ امور** کہا جاتا ہے، خواہ یہ شک خارجی حقیقت اور موضوع کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوا ہو یا خود شرعی حکم کے بارے میں تردّد کی بنا پر۔ پس ورع کا ملکہ صرف یقینی حرام سے بچنے کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ **مشتبہ امور سے اجتناب** بھی اس میں شامل ہے؛ یعنی ان چیزوں سے بھی بچنا جن کا حرام ہونا معلوم نہیں، لیکن جن کے ذریعے حرام میں پڑنے کا خطرہ ہو یا جو حرام سے مشابہ و مشتبہ ہوں۔ ائمۂ طاہرینؑ نے فرمایا:

اَورَعَ النّاسِ مِن وَقَفَ عِندَ الشُّبهَةِ.

''سب سے زیادہ صاحبِ ورع وہ ہے جو شبہ کے مقام پر رک جائے۔'' (بحار الانوار، ج70، ص305، حدیث 25، بحوالہ الخصال۔)

دین کے معاملے میں احتیاط کرنا خود **عقل کا حکم** ہے۔ عقل انسان سے کہتی ہے کہ یقینی حرام کی سرحد تک پہنچنے سے پہلے ہی رک جاؤ، تاکہ تمہیں اطمینان رہے کہ حرام میں داخل نہیں ہوگے۔ اگر کوئی شخص ہمیشہ عین سرحد پر چلتا رہے تو اس کے دوسری طرف پھسل جانے کا امکان بہت زیادہ ہے۔ اسی لیے حرام میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہنے کے لیے عقل اسے حکم دیتی ہے: **احتیاط کرو۔** ہم دنیاوی اور مادی معاملات میں بھی بالکل اسی قسم کی عقلی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ جہاں کسی سنجیدہ خطرے کا احتمال ہو، وہاں بے پروائی سے کام نہیں لیتے۔ مثلاً ہم کسی بلند کھائی کے برف سے جمے ہوئے کنارے پر چلتے ہوئے یہ نہیں کہیں گے کہ: ''ہمیں یقین تو نہیں کہ ہم نیچے گر جائیں گے''!

بلکہ ہم کہیں گے کہ چونکہ گرنے کا احتمال معقول اور سنجیدہ ہے، اس لیے عقل احتیاط کا حکم دیتی ہے۔ چنانچہ ہم کنارے سے اتنا فاصلہ اختیار کرتے ہیں کہ ہمیں اطمینان ہو جائے کہ ہم کھائی میں نہیں گریں گے۔

اگر دنیاوی اور مادی امور میں ایسی احتیاط عاقلانہ سمجھی جاتی ہے **تو دین کے معاملے میں اس کی ضرورت کہیں زیادہ ہے**، کیونکہ یہاں ممکنہ نقصان کہیں زیادہ گہرا اور سنگین ہے۔ امیر المؤمنین علیؑ نے اپنے خاص اور مقرب اصحاب میں سے کمیل بن زیاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

یا کُمَیلُ، اَخُوکَ دینُکَ. فَاحتَط لِدینِکَ بِما شِئتَ.

''اے کمیل! تمہارا دین تمہارا بھائی ہے؛ لہٰذا اپنے دین کی حفاظت کے لیے جتنی چاہو احتیاط کرو۔) ''بحار الانوار، ج2، ص 258، حدیث 4، بحوالہ امالی شیخ طوسی۔(

امیر المؤمنینؑ نے یہ نصیحت محض کسی عمومی مجلس میں نہیں فرمائی، بلکہ خاص طور پر **کمیل** کو مخاطب کیا، جو آپؑ کے ممتاز اور مقرب اصحاب میں شمار ہوتے تھے۔ لہٰذا جن لوگوں کو ائمہؑ کی ولایت اور معرفت نصیب ہوئی ہے، انہیں ایسی ہدایات کو اپنے طرزِ عمل اور کردار کا نمونہ بنانا چاہیے، نہ یہ کہ مشتبہ امور میں بھی کوئی ایسا راستہ تلاش کرتے رہیں—خواہ وہ احتیاط کے خلاف ہی کیوں نہ ہو—جس کے ذریعے اسے اپنے لیے جائز قرار دے سکیں۔

رسولِ خداؐ نے ایک نہایت سبق آموز مثال کے ذریعے اپنی امت کو مشتبہ امور سے بچنے کی ضرورت سے آگاہ فرمایا:

اِنَّ لِکُلِّ مَلِکٍ حِمًی. وَ اِنَّ حِمَی اللهِ حَلالُهُ وَ حَرامُهُ. وَ المُشتَبِهاتُ بَینَ ذلِکَ. کَما لَو اَنَّ راعِیاً رَعی اِلی جانِبِ الحِمی، لَم تَلبَث غَنَمُهُ اَن تَقَعَ فی وَسَطِهِ، فَدَعُوا المُشتَبِهاتِ.

''ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ اور ممنوعہ حدود ہوتی ہیں۔ اور اللہ کی محفوظ حدود اس کے حلال و حرام ہیں، جبکہ ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں۔ اس کی مثال ایسے چرواہے کی ہے جو اپنی بھیڑوں کو محفوظ چراگاہ کی سرحد کے بالکل قریب چرائے؛ زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ اس کی بھیڑیں اس کے اندر داخل ہو جائیں گی۔ لہٰذا مشتبہ امور کو چھوڑ دو۔''

)بحار الانوار، ج2، ص259، حدیث 6، بحوالہ امالی شیخ طوسی۔(

جب انسان مسلسل ان حدود کے بالکل قریب چلتا رہے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے تو ممکن ہے اسے احساس بھی نہ ہو اور وہ حرام میں داخل ہو جائے۔

اگر کوئی چرواہا اپنی بھیڑوں کو کسی ممنوعہ چراگاہ کی سرحد کے بالکل ساتھ چرنے دے تو وہ یہ اطمینان نہیں رکھ سکتا کہ تمام بھیڑیں اس حد کا خیال رکھیں گی اور باہر ہی رہیں گی۔ ممکن ہے اپنی اسی بے احتیاطی کے نتیجے میں اسے اچانک معلوم ہو کہ بھیڑیں ممنوعہ علاقے میں داخل ہو چکی ہیں، اور اس وقت بہت دیر ہو چکی ہو۔ انسان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اگر ہم ہمیشہ حرام کی سرحدوں کے بالکل قریب رہیں اور یہ سوچتے رہیں کہ جو کچھ فقہی طور پر حلال ہے اس سے آخری حد تک فائدہ اٹھانا چاہیے، تو ممکن ہے رفتہ رفتہ ہمیں احساس بھی نہ ہو اور ہم صریح حرام میں مبتلا ہو جائیں۔

اسی لیے عقل اور تعلیماتِ وحی دونوں انسان کو یہ ہدایت دیتی ہیں کہ وہ واضح اور یقینی حلال پر اکتفا کرے اور مشتبہ امور کے پیچھے نہ جائے، تاکہ یقینی حرام میں پڑنے کے خطرے سے محفوظ رہے۔

یہ ایسا معاملہ نہیں جس میں بے احتیاطی یا بے جا سہولت پسندی سے کام لیا جائے، کیونکہ یہاں ممکنہ نقصان نہایت سنگین اور ناقابل تلافی ہو سکتا ہے۔ اگر انسان اپنا دین ہی کھو بیٹھے تو اس نقصان کی تلافی بعد میں آسانی سے ممکن نہیں۔

اسی لیے عقل انسان کو **احتیاط کی راہ** اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

اس وضاحت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ **ورع کے ذریعے دین کی حفاظت** کس طرح ہوتی ہے۔

مؤمن، اس خوف سے کہ کہیں اس کا ایمان اس سے سلب نہ ہو جائے، ہر گناہ سے بھاگتا ہے۔ وہ کسی ایک گناہ کو بھی اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس کے بارے میں بے پروائی یا لاپرواہی اختیار کرے۔

کسی کو معلوم نہیں کہ اس کا کون سا گناہ اللہ کی ناراضی کا سبب بن جائے۔ اسی لیے وہ کسی معصیت کو معمولی نہیں سمجھتا۔

امیر المؤمنین علیؑ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ تَبارَکَ وَ تَعالی ... اَخفی رِضاهُ فی طاعَتِهِ. فَلاتَستَصغِرَنَّ شَیئاً مِن طاعَتِهِ. فَرُبَّما وافَقَ رِضاهُ وَ اَنتَ لا تَعلَمُ. وَ اَخفی سَخَطَهُ فی مَعصِیَتِهِ. فَلا تَستَصغِرَنَّ شَیئاً مِن مَعصِیَتِهِ. فَرُبَّما وافَقَ سَخَطَهُ وَ اَنتَ لا تَعلَمُ. ...

”بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے... اپنی رضا کو اپنی اطاعت کے اعمال میں پوشیدہ رکھا ہے؛ لہٰذا اس کی کسی اطاعت کو ہر گز معمولی نہ سمجھو، کیونکہ ممکن ہے اسی میں اس کی رضا ہو اور تمہیں معلوم نہ ہو۔

اور اس نے اپنی ناراضی کو اپنی نافرمانی کے اعمال میں پوشیدہ رکھا ہے؛ لہٰذا اس کی کسی معصیت کو ہر گز معمولی نہ سمجھو، کیونکہ ممکن ہے اسی میں اس کی ناراضی ہو اور تمہیں معلوم نہ ہو) “... کمال الدین، باب 26، حدیث 4۔(

انسان نہیں جانتا کہ کون سا خاص گناہ اس کے لیے ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونے میں رکاوٹ بن جائے۔

بسا اوقات انسان کسی گناہ کو بہت معمولی سمجھتا ہے، لیکن عین موت کے وقت وہی گناہ اس کے ایمان کے راستے میں ایک سنگین رکاوٹ بن جاتا ہے۔

موت کے وقت ماں کی ناراضی کا اثر

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ کے زمانے میں مدینہ کا ایک شخص سخت بیمار ہوا اور اس کی بیماری بالآخر اسے موت کے قریب لے آئی۔ جب وہ حالتِ نزع میں تھا تو رسولِ خداؐ اس کے سرہانے تشریف لائے اور اسے تلقین فرمائی کہ کہو:

لا الہ الّا اللہ

لیکن وہ شخص یہ کلمات ادا نہ کر سکا؛ اس کی زبان بولنے سے عاجز ہو گئی تھی۔

رسولِ خداؐ نے دوبارہ اسے تلقین فرمائی، مگر وہ پھر بھی یہ کلمات ادا نہ کر سکا۔

اس کے سرہانے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ رسولِ خداؐ نے اس سے پوچھا:

”کیا اس شخص کی ماں زندہ ہے؟“

اس عورت نے عرض کیا” :جی ہاں، یا رسول اللہ! میں اس کی ماں ہوں۔“

آپؐ نے پوچھا” :تم اس سے راضی ہو یا ناراض؟“

اس نے کہا” :میں اس سے ناراض ہوں۔“

رسولِ خداؐ نے فرمایا :**فَاِنّی اُحَبُّ اَن تَرضی عَنهُ.**

''میں چاہتاہوں کہ تم اس سے راضی ہو جاؤ۔''

اس نے عرض کیا'' :یارسول اللہ !آپ کی خوشنودی کی خاطر اب میں اس سے راضی ہوں۔''

رسولِ خداؐ نے ایک مرتبہ پھر اس شخص کو تلقین فرمائی :**لا اله الّا الله**

اس مرتبہ وہ شخص کہنے میں کامیاب ہو گیا :**لا اله الّا الله**

پھر رسولِ خداؐ نے اس سے فرمایا کہ کہو :**قُل: یا مَن یَقبَلُ الیَسیرَ وَ یَعفُو عَنِ الکَثیرِ، اِقبَل مِنّی الیَسیرَ وَ اعفُ عَنّی الکَثیرَ. اَنَّکَ اَنتَ العَفُوُّ الغَفُورُ.**

''اے وہ ذات جو تھوڑے سے [نیک عمل] کو قبول کرتی ہے اور بہت زیادہ [گناہوں] سے در گزر فرماتی ہے !میری تھوڑی سی نیکی کو قبول فرما اور میری بہت سی خطاؤں کو معاف فرما۔ بے شک تو ہی بہت معاف کرنے والا، بہت بخشنے والا ہے۔''

اس شخص نے یہ دعا پڑھی۔

رسولِ خداؐ نے اس سے پوچھا'' :اب تم کیا دیکھ رہے ہو؟''

اس نے کہا'' :میں دو سیاہ صورتیں دیکھ رہا ہوں جو میری طرف آئی ہیں۔''

رسولِ خداؐ نے فرمایا'' :اس دعا کو دوبارہ پڑھو۔''

اس نے پھر دعا پڑھی۔

آپؐ نے پوچھا'' :اب کیا دیکھ رہے ہو؟''

اس نے کہا'' :وہ دونوں سیاہ صورتیں مجھ سے دور ہو گئی ہیں اور دو نورانی صورتیں آ گئی ہیں۔ وہ سیاہ صورتیں چلی گئی ہیں اور اب مجھے نظر نہیں آتیں، جبکہ نورانی صورتیں میرے قریب آ گئی ہیں اور اب میری روح قبض کر رہی ہیں۔''

اسی وقت وہ شخص دنیا سے رخصت ہو گیا۔) من لایحضرہ الفقیہ، ج 1، ص 132، حدیث 347۔(

یہ ایک ایسے گناہ کی مثال ہے جس کے آثار انسان کے **ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونے میں رکاوٹ** بن گئے۔ ممکن ہے اس شخص نے کبھی یہ تصور بھی نہ کیا ہو کہ اس کی ماں کی ناراضی ایسے نازک اور فیصلہ کن لمحے میں اس کے سامنے

آ کھڑی ہو گی۔ دوسرے گناہوں کے بھی ایسے ہی آثار ہو سکتے ہیں۔اسی لیے مؤمن کسی گناہ کو معمولی یا بے اہمیت نہیں سمجھتا۔

ایمان کی گہرائی اور استحکام میں ورع کا اثر

اب امام باقرؑ کی وہ تنبیہ زیادہ واضح ہو جاتی ہے جو آپؑ نے جابر بن یزید جعفی سے فرمائی:

مَن كانَ لِلّهِ مُطيعاً، فَهُوَ لَنا وَلِيٌّ. وَ مَن كانَ لِلّهِ عاصِياً، فَهُوَ لَنا عَدُوٌّ. ما تُنالَ وِلايَتُنا اِلّا بِالعَمَلِ وَ الوَرَعِ.

''جو اللہ کا مطیع ہے وہ ہمارا ولی ہے، اور جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ ہماری ولایت عمل اور ورع کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔) ''اصول الکافی، ج2، ص75، کتاب الایمان والکفر، باب الطاعۃ والتقویٰ، حدیث 3 کے آخر میں۔(

یہاں ائمۂ طاہرینؑ کا مطلوب ایک عمومی اصول بیان کیا جا رہا ہے : **اہلِ ولایت کو احکامِ دین پر عمل کرنے والے لوگ ہونا چاہیے۔**

ائمہؑ نے خود اس عملی روش کو اپنے حقیقی محبّین کی علامت اور خصوصیت قرار دیا ہے۔ یہاں **''مطیع ''** سے مراد ایسا شخص نہیں جو زندگی میں کبھی کوئی گناہ ہی نہ کرے، بلکہ مراد وہ شخص ہے جس کی زندگی کا عمومی رخ، اپنے ائمہؑ سے محبت اور ان کی ولایت کی بنا پر، ان کے احکام پر عمل کرنے کی طرف ہو۔

ایسا شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو ان کے پیروکاروں کی صف سے جدا نہ کرے اور کوئی ایسا عمل انجام نہ دے جس سے اس پر ان کے دشمنوں کا رنگ چڑھ جائے۔ اس کی مستقل روش شریعت کے احکام کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر کبھی اس سے لغزش ہو جائے تو وہ فوراً نادم ہوتا ہے، اپنے نفس کو ملامت کرتا ہے اور اپنی خطا کی تلافی کی کوشش کرتا ہے۔

جہاں تک لفظ **''عاصی ''** کا تعلق ہے، اگر اس سے ایسا شخص مراد لیا جائے جو جان بوجھ کر دشمنی اور مخالفت کے جذبے سے اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو یقیناً ایسا شخص اللہ کا دشمن ہے، اور جو اللہ کا دشمن ہو وہ اہلِ بیتؑ کا بھی دشمن ہے۔

لیکن اس روایت کے سیاق میں لفظ ''عاصی'' کی یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ امامؑ ان لوگوں کو مخاطب فرمارہے ہیں جو خود کو اہلِ بیتؑ کے شیعہ اور محبّین میں شمار کرتے ہیں۔

بظاہر یہاں مراد ایسا گناہگار ہے جو بغاوت یا جان بوجھ کر اللہ کی مخالفت کے ارادے سے گناہ نہیں کرتا، لیکن بہر حال دھوکے میں آکر گناہ کا مرتکب ہوا اور اپنے اسی عمل کے ذریعے اس نے وقتی طور پر اپنے آپ کو اللہ اور اہلِ بیتؑ کے دشمنوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اپنے **عمل کی حیثیت سے** اس نے اہلِ بیتؑ کے دشمنوں جیسا کام کیا، کیونکہ اس سے ایسا فعل صادر ہوا جو ان کے مخالفین اور دشمنوں کے کردار سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔

فرض کیجیے کہ ایک مجلس میں اہلِ بیتؑ کے حامی اور ان کے مخالفین دونوں موجود ہیں اور دونوں گروہوں کی شناخت ان کے لباس کے الگ الگ رنگ سے ہوتی ہے۔ ایک گناہگار مؤمن نے اپنی معصیت کے ذریعے عارضی طور پر مخالف گروہ کا لباس پہن لیا۔ اگر عین اسی لمحے دونوں گروہوں کی تصویر کھینچی جائے تو وہ بھی مخالفین ہی کے درمیان نظر آئے گا۔

اصل خطرہ یہ ہے کہ کہیں اللہ اسی حالت میں اس کی موت مقدر نہ فرمادے۔ اگر ایسا ہو جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اہلِ شقاوت میں شامل ہو گیا اور اپنے آپ کو اہلِ سعادت کی صف میں باقی نہ رکھ سکا۔

لہٰذا انسان کو اللہ سے مدد طلب کرتے رہنا چاہیے اور ائمہؑ کی ہدایات سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

روایت کا آخری جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اعمال پر سنجیدہ توجہ اور ورع کی رعایت کے ذریعے انسان اہلِ بیتؑ کی ولایت کے بلند درجات حاصل کر سکتا ہے:

ما تُنالَ وِلایَتُنا اِلّا بِالعَمَلِ وَ الوَرَعِ

''ہماری ولایت عمل اور ورع کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔''

اس جملے میں جو حصر پایا جاتا ہے '' — **حاصل نہیں ہو سکتی مگر** — ''... اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر ہم یہ نہ بھی کہیں کہ اصلِ ولایت ہی عمل و ورع پر موقوف ہے، تب بھی کم از کم یہ ضرور کہنا ہوگا کہ **ولایت کے بعض درجات، ورع اور عملِ صالح کی سنجیدہ پابندی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔**

پس جو شخص چاہتا ہے کہ اس کا ایمان **مستقر** یعنی مضبوط، راسخ اور پائیدار ہو جائے، اور وہ موت کے وقت ایمان کے سلب ہو جانے کے خطرے سے محفوظ رہے، اسے چاہیے کہ **ورع کے ذریعے ایمان کی بنیادوں کو اپنے دل میں مضبوط اور مستحکم کرے**، تاکہ معمولی سے خطرے اور آزمائش کے سامنے اس کا ایمان متزلزل ہو کر اس سے جدا نہ ہو جائے۔

حسنِ عاقبت کا راستہ

امام صادقؑ کی ان ہدایات میں سے، جو آپؑ نے تحریری طور پر بیان فرمائی تھیں، ایک یہ ہے:

اِن اَردتَ اَن یُختَمَ بِخَیرٍ عَمَلَکَ حَتّی تُقبَضَ وَ اَنتَ فی اَفضَلِ الاَعمالِ، فَعَظِّم لِلّهِ حَقَّهُ اَن تَبذُلَ نَعماءَهُ فی مَعاصیهِ وَ اَن تَغتَرَّ بِحِلمِهِ عَنکَ وَ اَکرِم کُلَّ مَن وَجَدتُهُ یَذکُرُنا اَو یَنتَحِلُ مَوَدَّتَنا. ثُمَّ لَیسَ عَلَیکَ صادِقاً کانَ اَو کاذِباً اِنَّما لَکَ نَبِیُّکَ وَ عَلَیهِ کِذبُهُ.

"اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے اعمال کا خاتمہ خیر پر ہو اور تمہاری روح اس حال میں قبض کی جائے کہ تم بہترین اعمال میں مشغول ہو، تو اللہ کے حق کو اس قدر عظیم جانو کہ اس کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں صرف نہ کرو، اور تمہارے ساتھ اس کے حلم و بردباری کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

اور جس شخص کو بھی ہمارے ذکرِ خیر میں مشغول پاؤ یا ہماری مودّت کا دعویٰ کرتے دیکھو، اس کا احترام کرو۔ پھر یہ تمہاری ذمہ داری نہیں کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے یا جھوٹا۔ تمہیں تمہاری نیک نیتی کا فائدہ پہنچے گا اور اس کے جھوٹ کا وبال خود اسی پر ہو گا۔) "بحار الانوار، ج 73، ص 351، حدیث 49، بحوالہ عیون اخبار الرضا (ع)۔(

یہ ہدایات **ورع کے بعض عملی مظاہر** کو بیان کرتی ہیں، جن کی پابندی شیعوں کو کرنی چاہیے تاکہ وہ برے انجام سے محفوظ رہیں اور ان کا خاتمہ خیر پر ہو۔

ورع پر ائمہؑ کی شدید تاکید

ائمہؑ کو اس بات کی بہت فکر تھی کہ ان کے پیروکار ورع اختیار کریں۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر انہوں نے فرمایا کہ ہم کسی شخص کو اس وقت تک حقیقی مؤمن شمار نہیں کرتے جب تک وہ ورع کا حامل نہ ہو۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنّا لا نَعُدُّ الرَّجُلَ مُؤمِناً حَتّی یَکُونَ لِجَمیعِ اَمرِنا مُتَّبِعاً مُریداً. اَلا وَ اِنَّ مِنِ اتّباعِ اَمرِنا وَ اِرادَتِهِ الوَرَعَ. فَتَزَیَّنُوا بِهِ یَرحَمُکُمُ اللهُ وَ کَبِّدُوا اَعداءَنا [بِهِ] یَنعَشُکُمُ اللهُ.

''ہم کسی شخص کو اس وقت تک مؤمن شمار نہیں کرتے جب تک وہ ہمارے تمام احکام کی پیروی کرنے والا اور انہیں بجالانے کا حقیقی ارادہ رکھنے والا نہ ہو۔

آگاہ رہو! ہمارے امر کی پیروی اور اسے بجالانے کے ارادے کا ایک لازمی حصہ **ورع** ہے۔ پس اپنے آپ کو ورع سے آراستہ کرو تاکہ اللہ تم پر رحم فرمائے، اور اس کے ذریعے ہمارے دشمنوں کو رنج پہنچاؤ، تاکہ اللہ تمہیں قوت اور سربلندی عطا فرمائے۔) ''اصول الکافی، ج2، ص78، کتاب الایمان والکفر، باب الورع، حدیث 13۔(

پس ائمہؑ کے شیعوں سے یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ **ورع کی قوت کے ساتھ اہلِ بیتؑ کے دشمنوں کا سامنا کریں** اور اپنے پاکیزہ کردار کے ذریعے مخالفین کے لیے اعتراض اور طعن و تشنیع کا کوئی موقع باقی نہ چھوڑیں۔

اگر اہلِ ولایت ورع سے خالی ہوں تو وہ ائمہؑ کے دشمنوں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ صرف شیعوں ہی پر اعتراض نہ کریں بلکہ خود ائمہؑ کو بھی ان کے پیروکاروں کے اعمال کی وجہ سے موردِ اعتراض قرار دیں۔

بعض مؤمنین کے نادرست کردار کے نتیجے میں ائمۂ طاہرینؑ تک دشمنوں کی بدزبانی اور بے احترامی کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

ائمہؑ کے حق میں اس ظلم کی شدت کا اندازہ **ابوالصباح کنانی** کے واقعے سے کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے امام صادقؑ سے عرض کیا'' :لوگوں کی طرف سے آپ کی وجہ سے ہمیں کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے''!

امامؑ نے پوچھا'' :میری وجہ سے تمہیں لوگوں کی طرف سے کیا برداشت کرنا پڑتا ہے؟''

انہوں نے عرض کیا'' :جب بھی ہمارے اور کسی دوسرے شخص کے درمیان کوئی اختلاف ہوتا ہے تو وہ مجھ سے کہتا ہے: تم خبیث جعفری ہو''!

امامؑ نے پوچھا'' :کیا لوگ میری نسبت کی وجہ سے تمہیں ملامت کرتے ہیں؟''

انہوں نے عرض کیا'' :جی ہاں۔''

تب امام صادقؑ نے فرمایا :**ما اَقَلَّ وَ اللهِ مَن یَتَّبَعُ جَعفَراً مِنکُم! اِنَّما اَصحابی مَنِ اشتَدَّ وَرَعُهُ وَ عَمِلَ لِخالِقِهِ وَ رَجا ثَوابَهُ. فَهؤُلاءِ اَصحابی.**

''اللہ کی قسم! تم میں کتنے کم لوگ ہیں جو حقیقتاً جعفر کی پیروی کرتے ہیں! میرے اصحاب تو صرف وہ ہیں جن کا ورع بہت مضبوط ہو، جو اپنے خالق کے لیے عمل کریں اور اسی سے اجر کی امید رکھیں۔ یہی لوگ میرے اصحاب ہیں۔) ''اصول الکافی، ج2، ص77، کتاب الایمان والکفر، باب الورع، حدیث 6۔(

پس یہ اس وقت کا نتیجہ ہے جب کسی شیعہ میں ورع نہ ہو—یا زیادہ صحیح الفاظ میں، وہ **شدید اور مضبوط ورع** نہ رکھتا ہو جس پر امامؑ نے تاکید فرمائی ہے۔

امام باقرؑ کا اپنے پیروکاروں کے نام پیغام

اس بحث کو ہم امام باقرؑ کے اس پیغام پر ختم کرتے ہیں جو تمام محبّانِ اہلِ بیتؑ کے لیے ہے۔

جب **خیثمہ** امام باقرؑ کی خدمت میں رخصت ہونے کے لیے حاضر ہوئے تو امامؑ نے ان سے فرمایا:

یا خَیثَمَةُ، اَبلِغ مَن تَری مِن مَوالینَا السَّلامَ. وَ اَوصِهِم بِتَقوَی اللهِ العَظیمِ، وَ اَن یَعُودَ غَنِیُّهُم عَلی فَقیرِهِم وَ قَوِیُّهُم عَلی ضَعیفِهِم، وَ اَن یَشهَدَ حَیُّهُم جِنازَةَ مَیِّتِهِم، وَ اَن یَتَلاقَوا فی بُیُوتِهِم. فَاِنَّ لُقِیّا بَعضُهُم بَعضاً حَیاةً لِاَمرِنا. وَ رَحِمَ اللهُ عَبداً اَحیا اَمرَنا.

''اے خیثمہ! ہمارے موالی اور پیروکاروں میں سے جس سے بھی ملاقات ہو اسے ہمارا اسلام پہنچانا، اور انہیں خدائے عظیم کا تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت کرنا۔ ان میں سے مالدار اپنے محتاج بھائی کی خبر گیری کرے اور طاقتور کمزور کی مدد کرے۔ ان کے زندہ افراد اپنے مرنے والوں کے جنازوں میں شریک ہوں اور وہ ایک دوسرے سے اپنے گھروں میں ملاقات کرتے رہیں، کیونکہ ان کا ایک دوسرے سے ملنا ہمارے امر کو زندہ رکھتا ہے۔

اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جو ہمارے امر کو زندہ رکھے۔''

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

يا خَيثَمَةُ، اَبلِغ مَوالينا اَنّا لا نُغنى عَنهُم مِنَ اللهِ شَيئاً اِلّا بِعَمَلٍ وَ اَنَّهُم لَن يَنالُوا وِلايَتَنا اِلّا بّالوَرَعِ، وَ اَنَّ اَشَدَّ النّاسِ حَسرَةً يَومَ القِيامَةِ مَن وَصَفَ عَدلاً ثُمَّ خالَفَهُ اِلى غَيرِهِ.

''اے خیثمہ! ہمارے موالی کو یہ پیغام پہنچادینا کہ ہم اللہ کے مقابلے میں عمل کے بغیر ان کے کچھ کام نہیں آسکتے، اور وہ ہماری ولایت کو ورع کے بغیر ہر گز حاصل نہیں کر سکتے۔

اور قیامت کے دن سب سے زیادہ حسرت اس شخص کو ہو گی جس نے عدل اور حق کو بیان تو کیا، مگر خود اسے چھوڑ کر کسی دوسری راہ پر چل پڑا۔) ''اصول الکافی، ج2، ص175، کتاب الایمان والکفر، باب زیارۃ الاخوان، حدیث 2۔(

اس روایت میں امامؑ کے پیغام کے دو اہم پہلو ہیں۔

پہلا یہ کہ **اہلِ بیتؑ کے پیروکار ایک دوسرے کی خبر گیری کریں۔** وہ ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہیں، ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کریں اور اپنے درمیان محبت، اخوت اور باہمی تعلق کو مضبوط رکھیں۔

دوسرا یہ کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں کہ **اہلِ بیتؑ کی ولایت کی حفاظت اور اسے اپنے اندر باقی رکھنے کے لیے ورع ضروری ہے۔**

جب امامؑ فرماتے ہیں '' : **ہم عمل کے بغیر اللہ کے مقابلے میں اپنے پیروکاروں کے کچھ کام نہیں آسکتے''**

تو **عمل** کا پہلا اور بنیادی مصداق **قلب کا عمل** ہے؛ یعنی اہلِ بیتؑ کی حقیقی معرفت رکھنا اور ان کی ولایت کے سامنے قلباً تسلیم ہونا۔ ہر ظاہری عمل کی قدر و قیمت بالآخر اسی باطنی اور قلبی حقیقت کی طرف پلٹتی ہے۔

اس کے بعد شریعت کے وہ احکام آتے ہیں جنہیں سنجیدگی سے لینا اور ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

پس اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ دین کی بنیاد اور آخرت میں انسان کی نجات کا اصل سرمایہ **اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ولایت** ہے—بشرطیکہ انسان اسی ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔

اور اس ایمان کو موت کے آخری لمحے تک محفوظ رکھنے کے لیے **حدودِ الٰہی اور شریعتِ اسلام کی ایسی کامل پابندی جو انسان کو مقامِ ورع تک پہنچادے، ضروری اور ناگزیر ہے۔**

یوں **معرفت و ولایت نجات کی بنیاد ہیں، اور ورع اس بنیاد کی حفاظت کا حصار ہے۔**

اب جبکہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ **دین، اہلِ بیتؑ کی معرفت اور ان کی ولایت کو قبول کرنے کے سوا کچھ نہیں**، اور اس حقیقت کا اظہار انسان کے دل میں ان کی محبت کی شدت سے ہوتا ہے، تو ایک دوسری حقیقت کو بھی سمجھنا ضروری ہے :

ولایت اور محبتِ اہلِ بیتؑ کا فطری تقاضا ان کے احکام کی اطاعت اور ان کی پیروی ہے۔

محبت جتنی زیادہ ہو گی، اطاعت اور پیروی بھی اتنی ہی زیادہ اور کامل ہو گی۔

اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو حکم دیتا ہے:

»قُل اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونی یُحبِبکُمُ اللهُ.«

"کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔) "سورۂ آل عمران 3:31(

اہلِ بیتؑ کی محبت، اللہ کی محبت سے جدا نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص اہلِ بیتؑ سے محبت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اللہ کی خاص توجہ اور عنایت اس کے شاملِ حال ہو، اسے رسولِ خداؐ اور ائمہؑ کی پیروی کرنا ہو گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گناہ اللہ اور اہلِ بیتِ عصمت و طہارتؑ کو ناپسند ہیں۔ جو شخص حقیقتاً اُن سے محبت رکھتا ہو، وہ ان کے احکام پر عمل کرنے کے سلسلے میں بے پرواہ اور لاابالی نہیں رہ سکتا۔

لہٰذا اگر کوئی شخص ان کی ہدایات پر عمل کرنے کے معاملے میں بے اعتنا ہو تو یہی بے اعتنائی اس بات کی علامت ہے کہ اس کی محبت کا دعویٰ مطلوبہ صداقت اور قوت نہیں رکھتا۔

امام باقرؑ نے جابر کے سامنے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

حَسبُ الرَّجُلِ اَن یقولَ: اُحِبُّ عَلِیّاً وَ اَتَوَلّاهُ ثُمَّ لا یَکُونُ مَعَ ذلِکَ فَعّالاً؟! فَلَو قالَ: اِنّی اُحَبُّ رَسُولَ اللهِ، فَرَسولُ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلم خَیرٌ مِن عَلِیٍّ علیه السّلام، ثُمَّ لا یَتَّبِعُ سیرَتَهُ وَ لا یَعمَلُ بِسُنَّتِهِ، ما نَفَعَهُ حُبُّهُ اِیّاهُ شَیئاً. فَاتَّقُوا اللهَ وَ اعمَلُوا لِما عِندَاللهَ. لَیسَ بَینَ اللهَ وَ بَینَ اَحَدٍ قَرابَةٌ. اَحَبُّ العِبادِ اِلَی اللهِ عَزَّوَجَلَّ (وَ اَکرَمُهُم عَلَیهِ) اَتقاهُم وَ اَعمَلُهُم بِطاعَتِهِ.

''کیا کسی شخص کے لیے صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ 'میں علیؑ سے محبت کرتا ہوں اور ان کی ولایت کو قبول کرتا ہوں'، لیکن اس کے باوجود وہ عمل نہ کرے؟ ! اگر وہ کہے: 'میں رسولِ خداؐ سے محبت کرتا ہوں'—جبکہ رسولِ خداؐ علیؑ سے افضل ہیں —لیکن پھر وہ رسولِ خداؐ کی سیرت کی پیروی نہ کرے اور ان کی سنت پر عمل نہ کرے، تو رسولِ خداؐ سے اس کی محبت اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس اجر کے لیے عمل کرو جو اللہ کے پاس ہے۔ اللہ اور کسی شخص کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں۔ اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے محبوب—اور اس کی بارگاہ میں سب سے زیادہ مکرم —وہ بندے ہیں جو سب سے زیادہ متقی اور اس کی اطاعت میں سب سے زیادہ سرگرم ہیں۔) ''اصول الکافی، ج2، ص 74، کتاب الایمان والکفر، باب الطاعۃ والتقویٰ، حدیث 3۔(

المجالس اور بعض دوسری کتابوں کی روایت میں **''اور رسول ''** کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں۔ مرحوم علامہ مجلسی نے اسی عبارت کو زیادہ ظاہر قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو : مرآۃ العقول، ج8، ص 51۔

ایمان اور عمل کا ناقابل جدائی تعلق

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا جیسی روایات میں ائمہؑ کا مقصود **ایمان** کو اسلام کے اس اصطلاحی اور ظاہری مفہوم سے ممتاز کرنا ہے جو صرف زبان سے شہادتین کے اقرار سے ثابت ہو جاتا ہے، خواہ دل میں ایمان موجود نہ بھی ہو، اور جس پر دنیا میں بعض فقہی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ اس ظاہری اسلام کا تعلق لازماً انسان کے دل کی کیفیت یا اس کے اعمال سے نہیں ہوتا۔ اسی لیے ایسا اسلام ضروری نہیں کہ ایمان کے ساتھ بھی ہو۔ ایک ایسا مسلمان جو ایمان سے محروم ہو، زبان سے کیے گئے اپنے اقرار کے بالکل برخلاف عمل کر سکتا ہے؛ لیکن حقیقی مؤمن اس طرح مکمل طور پر بے پروا نہیں رہ سکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان خود **قلب کا ایک عمل** ہے۔ مؤمن اپنے اعمال کے بارے میں بالکل بے فکر اور بے اعتنا نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص زبان سے اسلام کا اظہار کر سکتا ہے اور پھر جو چاہے کرتا پھرے، یہاں تک کہ اس کا عمل رسولِ خداؐ یا امامؑ کے قتل تک جا پہنچے۔

لیکن ایمان کی حقیقت ایسی نہیں ہے۔ کوئی شخص محض زبان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ''میں رسولِ خداؐ سے محبت کرتا ہوں'' یا ''میں علیؑ سے محبت کرتا ہوں'' اور پھر جس طرح چاہے عمل کرتا رہے۔ محبت ایک **قلبی حقیقت** ہے۔ یہ شہادتین کے ظاہری اقرار کی مانند نہیں کہ کوئی شخص نفاق یا دکھاوے کے طور پر بھی انہیں زبان سے ادا کر سکے۔ محبت کی حقیقت محض زبانی دعوے سے قائم نہیں ہوتی۔ انسان کے دل میں یہ محبت جتنی مضبوط ہوتی جائے گی، دینی پیشواؤں کی اطاعت اور ان کے سامنے تسلیم پر اس کا اثر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ لہٰذا مذکورہ روایت سے، خصوصاً علامہ مجلسی کی مرآۃ العقول میں بیان کردہ توضیح کو سامنے رکھتے ہوئے، یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ: اگر اہلِ ولایت، امیر المؤمنینؑ کی محبت پر تکیہ کرتے ہوئے اور اسی پر مطمئن ہو کر، آپؑ کی سیرت اور ہدایات کی پیروی سے غافل ہو جائیں، تو ان کے مخالفین ـــــ یعنی وہ لوگ جو آپؑ کی ولایت کو قبول نہیں کرتے ـــــ ان کے مقابل یہ استدلال کر سکتے ہیں'' : ہم بھی رسولِ خداؐ کی محبت پر تکیہ کرتے ہیں، لہٰذا ہمیں بھی ان کی سنت اور سیرت کی پیروی کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ اور چونکہ رسولِ خداؐ علیؑ سے افضل ہیں، تو اگر محض علیؑ سے محبت کر کے، عمل کے بغیر، سعادت حاصل کی جا سکتی ہے تو ہم بھی رسولِ خداؐ سے محبت کے ذریعے، ان کی اطاعت کیے بغیر، سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔''

اگر اس استدلال کو قبول کر لیا جائے تو شیعوں کے پاس اپنے مخالفین کو دینے کے لیے کوئی جواب باقی نہیں رہتا۔ البتہ خود روایت کے الفاظ سے واضح ہے کہ مخالفین کی طرف سے ایسا کہنا محض ایک دعویٰ ہوگا۔ رسولِ خداؐ کی حقیقی محبت، امیر المؤمنینؑ کی محبت سے جدا نہیں ہو سکتی۔ آیتِ مباہلہ میں قرآنِ کریم کی صریح تعبیر اور رسولِ خداؐ کے عملی اقدام کی روشنی میں علیؑ کی مقدس ذات کو رسولِ اکرمؐ کا **نفس** قرار دیا گیا ہے۔

لہٰذا جو شخص حقیقتاً رسولِ خداؐ سے محبت کرتا ہے، اسے امیر المؤمنینؑ سے بھی محبت ہونی چاہیے۔ اگر وہ علیؑ سے محبت نہیں رکھتا تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسولِ خداؐ سے محبت کا اس کا دعویٰ بھی سچا نہیں ہے۔ پس مجموعی طور پر جو لوگ خود کو شیعہ کہتے ہیں انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اہلِ بیتؑ کی محبت پر تکیہ کرتے ہوئے دینی احکام اور شریعت کے قوانین پر عمل سے غفلت نہیں برت سکتے۔

جابر سے منقول روایت میں امام باقرؑ کے مخاطب بھی دراصل یہی لوگ ہیں جو خود کو شیعہ کہتے ہیں۔ روایت کے آغاز میں امامؑ فرماتے ہیں:

یا جابِرُ، اَیَکتَفی مَن یَنتَحِلُ التَشَیُّعَ اَن یَقُولَ بِحُبِّنا اَهلَ البَیتِ؟! فَوَاللهِ ما شیعَتُنا اِلّا مَنِ اتَّقَی اللهَ وَ اَطاعَهُ وَ ما کانُوا یُعرَفُونَ – یا جابِرُ – اِلّا بِالتَّواضُعِ وَ التَّخَشُّعِ وَ الاَمانَةِ وَ کَثرَةِ ذِکرِ اللهِ وَ الصَّومِ وَ الصَّلاةِ وَ البِرِّ بِالوالِدَینِ وَ التَّعاهُدِ لِلجیرانِ مِنَ الفُقَراءِ وَ اَهلِ المَسکَنَةِ وَ الغارِمینَ وَ الایتامِ وَ صِدقِ الحَدیثِ وَ تَلاوَةِ القُرآنِ وَ کَفِّ الاَلسُنِ عَنِ النّاسِ اِلّا مِن خَیرٍ وَ کانُوا اُمَناءَ عَشائِرِهِم فِی الاَشیاءِ.

''اے جابر! کیا شیعہ ہونے کا دعویٰ کرنے والے کے لیے صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہ ہم اہلِ بیتؑ سے محبت کرتا ہے؟ اللہ کی قسم! ہمارے شیعہ صرف وہ ہیں جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

اے جابر! ہمارے شیعہ صرف ان اوصاف سے پہچانے جاتے تھے: تواضع، اللہ کے حضور خشوع، امانت داری، کثرت سے ذکرِ خدا، روزہ، نماز، والدین کے ساتھ نیکی، غریب و محتاج پڑوسیوں، قرض داروں اور یتیموں کی خبر گیری، گفتگو میں سچائی، تلاوتِ قرآن، لوگوں کے بارے میں زبان کو خیر کے سوا ہر بات سے روکنا، اور اپنے قبیلے اور معاشرے میں تمام معاملات میں امانت دار ہونا۔''

یہ اور اسی طرح کی دوسری صفات وہ اوصاف ہیں جن کی ائمہؑ اہلِ ولایت سے توقع رکھتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے پیروکار انہی خصوصیات کے ذریعے پہچانے جائیں۔

ولایتِ ائمہؑ — ہر خیر کا سرچشمہ

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیک اعمال، **ولایت اور محبتِ اہلِ بیتؑ کے بارآور درخت کی شاخیں** ہیں۔

اس کے برعکس، گناہ اور برے اعمال انکارِ ولایت سے مناسبت رکھتے ہیں اور اہلِ بیتؑ سے دشمنی کے آثار و علامات میں شمار ہوتے ہیں۔ جو شخص خود کو اہلِ ولایت میں شمار کرتا ہے اسے اپنے اعمال کے ذریعے ائمہؑ سے دشمنی کے درخت کی شاخوں سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے۔

امام صادقؑ نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

نَحنُ اَصلُ کُلِّ خَیرٍ. وَ مِن فُرُوعِنا کُلُّ بِرٍّ. فَمِنَ البِرِّ التَّوحیدُ وَ الصَّلاةُ وَ الصِّیامُ وَ کَظمُ الغَیظُ وَ العَفوُ عَنِ المُسیءِ وَ رَحمَةُ الفَقیرِ وَ تَعَهُّدُ الجارِ وَ الاِقرارِ بِالفَضلِ لِاَهلِهِ.

وَ عَدُوُّنا اَصلُ کُلِّ شَرٍّ. وَ مِن فُرُوعِهِم کُلُّ قَبیحٍ وَ فاحِشَةٍ. فَمِنهُمُ الکَذِبُ وَ البُخلُ وَ النَّمیمَةُ وَ القَطیعَةُ وَ اَکلُ الرِّبا وَ اَکلُ مالِ الیَتیمِ بِغَیرِ حَقِّهِ وَ تَعَدّی الحُدُودِ الَّتی اَمَرَ اللهَ وَ رُکُوبُ الفَواحِشِ ما ظَهَرَ مِنها وَ ما بَطَنَ وَ الزِّنا وَ السَّرِقَةُ وَ کُلُّ ما وافَقَ ذلِکَ مِنَ القَبیحِ. فَکَذَبَ مَن زَعَمَ اَنَّهُ مَعَنا وَ هُوَ مُتَعَلِّقٌ بِفُرُوعِ غَیرِنا.

''ہم ہر خیر کی اصل ہیں، اور ہر نیکی ہماری شاخوں میں سے ہے۔ ان نیکیوں میں توحید، نماز، روزہ، غصے کو ضبط کرنا، برائی کرنے والے کو معاف کرنا، فقیر پر رحم کرنا، پڑوسی کی خبر گیری کرنا اور اہلِ فضیلت کی فضیلت کا اقرار کرنا شامل ہیں۔

اور ہمارا دشمن ہر شر کی اصل ہے، اور ہر قبیح و ناپسندیدہ عمل ان کی شاخوں میں سے ہے۔ انہی میں جھوٹ، بخل، چغلی، قطعِ تعلق، سود کھانا، ناحق یتیم کا مال کھانا، اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا، کھلی اور پوشیدہ بے حیائیوں کا ارتکاب، زنا، چوری اور اسی نوع کی تمام برائیاں شامل ہیں۔

پس جھوٹا ہے وہ شخص جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ ہمارے ساتھ ہے، جبکہ وہ دوسروں کی شاخوں سے وابستہ ہے۔) ''روضۃ الکافی، ص 242، حدیث 336۔(

اس نورانی روایت میں امام صادقؑ اہلِ ولایت اور اہلِ بیتؑ کے دشمنوں کی صفوں کے درمیان ایک واضح امتیاز قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اہلِ ولایت ایک طرف کھڑے ہوں اور اہلِ بیتؑ کے دشمن دوسری طرف، تو ہمارے ائمہؑ کی نظر میں ان کے دوستوں کا پرچم اور ان کی شناخت **اطاعت اور اعمالِ صالحہ** ہوں گے، جبکہ مخالفین کی شناخت اور ان کا نشان **گناہ اور برے اعمال** ہوں گے۔

پس ہر وہ نیکی جس کی اصل اہلِ بیتؑ کی تعلیم و ہدایت میں ہو اور جو ان کی ولایت کی برکت سے انسان کو نصیب ہو، ان کے دوستوں کی ایک شناخت ہے۔ لیکن اگر ان کا کوئی دوست گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس گناہ کے ذریعے گویا اس نے اہلِ بیتؑ کے دشمنوں کا لباس پہن لیا اور نادانستہ طور پر خود کو ان کے مخالفین کی صف میں کھڑا کر دیا۔

البتہ جب تک اس شخص کی محبت اور ولایت زائل نہیں ہوئی، وہ حقیقتاً اب بھی اہلِ بیتؑ کے محبّین میں شامل ہے؛ لیکن اپنے برے عمل کے ذریعے اس نے ان کے دشمنوں کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اسے چاہیے کہ توبہ و استغفار کے ذریعے جلد از جلد اس عارضی اور مصنوعی رنگ سے خود کو پاک کرے اور دوبارہ اہلِ ولایت کی صف میں اپنی حقیقی جگہ پر واپس آ جائے۔

دھوکے میں نہ پڑو!

پس فطری راستہ ـــــ اور وہ راستہ جسے اہلِ بیتؑ نے اپنے پیروکاروں کے لیے مقرر فرمایا ہے ـــــ یہی ہے کہ **اہلِ ولایت، اہلِ عملِ صالح بھی ہوں۔**

ان کی محبت اور ولایت جس قدر بلند اور مضبوط ہوتی جائے، اہلِ بیتؑ کے احکام کی اطاعت بھی اتنی ہی زیادہ اور بہتر ہونی چاہیے۔ اسی لیے ائمہؑ نے اپنے پیروکاروں کو سختی سے متنبہ فرمایا کہ وہ اہلِ بیتؑ کی محبت پر تکیہ کر کے نہ اطاعت میں سستی کریں اور نہ گناہوں سے بچنے میں بے پروائی اختیار کریں۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

وَ اللهِ ما مَعَنا مِنَ اللهِ بَراءَةٌ. وَ لا بَينَنا وَ بَينَ اللهِ قَرابَةٌ. وَ لا لَنا عَلَى اللهِ حُجَّةٌ. وَ لا نُقَرَّبُ اِلى اللهِ اِلّا بِالطّاعَةِ. فَمَن كانَ مِنكُم مُطيعاً لِلّهِ، تَنفَعُهُ وِلايَتُنا. وَ مَن كانَ مِنكُم عاصِياً لِلّهِ، لَم تَنفَعهُ وُلايَتُنا.

وَيحَكُم! لا تَغتَرُّوا! وَيحَكُم! لا تَغتَرُّوا!

”اللہ کی قسم! ہمارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی پروانۂ براءت نہیں، نہ ہمارے اور اللہ کے درمیان کوئی رشتہ داری ہے، نہ اللہ پر ہمارا کوئی ایسا حق ہے جسے ہم اس کے مقابل حجت بنا سکیں، اور ہم اللہ کا قرب صرف اس کی اطاعت کے ذریعے حاصل

کرتے ہیں۔ پس تم میں سے جو اللہ کا اطاعت گزار ہو گا، ہماری ولایت اسے فائدہ پہنچائے گی؛ اور تم میں سے جو اللہ کا نافرمان ہو گا، ہماری ولایت اسے فائدہ نہیں پہنچائے گی۔

افسوس تم پر! دھوکے میں نہ پڑو! افسوس تم پر! دھوکے میں نہ پڑو) "! اصول الکافی، ج 2، ص 75، کتاب الایمان والکفر، باب الطاعۃ والتقویٰ، حدیث 6، امام باقرؑ سے۔ (اس روایت میں **براءت** سے مراد اللہ کے عذاب اور جہنم سے چھٹکارے اور معافی کی ضمانت ہے۔ امامؑ کے اس فرمان کا مطلب کہ "ہمارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی براءت نہیں" یہ ہے کہ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ صرف اہلِ بیتؑ کی ولایت اور محبت قبول کر لینے سے اسے خود بخود اللہ کے عذاب سے نجات کا قطعی پروانہ مل گیا ہے۔

وہ یہ نہ سمجھے کہ اب وہ جتنے چاہے گناہ کرے، جس قدر چاہے اہلِ بیتؑ کی نافرمانی کرے، پھر بھی ہر حال میں مطمئن رہے کہ وہ غضبِ الٰہی کی آگ سے بچ چکا ہے اور اسے کبھی کسی الٰہی سزا کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اسی غلط فہمی سے بچانے کے لیے امامؑ فرماتے ہیں کہ اگر انسان اللہ کی اطاعت کے راستے پر ہو تو ہماری ولایت اسے فائدہ پہنچائے گی، لیکن اگر وہ گناہ اور نافرمانی کے راستے پر چل رہا ہو تو ہماری ولایت اسے اس حالت میں فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ لہٰذا انسان کو ہر گز خود فریبی اور بے فکری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

محبتِ اہلِ بیتؑ کا گناہ سے روکنے والا اثر

یہاں یہ سمجھنے کے لیے کہ اہلِ بیتؑ کی ولایت اور محبت انسان کو کس طرح فائدہ پہنچاتی ہے، ضروری ہے کہ ایک طرف **ولایت و محبت** اور دوسری طرف **اطاعت اور گناہ سے اجتناب** کے درمیان موجود باطنی اور وجدانی تعلق کو کچھ وضاحت سے بیان کیا جائے۔ ابتدا میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ محبت کے مختلف درجات ہوتے ہیں؛ کبھی وہ شدید ہوتی ہے اور کبھی کمزور۔ مختلف افراد میں بھی محبت کی شدت یکساں نہیں ہوتی، بلکہ ایک ہی شخص کی ایک ہی محبوب سے محبت بھی مختلف اوقات میں بڑھ اور گھٹ سکتی ہے۔ ہر محبت کرنے والا ایک ہی درجۂ محبت نہیں رکھتا، اور نہ ہی کسی شخص کی محبت ہمیشہ ایک ہی شدت پر قائم رہتی ہے۔

مزید یہ کہ محبت کا ہر درجہ اپنے مخصوص آثار پیدا کرتا ہے، جو ممکن ہے اس سے کم درجے کی محبت میں موجود نہ ہوں۔ انسان کسی سے جتنی محبت کرتا ہے، اسی نسبت سے اس محبوب کی پسند اور ناپسند کے بارے میں بے اعتنا نہیں رہ سکتا۔ اور اگر اس کی محبت شدید ہو جائے تو وہ جان بوجھ کر کبھی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے اس کے محبوب کو اذیت یا ناراضی ہو؛ بلکہ ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں ایسا کرنے کا خیال تک نہ آئے۔ اب ایک ایسے شخص کو دیکھیے جو اہلِ بیتؑ سے محبت رکھتا ہے۔ جب وہ کسی ایسی مجلس میں شریک ہوتا ہے جہاں اہلِ بیتؑ کا ذکر ہو رہا ہو اور ان کی محبت کی آگ اس کے دل میں پوری شدت سے بھڑک اٹھے، تو وہ اپنے اندر ان کی محبت کو دوسرے اوقات سے کہیں زیادہ شدید محسوس کرتا ہے۔ اگر اسی کیفیت میں اس سے پوچھا جائے" : کیا تم ان گناہوں کی طرف دوبارہ لوٹنے کے لیے تیار ہو جن کا پہلے ارتکاب کرتے رہے ہو؟"

تو اس کے دل کی گہرائیوں سے جواب آئے گا" :ہرگز نہیں"!

کیوں؟

اس لیے کہ اس لمحے اس کا پورا وجود ہر اس چیز سے متنفر ہوتا ہے جو اہلِ بیتؑ کو ناپسند ہے۔ ان کی شدید محبت کی وجہ سے وہ اپنے سابقہ گناہوں کی طرف لوٹنے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ اگر مجلس ختم ہونے کے بعد بھی یہی کیفیت اس کے اندر برقرار رہے تو وہ کبھی گناہ کے پیچھے نہ جائے۔ لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ اہلِ بیتؑ سے محبت کی وہ شدید کیفیت بتدریج کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس طرح ہم اپنے باطنی تجربے سے سمجھ سکتے ہیں کہ **محبتِ اہلِ بیتؑ اپنی ذات میں انسان کو گناہ سے روکنے کی تاثیر رکھتی ہے۔** اس اعتبار سے محبتِ اہلِ بیتؑ کا اثر توبہ کی کیفیت سے مشابہ ہے۔

جب کوئی توبہ کرنے والا شخص اپنے ماضی پر حقیقتاً نادم ہوتا ہے اور گناہ چھوڑنے کا پختہ عزم کرتا ہے تو اس لمحے اس کی توبہ حقیقی ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی توبہ میں جھوٹا ہے۔ لیکن ممکن ہے وہ کیفیت گزر جانے کے بعد دوبارہ گناہ کرے اور یوں اپنی توبہ توڑ دے۔ یہی صورت اہلِ بیتؑ سے محبت کرنے والے کی بھی ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ جو شخص گناہ کرتا ہے وہ لازماً اہلِ بیتؑ سے اپنی محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ **محبت کا بلند اور شدید درجہ گناہ کے ارتکاب کے ساتھ سازگار نہیں**، لیکن انسان ہمیشہ محبت کی بلند ترین کیفیت میں نہیں رہتا۔ اس کی محبت کی شدت کم ہو سکتی ہے، جبکہ اصل محبت اس کے دل سے ختم نہ ہوئی ہو۔

پس فرق دراصل توبہ وندامت کی کیفیت، یا اہلِ بیتؑ کی طرف توجہ، وابستگی اور محبت کی شدت وضعف میں ہے۔

اہلِ بیتؑ سے شدید محبت انسان کو گناہ سے روکتی ہے، کیونکہ ان کی طرف کھینچنے والی محبت کی قوت اتنی طاقتور ہو جاتی ہے کہ وہ انسان کو خواہشاتِ نفس کے جال میں پھنسنے اور گناہ کی طرف کھنچنے سے محفوظ رکھتی ہے۔

لیکن جیسے جیسے محبت کمزور ہوتی ہے، اس کا یہ باز رکھنے والا اثر بھی کمزور پڑتا جاتا ہے۔

یہ کمزوری اس حد تک پہنچ سکتی ہے کہ انسان کی نفسانی خواہشات اس پر غالب آ جائیں۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت یہ ہے کہ بعض افراد میں اہلِ بیتؑ کی محبت کی فعال کیفیت کچھ مدت کے لیے—خواہ بہت مختصر اور عارضی طور پر ہی—بالکل زائل ہو جائے۔ ایسی حالت میں انسان گناہ کے سامنے ہچکچاہٹ بھی محسوس نہ کرے اور ممکن ہے سنگین گناہوں کا مرتکب ہو جائے۔

محبِّ اہلِ بیتؑ کی مختلف کیفیات

پس اہلِ بیتؑ کی محبت اور ولایت کے اعتبار سے انسان کے باطن کی بہت سی مختلف کیفیات اور درجات ہو سکتے ہیں۔

موجودہ بحث کے لیے انہیں مجموعی طور پر **دو بڑے دائروں** میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اگرچہ ان میں سے ہر دائرے کے اندر بھی مختلف درجات پائے جاتے ہیں۔ **پہلا دائرہ** وہ کیفیت ہے جس میں اہلِ بیتؑ اور عترتِ طاہرہؑ کی محبت اور وابستگی انسان کے دل میں زندہ، شدید اور مؤثر ہوتی ہے۔ وہ خود کو ان کی محبت اور کشش سے پوری طرح متاثر پاتا ہے۔ اس کیفیت میں وہ نہ صرف گناہ نہیں کرتا بلکہ گناہ کرنے کا خیال تک اس کے ذہن میں نہیں آتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے گزشتہ گناہوں پر شدید شرمندگی اور ندامت بھی محسوس کرتا ہے۔ **دوسرا دائرہ** وہ حالت ہے جس میں محبت کی وہ تیز آگ کسی حد تک سرد پڑ چکی ہو اور انسان کے دل کی اہلِ بیتؑ کی طرف شدید توجہ باقی نہ رہی ہو، لیکن وہ باطناً ان سے بیگانہ بھی نہ ہوا ہو۔ اس کے دل کا تعلق کمزور ہوا ہے، ٹوٹا نہیں۔

ان کی طرف اس کی کشش کم ہوئی ہے، ختم نہیں ہوئی۔ ایسا شخص اگر خواہشاتِ نفس اور شہوات کے دباؤ میں آجائے تو ممکن ہے اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکے اور گناہ میں مبتلا ہو جائے۔

یہاں بھی معاملہ اس محبت کی مقدار پر منحصر ہے جو اس کے دل میں باقی ہے۔ اگر باقی ماندہ محبت اتنی قوی ہو کہ اس کی نفسانی خواہشات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آجائے تو وہ اسے لغزش سے محفوظ رکھے گی۔

اس دوسرے دائرے میں موجود محبِّ اہلِ بیتؑ، جب تک خواہشات و شہوات سے مغلوب نہ ہو، کم از کم اپنے باطن میں **اطاعت کا عزم** رکھتا ہے۔

اطاعت اور گناہ سے اجتناب کا عزم خود ایک قلبی عمل ہے۔ یہ خارجی طور پر اطاعت یا معصیت کے وقوع سے مختلف ہے، جسے ہم **فعلی اطاعت** اور **فعلی معصیت** کہہ سکتے ہیں۔

فعلی اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان عملاً کوئی اطاعت بجالائے، جبکہ فعلی معصیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ عملاً کسی گناہ کا ارتکاب کرے۔

لیکن **اطاعت کرنے اور گناہ سے بچنے کا عزم** انسان کی وہ باطنی کیفیت ہے جس میں وہ نافرمانی کا ارادہ نہیں رکھتا، بلکہ اس کی نیت اور قلبی روش اپنے ائمہؑ کے احکام کی اطاعت کرنا ہوتی ہے۔ یہ مرحلہ خارجی طور پر اطاعت یا گناہ کے واقع ہونے سے پہلے کا ہے۔ اب اگر ایسے شخص کے سامنے کوئی ایسی چیز آجائے جو اسے گناہ کی طرف شدت سے کھینچے تو اہلِ بیتؑ سے اس کی محبت کی کمزوری کے سبب ممکن ہے وہ مغلوب ہو جائے اور گناہ کا مرتکب ہو جائے۔ لیکن شاید کچھ ہی دیر بعد اسے ہوش آجائے، وہ اپنے کیے پر سخت نادم ہو اور اپنے محبوبوں کے سامنے شرمندگی محسوس کرے۔

اس کے باوجود گناہ کے ان لمحات میں اس سے لغزش واقع ہوئی؛ وہ اپنے ائمہؑ کی محبت کی فعال کیفیت سے دور ہو گیا اور غفلت میں جا پڑا۔ ایسی حالت میں اگرچہ خود گناہ، اللہ اور اہلِ بیتؑ کی نافرمانی اور مخالفت ہے، لیکن گناہ کرنے والا شخص—گناہگار ہونے کے باوجود—لازماً اللہ سے دشمنی کا ارادہ نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ اہلِ بیتؑ کا دشمن بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے وہ برا عمل اللہ اور اہلِ بیتؑ کے مقابل بغاوت، سرکشی اور عناد کی نیت سے انجام نہیں دیا۔

اسی لیے جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو فطری طور پر شدید پریشانی اور ندامت محسوس کرتا ہے اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ واستغفار کرتا ہے۔ پس یہ ممکن ہے کہ اہلِ بیتؑ سے محبت کرنے والا شخص عارضی اور لحاتی طور پر ان کی محبت کی **فعال کیفیت** سے محروم ہو جائے۔ایسی حالت میں غفلت کی وجہ سے کم از کم اس کا عزمِ اطاعت باقی نہیں رہتا، بلکہ ممکن ہے وہ گناہ کرنے اور نافرمانی کا ارادہ بھی کر لے۔

لیکن اس کے باوجود ضروری نہیں کہ وہ اللہ یا اہلِ بیتؑ سے دشمنی کا ارادہ رکھتا ہو۔ یہ دوسرے دائرے کا سب سے نچلا درجہ ہے۔ اگر انسان بار بار خود کو ایسی حالت میں پڑنے دے تو معاملہ خطرناک ہو جاتا ہے۔یہ کیفیت بالآخر **خذلانِ الٰہی** ـــــ یعنی اللہ کی خصوصی توفیق و مدد سے محرومی ـــــ تک پہنچ سکتی ہے اور نتیجتاً انسان سے ایمان بھی سلب ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر اللہ اور اہلِ بیتؑ کی عنایت اس کے شاملِ حال ہو جائے تو وہ اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہے۔اور جب تک ان کی محبت اور ولایت اس کے دل میں باقی ہے، اللہ کی مغفرت اور رحمت کا وعدہ اس کے لیے برقرار رہتا ہے۔

محبتِ ائمہؑ اور اعمالِ صالحہ کا باہمی اثر

یہاں ایک اور اہم نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ جس قدر انسان کے دل میں اہلِ بیتؑ کی محبت بڑھتی ہے، اسی قدر اطاعت و بندگی کے اعمال انجام دینے کا شوق بھی اس کے اندر بڑھتا جاتا ہے۔ البتہ اس کے ساتھ شیطانی وسوسوں اور فریب کے مواقع بھی بڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ اہلِ بیتؑ کی ہدایت کے ذریعے شیطان کا مقابلہ کرنے کے طریقے سیکھے اور ان تعلیمات پر عمل کرے تو اسے اطاعت و بندگی میں مزید توفیق حاصل ہوتی جائے گی۔ دوسری طرف، ہر نیک عمل جو انسان انجام دیتا ہے، اسے اہلِ بیتؑ کی محبت کے ایک بلند تر درجے تک پہنچاتا ہے۔

پس اعمالِ صالحہ اور محبت و ولایتِ اہلِ بیتؑ کے درمیان ایک باہمی اور دو طرفہ تعلق ہے: ہر ایک دوسرے کو تقویت دیتا اور بڑھاتا ہے۔

اس کے برعکس، اہلِ بیتؑ سے انسان کی محبت جتنی کمزور اور کم ہوتی جائے گی، اتنی ہی آسانی اور تیزی سے وہ گناہ میں مبتلا ہوگا۔ اور دوسری طرف، انسان کا ہر برا عمل اسے کم از کم ایک درجہ محبتِ اہلِ بیتؑ سے دور اور ان کی مخالفت و دشمنی کی سمت ایک درجہ قریب کر دیتا ہے۔

پس جس طرح محبتِ اہلِ بیتؑ نیکی کو تقویت دیتی ہے اور نیکی ان کی محبت کو بڑھاتی ہے، اسی طرح گناہ ان کی محبت کو کمزور کرتا ہے اور محبت کی کمزوری انسان کے لیے مزید گناہوں کا راستہ ہموار کرتی ہے۔

باب دوم: زمانۂ غیبت میں دینداری

غضبِ الٰہی اور امامؑ کی غیبت

اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے خاندانِ رسولؐ سے ائمہؑ کا تعارف کرایا، تاکہ لوگ ان کی طرف رجوع کر کے گمراہی سے نجات پائیں اور ابدی سعادت تک پہنچ سکیں۔

یہ انسانوں پر اللہ کی سب سے عظیم نعمت تھی، کیونکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ہدایتِ الٰہی کا واحد راستہ یہی چودہ معصومینؑ ہیں۔ امتِ مسلمہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ان چودہ مقدس ہستیوں میں سے تیرہ کے زمانے میں زندگی بسر کرے اور ان کی موجودگی سے براہِ راست فیض اٹھانے کا موقع پائے۔ افسوس کہ اس عظیم موقع سے صحیح فائدہ اٹھانے والے بہت ہی کم تھے۔ اس کے باوجود آخری امامؑ کے زمانے تک اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ائمہؑ کی براہِ راست موجودگی کی نعمت سے محروم نہیں فرمایا۔ یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ جب اللہ کسی انسان کو ایسی نعمت عطا فرمائے جس کا وہ بذاتِ خود کوئی حق دار نہ ہو تو اس عنایتِ الٰہی کو **فضل** کہا جاتا ہے۔

اگر کچھ مدت کے بعد اللہ اس نعمت کو واپس لے لے تو اس شخص پر کوئی ظلم نہیں ہوتا، کیونکہ ابتدا ہی سے اس نعمت پر اس کا کوئی ذاتی اور لازمی حق نہیں تھا۔ لہٰذا ایسی نعمت کا واپس لے لیا جانا **عدلِ الٰہی** کے عین مطابق ہے۔

اللہ پر لازم نہیں کہ وہ ہمیشہ اور ہر شخص کے ساتھ صرف اپنے فضل ہی سے معاملہ کرے۔ کبھی وہ اپنے فضل سے معاملہ فرماتا ہے اور کبھی اپنے عدل کے مطابق؛ اور دونوں ہی حکمت پر مبنی ہیں۔

ساتھ ہی یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم انسان ہمیشہ یہ سمجھ سکیں کہ اللہ اپنی مخلوقات کے ساتھ مختلف انداز سے معاملہ کیوں فرماتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے—خواہ عدل کے مطابق ہو یا فضل کے تحت—یقیناً حکمت پر مبنی ہے، خواہ اس کی حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

بلکہ جہاں افعالِ الٰہی کی حکمت کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن بھی ہو، وہاں عموماً اس کی معرفت **نقلی دلائل** ہی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے؛ ضروری نہیں کہ انسانی عقل اپنی مستقل رسائی اور ادراک سے اس حکمت تک پہنچ سکے۔

نعمت کے سلب ہونے کے بارے میں ایک سنتِ الٰہی

قرآنِ کریم اور روایات میں بیان ہونے والی سنتوں میں سے ایک یہ ہے:

»اِنَّ اللهَ لا یُغَیِّرُ ما بِقَومٍ حَتّی یُغَیِّرُوا ما بِاَنفُسِهِم.«

''بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر کی حالت کو نہ بدل دے۔'' سورۂ رعد 13:11)

اور فرمایا» :ذلِکَ بِاَنَّ اللهَ لَم یَکُ مُغَیِّراً نِعمَةً اَنعَمَها عَلی قَومٍ حَتّی یُغَیِّرُوا ما بِاَنفُسِهِم.«

''یہ اس لیے ہے کہ اللہ کسی قوم کو عطا کی ہوئی نعمت اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر کی حالت کو نہ بدل دے۔'' سورۂ انفال 8:53)

امام باقرؑ نے فرمایا :اِنَّ اللهَ قَضی قَضاءً حَتماً لا یُنعِمُ عَلی عَبدِهِ نِعمَةً فَیَسلُبُها اِیّاهُ قَبلَ اَن یُحدِثَ العَبدُ ذَنباً یَستَوجِبُ بِذلِکَ الذَّنبِ سَلبَ تِلکَ النِّعمَةِ. وَ ذلِکَ قَولُ اللهِ: «اِنَّ اللهَ لا یُغَیِّرُ ما بِقَومٍ حَتّی یُغَیِّرُوا ما بِاَنفُسِهِم.«

''اللہ نے ایک حتمی فیصلہ فرمایا ہے کہ جب وہ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو اس وقت تک وہ نعمت اس سے سلب نہیں کرتا جب تک وہ بندہ ایسا گناہ نہ کرے جس کے سبب اس نعمت کے سلب کیے جانے کا مستحق ہو جائے۔

اور یہی اللہ کے اس فرمان کا مفہوم ہے: 'بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر کی حالت کو نہ بدل دے۔'' تفسیر نور الثقلین، ج2، ص488۔(

یہ سنتِ الٰہی اس حقیقت کا ایک مظہر ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

پس اگرچہ کسی قوم سے کسی نعمت کا واپس لے لیا جانا بذاتِ خود ان پر ظلم نہیں، لیکن اللہ نے اپنے فضل سے یہ اصول مقرر فرمایا ہے کہ جب تک لوگ اس نعمت کی ناشکری نہ کریں اور اس کی قدر و منزلت کو پامال نہ کریں، ان سے وہ نعمت واپس نہیں لی جاتی۔

اس مقدمے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ امامِ عصرؑ کی غیبت کی مکمل حکمت ہمارے لیے واضح نہیں کی گئی—اور اس سلسلے کی روایات کے مطابق اس کا حقیقی راز ظہور کے بعد آشکار ہوگا—لیکن غیبت کے جن اسباب اور حکمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک کا براہِ راست تعلق خود لوگوں سے ہے، اور وہ ہے: **رسولِ خداؐ کی ناشکری کرنے والی امت پر اللہ کی ناراضی۔**

ائمہؑ کی موجودگی کی نعمت امتِ مسلمہ پر اللہ کے عظیم فضل کا مظہر تھی۔ افسوس کہ لوگوں نے اپنے گناہوں کے ذریعے خود کو اس نعمت سے محروم کر دیا، اور مخلوق سے اللہ کی ناراضی کے نتیجے میں امامِ عصرؑ ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

اِذا غَضِبَ اللهُ تَبارَکَ وَ تَعالی عَلی خَلقِهِ، نَحّانا عَن جِوارِهِم.

"جب اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مخلوق سے ناراض ہوتا ہے تو ہمیں ان کے قرب وجوار سے دور کر دیتا ہے۔) "اصول الکافی، ج 1، ص 343، کتاب الحجۃ، باب فی الغیبۃ، حدیث 31۔(

لوگوں کے لیے ائمہؑ کا اس طرح دسترس میں ہونا کہ وہ آسانی اور براہِ راست ان کی طرف رجوع کر سکیں، اللہ کے **فضل** کا ایک مظہر تھا۔ اور امامؑ کو عام اور براہِ راست دسترس سے دور کر دینا **عدلِ الٰہی** کے مطابق ہے۔

یہ عدل اس وقت نافذ ہوا جب اس سے پہلے فضلِ الٰہی اپنی حجت تمام کر چکا تھا؛ لیکن لوگوں کے اعمال نے غضبِ الٰہی کو دعوت دی اور یوں معاملہ فضل سے عدل کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور یہ ناراضی بھی خود مسلمانوں کی نافرمانیوں اور گناہوں کا نتیجہ تھی۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانۂ غیبت میں امامِ عصرؑ تک معمول کی اور براہِ راست رسائی سے محرومی، محرومی کی عظیم ترین صورتوں میں سے ایک ہے، اور دنیا کی کوئی دوسری چیز حقیقتاً اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ اسی لیے ہم اس محرومی سے خوش اور راضی نہیں ہیں؛ ہمیں اس کا شدید رنج ہے۔ لیکن ہماری ناراضی اللہ سے نہیں، کیونکہ اس کے عدل پر ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ ہمیں اپنے آپ سے، اپنے گناہوں سے، اور ان لوگوں کے کردار سے ناراضی ہے جن کے اعمال اس غضبِ الٰہی کے اسباب بنے۔

یہ معاملہ اس وقت اور بھی سنگین ہو جاتا ہے جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کی غیبت کے ذریعے اللہ امت کو آزماتا ہے، اور اس امتحان میں امامؑ کی معرفت رکھنے والے بہت سے لوگ ناکام ہو کر رسوا ہو جائیں گے۔

زمانۂ غیبت میں دیندار باقی رہنے کا سخت امتحان

نقلی دلائل کے مطابق غیبت کی حکمتوں میں سے ایک **امتحان وابتلاء** ہے۔

اور یہ ایسا امتحان ہے جس میں بہت سے شیعہ کامیاب نہیں ہوں گے۔

امام کاظمؑ نے فرمایا :

اِنَّهُ لابُدَّ لِصاحِبِ هذَاالاَمرِ مِن غَيبَةٍ حَتّى يَرجِعَ عَن هذَا الاَمرِ مِن كانَ يَقُولُ بِهِ . اِنَّما هِيَ مِحنَةٌ مِنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ امتَحَنَ بِها خَلقَهُ.

''صاحبِ امرؑ کے لیے ایک غیبت ناگزیر ہے، یہاں تک کہ ان لوگوں میں سے بھی بعض اس امر سے پھر جائیں گے جو پہلے اس کے قائل تھے۔ یہ اللہ عزوجل کی طرف سے ایک آزمائش کے سوا کچھ نہیں، جس کے ذریعے وہ اپنی مخلوق کو امتحان میں ڈالتا ہے۔) ''اصول الکافی، ج 1، ص 336، کتاب الحجۃ، باب فی الغیبۃ، حدیث 2۔(

یہ مخصوص امتحان ان لوگوں کا ہے جو پہلے ہی امامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس سے پہلے کے مراحل میں ناکام ہو چکے ہیں اور اس درجۂ امتحان تک پہنچے ہی نہیں۔ اب آخری امامؑ کی غیبت کے زمانے میں اللہ ان لوگوں کو جو اپنے ایمان پر ثابت قدم ہیں، ان لوگوں سے جدا اور ممتاز کرتا ہے جن کا ایمان کمزور اور جن کی معرفت سطحی ہے۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

اَما وَ اللهِ لَيَغيبَنَّ اِمامُكُم سِنيناً مِن دَهرِكُم. وَ لَتُمَحَّصُنَّ حَتّى يُقالَ: ماتَ. قُتِلَ. هَلَكَ. بِاَيِّ وادٍ سَلَكَ؟! وَ لَتَدمَعَنَّ عَلَيهِ عُيُونُ المُؤمِنينَ وَ لَتُكفَؤُنَّ كَما تُكفَأُ السُّفُنُ فى اَمواجِ البَحرِ.

''آگاہ ہو جاؤ! اللہ کی قسم، تمہارا امامؑ تمہاری زندگی کے طویل برسوں تک غیبت میں رہے گا، اور تمہیں ضرور سخت آزمائش اور چھان بین سے گزارا جائے گا، یہاں تک کہ کہا جائے گا: 'وہ فوت ہو گئے! قتل کر دیے گئے! ہلاک ہو گئے! معلوم نہیں کس وادی میں چلے گئے'!

اور یقیناً مؤمنوں کی آنکھیں ان کے فراق میں اشک بار ہوں گی، اور تم اس طرح الٹ پلٹ کیے جاؤ گے جیسے سمندر کی موجوں میں کشتیاں الٹ پلٹ ہو جاتی ہیں۔) ''اصول الکافی، ج 1، ص 336، کتاب الحجۃ، باب فی الغیبۃ، حدیث 3۔(

لہٰذا انسان کے عقائد کی بنیادیں اتنی مضبوط ہونی چاہییں کہ یہ سختیاں اور دشواریاں اسے لغزش میں مبتلا نہ کریں اور اس کے یقین و اعتقاد کو کمزور نہ کر سکیں۔ اسی لیے ہمیں اپنے ائمہؑ کا بے حد شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے غیبت کا زمانہ آنے سے پہلے ہی ہمیں اس دور کے خطرات اور لغزش گاہوں سے آگاہ فرما دیا۔

زمانۂ غیبت میں یادِ امامؑ کا ماند پڑ جانا

غیبت کا امتحان اس حد تک پہنچے گا کہ امامِ غائبؑ کی امامت کے اکثر مدعی اپنے اعتقاد سے پھر جائیں گے۔ لوگوں میں آپؑ کا نام کم لیا جائے گا اور آپؑ کی یاد ماند پڑ جائے گی۔ صقر بن ابی دلف روایت کرتے ہیں:

سَمِعتُ اَباجَعفَر مُحَمَّدَ بنَ عَلِیِّ الرِّضا علیه السّلام یَقُولُ: اِنَّ الاِمامَ بَعدی، اِبنی عَلِیٌّ. اَمرُهُ اَمری. وَ قَولُهُ قَولی. وَ طاعَتُهُ طاعَتی. وَ الاِمامُ بَعدَهُ ابنُهُ الحَسَنُ. اَمرُهُ اَمرُ اَبیه. وَ قَولُهُ قَولُ اَبیه. وَ طاعَتُهُ طاعَةُ اَبیهِ. ثُمَّ سَکَتَ. فَقُلتُ لَهُ: یَابنَ رَسُولِ اللهِ، فَمَنِ الاِمامُ بَعدَ الحَسَنِ؟ فَبَکی علیه السّلام بُکاءً شَدیداً ثُمَّ قالَ: اِنَّ مَن بَعدَ الحَسَنِ ابنُهُ القائِمُ بِالحَقِّ المُنتَظَرُ .فَقُلتُ لَهُ: یَابنَ رَسُولِ اللهِ، لِمَ سُمِّیَ القائِمَ؟ قالَ علیه السّلام: لِاَنَّهُ یَقُومُ بَعدَ مَوتِ ذِکرِهِ وَ اِرتِدادِ اَکثَرِ القائِلینَ بِاِمامَتِهِ.

''میں نے ابو جعفر محمد بن علی الرضاؑ ــــ امام جوادؑ ــــ کو فرماتے ہوئے سنا:

'میرے بعد امام میرا بیٹا علیؑ ہے۔ اس کا امر میرا امر، اس کا قول میرا قول، اور اس کی اطاعت میری اطاعت ہے۔

اور اس کے بعد امام اس کا بیٹا حسنؑ ہے۔ اس کا امر اس کے والد کا امر، اس کا قول اس کے والد کا قول، اور اس کی اطاعت اس کے والد کی اطاعت ہے۔ 'اس کے بعد امامؑ خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا: 'اے فرزندِ رسولِ خداؐ! حسنؑ کے بعد امام کون ہو گا؟'

امامؑ شدت سے رونے لگے، پھر فرمایا' : حسنؑ کے بعد ان کا بیٹا **قائم بالحق، وہ منتظر امامؑ** ہے جس کے ظہور کا انتظار کیا جائے گا۔'

میں نے عرض کیا: 'اے فرزندِ رسولِ خداؐ! انہیں قائم کیوں کہا گیا ہے؟'

آپؑ نے فرمایا' : **کیونکہ وہ اس وقت قیام کریں گے جب ان کی یاد مردہ ہو چکی ہو گی اور ان کی امامت کے اکثر قائل اپنے عقیدے سے پھر چکے ہوں گے۔**) ''[5]کمال الدین، باب 36، حدیث 3۔(

حقیقت یہ ہے کہ زمانۂ غیبت میں امامِ زندہؑ سے بے وفائی اور ان کی نعمت کی ناقدری اس قدر عام ہو جائے گی کہ معاشرے میں آپؑ کا نام اور ذکر ماند پڑ جائے گا، اور ان لوگوں کی اکثریت بھی جو آپؑ کے شیعوں میں شمار ہوتے ہیں، آپؑ کی امامت پر اس درجے کا ایمان باقی نہیں رکھے گی جو انہیں رکھنا چاہیے۔

بے خبری میں دین کا ہاتھ سے نکل جانا

اس مسئلے کی سنگینی اس وقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم جانتے ہیں کہ ممکن ہے انسان کا عقیدہ **اس طرح اس کے ہاتھ سے نکل جائے کہ خود اسے اس کا احساس تک نہ ہو۔** اور ضروری نہیں کہ اس تبدیلی کے لیے کوئی طویل مدت درکار ہو۔ کبھی صبح سے شام تک کا مختصر وقت بھی انسان کے دین سے محروم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ امام باقرؑ نے فرمایا:

لَتُمَحَّصُنَّ یا شیعَةَ آلِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیه و آله و سلم تَمحیصَ الکُحلِ فِی العَینِ. وَ اِنَّ صاحِبَ العَینِ یَدری مَتی یَقَعُ الکُحلُ فی عَینِهِ وَ لا یَعلَمُ مَتی یَخرُجُ مِنها. وَ کَذلِکَ یُصبِحُ الرَّجُلُ عَلی شَریعَةٍ مِن اَمرِنا وَ یُمسی وَ قَد خَرَجَ مِنها؛ وَ یُمسی عَلی شَریعَةٍ مِن اَمرِنا وَ یُصبِحُ وَ قَد خَرَجَ مِنها.

''اے آلِ محمدؐ کے شیعو! تمہیں ضرور اس طرح چھانٹا اور آزمایا جائے گا جیسے آنکھ سے سرمہ آہستہ آہستہ نکل جاتا ہے۔ انسان جانتا ہے کہ سرمہ اس کی آنکھ میں کب ڈالا گیا، لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب آنکھ سے نکل گیا۔ اسی طرح ایک شخص صبح ہمارے امر کی شریعت پر ہو گا، لیکن شام ہوتے ہوتے اس سے نکل چکا ہو گا؛ اور شام کو ہمارے امر کی شریعت پر ہو گا، مگر صبح تک اس سے باہر ہو چکا ہو گا۔) ''غیبت نعمانی، باب 12، حدیث 12۔(

اس روایت میں امامؑ کا خطاب تمام شیعوں سے ہے، لہٰذا اس میں وہ پیروکار بھی شامل ہیں جنہیں ائمہؑ کے زمانۂ حضور میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔

اگر امامؑ کی موجودگی اور دسترس کے زمانے میں رہنے والوں کو بھی ایسا خطرہ لاحق تھا تو زمانۂ غیبت کے شیعوں کے لیے یہ خطرہ کتنا سنگین ہوگا، جبکہ وہ امامؑ کی ظاہری دسترس سے محرومی، حیرت اور سرگردانی کے دور سے گزر رہے ہیں!

غیبت میں مؤمنین کے امتحانات پر امام صادقؑ کے آنسو

غیبت کے زمانے کے امتحانات اور مصائب کی یہی شدت تھی جس نے امام صادقؑ کو اس دور کے مؤمنین کے حال پر غمگیں ہو کر رونے پر مجبور کر دیا۔ سدیر صیرفی روایت کرتے ہیں کہ وہ مفضل بن عمر، ابو بصیر اور ابان بن تغلب کے ساتھ اپنے مولا امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

انہوں نے امامؑ کو زمین پر بیٹھے دیکھا۔ آپؑ کے دوشِ مبارک پر خیبری چادر تھی اور آپؑ اس ماں کی طرح گریہ کر رہے تھے جس کا بچہ اس سے چھن گیا ہو۔ آپؑ کے چہرۂ مبارک پر غم واندوہ کے آثار نمایاں تھے، حالت متغیر تھی اور آنسوؤں سے آنکھوں کے اطراف تر ہو چکے تھے۔

اسی حالت میں امامؑ، امام مہدیؑ کو مخاطب کر کے وہ کلمات فرما رہے تھے جنہیں سدیر نے روایت کیا ہے۔

انہوں نے عرض کیا" :اے بہترین مخلوق کے فرزند! اللہ آپ کی آنکھوں کو کبھی اشک بار نہ کرے۔ کون سا واقعہ پیش آیا ہے جس نے آپؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیے؟ کس چیز نے آپؑ کو اس قدر سوگوار کر دیا ہے؟"

امامؑ نے گہری آہ بھری اور فرمایا:

نَظَرتُ فی کِتابِ الجَفرِ صَبیحَةَ هذَا الیَومِ. وَ هُوَ الکِتابُ المُشتَمِلُ عَلی عِلمِ المَنایا وَ البَلایا وَ الرَّزایا وَ عِلم ما کانَ وَ ما یَکُونُ اِلی یَومِ القِیامَةِ الَّذی خَصَّ اللهُ بِهِ مُحَمَّداً صلی الله علیه و آله و سلم وَ الاَئِمَّةَ مِن بَعدِهِ علیهم السّلام. وَ تَاَمَّلتُ مِنهُ مَولِدَ قائِمِنا وَ غَیبَتَهُ وَ اِبطاءَهُ وَ طُولَ عُمرِهِ وَ بَلوَی المُؤمِنینَ فی ذلِکَ الزَّمانِ وَ تَوَلُّدَ الشُّکُوکِ فی قُلُوبِهِم مِن طُولِ غَیبَتِهِ وَ ارتِدادَ اَکثَرِهِم عَن دینِهِم وَ خَلعَهُم رَبقَةَ الاِسلامِ مِن اَعناقِهِم؛ اَلَّتی قالَ اللهُ تَقَدَّسَ ذِکرُهُ: «وَ کُلَّ اِنسانٍ اَلزَمناهُ طائِرَهُ فی عُنُقِهِ» – یَعنِی الوِلایَةَ – فَاَخَذتَنِی الرِّقَّةُ وَ استَولَت عَلَیَّ الاَحزانُ.

”آج صبح میں نے کتابِ جفر میں نظر کی۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں موتوں، بلاؤں اور مصیبتوں کا علم، نیز جو کچھ ہو چکا ہے اور قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اس کا علم موجود ہے؛ وہ علم جسے اللہ نے خصوصیت کے ساتھ محمدؐ اور آپؐ کے بعد ائمہؑ کو عطا فرمایا ہے۔

میں نے اس میں اپنے قائمؑ کی ولادت، ان کی غیبت، ان کے ظہور میں تاخیر، ان کی طویل عمر، اس زمانے میں مؤمنین کی آزمائش، طولِ غیبت کے سبب ان کے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک، ان میں سے اکثر کے اپنے دین سے پھر جانے، اور اپنی گردنوں سے اسلام کے حلقے کو اتار پھینکنے پر غور کیا؛ وہی جس کے بارے میں اللہ — جس کا ذکر بلند ہے — فرماتا ہے:

’اور ہر انسان کا طائر ہم نے اس کی گردن سے وابستہ کر دیا ہے) ’سورۂ اسراء 17:13(،

یعنی ولایت۔

یہ دیکھ کر میرے دل پر رقت طاری ہو گئی اور غم واندوہ نے مجھے گھیر لیا۔) ”کمال الدین، باب 33، حدیث 51۔(

امامؑ کا یہ درد اور غم ان لوگوں کے لیے تھا جو اپنے زمانے کے امامؑ سے اپنا تعلق کھو بیٹھیں گے، اپنے عقائد میں شک و تردّد کا شکار ہو جائیں گے، اور بالآخر دین سے پھر کر بے دینی میں جا پڑیں گے۔

یہی وہ حقیقت تھی جس نے زمانۂ غیبت آنے سے صدیوں پہلے امام صادقؑ کو اشک بار کر دیا تھا۔

زمانۂ غیبت میں دین کی حفاظت

جیسا کہ بیان ہوا، امامِ عصرؑ کی غیبت کے زمانے میں ہمیں درپیش سب سے بڑا خطرہ **صحیح عقیدہ کھو دینے اور دین سے محروم ہو جانے کا خطرہ** ہے۔

اسی لیے زمانۂ غیبت میں دین کی حفاظت کے بارے میں نہایت مؤکد اور بار بار ہدایات دی گئی ہیں۔

امام کاظمؑ نے فرمایا:

اِذا فُقِدَ الخامِسُ مِن وُلدِ السّابِعِ، فَاللهَ اللهَ فی اَدیانِکُم لا یُزیلَنَّکُم عَنها اَحَدٌ.

''جب ساتویں امامؑ کی نسل سے پانچواں فرزند نظروں سے اوجھل ہو جائے تو اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، اپنے دین کے بارے میں! خبردار، کوئی شخص تمہیں تمہارے دین سے ہٹا نہ دے۔''

)اصول الکافی، ج 1، ص 336، کتاب الحجۃ، باب فی الغیبۃ، حدیث 2۔(

زمانۂ غیبت میں دین کی حفاظت کوئی آسان کام نہیں۔ اور محض دل میں یہ فیصلہ کر لینا بھی کافی نہیں کہ ہم اپنے دین کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہر چیز کے حصول کا ایک صحیح راستہ اور مناسب ذریعہ ہوتا ہے۔ جو شخص اس راستے سے داخل نہ ہو اسے مطلوبہ نتیجے تک پہنچنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ دین کی حفاظت کے بھی اپنے مخصوص اسباب اور ذرائع ہیں۔

غذائے روح کے بارے میں احتیاط

دین کی حفاظت کے ذرائع میں سے ایک یہ ہے کہ انسان ان کتابوں اور تحریروں کے بارے میں محتاط رہے جنہیں وہ پڑھتا ہے، ان باتوں کے بارے میں ہوشیار رہے جنہیں سنتا ہے، اور ان چیزوں کے بارے میں بھی احتیاط کرے جنہیں دیکھتا ہے۔ ان تمام چیزوں کے انتخاب میں سوچ سمجھ اور دقت ضروری ہے۔

جب تک انسان کو اطمینان نہ ہو کہ جو کچھ وہ پڑھ، دیکھ یا سن رہا ہے وہ فکری اور اعتقادی اعتبار سے صحیح ہے اور اس کے عقائد کو کمزور نہیں کرے گا، اسے خود کو اس کے سامنے بے محابا پیش نہیں کرنا چاہیے۔ ہر کتاب پڑھنے کے لائق نہیں۔

ہر شخص کی بات سننے کے لیے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ دل کا دروازہ ہر اجنبی اور نااہل شخص کے لیے نہیں کھول دینا چاہیے۔

جس طرح انسان اس وقت تک کوئی غذا نہیں کھاتا جب تک اسے اطمینان نہ ہو کہ وہ اس کے لیے محفوظ ہے، اور اپنی جسمانی غذا بھی ہر شخص اور ہر جگہ سے حاصل نہیں کرتا، اسی طرح اپنے عقائد، افکار اور نظریات بھی ہر شخص سے نہیں لینے چاہییں اور نہ ہر ایک پر اعتماد کرنا چاہیے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

»فَلیَنظُرِ الاِنسانُ اِلی طَعامِہِ.«

''پس انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کی طرف غور سے دیکھے۔'' سورۂ عبس 80:24(

یہ غذا صرف جسم کی خوراک نہیں، بلکہ روح و فکر کی غذا کو بھی شامل ہے۔

اسی لیے جب امام باقرؑ سے اس آیتِ کریمہ میں **"اس کی غذا"** کے معنی پوچھے گئے تو آپؑ نے فرمایا:

عِلمُهُ الَّذی یَأخُذُهُ مِمَّن یَأخُذُهُ.

"اس سے مراد اس کا علم ہے جو وہ حاصل کرتا ہے؛ اسے دیکھنا چاہیے کہ یہ علم کس سے حاصل کر رہا ہے۔) "بحار الانوار، ج 2، ص 96، حدیث 38، بحوالۂ المحاسن، برقی۔(

پس انسان کو اپنے جسم کی غذا سے بھی زیادہ اپنی روح کی غذا ـــ یعنی ان افکار و نظریات کے بارے میں جو اس کے ذہن اور دل میں داخل ہوتے ہیں ـــ محتاط ہونا چاہیے۔

جب تک اسے اطمینان نہ ہو کہ کوئی چیز اس کے دین کو نقصان نہیں پہنچائے گی، اسے اپنے آپ کو اس کے سامنے نہیں رکھنا چاہیے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان "تحقیق" کے نام پر اور بظاہر فکری وسعت و آزاد اندیشی کے جذبے سے ایسی کتابوں اور مقالات کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے، جبکہ اس کے پاس صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے کی ضروری علمی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ پھر وہ یہ سمجھتے ہوئے کہ تحقیق کر رہا ہے، نہایت آسانی سے اپنے پہلے سے موجود عقائد کھونے لگتا ہے۔ جن امور کے بارے میں پہلے اسے یقین حاصل تھا، انہی کے بارے میں رفتہ رفتہ شک و تردّد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اور جب تک اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے، ممکن ہے بہت دیر ہو چکی ہو۔ اس کا ذہن اور دل باطل اقوال اور منحرف افکار سے اس قدر بھر چکا ہو کہ حق کے لیے اس کے اندر جگہ باقی نہ رہے، بلکہ وہ ہر صحیح بات کے مقابل بھی مخالفت اور عناد کا ردِ عمل ظاہر کرنے لگے۔

دل کی یہ نابینائی کبھی صرف ایک دن میں، صبح سے شام تک، محض ایک مقالہ پڑھنے کے نتیجے میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

انحراف کی رفتار کا انحصار انسان کی فکری اور دینی بنیادوں کی قوت و ضعف پر ہوتا ہے۔

اگر یہ بنیادیں بہت کمزور ہوں تو ممکن ہے انسان ایسے نظریے کے سامنے ٹھہر نہ سکے جو بظاہر دلکش ہو لیکن حقیقت میں فاسد ہو۔ پہلے وہ شک و تردّد میں پڑتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ انکار تک پہنچ جاتا ہے۔

زمانۂ غیبت میں یہ خطرات اہلِ ایمان کو دوسرے زمانوں کی نسبت زیادہ شدت سے درپیش ہیں۔ لہٰذا ایسے حالات میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے انسان کو انتہائی ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت ہے۔

اسی بنیاد پر شیعہ فقہاء نے ان گمراہ کن کتابوں اور تحریروں کے مطالعے سے منع کیا ہے جنہیں فقہی اصطلاح میں **کتبِ ضالّہ** کہا جاتا ہے، خصوصاً اس شخص کے لیے جس میں ان کے باطل مطالب کا علمی جائزہ لینے، ان کا ردّ کرنے اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ ایسے احکام کی بنیاد بھی ائمہؑ کی نقلی تعلیمات پر ہے۔ ائمہؑ اپنے پیروکاروں سے محبت اور ان کی خیر خواہی کی بنا پر نہیں چاہتے تھے کہ ان کا دین اور ان کے عقائد آسانی سے انحراف اور فساد کی زد میں آجائیں؛ اسی لیے انہوں نے ایسی ہدایات عطا فرمائیں۔

ان ہدایات پر عمل کرنا زمانۂ غیبت میں دین کی حفاظت اور نگہبانی کے طریقوں میں سے ایک ہے۔

گمراہی کے اس قدر راستوں کے درمیان جو شخص ثابت قدم رہ سکے، اپنے صحیح عقائد محفوظ رکھے اور اہلِ بیتؑ کے راستے سے منحرف نہ ہو، اسے ایک عظیم امتیاز حاصل ہے اور اس کی یہ جدوجہد نہایت گراں قدر ہے۔

ہماری روایات نے زمانۂ غیبت میں دین پر مضبوطی سے قائم رہنے کو اس شخص سے تشبیہ دی ہے جو اپنے ننگے ہاتھ سے کانٹوں بھری شاخ کے تیز کانٹے نوچ رہا ہو۔

یہ مثال نہایت واضح انداز میں اس دور میں دیندار باقی رہنے کی دشواری کو بیان کرتی ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ لِصاحِبِ هذَا الاَمرِ غَيبَةً المُتَمَسِّکُ فيها بِدينِهِ کَالخارِطِ لِلقَتادِ. ثُمَّ قالَ هکَذا بِيَدِهِ. فَاَيُّکُم يُمسِکُ شَوکَ القَتادِ بِيَدِهِ؟! ... اِنَّ لِصاحِبِ هذَا الاَمرِ غَيبَةً. فَلْيَتَّقِ اللهَ عَبدٌ وَ لْيَتَمَسَّکْ بِدينِهِ.

"صاحبِ امرؑ کے لیے ایک غیبت ہوگی جس میں اپنے دین کو مضبوطی سے تھامے رکھنے والا اس شخص کی مانند ہوگا جو اپنے ہاتھ سے درختِ قتاد کے کانٹے نوچے۔"

پھر امامؑ نے اپنے ہاتھ سے اس عمل کی کیفیت دکھائی اور فرمایا" : تم میں سے کون ہے جو قتاد کے کانٹوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑ سکتا ہے؟...

یقیناً صاحبِ امرؑ کے لیے ایک غیبت ہو گی۔ پس بندے کو چاہیے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرے اور اپنے دین کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔) ''اصول الکافی، ج 1، ص 335، کتاب الحجۃ، باب فی الغیبۃ، حدیث 1۔(

قتاد ایک سخت اور کانٹے دار درخت ہے جس کے کانٹے سوئی کی مانند نہایت تیز ہوتے ہیں۔ عربی محاورے میں ہاتھ سے قتاد کے کانٹے نوچنا ایک انتہائی دشوار اور تکلیف دہ کام کے لیے ضرب المثل بن گیا ہے۔

اپنے دین میں غریب بن کر زندگی گزارنا

زمانۂ غیبت کے حالات پُر سکون اور خطرات سے خالی نہیں ہیں۔

صورتِ حال ایسی ہے کہ انسان کو اپنے دین کو لاحق خطرات سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ ان خطرات سے بے توجہی خود دین کے ضائع ہو جانے کا سبب بن سکتی ہے۔

انسان کو اپنی حقیقی اور ابدی مصلحت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے اور دنیاوی زندگی کی مشکلات اور مشغولیات کو یہ اجازت نہیں دینی چاہیے کہ وہ اسے اپنی آخرت کی سعادت سے غافل کر دیں۔

روایات کی تعبیر کے مطابق اسے چاہیے کہ **اپنے دین کو لے کر بھاگے۔**

یعنی ان دشمنوں سے دور ہو جائے جو مختلف صورتوں میں اس کے دین کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔

ہر شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو، اس کا مقابلہ کرے اور اسے شکست دے۔ سب سے پہلے اپنی حفاظت ضروری ہے۔

امام جوادؑ نے فرمایا:

اِذا ماتَ ابنی عَلِیٌّ، بَدا سِراجٌ بَعدَهُ ثُمَّ خَفِیَ. فَوَیلٌ لِلمُرتابِ! وَ طوبی لِلغَریبِ الفارِّ بِدینِهِ!

''جب میرا بیٹا علیؑ [امام ہادیؑ] دنیا سے رخصت ہو گا تو اس کے بعد ایک چراغ روشن ہو گا [امام عسکریؑ]، پھر وہ نور نگاہوں سے پوشیدہ ہو جائے گا [بارہویں امامؑ کی غیبت کے ذریعے]۔

پس شک میں پڑنے والے کے لیے ہلاکت ہے، اور خوش نصیب ہے وہ **غریب جو اپنے دین کو لے کر بھاگتا ہے''!**

)غیبت نعمانی، باب 10، حدیث 37۔(

زمانۂ غیبت میں اپنے دین کے ساتھ ایک **غریب واجنبی** کی طرح رہنا انسان کو انحراف سے زیادہ محفوظ رکھ سکتا ہے۔

یہ وہ صفت ہے جسے اہلِ ایمان اپنے تنہا اور پردۂ غیبت میں موجود امام، حضرت بقیۃ اللہؑ —— ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں —— سے میراث میں پاتے ہیں۔

یہاں جو کچھ بیان ہوا، وہ صرف اس تصویر کا ایک حصہ ہے جو اہلِ بیتؑ کی روایات ہمیں زمانۂ غیبت میں دینداری اور حفظِ دین کے بارے میں دکھاتی ہیں۔

ان تمام دشواریوں اور خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے اب بنیادی سوال یہ ہے:

ان خطرات سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ انسان کس طرح ان تمام فتنوں سے محفوظ رہتے ہوئے اپنے دین کو صحیح وسالم بچا سکتا ہے؟ اگلے باب میں ہم اس سوال کا جواب اہلِ بیتؑ کی روایات کی روشنی میں تلاش کریں گے۔

باب سوم: معرفتِ امامؑ ـــــ زمانۂ غیبت میں حفظِ دین کا واحد راستہ

زمانۂ غیبت میں معرفت کے لیے اللہ سے دعا

امامؑ کی غیبت کے زمانے میں انسان کو کیا کرنا چاہیے اور نجات کا راستہ کہاں تلاش کرنا چاہیے؟ یہ سوال خود گزشتہ ائمہؑ کے زمانے میں بھی ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اور ائمہؑ نے خود اس کا جواب عطا فرمایا۔

وہ سوالات اور ان کے جوابات آج براہِ راست ہمارے لیے بھی راہنما ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنے ائمہؑ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس معاملے میں بھی ہماری رہنمائی فرمائی۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ لِلغُلامِ غَیبَةً قَبلَ اَن یَقُومَ ... . غَیرَ اَنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ یُحِبُّ اَن یَمتَحِنَ الشّیعَةَ. فَعِندَ ذلِکَ یَرتابُ المُبطِلُونَ.

”اس جوان کے قیام سے پہلے ایک غیبت ہو گی... لیکن اللہ عزوجل چاہتا ہے کہ شیعوں کو آزمائے۔ اس وقت اہلِ باطل شک و تردّد میں مبتلا ہو جائیں گے۔“

)اصول الکافی، ج 1، ص 337، کتاب الحجۃ، باب فی الغیبۃ، حدیث 5۔(

اس روایت کے راوی زرارہ نے امامؑ سے پوچھا کہ اگر وہ اس زمانے کو پالیں تو ان کی ذمہ داری کیا ہو گی؟

امامؑ نے فرمایا:

اِذا اَدرَکتَ هذَا الزَّمانَ فَادعُ بِهذَا الدُّعاءِ: اَللّهُمَّ عَرِّفنی نَفسَکَ. فَاِنَّکَ اِن لَم تُعَرِّفنی نَفسَکَ، لَم اَعرِف نَبِیَّکَ. اللّهُمَّ عَرِّفنی رَسُولَکَ. فَاِنَّکَ اِن لَم تُعَرِّفنی رَسُولَکَ، لَم اَعرِف حُجَّتَکَ. اللّهُمَّ عَرِّفنی حُجَّتَکَ. فَاِنَّکَ اِن لَم تُعَرِّفنی حُجَّتَکَ، ضَلَلتُ عَن دینی.

”اگر تم اس زمانے کو پالو تو یہ دعا پڑھنا:

اے اللہ! مجھے اپنی معرفت عطا فرما، کیونکہ اگر تو مجھے اپنی معرفت عطا نہ فرمائے تو میں تیرے نبیؐ کو نہ پہچان سکوں گا۔

اے اللہ! مجھے اپنے رسولؐ کی معرفت عطا فرما، کیونکہ اگر تو مجھے اپنے رسولؐ کی معرفت عطا نہ فرمائے تو میں تیری حجتؑ کو نہ پہچان سکوں گا۔ اے اللہ! مجھے اپنی حجتؑ کی معرفت عطا فرما، کیونکہ اگر تو مجھے اپنی حجتؑ کی معرفت عطا نہ فرمائے تو میں اپنے دین سے گمراہ ہو جاؤں گا۔"

حصولِ معرفت میں دعا کا کردار

امام صادقؑ کی اس ہدایت میں دو اہم نکات قابلِ توجہ ہیں۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ امامؑ ہمیں **دعا کرنے** کا حکم دیتے ہیں۔ انسان کو اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، اسی سے مدد مانگنی چاہیے اور اسی سے نجات اور حفاظت طلب کرنی چاہیے۔ یہ نہایت اہم اصول ہے۔

اگر انسان ذرّہ برابر بھی اپنے آپ پر، یا اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں پر بھروسا کرنے لگے، اور اپنے اعمال پر اعتماد پیدا کر لے —— مثلاً اس بات پر کہ اس نے کتنا علم حاصل کیا ہے، کتنی خدمات انجام دی ہیں یا کتنے نیک کام کیے ہیں —— تو غیرِ خدا پر یہی اعتماد اس کی لغزش اور دین کھو دینے کی ہلاکت خیز کھائی میں گرنے کا سبب بن سکتا ہے۔

اگر اللہ ایک لمحے کے لیے بھی انسان کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دے اور اس سے اپنی توفیق واپس لے لے تو نہ اس کے اعمال اسے کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا شخص اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بچا سکتا ہے:

»مَن یَھدِ اللہُ فَھُوَ المُھتَدِ وَ مَن یُضلِل فَلَن تَجِدَ لَہُ وَلِیّاً مُرشِدا.«

"جسے اللہ ہدایت دے، وہی ہدایت یافتہ ہے، اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے، تم اس کے لیے ہرگز کوئی راہ دکھانے والا سرپرست نہ پاؤ گے۔"

(سورۂ کہف 18:17)

اللہ کا کسی کو "گمراہ کرنا" اس معنی میں نہیں کہ وہ اسے جبراً گمراہی میں ڈال دے اور زبردستی جہنم کی طرف لے جائے۔ اللہ اس سے منزّہ و برتر ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس سے اپنی توفیق واپس لے لے اور اسے اس کے اپنے حال پر چھوڑ دے۔

لہٰذا انسان کو صرف اللہ کے فضل و عنایت پر بھروسا کرنا چاہیے اور ہدایت و نصرت کے لیے اسی دروازے کی طرف رجوع کرنا چاہیے جسے خود اللہ نے کھولا ہے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

»وَ أتُوا البُيُوتَ مِن اَبوابِها.«

''اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو۔''

(سورۂ بقرہ 2:189)

اللہ کی ہدایت کے دروازے اہلِ بیتِ عصمت و طہارتؑ کے سوا کوئی اور نہیں۔

امیر المؤمنینؑ نے فرمایا:

نَحنَ البُيُوتَ الَّتی اَمَرَ اللهُ بِها اَن تُؤتی مِن اَبوابِها. ... فَمَن تابَعَنا وَ اَقَرَّ بِوِلايَتِنا، فَقَد اَتَی البُيُوتَ مِن اَبوابِها. وَ مَن خالَفَنا وَ فَضَّلَ عَلَينا غَيرَنا، فَقَد اَتَی البُيُوتَ مِن ظُهُورِها.

''ہم وہ گھر ہیں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا جائے...

پس جو ہماری پیروی کرے اور ہماری ولایت کا اقرار کرے، اس نے گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہونے کا راستہ اختیار کیا؛ اور جو ہماری مخالفت کرے اور دوسروں کو ہم پر ترجیح دے، اس نے گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہونے کی کوشش کی۔''

(الاحتجاج، طبرسی، ج 1، ص 338۔)

پس انسان کو اللہ کی طرف انہی دروازوں کے ذریعے متوجہ ہونا چاہیے جنہیں اس نے خود مقرر فرمایا ہے، تاکہ وہ اس کے فضل و عنایت کا مستحق بن سکے۔

اسی عقیدے کے ساتھ انسان کو اللہ کے حضور دعا کرنی چاہیے۔

دعا کے بغیر انسان اللہ کی خصوصی توجہ کا مستحق نہیں بنتا:

»قُل ما يَعبَأُ بِكُم رَبّی لَولا دُعاؤُكُم.«

''کہہ دیجیے: اگر تمہاری دعا نہ ہو تو میرا پروردگار تمہاری کوئی پروا کیوں کرے؟''

)سورۂ فرقان 25:77(

اللہ کے نزدیک اس حقیقت پر ایمان کی خاص اہمیت ہے کہ انسان اپنی تمام ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد بھی کبھی اپنے اعمال پر تکیہ نہ کرے۔

اسی لیے معصومینؑ سے منقول دعاؤں میں بار بار اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

مثلاً دعائے افتتاح میں، جو امامِ عصرؑ سے منسوب ہے، قرآنِ کریم سے ماخوذ یہ نورانی کلمات ملتے ہیں:

اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذی ھَدانا لِھذا. وَ ما کُنا لِنَھتَدِیَ لَولا اَن ھَدانَا اللّٰہُ.

''تمام حمد اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اس راستے کی ہدایت دی، اور اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہرگز ہدایت نہ پا سکتے۔''

یعنی ولایت و امامت کی ہدایت بھی ہمیں اللہ ہی نے عطا فرمائی ہے۔

ماثور دعاؤں کی اہمیت

دعا کے سلسلے میں ایک اور اہم امر **ماثور دعاؤں** ـــــ یعنی معصومینؑ سے منقول دعاؤں ـــــ کی طرف خصوصی توجہ ہے۔

اگرچہ انسان اللہ کو کسی بھی زبان اور درست الفاظ کے ساتھ پکار سکتا ہے، لیکن اللہ نے انبیاءؑ اور ائمہؑ کو اس لیے بھی مقرر فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ سکھائیں کہ اس کی عبادت کس طرح کی جائے اور اپنے پروردگار سے رابطہ کس طرح قائم کیا جائے۔

لہٰذا بہتر یہی ہے کہ انسان **دعا کرنے کا طریقہ بھی انہی سے سیکھے** اور اللہ کو اسی انداز سے پکارے جس کی انہوں نے تعلیم دی ہے۔

معصومینؑ سے منقول دعاؤں میں جو اثر پایا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ عام انسانوں کی بنائی ہوئی دعاؤں میں بھی وہی اثر موجود ہو۔

مزید یہ کہ جب معصومؑ سے منقول کوئی دعا انسان تک پہنچ جائے تو اسے اسی طرح پڑھنا چاہیے جس طرح معصومؑ نے تعلیم فرمائی ہے۔ اسے یہ اختیار نہیں کہ اپنی پسند سے اس کے الفاظ میں اضافہ یا کمی کرے۔

یہ اصول امام صادقؑ کی اس ہدایت میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے جو بالخصوص امامِ عصرؑ کی غیبت کے زمانے سے متعلق ہے۔

روایت کے آغاز میں امامؑ فرماتے ہیں:

سَتُصیبُکُم شُبهَةٌ فَتَبقَونَ بِلا عَلَمٍ یُری وَ لا اِمامِ هُدیً. لا یَنجُو مِنها اِلّا مِن دَعا بِدُعاءِ الغَریقِ.

''تم پر ایسا اشتباہ اور حیرت کا زمانہ آئے گا جس میں حق و باطل باہم مشتبہ ہو جائیں گے، اور تم ایسے حال میں رہ جاؤ گے کہ نہ کوئی نمایاں عَلَم تمہیں دکھائی دے گا اور نہ کوئی امامِ ہدایت تمہارے سامنے موجود ہو گا۔ اس حالت سے صرف وہی نجات پائے گا جو **دعائے غریق** پڑھے۔''

(بحار الانوار، ج 52، ص 149، حدیث 73، بحوالۂ کمال الدین۔)

راویِ حدیث عبداللہ بن سنان نے عرض کیا:

''دعائے غریق کیا ہے؟''

امامؑ نے فرمایا:

یا اللهُ یا رَحمنُ یا رَحیمُ یا مُقَلِّبَ القُلُوبِ، ثَبِّت قَلبی عَلی دینِکَ.

''اے اللہ! اے رحمان! اے رحیم! اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔''

عبداللہ بن سنان نے دعا کو اس طرح دہرایا:

یا مُقَلِّبَ القُلُوبِ وَ الاَبصارِ، ثَبِّت قَلبی عَلی دینِکَ

''اے دلوں **اور نگاہوں** کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔''

اگرچہ انہوں نے جو الفاظ بڑھائے تھے وہ اپنی جگہ درست تھے، لیکن امام صادقؑ نے انہیں معصومؑ سے منقول الفاظ کی بعینہٖ حفاظت کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ مُقَلِّبَ القُلُوبِ وَ الاَبصارِ، وَ لکِن قُل کَما اَقُولُ: یا مُقَلِّبَ القُلُوبِ ثَبِّت قَلبی عَلی دینِکَ.

"بے شک اللہ عزوجل دلوں اور نگاہوں دونوں کو پھیرنے والا ہے، لیکن تم اسی طرح کہو جیسے میں کہتا ہوں:

اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔"

امامؑ کی اس ہدایت میں، جو بالخصوص زمانۂ غیبت سے متعلق ہے، ایک مرتبہ پھر دعا اور اللہ سے مدد طلب کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ خاص طور پر قابلِ توجہ وہ نام ہے جو امامؑ نے اس دعا کو عطا فرمایا: **دعائے غریق—ڈوبنے والے کی دعا۔**

غریق اس شخص کو کہتے ہیں جو ڈوب رہا ہو۔ یہاں اس سے مراد وہ انسان ہے جو زمانۂ غیبت کے فتنوں اور آزمائشوں کی موجوں میں گھرا ہوا ہو اور خود اپنے آپ کو بچانے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔

ایسے شخص کو کسی کی ضرورت ہے جو اس کا ہاتھ پکڑے اور اسے نجات دے۔

اسی لیے اسے دعائے غریق سکھائی گئی ہے، تاکہ وہ جان سکے کہ **مدد کس سے مانگنی ہے اور اس سے کیا مانگنا ہے۔**

زمانۂ غیبت میں دین کھو دینے کا خوف

اس حقیقت کا شعور کہ زمانۂ غیبت میں اہلِ ایمان فساد اور انحراف کے ایک سمندر میں ڈوبنے کے خطرے سے دوچار ہیں، خود انسان کے لیے نہایت فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔

جب انسان بیماری کو پہچان لے تو علاج تلاش کرتا ہے۔ جسے درد ہی محسوس نہ ہو، وہ علاج کے لیے کیوں جائے گا؟

افسوس کہ امامؑ کی غیبت کے زمانے میں بہت سے اہلِ ایمان اپنے حالات کی نزاکت اور خطرے کو محسوس ہی نہیں کرتے۔ وہ ایک ایسی کشتی میں اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں جس پر ہر طرف سے خطرناک موجیں ضربیں لگا رہی ہیں اور ہر لمحہ اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ صرف وہ لوگ جو باہر کے حالات سے واقف ہیں، سمندر کے طوفان اور کشتی کی کمزوری کو سمجھتے ہیں، خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ باقی لوگ اسی کشتی میں سکون سے بیٹھے اپنے معمول کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔

زمانۂ غیبت میں بہت کم لوگ حقیقتاً اس دور کے خطرات کو پہچانتے اور حالات کی سنگینی کو سمجھتے ہیں۔

جو لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ دوسروں کو بھی بیدار اور خبردار کریں، تاکہ وہ بھی سنجیدگی سے غور کرنا شروع کریں اور اپنے دین کے بارے میں کم از کم اتنی فکر تو کریں جتنی اپنی دنیا کے معاملات کے بارے میں کرتے ہیں، نہ یہ کہ اپنے ایمان کی حفاظت سے بے پرواا اور غافل رہیں۔

جب انسان حقیقتاً زمانۂ غیبت کی نزاکت اور اس دور میں دیندار باقی رہنے کی دشواری کو سمجھ لیتا ہے تو اس کے دل کی گہرائیوں سے سچی دعا نکلتی ہے۔

وہ اپنے پروردگار کے حضور دستِ نیاز بلند کرتا ہے اور ائمہؑ کی عنایت و دستگیری کی پناہ لیتا ہے، تاکہ وہ اسے اس نازک حالت سے نجات دلائیں اور سلامتی کے ساتھ ساحلِ نجات و سعادت تک پہنچادیں۔

خلاصہ یہ کہ ہمیں اس حقیقت پر پختہ ایمان ہونا چاہیے کہ اگر آج ہمارے دل میں اللہ، رسولِ خداؐ اور امامؑ پر ایمان موجود ہے اور ہم اس عقیدے پر ثابت قدم رہ سکے ہیں تو یہ صرف اور صرف اللہ کے فضل و عنایت سے ہے۔

ہمیں اس نعمت کو کبھی اپنی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے۔

اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو اللہ کی نعمتیں جتنی زیادہ ہوتی جائیں گی، اتنا ہی ہمارے اندر یہ احساس گہرا ہو گا کہ ہم بذاتِ خود ان کے مستحق نہ تھے۔ نتیجتاً اللہ کے حضور ہماری دعائیں، تضرع اور عاجزی زیادہ حقیقی اور قلبی ہوتی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان راہِ ہدایت پر جتنا آگے بڑھتا ہے، اتنا ہی زیادہ امدادِ الٰہی کا محتاج ہوتا جاتا ہے۔

اس راستے پر آگے بڑھنے کے ساتھ اسے اللہ کے مقرر کردہ ابوابِ ہدایت کے ذریعے اپنے توسل کو بھی بڑھاتے رہنا چاہیے اور دل کی گہرائیوں سے پکارنا چاہیے:

اللّٰھُمَّ لا تُمِتنی میتَةً جاھِلِیَّةً. وَ لا تُزِغ قَلبی بَعدَ اِذ ھَدَیتَنی.

"اے اللہ! مجھے جاہلیت کی موت نہ دینا، اور ہدایت عطا فرمانے کے بعد میرے دل کو منحرف نہ ہونے دینا۔"

یہ جمعہ کے دن نمازِ عصر کے بعد پڑھی جانے والی اس دعا کا ایک حصہ ہے جو امام مہدیؑ کے پہلے نائب سے منقول ہے۔

(جمال الاسبوع، سید ابن طاؤس، باب 47، ص 315؛ کمال الدین، باب 45، حدیث 43۔)

انسان کا دل وہ مقام ہے جہاں ہدایتِ الٰہی اترتی ہے، اور اس کا پلٹنا اللہ کے اختیار میں ہے؛ انسان اس پر مستقل اور ذاتی اختیار نہیں رکھتا۔ اور اللہ کا وہ **"ہاتھ"** جس کے ذریعے اس کی ہدایت بندوں تک پہنچتی ہے، رسولِ خداؐ اور آپؐ کے پاکیزہ اہلِ بیتؑ کے مقدس وجود سے ظاہر ہوتا ہے۔

لہٰذا انہی کو وسیلۂ تقرب بناتے ہوئے اللہ سے ہدایت طلب کرنی چاہیے۔

زمانۂ غیبت کی دعاؤں کا بنیادی مضمون

امام صادقؑ کی اس ہدایت میں دوسرا اہم نکتہ:

اَللّٰھُمَّ عَرِّفنی نَفسَکَ ... ضَلَلتُ عَن دینی

"اے اللہ! مجھے اپنی معرفت عطا فرما... ورنہ میں اپنے دین سے گمراہ ہو جاؤں گا"

اس دعا کا **مضمون** ہے۔

اس دعا میں طلب کیا جاتا ہے: **اللہ کی معرفت، رسولِ خداؐ کی معرفت، اور امامؑ کی معرفت۔**

یہ دین کی بنیادیں ہیں، جبکہ دوسرے امور اس کی شاخیں شمار ہوتے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ جب انسان امامؑ کی معرفت رکھتا ہو اور ان کی ولایت پر قائم ہو تو حقیقت میں معرفتِ قلبی کی دوسری دونوں صورتیں بھی اسے حاصل ہو جاتی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان ولایتِ امامؑ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے تو اسے حاصل ہونے والی پہلی برکت **صحیح توحید، معرفتِ خدا کا اقرار، اور اس کی بندگی کے سامنے التزام و تسلیم** ہے۔

اسی لیے دعا کے آخر میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر ہم اللہ کی حجت ـــــ یعنی امامؑ ـــــ کو نہ پہچانیں تو اس کا نتیجہ دین سے گمراہی ہوگا۔ یہ صرف اس وجہ سے نہیں کہ امامؑ کی معرفت نہ ہونے کی صورت میں انسان احکامِ دین سے ناواقف رہ جاتا ہے۔

یہ بات یقیناً درست ہے کہ فروعِ دین کے احکام اہلِ بیتؑ ہی سے حاصل کیے جانے چاہییں، لیکن فروع سے کہیں زیادہ اہم **اصولِ دین اور اعتقادات کی بنیادیں** ہیں، اور معرفتِ امامؑ ان سب کا محور اور جوہر ہے۔

اس معرفت کے بغیر حتیٰ توحید اور معرفتِ خدا بھی انسان کے لیے نفع بخش نہ ہو گی، جبکہ معرفتِ امامؑ کے ساتھ عملاً تمام صحیح عقائد تک رسائی اس کے لیے ممکن ہو جاتی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ **"دین، معرفتِ امامؑ ہے"** نہ مبالغہ ہے اور نہ محض ایک مسامحانہ تعبیر۔

اس دعا اور دعائے غریق میں انسان جس چیز کو سب سے بڑھ کر طلب کرتا ہے وہ **امامِ عصرؑ کی صحیح معرفت اور اس معرفت پر ثبات و استقامت** ہے۔ اگر یہ حاصل ہو گئی تو باقی سب کچھ اس کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ حاصل نہ ہوئی تو بالآخر کوئی دوسری چیز انسان کو فائدہ نہیں دے گی۔

زمانۂ غیبت میں ولایتِ امامؑ پر ثابت قدم رہنے کی فضیلت

اگر غیبت کی تمام سختیوں اور دشواریوں کے باوجود کوئی شخص اللہ کے فضل اور اہلِ بیتؑ کی دستگیری سے معرفتِ امامؑ پر ثابت قدم رہے، ان کی ولایت کو قبول کیے رکھے اور راہِ ایمان سے منحرف نہ ہو تو اس کے ایمان کی قدر و منزلت غیر معمولی ہے۔ چونکہ وہ ایسے امامؑ پر ایمان رکھتا ہے جو غیبت میں ہیں اور اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، اس لیے اسے ان لوگوں کے مقابل ایک خاص فضیلت حاصل ہوتی ہے جو ائمہؑ کے ظاہری حضور کے زمانے میں زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے سامنے روشن نشانیاں دیکھنے کے بعد تسلیم ہوئے۔

رسولِ خداؐ نے فرمایا:

یا عَلِیُّ، وَاعلَم اَنَّ اَعجَبَ النّاسِ ایماناً وَ اَعظَمَهُم یَقیناً قَومٌ یَکونونَ فی آخِرِ الزَّمانِ لَم یَلحَقُوا النَّبِیَّ وَ حَجَبَتهُمُ الحُجَّةُ فَآمَنُوا بِسَوادٍ عَلی بَیاضٍ.

"اے علیؑ! جان لو کہ ایمان کے اعتبار سے سب سے زیادہ حیرت انگیز اور یقین کے اعتبار سے سب سے عظیم وہ لوگ ہوں گے جو آخری زمانے میں آئیں گے۔

انہوں نے نبیؐ کو نہیں پایا ہو گا اور حجتؑ بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو گی، لیکن وہ **سیاہی کو سفیدی پر دیکھ کر** ایمان لائیں گے۔) ''کمال الدین، باب 25، حدیث 8۔(

''سفیدی پر سیاہی'' سے مراد ممکن ہے قرآنِ کریم اور اہلِ بیتؑ کی وہ تحریری روایات ہوں جن پر زمانۂ غیبت کے مؤمنین اپنے ایمان میں اعتماد کرتے ہیں۔

ایک دوسری روایت میں رسولِ خداؐ نے حضرت قائمؑ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

طوبی للصابرین فی غیبته! طوبی لمقیمین علی محبتهم! اولئک من وصفهم الله فی کتابه فقال: «الذین یؤمنون بالغیب. ...«

''خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ان کی غیبت میں صبر کریں گے! خوش نصیب ہیں وہ جو ان کی محبت پر قائم رہیں گے!

یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

'جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔) ''سورۂ بقرہ 2:3(

) تفسیر البرہان، ج 1، ص 54، حدیث 6۔(

جب انسان اپنی آنکھوں سے اہلِ بیتؑ کی حقانیت پر دلالت کرنے والے معجزات اور نشانیاں دیکھتا ہے تو ان پر ایمان لانا اور ان کے سامنے تسلیم ہونا فطری طور پر اس حالت سے کہیں آسان ہے جب وہ نشانیاں براہِ راست اس کے سامنے موجود نہ ہوں۔ زمانۂ غیبت کا انسان ان واقعات کو تاریخ اور احادیث کی نقل کے ذریعے جانتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا ایمان ایسا ہو سکتا ہے جیسے اس نے ان حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہو۔

ائمہؑ کے ظاہری حضور کے زمانے کے لوگوں کا امتحان ایک انداز سے تھا، اور زمانۂ غیبت میں رہنے والوں کا امتحان دوسرے انداز سے ہے۔

زمانۂ غیبت کے مؤمنین ـــــ رسولِ خداؐ کے بھائی

اہلِ غیبت کے امتحان کا سب سے اہم پہلو یہی **ایمان بالغیب** ہے۔

اس ایمان کی قدر و منزلت اس قدر عظیم ہے کہ رسولِ خداؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں ایسے مؤمنین کو **اپنے بھائی** قرار دیا۔

ایک دن رسولِ خداؐ اپنے اصحاب کے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپؐ نے دعا فرمائی:

اللھم لقنی اخوانی

''اے اللہ! مجھے میرے بھائیوں سے ملادے۔''

آپؐ نے یہ دعا دو مرتبہ فرمائی۔

آپؐ کے گرد موجود اصحاب نے عرض کیا'' : یارسول اللہؐ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟''

آپؐ نے فرمایا:

لا، اِنَّکُم اَصحابی؛ وَ اِخوانی قَومٌ فی آخِرِ الزَّمانِ آمَنُوا وَ لَم یَرَونی، لَقَد عَرَّفَنیھِمُ اللہُ بِاَسمائِھِم وَ اَسماءِ آبائِھِم مِن قَبلِ اَن یُخرِجَھُم مِن اَصلابِ آبائِھِم وَ اَرحامِ اُمَّھاتِھِم. لَاَحَدُھُم اَشَدُّ بَقِیَّةً عَلی دینِہِ مِن خَرطِ القَتادِ فی اللَّیلَةِ الظَّلماءِ اَو کَالقابِضِ عَلی جَمرِ الغَضا. اُولئِکَ مَصابیحُ الدُّجی؛ یُنجیھِمُ اللہُ مِن کُلِّ فِتنَةٍ غَبراءَ مُظلِمَةٍ.

''نہیں، تم میرے اصحاب ہو؛ میرے بھائی وہ لوگ ہیں جو آخری زمانے میں آئیں گے۔ وہ مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔ اللہ نے انہیں میرے لیے ان کے ناموں اور ان کے باپوں کے ناموں کے ساتھ اس وقت سے پہلے ہی متعارف کرادیا ہے جب وہ انہیں ان کے باپوں کی صلبوں اور ماؤں کے رحموں سے دنیا میں لائے گا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے اپنے دین پر قائم رہنا اندھیری رات میں قتاد کے کانٹے نوچنے سے بھی زیادہ دشوار ہوگا، یا اس شخص کی مانند ہوگا جو اپنے ہاتھ میں درختِ عضا کا دہکتا ہوا انگارہ پکڑے ہوئے ہو۔ یہ لوگ تاریکیوں کے چراغ ہیں؛ اللہ انہیں ہر تاریک اور غبار آلود فتنے سے نجات دے گا۔) ''بحار الانوار، ج 52، ص 124، حدیث 8، بحوالۂ بصائر الدرجات۔(

عضا ایک ایسا درخت ہے جس کی لکڑی دیر تک آگ اور حرارت کو محفوظ رکھتی ہے، اسی لیے اس کا کوئلہ نہایت عمدہ اور دیر تک دہکتا رہتا ہے۔

پس زمانۂ غیبت میں دین پر قائم رہنے کو اس درخت کے دہکتے ہوئے انگارے کو ہاتھ میں تھامنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چونکہ اس کی شدید حرارت دیر تک باقی رہتی ہے اور جلد سرد نہیں ہوتی، اس لیے یہ مثال غیبت کے طویل زمانے میں دین کی حفاظت کی غیر معمولی دشواری کو نہایت مؤثر انداز میں ظاہر کرتی ہے۔

زمانۂ غیبت میں حقیقی اہلِ ایمان کی کمی

جو مؤمن اس انداز سے ثابت قدم رہے، وہ ان عظیم فضائل کا حامل ہوگا جن کا روایات میں ذکر ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ ایسے لوگ نہایت کم یاب ہوں گے۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا:

اِنَّ عَلِیَّ بنَ اَبی طالبٍ اِمامُ اُمَّتی وَ خَلیفَتی عَلَیها مِن بَعدی. وَ مِن وُلدِهِ القائِمُ المُنتَظَرُ الَّذی یَمَلَأُ اللهُ بِهِ الاَرضَ عَدلاً وَ قِسطاً کَما مُلِئَت جَوراً وَ ظُلماً. وَ الَّذی بَعَثَنی بِالحَقِّ بَشیراً اِنَّ الثابِتینَ عَلَی القَولِ بِهِ فی زَمانِ غَیبَتِهِ لَاَعَزُّ مِنَ الکِبریتِ الاَحمَرِ.

"بے شک علی بن ابی طالبؑ میری امت کے امام اور میرے بعد اس پر میرے خلیفہ ہیں۔ ان ہی کی نسل سے قائمِ منتظرؑ ہوں گے، جن کے ذریعے اللہ زمین کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بشارت دینے والا بنا کر بھیجا، ان کی غیبت کے زمانے میں ان پر ایمان و اعتقاد کے ساتھ ثابت قدم رہنے والے **کبریتِ احمر سے بھی زیادہ نایاب** ہوں گے۔)" کمال الدین، باب 25، حدیث 7۔(

ایسے لوگوں کے اجر کو اسلام کے ابتدائی دور میں رسولِ خداؐ کے ساتھ جہاد کرنے اور شہید ہونے والوں کے اجر سے تشبیہ دی گئی ہے؛ بلکہ ان میں سے ہر ایک کا اجر **بدر و اُحد کے ایک ہزار شہداء** کے اجر کے برابر بیان ہوا ہے۔

امام زین العابدینؑ نے فرمایا:

مَن ثَبَتَ عَلی مُوالاتِنا فی غَیبَةِ قائِمِنا، اَعطاهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ اَجرَ اَلفِ شَهیدٍ مِن شُهَداءِ بَدرٍ وَ اُحُدٍ.

"جو شخص ہمارے قائمؑ کی غیبت کے زمانے میں ہماری ولایت و محبت پر ثابت قدم رہے، اللہ عزوجل اسے بدر و اُحد کے شہداء میں سے ایک ہزار شہیدوں کا اجر عطا فرمائے گا۔)" کمال الدین، باب 31، حدیث 7۔(

جب انسان کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھ لیتا ہے تو خوشی اور شوق کے ساتھ اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ اسے پانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑتا، اور اس کی حفاظت میں پیش آنے والی ہر دشواری اس کے لیے برداشت کرنا آسان ہو جاتی ہے۔ پس خوش نصیب ہے وہ شخص جو **ایمان بالغیب** کی حقیقی قدر پہچان لے۔

معرفت کے ذریعے زمانۂ ظہور میں نصرتِ امامؑ کا اجر

گزشتہ مطالب سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بندگیِ خدا میں تمام فضیلت اور قدر و قیمت بالآخر **معرفتِ امامؑ اور اس معرفت پر ثابت قدم رہنے** کی طرف لوٹتی ہے۔

اگر انسان کے پاس یہ قیمتی اکسیر موجود ہو تو اللہ اس سے جو کچھ چاہتا ہے، اس اعتبار سے وہ کسی بنیادی چیز سے محروم نہیں۔

اگر اس اصول کے ساتھ ایک اور مقدمہ ملایا جائے تو ایک نہایت اہم نتیجہ سامنے آتا ہے۔

اور وہ مقدمہ یہ ہے:

معرفتِ امامؑ ایک قلبی امر ہے۔

اس کا فطری نتیجہ امامؑ سے محبت و ولایت، اور ظہور کے وقت ان کی نصرت اور ان کے پرچم تلے خدمت کرنے کی آرزو اور آمادگی ہے۔ امامؑ کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنا نہ اس قلبی معرفت کا بنیادی جزو ہے اور نہ اس کے حصول کی لازمی شرط۔

بہت سے لوگ ائمہؑ، بلکہ خود رسولِ خداؐ کے ظاہری حضور کے زمانے میں زندگی بسر کرتے تھے، لیکن انہیں ان حضرات کی کوئی حقیقی معرفت حاصل نہ تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے ہادیانِ الٰہی کے بعض سخت ترین اور بدترین دشمن وہی لوگ تھے جو برسوں اہلِ بیتؑ کے ساتھ رہے، انہیں قریب سے دیکھا اور مختلف حالات میں ان سے براہِ راست واسطہ رکھتے تھے۔

معرفتِ امامؑ وہ باطنی شناخت اور قلبی قبول و تسلیم ہے جس کے بغیر اگر کوئی شخص امامؑ کو ہر مہینے، ہر ہفتے، بلکہ ہر روز بھی دیکھتا رہے تو یہ دیدار اسے کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

البتہ جب انسان پہلے ہی معرفت رکھتا ہو تو امامؑ کا ظاہری دیدار اس کی معرفت کو مزید گہرا، اس کی محبت و تسلیم کو زیادہ مضبوط، اور ظہور کے وقت امامؑ کی نصرت کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

ان دونوں اصولوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص امامؑ کی معرفت رکھتا ہو اور اسی کے نتیجے میں ان کی نصرت کے لیے حقیقی آمادگی بھی رکھتا ہو، لیکن اپنی کسی کوتاہی کے بغیر امامؑ کی ملاقات اور ان کی ظاہری خدمت سے محروم رہ جائے، تو عین ممکن ہے کہ اللہ اسے اس شخص کا اجر عطا فرمائے جو امامؑ کے ظہور کو پائے اور ان کے لشکر میں اپنی ذمہ داری انجام دے۔ اس طرح اللہ اسے اس عظیم نعمت اور بے مثال اجر سے محروم نہ فرمائے گا۔

پس جب انسان اپنے امامؑ کی حقیقی معرفت رکھتا ہو تو ائمہؑ کی ظاہری حکومت اس کی زندگی میں قائم ہو یا نہ ہو، اس کے لیے باعثِ نقصان نہیں۔ وہ ان لوگوں کی مانند شمار ہو سکتا ہے جو اپنے امامؑ کے قیام و حکومت کو پائیں اور ان کے سپاہیوں میں شامل ہوں۔ فضیل بن یسار نے امام صادقؑ سے اس آیتِ کریمہ کے بارے میں سوال کیا:

»یوم ندعو کل اناس بامامھم«

''جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔'' (سورۂ اسراء 17:71)

امامؑ نے فرمایا:

یا فُضَیلُ، اِعرِف اِمامَکَ. فَاِنَّکَ اِذا عَرَفتَ اِمامَکَ، لَم یَضُرَّکَ تَقَدَّمَ ھذَا الاَمرُ اَو تَأَخَّرَ. وَ مَن عَرَفَ اِمامَهُ ثُمَّ ماتَ قَبلَ اَن یَقُومَ صاحِبُ ھذَا الاَمرِ، کانَ بِمَنزِلَةِ مَن کانَ قاعِداً فی عَسکَرِهِ لا؛ بَل بِمَنزِلَةِ مَن قَعَدَ تَحتَ لِوائِهِ.

''اے فضیل! اپنے امامؑ کی معرفت حاصل کرو۔ کیونکہ جب تم اپنے امامؑ کو پہچان لو گے تو پھر اس امر کا جلد واقع ہونا یا دیر سے واقع ہونا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اور جو شخص اپنے امامؑ کی معرفت رکھتا ہو، پھر صاحبِ امرؑ کے قیام سے پہلے دنیا سے چلا جائے، وہ اس شخص کی مانند ہو گا جو آپؑ کے لشکر میں بیٹھا ہو — نہیں، بلکہ اس شخص کی مانند ہو گا جو آپؑ کے پرچم تلے بیٹھا ہو۔'' (اصول الکافی، ج 1، ص 371، کتاب الحجۃ، باب أنہ من عرف إمامہ...، حدیث 2۔)

جو لوگ اپنے امامؑ کے قیام اور ظہور کو پانے کی آرزو رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ عظیم ترین بشارتوں اور قیمتی ترین وعدوں میں سے ایک ہے۔ اس بشارت کو ان کے اندر امامِ عصرؑ کی معرفت کی اہمیت کا احساس مزید گہرا کرنا چاہیے، اور ساتھ ہی اس معرفت کی علامات، آثار اور عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان کی سنجیدگی میں اضافہ ہونا چاہیے۔

گزشتہ ائمہؑ کے زمانے میں بھی بعض اصحاب جب حضرت قائمؑ کے اوصاف اور آپؑ کے ظہور کا زمانہ پانے کی فضیلت سنتے تو اپنے امامؑ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرتے کہ کاش وہ حکومتِ حقہ کے قیام کو دیکھ سکیں۔ اس کے جواب میں ائمہؑ ان کی توجہ **معرفتِ امامؑ** کی طرف دلاتے تھے۔

انہی میں سے ایک ابو بصیر تھے۔ انہوں نے امام صادقؑ سے عرض کیا:

تَرانی اُدرِکُ القائم علیه السّلام؟

''کیا آپؑ سمجھتے ہیں کہ میں قائمؑ کو پالوں گا؟''

امامؑ نے فرمایا: **یَا اَبابَصیرٍ، اَلَستَ تَعرِفُ اِمامَکَ؟**

''اے ابو بصیر! کیا تم اپنے امامؑ کو نہیں پہچانتے؟''

ابو بصیر نے عرض کیا: **ای وَاللهِ وَ اَنتَ هُوَ.**

''کیوں نہیں، اللہ کی قسم! اور وہ امام آپؑ ہی ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے امامؑ کے دستِ مبارک کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس پر امام صادقؑ نے فرمایا: **وَ اللهِ ما تُبالی یا اَبابَصیرٍ اَلا تَکُونَ مُحتَبِیاً بِسَیفِکَ فی ظِلِّ رِواقِ القائِمِ صَلَواتُ اللهِ عَلَیهِ؟!**

''اللہ کی قسم، اے ابو بصیر! پھر تمہیں کیا پروا اگر تم ظاہراً قائمؑ کے خیمے کے سائے میں اپنی تلوار پہلو میں رکھے موجود نہ بھی ہو؟'' (اصول الکافی، ج 1، ص 371، کتاب الحجۃ، باب أنہ من عرف إمامہ...، حدیث 4۔)

یہ اس شخص کے لیے امامؑ کی طرف سے تسلی تھی جس کے دل میں قائمؑ کے ظہور کو پانے کی شدید آرزو تھی۔

امامؑ نے اپنے زمانے کے امام کی معرفت کو اس سچی آرزو سے وابستہ اجر کے حصول کے لیے کافی قرار دیا اور یوں معرفتِ امامؑ کی غیر معمولی اہمیت کی طرف متوجہ فرمایا۔ اسی طرح زمانۂ غیبت میں جو اہلِ ایمان اپنے امامؑ کے ظہور و قیام کو پانے کی آرزو رکھتے ہیں، انہیں چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو آپؑ کی معرفت کو اپنے اندر گہرا کریں۔

آپؑ کے فضائل و کمالات سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں، آپؑ کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں، معرفت کی علامات اور عملی تقاضوں کو سمجھیں، اور پوری سنجیدگی سے انہیں اپنی زندگی میں متحقق کرنے کی کوشش کریں؛ تاکہ **ان شاءاللہ وہ حسنِ عاقبت کے ساتھ، اپنے ایمان کو محفوظ رکھتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں۔**

اب تک ہم نے زمانۂ غیبت میں امامِ عصرؑ کی معرفت کی فضیلت اور اہمیت پر گفتگو کی۔

اب ضروری ہے کہ کسی حد تک اس معرفت کی خصوصیات اور اوصاف کا جائزہ لیا جائے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ **وہ کون سی معرفت ہے جو روایات میں بیان کیے گئے آثار پیدا کرتی ہے، اور اس کے تقاضے اور نشانیاں کیا ہیں۔**

معرفت اپنی حقیقت میں ایک قلبی امر ہے، لیکن اس کے آثار اور نتائج میں بعض قلبی و باطنی کیفیات بھی شامل ہو سکتی ہیں اور بعض ظاہری اعمال بھی۔

کتاب کے آخری حصے میں، گزشتہ مباحث کی تکمیل کے لیے، ہم ان میں سے اہم ترین امور کا جائزہ لیں گے اور اب تک بیان ہونے والے مطالب کے عملی نتائج کو واضح کریں گے۔

ان میں سے اہم ترین مطالب کو ہم **دس ابواب** میں پیش کریں گے۔

حصہ چہارم: معرفتِ امامِ عصرؑ کے آثار اور تقاضے

باب اول: معرفت کا صحیح ہونا

جو معرفت زمانۂ غیبت میں انسان کو انحراف اور دین کے ضائع ہو جانے سے محفوظ رکھ سکتی ہے، اس کی پہلی لازمی خصوصیت یہ ہے کہ وہ **صحیح اور درست معرفت** ہو۔

اس شرط کے بغیر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ بظاہر معرفت رکھنے والا شخص ائمہؑ کی ولایت و امامت پر ثابت قدم باقی رہ سکے گا۔

امام زین العابدینؑ نے فرمایا:

اِنَّ لِلقائِمِ مِنّا غَیبَتَینِ اِحداهُما اَطوَلُ مِنَ الأُخری ... .وَ اَمَّا الأُخری فَیَطُولُ اَمَدُها حَتّی یَرجِعَ عَن هذَا الاَمرِ اَکثَرُ مَن یَقُولَ بِهِ. فَلا یَثبُتُ عَلَیهِ اِلّا مَن قَوِیَ یَقینُهُ وَ صَحَّت مَعرِفَتُهُ وَ لَم یَجِد فی نَفسِهِ حَرَجاً مِمّا قَضَینا وَ سَلَّمَ لَنا اَهلَ البَیتِ.

''ہم میں سے قائمؑ کے لیے دو غیبتیں ہوں گی، جن میں سے ایک دوسری سے زیادہ طویل ہو گی...

دوسری غیبت کی مدت اس قدر طویل ہو جائے گی کہ اس امر کے اکثر قائل اس سے پھر جائیں گے۔

اس پر صرف وہی شخص ثابت قدم رہے گا جس کا یقین مضبوط، جس کی معرفت صحیح ہو، جو ہمارے فیصلے کے بارے میں اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کرے، اور ہم اہلِ بیتؑ کے سامنے سراپا تسلیم ہو۔''

(کمال الدین، باب 31، حدیث 8۔)

یہ شرط ہر قسم کی معرفت کے بارے میں صادق آتی ہے، خواہ وہ معرفتِ خدا ہو، معرفتِ رسولؐ ہو یا معرفتِ امامؑ۔

اصولی طور پر ہر دینی معرفت کا صحیح ہونا اور اللہ کی مراد کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ معرفت کے صحیح ہونے کا معیار کیا ہے؟

ہم کس طرح اطمینان حاصل کریں کہ ہمارا کوئی مخصوص فہم اور اعتقاد صحیح ہے؟

معرفت کے صحیح ہونے کا معیار

اس سوال کا جواب اس وقت واضح ہو جاتا ہے جب ہم **معرفت** کی اس تعریف پر غور کریں جو اہلِ بیتؑ نے بیان فرمائی ہے۔

امام باقرؑ نے اپنے فرزند امام صادقؑ کو مخاطب کر کے فرمایا:

یا بُنَیَّ، اِعرِف مَنازِلَ الشّیعَةِ عَلی قَدرِ رِوایَتِهِم وَ مَعرِفَتِهِم. فَاِنَّ المَعرِفَةَ هِیَ الدِّرایَةُ لِلرِّوایَةِ. وَ بِالدِّرایاتِ لِلرِّوایاتِ یَعلُو المُؤمِنُ اِلی اَقصی دَرَجاتِ الایمانِ. اِنّی نَظَرتُ فی کِتابٍ لِعَلِیٍّ علیه السّلام فَوَجَدتُ فِی الکِتابِ اَنَّ قیمةَ کُلِّ امرِیٍ وَ قَدرَهُ مَعرِفَتُهُ.

''اے میرے بیٹے! شیعوں کے مراتب و درجات کو ان کی روایت اور معرفت کے مطابق پہچانو۔

کیونکہ **معرفت، روایت کی درایت و فہم کا نام ہے۔**

اور روایات کی درایت و گہری سمجھ کے ذریعے مؤمن ایمان کے بلند ترین درجات تک پہنچتا ہے۔

میں نے علیؑ کی ایک تحریر میں دیکھا تو اس میں یہ لکھا پایا:

'ہر انسان کی قدر و منزلت اس کی معرفت کے مطابق ہے۔''

(بحار الانوار، ج2، ص184، حدیث 4، بحوالہ معانی الاخبار۔)

اس مختصر کلام میں پورا اصول بیان کر دیا گیا ہے۔

ہمارے ائمہؑ کی نگاہ میں معرفت کا **روایات کی درایت اور صحیح فہم** کے ساتھ ایک ناقابل جدائی تعلق ہے۔

اور یہی حقیقت صحیح معرفت کو پہچاننے کا معیار بھی فراہم کرتی ہے: دینی معرفت کے ہر شعبے میں اس موضوع سے متعلق روایات وہ میزان ہیں جن کے ذریعے اس شعبے میں انسان کی معرفت کے صحیح یا غلط ہونے کو پرکھا جاتا ہے۔

مثلاً معرفتِ خدا کے باب میں اللہ کے بارے میں صحیح فہم کو غلط فہم سے ممتاز کرنے کا معیار وہ روایات ہیں جو اس موضوع کے بارے میں اہلِ بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں۔

اس سے دینی معرفت کے ہر شعبے میں روایاتِ اہلِ بیتؑ کی طرف رجوع کرنے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

یہ انسان کے درجۂ ایمان کا بھی ایک معیار ہے۔

انسان جتنا ائمہؑ کی روایات کی گہری درایت و فہم رکھتا ہے، اسی قدر کمالِ ایمان سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص دینی معرفت کے حصول میں روایات کی طرف رجوع نہ کرے اور اپنا دینی فہم حدیث کے علاوہ دوسرے سرچشموں سے اخذ کرے تو اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اس کی معرفت لازماً صحیح ہو گی۔

امیر المؤمنینؑ نے ہر انسان کی قدر و قیمت کو اس کی معرفت سے وابستہ فرمایا ہے، جبکہ خود معرفت کے صحیح ہونے کا معیار روایات کی طرف رجوع اور ان کی صحیح و عمیق درایت ہے۔

حقیقی علم صرف اہلِ بیتؑ کے پاس ہے

روایات کے مطابق ہونا صحیح معرفت کا معیار کیوں ہے؟ اس کی وجہ ایک بنیادی حقیقت ہے:

حقیقی علم صرف اہلِ بیتؑ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

یہاں ''علم'' سے مراد وہ نورانی حقیقت ہے جسے اللہ اس شخص کے دل میں قرار دیتا ہے جس کی ہدایت کا ارادہ فرماتا ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

لَیسَ العِلمُ بِالتَّعَلُّمِ. اِنَّما هُوَ نُورٌ یَقَعُ فی قَلبِ مَن یُریدُ اللهُ تَبارَکَ وَ تَعالی اَن یَهدِیَهُ.

''علم محض سیکھنے سے حاصل نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ ایک نور ہے جو اس شخص کے دل میں اترتا ہے جسے اللہ تبارک و تعالیٰ ہدایت دینا چاہتا ہے۔''

(بحار الانوار، ج 1، ص 225، حدیث 17۔)

اس علم میں خطا اور اشتباہ نہیں ہوتا۔

جب اللہ کسی شخص کی ہدایت کا ارادہ فرماتا ہے تو نورِ علم کے ذریعے اسے صحیح راستے تک پہنچاتا ہے۔

لہٰذا حقیقی علم ہمیشہ صحیح اور مطابقِ واقع ہوتا ہے۔

خطا کا امکان انسانی علم و ادراک کی صورتوں میں ہوتا ہے، جبکہ علم و معرفتِ الٰہی ہمیشہ حق اور صحیح ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے چودہ معصومینؑ کے مقدس قلوب کو اس نور کا سرچشمہ اور خزانہ قرار دیا ہے، اور علم کے طالب دوسرے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ انہی کی طرف رجوع کریں۔

امام صادقؑ نے یونس بن ظبیان سے فرمایا:

اِن اَرَدتَ العِلمَ الصَّحیحَ، فَعِندنَا اَهلَ البَیتِ. فَنَحنُ اَهلُ الذِّکرِ الَّذینَ قالَ اللهُ: «فَاسأَلُوا اَهلَ الذِّکرِ اِن کُنتُم لا تَعلَمُونَ.»

''اگر تم صحیح علم چاہتے ہو تو وہ ہم اہلِ بیتؑ کے پاس ہے۔

کیونکہ ہم ہی وہ اہلِ ذکر ہیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

'اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پوچھو۔''

(سورۂ نحل 16:43)

(وسائل الشیعہ، ج18، ص49، حدیث30، بحوالۂ کفایۃ الاثر۔)

حقیقی علم کی جستجو کا راستہ یہی ہے۔ اس راستے سے باہر حقیقی علمِ الٰہی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

وَ اللهِ لا یُوجَدُ العِلمُ اِلّا مِن اَهل بیت نَزَلَ عَلَیهِم جَبرئیلُ.

''اللہ کی قسم! علم صرف اسی گھرانے کے ذریعے مل سکتا ہے جس پر جبرئیلؑ نازل ہوئے۔''

(بحار الانوار، ج2، ص91، حدیث19، بحوالۂ بصائر الدرجات۔)

لہٰذا جب بھی کسی انسان تک کوئی حقیقت اور صحیح دینی بات پہنچتی ہے تو اس کا اصل سرچشمہ بالآخر اہلِ بیتؑ ہی کی طرف لوٹتا ہے، خواہ خود اس شخص کو اس حقیقت کا علم نہ ہو۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

اَما اَنَّهُ لَیسَ عِندَ اَحَدٍ مِنَ النّاسِ حَقٌّ وَ لا صَوابٌ اِلّا شَیءٌ اَخَذُوهُ مِنّا اَهلَ البَیتِ.

''جان لو کہ لوگوں کے پاس جو بھی حق اور صحیح بات موجود ہے، وہ بالآخر ایسی چیز ہے جسے انہوں نے ہم اہلِ بیتؑ ہی سے لیا ہے۔''

)بحار الانوار، ج2، ص94، حدیث 31، بحوالۂ المحاسن، برقی۔(

پس ہر صحیح دینی تعلیم اور ہر حقیقی دینی معرفت کا سرچشمہ اہلِ بیتؑ کی تعلیمات ہیں۔

اگر ان کی تعلیمات موجود نہ ہوتیں تو کسی شخص کے پاس صحیح معرفت نہ ہوتی۔

اہلِ بیتؑ سے اس تعلیم کا سرچشمہ ہونا ہی کسی عقیدے کے صحیح ہونے کی کسوٹی ہے۔ اگر کوئی عقیدہ ان کی تعلیمات سے مطابقت نہ رکھتا ہو اور کسی طرح بھی ان کی طرف نہ لوٹتا ہو تو وہ یقیناً باطل اور بے بنیاد ہے۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

كُلُّ ما يَخرُجُ مِن هذَا البَيتِ، فَهُوَ باطِلٌ.

''جو کچھ اس گھر [بیتِ وحی] سے صادر نہ ہو، وہ باطل ہے۔''

)وسائل الشیعہ، ج18، ص50، حدیث 34، بحوالۂ بصائر الدرجات۔(

پس ایمان کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس امر کا پابند بنالے کہ دین کی کوئی تعلیم اور کوئی عقیدہ اہلِ بیتؑ کے سوا کسی اور سے اخذ نہ کرے، اور صرف انہی کے در پر سراپا تسلیم رہے۔

اگر وہ ایسا کرے تو ممکن ہے اسے اس عظیم شرف تک رسائی حاصل ہو جائے کہ اسے **''ہم اہلِ بیتؑ میں سے ''** شمار کیا جائے۔

امیر المؤمنینؑ نے کمیل بن زیاد نخعی سے فرمایا:

يا كُمَيلُ، لا تَأخُذ اِلّا عَنّا، تَكُن مِنّا.

''اے کمیل! ہمارے سوا کسی اور سے نہ لو، تو تم ہم میں سے ہو جاؤ گے۔''

یہ ان عظیم ترین اعزازات میں سے ہے جسے اہلِ بیتؑ سے محبت کرنے والا انسان حاصل کر سکتا ہے۔

اگرچہ زمانۂ غیبت میں وہ اپنے زمانے کے امامؑ کی ظاہری صحبت اور حضور کی نعمت سے محروم ہے، لیکن ائمہؑ کی روایات سے پوری وفاداری کے ساتھ وابستہ ہو کر وہ دورِ غیبت میں بھی ایسے بلند مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔

صحیح علم کے ذریعے ثبات واستقامت

پس اگر کوئی شخص صحیح اور درست دینی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنا علم اہلِ بیتؑ کے سوا کسی اور سرچشمے سے اخذ نہیں کرنا چاہیے۔ اسے انسانی افکار و نظریات کو اہلِ بیتؑ کی تعلیمات پر ترجیح نہیں دینی چاہیے، اور نہ ہی دونوں کو باہم ملا کر ایک مرکب نظامِ فکر تشکیل دینا چاہیے۔

اگر انسان اس راستے پر چلے تو اس کی معرفت ایسے مضبوط یقین پر قائم ہو گی کہ کوئی شک یا اعتراض اس کے عقائد کو متزلزل نہیں کر سکے گا۔ وہ اس قدر ثابت قدم ہو جائے گا کہ اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔

جنگِ جمل کے موقع پر امیر المؤمنینؑ نے محمد بن حنفیہ سے فرمایا:

تَزولُ الجِبالُ وَ لا تَزُل.

''پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، لیکن تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا؛ ثابت قدم رہنا۔''

(نہج البلاغہ، فیض الاسلام، خطبہ 11)

امیر المؤمنینؑ کی اس ہدایت کو ایمان و عقیدے کے میدان میں بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

ایسی استقامت حاصل کرنے کا عملی طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے عقائد کو ان کے صحیح سرچشمے سے حاصل کرے اور کسی دوسرے راستے سے حاصل ہونے والی چیز پر بھروسا نہ کرے۔

پہاڑوں کی حرکت تدریجی اور غیر محسوس ہوتی ہے۔ لیکن مؤمن کو اپنی معرفت میں ایسا یقین حاصل ہونا چاہیے کہ اس کے اندر غیر محسوس انداز میں بھی کوئی انحراف اور جابجائی پیدا نہ ہو۔

تب ہی وہ مطمئن ہو سکتا ہے کہ کوئی فکر اسے متزلزل نہیں کرے گی اور وہ اپنے صحیح عقائد کے بارے میں شک و تردّد کا شکار نہیں ہو گا۔

شک ان خطرناک ترین آفات میں سے ہے جو انسان کے ایمان و یقین کو لاحق ہو سکتی ہیں۔

امامؑ کی غیبت کے زمانے میں انسان مختلف افکار اور عقائد سے روبرو ہوتا ہے، جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی انداز سے اس کی معرفت کو شک اور تردّد کا شکار بنا سکتا ہے۔

انسان خواہ کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، اور مختلف لوگوں کے نظریات اور دلائل سے خواہ کتنی ہی واقفیت رکھتا ہو، جب تک اس نے اپنے عقائد کو معرفت کے اصل سرچشمے سے حاصل نہ کیا ہو، وہ ان عقائد کے بارے میں شک کے خطرے سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

پس عقائد کو ان کے حقیقی سرچشمے سے حاصل کرنا ایمان کو شکوک اور وسوسوں سے محفوظ رکھنے کے اہم ترین ذرائع میں سے ہے۔

اگر کوئی شخص زمانۂ غیبت میں اپنے دین کی حفاظت کے بارے میں فکرمند ہے تو اسے اس راستے اور سرچشمے کے بارے میں انتہائی محتاط ہونا چاہیے جہاں سے وہ اپنا دین حاصل کرتا ہے، اور صرف اسی چیز پر اعتماد کرنا چاہیے جو اہلِ بیتؑ سے اس تک پہنچی ہو۔

امامؑ نے فرمایا:

مَن اَخَذَ مِن کِتابِ اللهِ وَ سُنَّةِ نَبِیِّهِ صَلَواتُ اللهِ عَلَیهِ وَ آلِهِ، زالَتِ الجِبالُ قَبلَ اَن یَزُولَ. وَ مَن اَخَذَ دینَه مِن اَفواهِ الرِّجالِ، رَدَّتْهُ الرِّجالُ.

"جو شخص اپنا دین کتابِ خدا اور اس کے نبیؐ کی سنت سے حاصل کرے، اس کے اپنی جگہ سے ہٹنے سے پہلے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔

اور جو شخص اپنا دین لوگوں کے منہ سے حاصل کرے، وہی لوگ اسے اس کے دین سے پھیر دیں گے۔"

(الکافی، مقدمہ۔)

صاحبانِ فہم کے لیے اللہ کی بشارت

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کو ہر نظریہ سننا چاہیے اور پھر ان سب میں سے بہترین نظریہ منتخب کرنا چاہیے۔ اس بنیاد پر مختلف افکار اور مکاتبِ فکر کو ایک دوسرے کے برابر رکھ کر ایک ہی انداز میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔

ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ لوگ اسی طریقۂ کار اور اپنی ذاتی سمجھ و تشخیص کی بنیاد پر یہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ معصومینؑ کی روایات کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کیا جائے۔ ان کے طرزِ فکر کی بنیاد ہی میں انسانی فکر اور تعلیمِ الٰہی کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا۔

پھر اس طرزِ فکر کی تائید کے لیے قرآنِ کریم کی اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے:

»**فَبَشِّر عِبادِ الَّذینَ یَستَمِعُونَ القَولَ فَیَتَّبِعُونَ اَحسَنَهُ اَولئِکَ الَّذینَ هَداهُمُ اللهُ وَ اُولئِکَ هُم اَولَواالاَلبابِ.**«

"پس میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجیے جو قول کو سنتے ہیں اور بہترین طریقے سے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبانِ عقل و فہم ہیں۔"

(سورۂ زمر 39:18)

اس آیت کی یہ تفسیر کی جاتی ہے کہ انسان کو **ہر بات** سننی چاہیے ــــ یعنی لفظ **القول** میں "ال" کو استغراق کے معنی میں لیا جاتا ہے ــــ اور پھر ان تمام باتوں میں سے بہترین کو منتخب کرنا چاہیے۔

مزید یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اللہ نے اس طریقے کو اختیار کرنے والوں کے لیے ہدایت کی ضمانت دی ہے اور انہیں صاحبانِ عقل قرار دیا ہے۔

لیکن چونکہ اس آیت کو سمجھنے کے لیے اہلِ بیتؑ کی طرف رجوع نہیں کیا گیا، اس لیے خود اسی آیت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں بھی خطا واقع ہوئی اور اس کی تفسیر ذاتی رائے کے مطابق کر دی گئی۔

جب ابو بصیر نے امام صادقؑ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا:

هُمُ المُسلِّمُونَ لِآلِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم الَّذینَ اِذا سَمِعُوا الحَدیثَ لَم یَزیدُوا فیهِ وَ لَم یَنقُصُوا مِنهُ؛ جاؤُوا بِهِ کَما سَمِعُوهُ.

''یہ وہ لوگ ہیں جو آلِ محمدؐ کے سامنے تسلیم ہیں۔ جب وہ کوئی حدیث سنتے ہیں تو نہ اس میں کچھ بڑھاتے ہیں اور نہ اس میں کچھ کم کرتے ہیں، بلکہ اسے اسی طرح نقل کرتے ہیں جس طرح انہوں نے اسے سنا ہے۔''

(تفسیر نور الثقلین، ج4، ص482، حدیث 35۔)

پس آیتِ کریمہ میں **القول** سے مراد ہر قسم کی بات نہیں، بلکہ ایک مخصوص قول، یعنی **قولِ حق اور صحیح تعلیم** ہے۔

یہاں ''ال'' اس چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے جو پہلے سے متعین اور معلوم ہے۔ لہٰذا آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اہلِ بیتؑ کی روایات سننے کے بعد ان کے سامنے تسلیم ہو جاتے ہیں اور ان میں کمی بیشی اور تحریف کیے بغیر ان کے پابند رہتے ہیں۔

اس بنا پر **''فَیَتَّبِعُونَ اَحسَنَهُ''** کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مختلف اور باہم متعارض نظریات کے مجموعے میں سے بہترین نظریہ چنتے ہیں، بلکہ اس کا تعلق حدیث کی بہترین انداز میں پیروی کرنے، یا اس کی پیروی کے بہترین طریقے سے ہے۔

حدیث کو محفوظ رکھنے اور اس کی پیروی کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے بغیر تبدیلی و تحریف کے نقل کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے۔[1]

[1] جہاں کسی حدیث کو اس کے ظاہری معنی کے خلاف سمجھنا ضروری یا جائز ہو، وہاں یہ امر اس بحث کے منافی نہیں۔ صحیح تاویل کے اپنے اصول اور معیار ہیں، اور ان اصولوں کی رعایت کرنا خود ''بہترین انداز میں پیروی'' کا مصداق ہے۔

آیتِ کریمہ یہ نہیں کہتی کہ ان لوگوں کو **آئندہ ہدایت دی جائے گی**، بلکہ انہیں ایسے لوگوں کے طور پر بیان کرتی ہے جو **پہلے ہی ہدایت پا چکے ہیں**؛ اسی لیے وہ جانتے ہیں کہ آلِ محمدؐ کی روایات کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے۔

یہی حقیقی **اُولُوا الْاَلْباب** —— **صاحبانِ عقل و فہم** ہیں۔

انہوں نے اپنے علم اور عقل کی حدود کو پہچان لیا ہے، اور اسی شناخت کی بنا پر وہ جانتے ہیں کہ اپنی کمی اور ناتمامی کی تلافی کے لیے انہیں اہلِ بیتؑ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

اسی لیے وہ اہلِ بیتؑ کے سامنے اپنی تسلیم میں کسی شک و تردّد کو راہ نہیں دیتے اور نہ اپنے آپ کو اس بات کا حق دار سمجھتے ہیں کہ اپنی پسند اور ذاتی رائے کے مطابق روایات کے الفاظ یا مفہوم میں مداخلت کریں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ صحیح معرفت اہلِ بیتؑ کے سامنے تسلیم ہوئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو ہر دعوے کو بلا امتیاز نہیں سننا چاہیے، ہر فکر کے پیچھے نہیں جانا چاہیے اور ہر مکتبِ فکر کے لیے اپنے ذہن و دل کے دروازے نہیں کھول دینے چاہییں۔

مختلف افکار اور فکری رجحانات انسان کے قلب و روح کی سلامتی کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ ''تحقیق'' کے نام پر انسان کو بلا امتیاز ہر فکری رجحان کے سامنے اپنے آپ کو نہیں رکھنا چاہیے اور ہر انحراف کے راستے میں خود کو معرضِ خطر میں نہیں ڈالنا چاہیے، کیونکہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ منحرف افکار و نظریات کی دلدل سے صحیح و سالم نکل آئے گا۔

عقل و بصیرت کا تقاضا خود یہی ہے کہ انسان احتیاط کرے اور ان خود ساختہ نظام ہائے فکر اور مکاتب سے دور رہے جن کا سرچشمۂ وحی سے تعلق قابلِ اعتماد نہ ہو۔

جب تک انسان مطمئن نہ ہو کہ کوئی فکری مکتب ایک الٰہی سرچشمے سے سیراب ہو رہا ہے، اسے غیر مشروط اعتماد کے ساتھ اس کی طرف نہیں بڑھنا چاہیے۔ اور اگر خود اس میں ایسی چیزوں کو جانچنے کی علمی صلاحیت نہ ہو تو اسے ان اہلِ علم کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔

یہی اصول انسانی جسم کے بارے میں بھی جاری ہے۔ انسان اپنی جسمانی صحت کو ہر کسی کے حوالے نہیں کرتا؛ پہلے یہ اطمینان حاصل کرتا ہے کہ اسے مشورہ دینے والا واقعی ایک ماہر اور قابلِ اعتماد طبیب ہے۔

جبکہ انسان کی روح اور قلب کی سلامتی اس کے جسم کی سلامتی سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ پس اپنی جسمانی صحت کی حفاظت میں جتنی حساسیت دکھاتا ہے، اپنی روح کی حفاظت میں اس سے کہیں زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔

انسان کی روح و عقل کے حقیقی طبیب ائمہؑ ہیں، اور جن لوگوں نے اپنے عقائد انہی سے حاصل کیے ہیں، دینی رہنمائی کے لیے انہی اہلِ علم کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

باب دوم: امامؑ کے بارے میں حکمِ الٰہی کے سامنے تسلیم

تسلیم ـــ معرفت کی شرط

معرفتِ امامؑ کا ایک اور اثر اور لازمی تقاضا **امامؑ کے سامنے تسلیم ہونا** ہے۔

بلکہ اس تسلیم کے بغیر صحیح معرفت حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّکُم لا تَکُونُونَ صالِحِینَ حَتّی تَعرِفُوا. وَ لا تَعرِفُونَ حَتّی تُصَدِّقُوا. وَ لا تُصَدِّقُونَ حَتّی تُسَلِّمُوا.

"تم صالحین میں سے نہیں ہو سکتے جب تک معرفت حاصل نہ کرو؛ اور معرفت حاصل نہیں کر سکتے جب تک تصدیق نہ کرو؛ اور حقیقی تصدیق نہیں کر سکتے جب تک تسلیم نہ ہو جاؤ۔"

(اصول الکافی، ج 1، ص 181، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث 6۔)

یہاں **تصدیق** سے مراد قلبی ایمان، اقرار اور قبول ہے۔ جب تک یہ کیفیت انسان کے اندر موجود نہ ہو، اسے اہلِ معرفت میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

پس تصدیق، معرفت کی شرط ہے، اور **تسلیم، تصدیق کی شرط** ہے۔

لہٰذا تسلیم کے بغیر معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔

جب یہ تینوں چیزیں ـــ **تسلیم، تصدیق اور معرفت** ـــ جمع ہو جائیں تو انسان صالحین کے زمرے میں داخل ہوتا ہے۔

پس جو شخص اہلِ بیتؑ کی تعلیمات کے سامنے تسلیم نہیں، وہ حقیقتاً نہ ان کی معرفت و ولایت کا حامل ہو سکتا ہے اور نہ صالحین میں شمار ہو سکتا ہے۔

ائمہؑ کے اوامر و نواہی کے سامنے تسلیم ہونا تو معرفتِ امامؑ کے کم ترین درجے کا بھی لازمی تقاضا ہے۔

جیسا کہ پہلے امام صادقؑ سے نقل ہو چکا ہے:

اَدنی مَعرِفَةِ الاِمامِ اَنَّهُ عِدلُ النَّبیِّ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اِلّا دَرَجَةَ النُّبُوَّةِ وَ وارِثُهُ وَ اَنَّ طاعَتَهُ طاعَةُ اللهِ وَ طاعَةُ رَسُولِ اللهِ وَ التَّسلیمُ لَهُ فی کُلِّ اَمرٍ وَ الرَّدُّ اِلَیهِ وَ الاَخذُ بِقَولِهِ.

''امامؑ کی معرفت کا کم ترین درجہ یہ ہے کہ انسان جان لے کہ امامؑ، مقامِ نبوت کے سوا، نبیؐ کے ہم پایہ اور ان کے وارث ہیں؛ ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت اور رسولِ خداؐ کی اطاعت ہے؛ اور ہر معاملے میں ان کے سامنے تسلیم ہونا، امور کو ان کی طرف پلٹانا اور پھر ان کے قول کو اختیار کرنا ضروری ہے۔''

)بحار الانوار، ج36، ص407، حدیث16، بحوالۂ کفایۃ الاثر۔(

جو شخص اپنے معاملات امامؑ کی طرف رجوع کرنے اور ان کے سامنے تسلیم ہونے کے مرحلے تک نہ پہنچا ہو، اسے حقیقتاً مؤمن نہیں کہا جا سکتا۔

البتہ تسلیم کے بھی مختلف درجات ہیں۔ انسان کا ایمان جتنا کامل ہوتا جاتا ہے، اس کی تسلیم کا درجہ بھی اتنا ہی بلند ہوتا جاتا ہے۔

اس کا کم ترین درجہ یہ ہے کہ انسان اصولی اور قلبی طور پر یہ عزم رکھتا ہو کہ وہ ائمہؑ کی اطاعت کرے گا اور ان کے سامنے تسلیم رہے گا۔

عمومی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ایمان، کم از کم درجۂ تسلیم کے بغیر وجود ہی نہیں پا سکتا۔

فرمایا گیا ہے:

لا یَکُونُ العَبدُ مُؤمِناً حَتّی یَعرِفَ اللهَ وَ رَسُولَهُ وَ الاَئِمَّةِ کُلَّهُم وَ اِمام زَمانِهِ وَ یَرُدَّ اِلَیهِ وَ یُسَلِّمَ لَهُ.

''بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اللہ، اس کے رسولؐ، تمام ائمہؑ اور اپنے زمانے کے امامؑ کی معرفت حاصل نہ کرے، اور امور کو ان کی طرف نہ پلٹائے اور ان کے سامنے تسلیم نہ ہو۔''

)اصول الکافی، ج1، ص180، کتاب الحجۃ، باب معرفۃ الامام والرد الیہ، حدیث2، امام باقرؑ یا امام صادقؑ سے منقول۔(

زمانۂ غیبت میں اپنے دین کی صحت و سلامتی محفوظ رکھنے کے لیے یہ ایک بنیادی شرط ہے۔

اسی لیے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، صحیح معرفت کی شرط کے بعد فرمایا گیا:

وَ لَم یَجِد فی نَفسِهِ حَرَجاً مِمّا قَضَینا وَ سَلَّمَ لَنا اَهلَ البَیتِ.

''اور ہمارے فیصلے کے بارے میں اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کرے اور ہم اہلِ بیتؑ کے سامنے تسلیم ہو۔''

)کمال الدین، باب 31، حدیث 8۔(

عدمِ تسلیم کا نتیجہ ـــ شرک اور کفر

یہاں جس تسلیم کی بات ہو رہی ہے وہ **قلبی تسلیم** ہے۔

انسان کو اہلِ بیتؑ کی خواہش، حکم اور فیصلے کو رضا و رغبت اور دل کی آمادگی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے، اور ان کے فیصلے کو قبول کرنے میں اپنے باطن میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرنی چاہیے۔

یہ معاملہ اتنا باریک اور اہم ہے کہ اگر کوئی شخص ظاہراً تمام دینی فرائض انجام دیتا ہو، لیکن اس کے اندر قلبی تسلیم کی یہ کیفیت ـــ کم از کم اس کے ابتدائی درجے میں ـــ موجود نہ ہو، تو وہ حقیقی ایمان سے محروم رہ سکتا ہے، بلکہ شرک کے زمرے میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔

اصولی طور پر انسان کے ایمان کا درجہ اس کی قلبی تسلیم کے درجے کے مطابق ہوتا ہے، اور جس مقدار میں اس کی تسلیم ناقص ہوتی ہے، اسی نسبت سے وہ شرک کے درجات سے متاثر ہو سکتا ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

لَو اَنَّ قَوماً عَبَدُوا اللهَ وَحدَهُ لا شَریکَ لَهُ وَ اَقاموا الصَّلاةَ وَ آتَوُا الزَّکاةَ وَ حَجُّوا البَیتَ وَ صامُوا شَهرَ رَمَضانَ ثُمَّ قالُوا لِشَیءٍ صَنَعَهُ اللهُ اَو صَنَعَهُ النَّبیُّ صلی الله علیه و آله و سلم اَلّا صَنَعَ خِلافَ الَّذی صَنَعَ، اَو وَجَدُوا ذلِکَ فی قُلُوبِهِم، لَکانُوا بِذلِکَ مُشرِکینَ. ثُمَّ تَلاهذِهِ الآیَةَ: «فَلا وَ رَبِّکَ لا یُؤمِنُونَ حَتّی یُحَکِّمُوکَ فیما شَجَرَ بَینَهُم ثُمَّ لا یَجِدُوا فی اَنفُسِهِم حَرَجاً مِمّا قَضَیتَ وَ یُسَلِّمُوا تَسلیماً». ثُمَّ قالَ اَبوعَبدِالله علیه السّلام: فَعَلَیکُم بِالتَّسلیمِ.

''اگر کچھ لوگ صرف اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، خانۂ خدا کا حج کریں اور ماہِ رمضان کے روزے رکھیں؛ پھر اللہ یا رسولِ خداؐ کے کسی فعل کے بارے میں کہیں: 'اس کے بجائے ایسا کیوں نہ کیا گیا؟' ـــ یا محض اپنے دل میں ہی اس پر اعتراض محسوس کریں ـــ تو اس کے سبب وہ مشرک ہو جائیں گے۔''

پھر امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

»فَلا وَ رَبِّکَ لا یُؤمِنُونَ حَتّی یُحَکِّمُوکَ فیما شَجَرَ بَینَهُم ثُمَّ لا یَجِدُوا فی اَنفُسِهِم حَرَجاً مِمّا قَضَیتَ وَ یُسَلِّمُوا تَسلیماً.«

”پس نہیں! آپ کے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک حقیقی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو حکم نہ بنائیں، پھر آپ کے فیصلے کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور مکمل طور پر تسلیم ہو جائیں۔“

(سورۂ نساء 4:65)

اس کے بعد امام صادقؑ نے فرمایا:

”پس تم پر تسلیم لازم ہے۔“

(اصول الکافی، ج2، ص398، کتاب الایمان والکفر، باب الشرک، حدیث 6۔)

پس حالتِ **تسلیم** اس وقت حقیقتاً پیدا ہوتی ہے جب انسان اہلِ بیتؑ کے فعل، تعلیم اور فیصلے سے قلباً راضی ہو اور اسے قبول کرنے میں اپنے دل میں بوجھ یا تنگی محسوس نہ کرے۔

ائمہؑ کے سامنے تسلیم حاصل کرنے کا راستہ

حقیقی تسلیم کا راستہ یہ ہے کہ انسان ہر معاملے میں ائمہؑ کی خواہش کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرے اور ان کے مقابل اپنی کوئی مستقل رائے اور فیصلہ باقی نہ رکھے۔

اسے ہمیشہ ان کی خواہش اور فیصلے کو—— جنہیں زمانۂ غیبت میں اہلِ بیتؑ سے توسل اور ان کی روایات کی طرف رجوع کر کے تلاش کیا جاتا ہے——اپنی خواہش اور دوسروں کی خواہش پر ترجیح دینی چاہیے۔

یہی وہ صفت ہے جو انسان کو ایمان کے بلند درجات تک پہنچاتی ہے۔

ایک شخص نے امام صادقؑ سے عرض کیا:

''میرے آقا! میں آپ کو سلمان فارسی کا ذکر بہت زیادہ کرتے ہوئے سنتا ہوں۔''

امامؑ نے فرمایا:

لا تَقُل سَلمانَ الفارسیَّ، وَ لکِن قُل سَلمانَ المُحَمَّدیَّ.

''سلمان فارسی نہ کہو، بلکہ **سلمان محمدی** کہو۔''

پھر امامؑ نے پوچھا:

اَتَدری ما کَثرَةُ ذِکری لَهُ؟

''کیا تم جانتے ہو کہ میں ان کا اتنا ذکر کیوں کرتا ہوں؟''

اس شخص نے عرض کیا کہ نہیں۔

امامؑ نے فرمایا:

لِثَلاثِ خِلالٍ: اِحداها ایثارُهُ هَوی اَمیرِالمُؤمنینَ علیه السّلام عَلی هَوی نَفسِهِ...

''تین صفات کی وجہ سے۔ان میں پہلی یہ ہے کہ وہ امیر المؤمنینؑ کی خواہش کو اپنی خواہش پر ترجیح دیتے تھے''...

)بحار الانوار، ج22، ص327، حدیث33، بحوالہ امالی شیخ طوسی۔(

باقی دو صفات یہ تھیں:

حَبُّهَ لِلفُقَراءِ وَ اختِیارُهُ اِیّاهُمُ عَلی اَهلِ الثَّروَةِ وَ العَدَدِ وَ حُبُّ العِلمِ وَ العُلَماءِ.

''ان کی فقراء سے محبت اور اہلِ ثروت و جاہ پر انہیں ترجیح دینا، اور علم اور اہلِ علم سے محبت کرنا۔''

اگر سلمانؓ ایسے مرتبے تک پہنچے کہ امام سجادؑ نے انہیں ''**ہم اہلِ بیتؑ میں سے**'' قرار دیا تو ان کی اہم ترین صفات میں سے ایک اپنے زمانے کے امامؑ کے سامنے ان کی کامل تسلیم تھی۔

امام سجادؑ نے فرمایا:

اِنَّما صارَ سَلمانُ مِنَ العُلَماءِ لِاَنَّهُ امرُؤٌ مِنّا اَهلَ البَیتِ.

''سلمان اہلِ علم میں سے اس لیے قرار پائے کہ وہ ہم اہلِ بیتؑ میں سے ایک شخص ہیں۔''

)بحار الانوار، ج2، ص190، حدیث 25، بحوالہ بصائر الدرجات۔(

سلمان کی تسلیم کا درجہ ایسا تھا کہ ضروری نہیں تھا امیر المؤمنینؑ انہیں کسی معاملے میں باقاعدہ حکم ہی دیں۔ جب سلمان کو معلوم ہو جاتا کہ کسی امر میں امامؑ کی خواہش کیا ہے تو وہ حکم کے انتظار کے بغیر اس خواہش کو اپنی خواہش پر مقدم کر دیتے۔ پس یہ مقام محض امامؑ کے صریح احکام کی اطاعت اور ان پر عمل کرنے سے بھی بلند تر ہے۔

یہاں لفظ **ہَوی** سے مراد خواہش اور میلان ہے؛ یعنی ایسی پسند جسے ممکن ہے امامؑ نے زبان سے بیان بھی نہ کیا ہو اور نہ اسے باقاعدہ حکم کی صورت دی ہو۔

پس **"مِنّا اہل البیت"** ـــــ **"ہم اہل بیتؑ میں سے "** ہونے کے مقام تک پہنچنے کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ انسان ائمہؑ کے سامنے سلمان کی طرح تسلیم ہو۔

اس سے پہلے امیر المؤمنینؑ کا کمیل بن زیاد سے یہ ارشاد بھی گزر چکا ہے:

لا تَأخُذ اِلّا عَنّا، تَکُن مِنّا.

"ہمارے سوا کسی اور سے نہ لو، تو تم ہم میں سے ہو جاؤ گے۔"

زمانۂ غیبت میں اس کا بنیادی عملی مصداق ائمہؑ کی روایات کے سامنے تسلیم اور تمام امور ـــــ خواہ عقائد سے متعلق ہوں، اخلاق سے یا عملی زندگی سے ـــــ میں ان کی احادیث کی طرف باقاعدہ اور منضبط رجوع ہے۔

جب امامؑ تک معمول کے مطابق براہِ راست رسائی ممکن نہ ہو تو احتیاط کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے۔ روایات کے ساتھ علمی اور عملی وابستگی کو کبھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔

یہی قلبی تسلیم **ایمان کی حقیقت اور دین کی روح** ہے۔

امام سجادؑ نے فرمایا:

اِنَّ دینَ اللہِ عَزَّوَجَلَّ لا یُصابُ بِالعُقُولِ النّاقِصَةِ وَ الآراءِ الباطِلَةِ وَ المَقاییسِ الفاسِدَةِ، وَ لا یُصابُ اِلّا بِالتَّسلیمِ. فَمَن سَلَّمَ لَنا سَلِمَ. وَ مَنِ اقتَدی بِنا هُدِیَ. وَ مَن کانَ یَعمَلُ بِالقِیاسِ وَ الرَّأیِ هَلَکَ. وَ مَن

وَجَدَ فی نَفسِهِ شَیئاً مِمّا نَقُولُهُ اَو نَقضی بِهِ حَرَجاً، کَفَرَ بِالَّذی اَنزَلَ السَّبعَ المَثانِیَ وَ القُرآنَ العَظیمَ وَ هُوَ لا یَعلَمُ.

"بے شک اللہ عزوجل کے دین تک ناقص عقلوں، باطل آراءاور فاسد قیاسات کے ذریعے نہیں پہنچا جاسکتا؛دین صرف **تسلیم** کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

پس جو ہمارے سامنے تسلیم ہوا،وہ سلامت رہا؛جس نے ہماری پیروی کی،اسے ہدایت ملی؛اور جس نے قیاس اور ذاتی رائے پر عمل کیا،وہ ہلاک ہوا۔

اور جس شخص نے ہماری کسی بات یا ہمارے کسی فیصلے کے بارے میں اپنے دل میں تنگی محسوس کی،اس نے اس ذات کا انکار کیا جس نے سبع مثانی اور قرآنِ عظیم نازل فرمایا،جبکہ خود اسے اس کا شعور بھی نہیں۔"

)کمال الدین،باب 31،حدیث 9۔(

اصل خطرہ یہی ہے کہ کبھی انسان خود بھی اپنی خطا کی سنگینی کو محسوس نہیں کرتا،لیکن اس کے باوجود شرک یا کفر میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینداری اہلِ بیتؑ کی تعلیمات کے سامنے کامل تسلیم کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتی۔کسی شخص کو اپنی یا کسی دوسرے کی سمجھ اور رائے کو ان کی روایات پر مقدم نہیں کرنا چاہیے۔

زمانۂ غیبت میں حدیث کے سامنے تسلیم

زمانۂ غیبت میں امامؑ کے سامنے تسلیم کی ایک علامت،ائمہؑ کی روایات کے سامنے تسلیم ہونا ہے۔

اہلِ بیتؑ سے ہم تک پہنچنے والی احادیث کو دو پہلوؤں سے دیکھا جاسکتا ہے:

صدور اور دلالت۔

صدور سے مراد یہ دیکھنا ہے کہ حدیث واقعی معصومؑ سے صادر ہوئی ہے یا نہیں؛اس کے لیے سند اور طریقِ نقل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

اگر سند کی تحقیق کے بعد یقینی طور پر ثابت ہو جائے کہ کوئی روایت جعلی ہے یا اسے جھوٹے طور پر معصومؑ کی طرف منسوب کیا گیا ہے تو پھر اس کے معنی پر غور کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اور اس کے مضمون کو قبول کرنا لازم نہیں، خواہ اس کا مضمون کچھ بھی ہو۔

لیکن اگر سند کی تحقیق سے روایت کا جعلی ہونا یقینی طور پر ثابت نہ ہو—اور معروف شیعہ حدیثی مجموعوں میں موجود روایات کی بڑی تعداد کے بارے میں یہی صورت پیش آتی ہے—تو پھر اس کی **دلالت اور مفہوم** کا مرحلہ آتا ہے۔

یہ حکم اس روایت کے بارے میں بھی جاری ہوتا ہے جو متواتر اور صدور کے اعتبار سے یقینی ہو، اور اس روایت کے بارے میں بھی جس کا صدور ظنی ہو، جیسے **خبرِ واحد**۔ مصنف کے بیان کے مطابق دونوں صورتوں میں روایت کے مضمون کے بارے میں دینداری کے متعلقہ اصولوں کی رعایت ضروری ہے۔[1]

[1] **خبرِ واحد** وہ روایت ہے جسے معصومؑ سے ایک یا چند قابلِ اعتماد راویوں نے نقل کیا ہو، لیکن راویوں کی تعداد اس حد تک نہ پہنچی ہو کہ معصومؑ سے اس کے صدور کا یقین حاصل ہو جائے۔ ایسی روایت پر عمل کے وجوب کے دلائل علمِ اصولِ فقہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ البتہ ایسی روایت جس کی سند نامعلوم ہو اور کسی صاحبِ صلاحیت عالم نے بھی اس پر اعتماد نہ کیا ہو، اس بحث سے خارج ہے۔ اس کے مضمون کے بارے میں ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں، اور یہ فیصلہ کہ وہ واقعاً معصومؑ سے صادر ہوئی ہے یا نہیں، ہم خود معصومینؑ ہی کے سپرد کرتے ہیں۔

دلالت کے اعتبار سے بعض روایات ان امور کے مطابق ہوتی ہیں جو ہمارے لیے پہلے سے مانوس اور قابلِ قبول ہیں، لہٰذا ان کے قبول کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

لیکن بعض روایات بظاہر اس چیز سے مختلف یا متعارض محسوس ہو سکتی ہیں جسے انسان پہلے سے جانتا یا صحیح سمجھتا ہے۔

یہ صورت بالخصوص **متشابہ روایات** میں پیش آتی ہے؛ یعنی وہ روایات جن کا مقصود فوری طور پر واضح نہ ہو اور جن کے الفاظ دو یا دو سے زیادہ معانی کا احتمال رکھتے ہوں۔

حدیث کے سامنے تسلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ائمہؑ سے ہم تک پہنچنے والی روایات کے ساتھ، بالخصوص اس دوسری قسم کی روایات کے ساتھ بھی، تسلیم کا رویہ اختیار کیا جائے جو ابتدائی طور پر ہماری سابقہ سمجھ سے مطابقت نہ رکھتی ہوں۔

ایسی صورت میں تسلیم کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی پہلے سے قائم ذہنی مفروضات کو حدیث کے مضمون کے مطابق درست کرنے کی کوشش کرے، نہ یہ کہ حدیث کو زبردستی اپنی پہلے سے قائم رائے کے مطابق ڈھالنے لگے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی حقیقتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن سے ہم بالکل ناواقف ہوں، اور ممکن ہے حدیث انہی میں سے کسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔

حدیث کی صحت کا معیار یہ نہیں کہ وہ ہماری سمجھ سے مطابقت رکھتی ہو۔

تمام حقائق اور علوم کا کامل علم چودہ معصومینؑ کے مقدس وجود کے ساتھ مخصوص ہے۔

لہٰذا اگر ان سے منقول کوئی روایت ہمارے پہلے سے موجود عقیدے یا فہم سے مطابقت رکھتی ہو تو اسے قبول کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔

لیکن اگر وہ ہماری سابقہ ذہنی بنیادوں سے مطابقت نہ رکھتی ہو تو ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ **حدیث کی روشنی میں اپنی سمجھ کی تکمیل اور اصلاح کریں۔**

اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ توقف کریں اور معاملے کو خود ائمہؑ کی طرف پلٹا دیں۔

محض اس وجہ سے روایت کا انکار کر دینا کسی صورت جائز نہیں۔

احادیثِ ائمہؑ کو برداشت کرنے کی دشواری

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ خود ائمہؑ کی تعلیمات کے مطابق ہر شخص اہلِ بیتؑ کے تمام علوم اور احادیث کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

حتیٰ اہلِ ایمان میں بھی ان علوم کو تحمل کرنے کی استعداد مخصوص شرائط اور خاص عنایتِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔

جس شخص میں یہ استعداد موجود ہو، وہ ائمہؑ سے منقول بہت سی ایسی روایات کو آسانی سے سمجھ اور قبول کر سکتا ہے جنہیں دوسرے لوگ نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ برداشت کر سکتے ہیں۔

لہٰذا محض اس وجہ سے کہ کسی حدیث کا مفہوم انسان کے پہلے سے قائم عقیدے کے مطابق نہیں، اسے ردّ یا ترک کرنے کا حق حاصل نہیں ہو جاتا۔

رسولِ خداؐ نے فرمایا:

اِنَّ حَدیثَ آلِ مُحَمَّدٍ صَعبٌ مَستَصعَبٌ لا یُؤمِنُ بِهِ اِلّا مَلَکٌ مُقَرَّبٌ اَو نَبِیٌّ مُرسَلٌ اَو عَبدٌ امتَحَنَ اللهُ قَلبَهُ لِلایمانِ. فَما وَرَدَ عَلَیکُم مِن حَدیثِ آلِ مُحَمَّدٍ صَلَواتُ اللهِ عَلَیهِم فَلانَت لَهُ قُلُوبُکُم وَ عَرَفتُمُوهُ فَاقبَلُوهُ. وَ مَا اشمَأَزَّت قُلُوبُکُم وَ اَنکَرتُمُوهُ، فَرُدُّوهُ اِلَی اللهِ وَ اِلَی الرَّسُولِ وَ اِلی العالِمِ مِن آلِ مُحَمَّدٍ عَلیهِم السّلام. وَ اِنَّمَا الهالِکُ اَن یُحَدَّثَ بِشَیءٍ مِنهُ لا یَحتَمِلُهُ فَیَقُولُ: وَ اللهِ ما کانَ هذا شَیئاً! وَ الاِنکارُ هُوَ الکُفرُ.

"بے شک آلِ محمدؐ کی حدیث دشوار اور گراں ہے۔ اس پر ایمان نہیں لاتا مگر کوئی مقرّب فرشتہ، اللہ کا بھیجا ہوا نبی، یا وہ بندہ جس کے دل کو اللہ نے ایمان کے لیے آزما کر خالص کر دیا ہو۔

پس آلِ محمدؐ کی احادیث میں سے جو کچھ تم تک پہنچے اور تمہارے دل اس کے لیے نرم ہوں اور تم اسے پہچان سکو تو اسے قبول کر لو۔

اور جو چیز تمہارے دلوں کو گراں گزرے اور تم اسے نہ پہچان سکو، اسے اللہ، رسولؐ اور آلِ محمدؑ میں سے صاحبِ علم کی طرف لوٹا دو۔

حقیقی ہلاکت اس شخص کے لیے ہے جس کے سامنے ہماری حدیث میں سے کوئی ایسی بات بیان کی جائے جسے وہ برداشت نہ کر سکے اور پھر کہہ دے: 'اللہ کی قسم! یہ کوئی چیز ہی نہیں!' اور اس طرح اس کا انکار کر دے۔

اور انکار ہی کفر ہے۔"

(بحار الانوار، ج2، ص189، حدیث 21، بحوالہ بصائر الدرجات۔)

پس تسلیم کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث انسان کے پہلے سے قائم فہم کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکے تو وہ فوراً انکار کا رویہ اختیار نہ کرے اور محض اسی بنیاد پر حدیث کو کمزور قرار دینے کی کوشش نہ کرے۔

بلکہ اسے چاہیے کہ اس کی توضیح اور صحیح تفسیر خود اہلِ بیتؑ کی تعلیمات میں تلاش کرے۔

اس مقصد کے لیے ایسے علماء کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جو ائمہؑ کی روایات اور تعلیمات سے گہری واقفیت رکھتے ہوں۔

اگر ایسے اہلِ علم تک رسائی نہ ہو تو آخری راستہ **توقف** ہے۔

یعنی انسان قطعی فیصلہ کرنے سے باز رہے اور معاملے کو غیر فیصلہ شدہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ ان شاءاللہ اہلِ بیتؑ کی تعلیمات کے ذریعے اس کا مفہوم واضح ہو جائے۔

ہر انسان کے لیے ہر حدیث کا مفہوم سمجھ لینا ضروری نہیں۔

کسی روایت کو نہ سمجھ پانا نہ اس کے انکار کا جواز بنتا ہے اور نہ اس پر اپنی طرف سے کوئی معنی مسلط کرنے کا۔

حدیث کو محض عدمِ تحمل کی بنا پر ردّ کرنا

ائمہؑ کے محبوب ترین اصحاب وہ ہیں جو ان کی احادیث کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور گہری درایت کے ذریعے انہیں قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس کے برخلاف وہ لوگ ناپسندیدہ ہیں جو کسی حدیث کو نہ سمجھ پانے اور اسے اپنے پہلے سے قائم نظریات سے مختلف پانے کی وجہ سے ردّ کر دیں اور اسے قبول کرنے سے نفرت محسوس کریں۔

ایسا رویہ حقیقت میں ائمہؑ کی ولایت کے انکار تک پہنچ سکتا ہے، کیونکہ ان کی ولایت کو قبول کرنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان ان کے سامنے مکمل تسلیم ہو — حتیٰ جب ان کا کلام اس چیز کے مطابق نہ ہو جسے وہ خود پہلے صحیح سمجھتا رہا ہو۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

اَما وَ اللهِ اِنَّ اَحَبَّ اَصحابی اِلَیَّ اَورَعُهُم وَ اَفقَهُهُم وَ اَکتَمُهُم لِحَدیثِنا. وَ اِنَّ اَسوَاَهُم عِندی حالاً وَ اَمقَتَهُم اِلَیَّ الَّذی اِذا سَمِعَ الحَدیثَ یُنسَبُ اِلَینا وَ یُروی عَنّا فَلَم یَعقِلهُ وَ لَم یَقبَلهُ قَلبُهُ اشمَاَزَّ مِنهُ وَ جَحَدَهُ

وَ کَفَرَ بِمَن دانَ بِهِ وَ هُوَ لایَدری لَعَلَّ الحَدیثَ مِن عِندِنا خَرَجَ وَ اِلَینا اُسنِدَ فَیَکُونُ بِذلِکَ خارِجاً مِن وِلایَتِنا.

''آگاہ رہو! اللہ کی قسم، میرے اصحاب میں مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ ہیں جو سب سے زیادہ صاحبِ ورع، دین کی سب سے گہری سمجھ رکھنے والے، اور جہاں ہماری احادیث کو پوشیدہ رکھنا ضروری ہو وہاں ان کی سب سے زیادہ حفاظت کرنے والے ہوں۔

اور میرے نزدیک سب سے بدتر حال اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ وہ شخص ہے جو کوئی ایسی حدیث سنے جو ہماری طرف منسوب اور ہم سے روایت کی گئی ہو، لیکن اسے سمجھ نہ سکے اور اس کا دل اسے قبول نہ کرے؛ تو وہ اس سے متنفر ہو جائے، اس کا انکار کر دے اور اسے ماننے والے کی بھی مذمت کرے۔

حالانکہ اسے معلوم نہیں؛ ممکن ہے وہ حدیث واقعاً ہماری ہی طرف سے صادر ہوئی ہو اور صحیح طور پر ہماری ہی طرف منسوب کی گئی ہو۔ پس اس طرزِ عمل کی وجہ سے وہ ہماری ولایت سے خارج ہو جائے۔''

(بحار الانوار، ج2، ص186، حدیث 12، بحوالہ بصائر الدرجات۔)

اگر کوئی شخص صرف انہی روایات کو قبول کرتا ہے جو اس کے اپنے نظریات کی تائید کرتی ہوں، اور جو روایت اس کے فکری موقف کی تصدیق نہ کرے اسے ردّ کر دیتا ہو، تو حقیقت میں اس نے اپنے اوپر ائمہؑ کی ولایت قبول ہی نہیں کی۔

وہ دراصل اپنی ہی آراء اور نظریات کی پیروی کر رہا ہے۔

ولایت قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ولیؑ کو اپنے اوپر اور دوسروں پر صاحبِ حقِ ولایت و اولویت مانے۔

اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان امامؑ کے فیصلے اور خواہش کو اپنی اور دوسروں کی رائے و خواہش پر مقدم رکھے۔

ولایت کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں امامؑ کا کلام ہمارے عقیدے سے موافق ہو وہاں ان کی پیروی کریں، اور جہاں موافق نہ ہو وہاں ان کے کلام کو ردّ یا اپنی مرضی کے مطابق تاویل کر دیں۔

جو شخص ایسا کرتا ہے اس نے حقیقت میں کبھی ائمہؑ کی پیروی کی ہی نہیں۔

جن مقامات پر بظاہر وہ ان کی پیروی کرتا ہے، وہاں بھی حقیقتاً وہ اپنے ہی عقیدے کی پیروی کر رہا ہوتا ہے؛ اتفاق سے اس کا عقیدہ روایت کے مطابق نکل آیا ہے۔

صحیح عقیدے کا معیار **وہ ہے جو حدیث میں تعلیم دیا گیا ہے**، خواہ وہ ہمارے پہلے سے قائم عقیدے سے موافق ہو یا نہ ہو۔

اسی صورت میں حقیقتاً کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے اہلِ بیتؑ کی ولایت قبول کی ہے۔

یہ حکم ان روایات کے بارے میں واضح ہے جن کی اہلِ بیتؑ کی طرف نسبت قبول شدہ ہو اور جن کے صدور میں شک نہ ہو۔ لیکن وہ روایات بھی جن کا ائمہؑ سے صدور قطعی طور پر ثابت نہ ہو ـــــ مثلاً **اخبارِ آحاد**، یا وہ روایات جن پر مرحوم کلینی اور علامہ مجلسی جیسے متقی اور حدیث شناس شیعہ علماء نے اعتماد کیا ہو، اگرچہ ان کے لیے اصطلاحی طور پر معتبر سند ہم تک نہ پہنچی ہو ـــــ محض اس بنا پر ردّ نہیں کی جا سکتیں کہ وہ ہماری سمجھ اور عقائد کے مطابق نہیں ہیں۔

کسی بات کے حق ہونے اور ائمہؑ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہونے کا معیار ہماری محدود سمجھ سے اس کی موافقت نہیں۔

لہٰذا جو لوگ اپنے آپ کو ائمہؑ کا پیروکار سمجھتے ہیں، وہ محض اپنی فہم سے عدمِ مطابقت کی بنیاد پر ان کی طرف منسوب مواد سے بے اعتنا نہیں ہو سکتے۔

جب حدیث کا مفہوم حکمِ عقل سے متعارض نظر آئے

یہاں اس طرزِ فکر کے بارے میں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے:

اگر ایسا ہے تو پھر عقل اور بدیہی عقلی حقائق کی کیا قدر و حیثیت رہ جاتی ہے؟

اگر اہلِ بیتؑ کی حدیث کے طور پر منقول کوئی بات ایک قطعی عقلی حقیقت سے ٹکراتی ہو تو کیا اسے بھی ردّ نہیں کیا جا سکتا؟

اگر ایسی بات بھی ردّ نہ کی جا سکے تو پھر مقدس ائمہؑ کو جھوٹ اور خطا سے منزّہ ماننے کی بنیاد باقی نہیں رہے گی۔ ان کی تعلیمات کی صحت، بلکہ خود ان کی صداقت بھی محلِ سوال بن جائے گی، کیونکہ یہ تمام امور خود عقل کے قطعی حکم سے ثابت کیے گئے ہیں، اور نتیجہ اپنی ہی بنیاد سے متعارض نہیں ہو سکتا۔

اس سوال کا جواب خود روایات میں دیا گیا ہے، اور عقل بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

ایک شخص امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

جُعِلتُ فِداکَ؛ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَأتینا مِن قَبلِکَ فَیُخبِرُنا عَنکَ بِالعَظیمِ مِنَ الاَمرِ فَیُضیقُ بِذلِکَ صُدُورُنا حَتّی نُکَذِّبَهُ.

''میں آپؑ پر قربان! کبھی آپؑ کی طرف سے کوئی شخص ہمارے پاس آتا ہے اور آپؑ سے ایک نہایت عظیم اور گراں بات نقل کرتا ہے۔ اسے سن کر ہمارے سینے اس قدر تنگ ہو جاتے ہیں کہ بالآخر ہم اس کی تکذیب کر دیتے ہیں۔''

امامؑ نے پوچھا:

اَلَیسَ عَنّی یُحَدِّثُکُم؟!

''کیا وہ تمہارے سامنے اسے میری طرف سے روایت نہیں کرتا؟''

راوی نے عرض کیا: ''جی ہاں۔''

امامؑ نے فرمایا:

فَیَقُولُ لِلَّیلِ اِنَّهُ نَهارٌ وَ لِلنَّهارِ اِنَّهُ لَیلٌ؟!

''کیا وہ یہ کہتا ہے کہ رات دن ہے اور دن رات ہے؟''

راوی نے عرض کیا: ''نہیں۔''

امامؑ نے فرمایا:

رُدَّهُ اِلَینا، فَاِنَّکَ اِن کَذَّبتَ فَاِنَّما تُکَذِّبنا.

''پس اسے ہماری طرف لوٹا دو اور اس کے بارے میں فیصلہ ہمارے سپرد کر دو، کیونکہ اگر تم اس کی تکذیب کرو گے تو درحقیقت ہماری تکذیب کرو گے۔''

(بحار الانوار، ج2، ص187، حدیث14، بحوالہ بصائر الدرجات۔)

امامؑ نے جو مثال بیان فرمائی ـــــ رات کو دن اور دن کو رات کہنا ـــــ وہ ایسی بات کی مثال ہے جو ایک **بدیہی اور قطعی عقلی حقیقت** کے صریح خلاف ہو۔

پس اگر حدیث کے طور پر منقول کوئی بات اس طرح عقل کے واضح اور بدیہی حکم سے ٹکرائے کہ اس کا تعارض رات کو دن اور دن کو رات کہنے جیسا ہو اور دونوں کے درمیان کسی طرح تطبیق ممکن نہ ہو، تو ایسی صورت میں ائمہؑ کے سامنے تسلیم کے نام پر اس معنی کو قبول کرنا ہمارے لیے لازم نہیں۔

لیکن ہر ظاہری اختلاف اس نوعیت کا نہیں ہوتا۔

ہماری سمجھ اور کسی روایت کے درمیان ہر عدمِ مطابقت کو حقیقی عقلی تعارض قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جہاں ایسا قطعی تعارض موجود نہ ہو، وہاں حتی الامکان ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے عقائد اور فہم کو منقول حدیث کے مطابق درست کریں۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس کے علم کو اہلِ بیتؑ کے سپرد کر دیں۔

عقل اور نقل کے درمیان تعارض کی مختلف صورتیں

حقیقی تعارض صرف اس وقت وجود میں آتا ہے جب زیرِ بحث عقلی حکم **بدیہی اور فطری** ہو؛ یعنی **مستقلاتِ عقلیہ** میں سے ہو۔

مثلاً عقل کا یہ حکم کہ:

ظلم قبیح ہے۔

ہر صاحبِ عقل انسان اس حقیقت کو سمجھتا ہے۔ اس کا ادراک کسی خاص تعلیم، فلسفے یا علمی تربیت کا محتاج نہیں، بلکہ یہ ایک بدیہی عقلی حکم ہے۔

دوسری طرف منقول حدیث کو بھی اپنے مفہوم میں **نص** ہونا چاہیے؛ یعنی اس کے الفاظ اس قدر صریح اور واضح ہوں کہ ان کے ظاہری معنی کے سوا کسی دوسرے معنی کا معقول احتمال موجود نہ ہو۔

صرف ان دونوں شرائط کے جمع ہونے کی صورت میں عقل کا بدیہی حکم اور حدیث کا صریح مفہوم حقیقی تعارض کی حالت میں قرار پائیں گے۔

لیکن اگر حدیث کو ایسے معنی میں سمجھنا ممکن ہو جو عقل کے بدیہی حکم سے متعارض نہ ہو تو اسے اسی معنی میں سمجھنا ضروری ہوگا، خواہ یہ معنی اس کے ابتدائی ظاہر سے مختلف کیوں نہ ہو۔

قرآنِ کریم کی بعض آیات کے بارے میں بھی ہم یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

چونکہ قرآن کا صدور قطعی اور یقینی ہے، اس لیے اگر کسی آیت کا ظاہری مفہوم عقلِ فطری کے کسی بدیہی حکم سے متعارض نظر آئے تو ہم آیت کو اس کے ابتدائی ظاہری معنی کے بجائے ایسے معنی میں سمجھتے ہیں جو اس قطعی عقلی حقیقت سے متصادم نہ ہو۔

مثلاً بعض آیات کا ابتدائی ظاہر بظاہر انسان کے اختیاری افعال میں **جبر** کا مفہوم دے سکتا ہے۔

لیکن ایسا مفہوم عقلِ فطری کے بدیہی حکم سے متعارض ہے۔

ایسی صورت میں ہم قرآن کے صدور کو کمزور یا مشکوک قرار نہیں دیتے، بلکہ یقین کرتے ہیں کہ آیت کا یہ ابتدائی ظاہری مفہوم اللہ کی مراد نہیں۔

اس طرح نصِ قرآنی اور دلیلِ عقلی کے درمیان بظاہر پیدا ہونے والا تعارض دور ہو جاتا ہے۔

البتہ اگر محض تعارض دور کرنے سے آگے بڑھ کر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس آیت میں اللہ کی **عین مراد کیا ہے** تو اس ظاہری معنی سے مختلف صحیح مفہوم کو ثابت کرنے کے لیے کافی دلائل اور قرائن کی ضرورت ہو گی۔

اگر ایسے دلائل اور قرائن موجود نہ ہوں تو ممکن ہے ہم آیت کی دقیق مراد متعین نہ کر سکیں، اگرچہ ہمیں یہ یقین ہو کہ اس کا ابتدائی ظاہری معنی مراد نہیں تھا۔

اس فرق کو اچھی طرح ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ائمہؑ سے منقول روایات کے بارے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

اگر کسی حدیث کا ظاہری مفہوم عقل کے کسی مستقل اور بدیہی حکم سے ٹکرائے تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ حدیث کا یہ ظاہری مفہوم مراد نہیں۔

ممکن ہے ہمارے پاس اس کے صحیح، غیر ظاہری معنی کو متعین کرنے کے لیے کافی دلیل موجود ہو، اور ممکن ہے نہ ہو۔

دونوں صورتوں میں عقل اور تعلیمِ وحی کے درمیان حقیقی تعارض باقی نہیں رہتا۔

یہ اس وقت ہے جب حدیث اپنے مفہوم میں **نص نہ ہو**، یعنی اس کے الفاظ ابتدائی ظاہری معنی کے علاوہ کسی دوسرے معنی کی گنجائش رکھتے ہوں۔

لیکن فرض کیجیے ایسا ممکن نہ ہو۔

یعنی کوئی منقول روایت اپنے ظاہری معنی کے علاوہ کسی دوسرے معنی کو قبول ہی نہ کرتی ہو—دوسرے لفظوں میں، وہ اسی معنی میں **نص** ہو—اور ساتھ ہی وہ عقل کے کسی بدیہی اور قطعی حکم کی صریح مخالفت بھی کرتی ہو۔

ایسی صورت رات کو دن اور دن کو رات کہنے کے مانند ہو گی۔

اگر بالفرض معروف شیعہ حدیثی کتب میں کوئی ایسی روایت پائی جائے تو اس روایت کے اس مفہوم کو قبول کرنا یا اس کے مضمون کے مطابق عمل کرنا ہم پر لازم نہیں ہو گا۔

متشابہ آیات و روایات کے بارے میں ہماری ذمہ داری

اہلِ بیتؑ سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے، ہماری ذمہ داری ہے کہ اسے دل و جان سے قبول کریں اور اس پر ایمان رکھیں، بالکل اسی طرح جیسے ہم قرآنِ کریم کی آیات کو قبول کرتے اور ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ اہلِ بیتؑ سے منقول ہر روایت کا مفہوم لازماً ہماری سمجھ میں بھی آجائے، جس طرح ہمارے لیے قرآنِ کریم کی ہر آیت کا مفہوم جاننا بھی ضروری نہیں۔

ہم قرآن کی **متشابہ آیات** کو بھی قبول کرتے ہیں، خواہ ان کا صحیح مفہوم ہمارے لیے پوری طرح واضح نہ ہو۔

مثلاً اس آیتِ کریمہ کے بارے میں:

»وَ ما رَمیتَ اِذ رَمَیتَ وَ لکِنَّ اللهَ رَمی«

''اور جب آپؐ نے پھینکا تو درحقیقت آپؐ نے نہیں پھینکا، بلکہ اللہ نے پھینکا۔''

(سورۂ انفال 8:17)

ہمیں یقین ہے کہ یہ آیت رسولِ خداؐ کے فعلِ رَمی میں آپؐ کے اختیار کی نفی نہیں کرتی، کیونکہ خود آیت آپؐ ہی کو اس فعل کا انجام دینے والا قرار دیتی ہے، اور آپؐ نے یہ کام نہ جبر سے کیا تھا اور نہ کسی اکراہ کے تحت۔ اس کے باوجود ممکن ہے کہ آیت کا دقیق مفہوم ہمیں معلوم نہ ہو۔

ایسی صورت میں ہم آیت کا انکار نہیں کرتے، بلکہ اس پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ اس کا پورا مفہوم ہماری سمجھ میں نہ آئے۔[1]

[1] یہ آیتِ کریمہ اس شخص کے لیے متشابہ آیات میں شمار ہو گی جو اس کے صحیح مفہوم سے واقف نہ ہو۔ اصولی طور پر کسی آیت کا **محکم یا متشابہ** ہونا ایک نسبی امر ہے، جو انسان کے علم و جہل کے لحاظ سے مختلف ہو سکتا ہے۔ ایک ہی آیت ایک شخص کے لیے محکم اور دوسرے کے لیے متشابہ ہو سکتی ہے۔ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا:

المتشابه ما اشتَبَه على جاهلِهِ

''متشابہ وہ ہے جس کا مقصود اس شخص پر مشتبہ ہو جائے جو اس کے معنی سے ناواقف ہو۔''

(بحار الانوار، ج 92، ص 382، حدیث 15، بحوالۂ تفسیر عیاشی۔)

لہٰذا اگر کوئی شخص مذکورہ آیت کا مقصود جانتا ہو تو یہ آیت اس کے لیے متشابہ نہیں رہے گی۔ یہ آیت کوئی کلی قاعدہ بیان نہیں کر رہی، بلکہ جنگِ بدر کے ایک مخصوص واقعے میں رسولِ خداؐ سے خطاب ہے، جب آپؐ نے ریت اور مٹی کی ایک مٹھی لے کر قریش کے چہروں کی طرف پھینکی تھی۔ اس فعل نے ایک معجزانہ اثر پیدا کیا، اور اسی **اثر** کے اعتبار سے رسولِ خداؐ کے ''پھینکنے'' کو اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے؛ نہ اس معنی میں کہ رسولِ خداؐ کا اختیاری فعل خود اللہ کا فعل تھا۔ (اس آیت کے ذیل میں روائی تفاسیر ملاحظہ ہوں۔)

احادیث کے بارے میں بھی ہماری ذمہ داری یہی ہے۔

ممکن ہے کسی روایت کا مفہوم ہمارے لیے صراحت کے ساتھ واضح نہ ہو اور اس کے کئی ممکنہ معانی ہمارے سامنے ہوں۔ ایسی صورت میں وہ حدیث **متشابہات** میں شمار ہو گی اور ممکن ہے ہم یقین کے ساتھ اس کا مفہوم متعین نہ کر سکیں۔

لیکن یہ عدمِ فہم، معصومؑ سے اس کے صدور پر ہمارے ایمان کو متاثر نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں روایت کو قبول کرنا چاہیے، اگرچہ ہم یقین کے ساتھ اس کا دقیق مفہوم متعین نہ کر سکیں۔

زیادہ عمومی طور پر ہمیں کبھی یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ اہلِ بیتؑ کی روایات کے معانی لازماً ہماری اپنی ذہنی مفروضات اور پہلے سے قبول شدہ تصورات کی حدود ہی میں سما سکتے ہیں۔

ممکن ہے کسی حدیث کے چند معانی ہمارے ذہن میں آئیں اور ہم سمجھیں کہ اس کا مفہوم لازماً انہی میں سے کوئی ایک ہو گا۔ حتیٰ ممکن ہے ہم یہ خیال کریں کہ عقلاً اس کے علاوہ کوئی اور احتمال ممکن ہی نہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہو کہ ہمارے ذہن میں پہلے سے موجود بعض مفروضات نے ہماری سوچ کو انہی چند احتمالات تک محدود کر دیا ہو۔

لہٰذا یہ بالکل ممکن ہے کہ امامؑ نے کوئی ایسی بات فرمائی ہو جس کا کوئی معقول مفہوم ہم تصور نہ کر سکیں؛ لیکن اگر بالفرض کسی شخص کو خود امامؑ سے اس کے بارے میں سوال کرنے کا موقع ملتا تو امامؑ ایسا مفہوم بیان فرماتے جو اس سے پہلے کسی کے ذہن میں آیا ہی نہ ہوتا، اور وہ مفہوم مستقلاتِ عقلیہ اور عقل کے بدیہی احکام سے ذرّہ برابر بھی متعارض نہ ہوتا۔

ایسا امکان بالکل معقول ہے۔

اہلِ بیتؑ کی احادیث کے ستر معانی

خود ائمہؑ سے روایت ہوئی ہے کہ وہ اپنے کلام کے ستر تک معانی بیان کر سکتے ہیں، اور وہ تمام معانی حدیث کے الفاظ کے ساتھ سازگار ہو سکتے ہیں۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ الکَلِمَةِ مِن کَلامِنا لَتَنصِرِفُ عَلی سَبعینَ وَجهاً، لَنا مِن جَمیعَها المَخرَجُ.

”بے شک ہمارے کلام کا ایک کلمہ ستر معانی کی طرف پھر سکتا ہے، اور ان سب کے لیے ہمارے پاس اس کی توضیح کا راستہ موجود ہے۔“

(بحار الانوار، ج2، ص184، حدیث 5، بحوالۂ معانی الاخبار۔)

اس حدیث سے دو نکات سامنے آتے ہیں۔

پہلا یہ کہ ائمہؑ کا ایک کلام متعدد معانی کا حامل ہو سکتا ہے، جن کی تعداد یہاں ستر تک بیان کی گئی ہے۔[1]

دوسرا یہ کہ ائمہؑ خود اپنے کلام کے الفاظ سے ان تمام معانی کو اخذ اور واضح کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یعنی اگر وہ کسی شخص کے سامنے اپنے کسی کلام کے مقصود کی وضاحت فرمانا چاہیں تو یہ بھی دکھا سکتے ہیں کہ وہ معانی انہی الفاظ سے کس طرح نکلتے ہیں۔

[1] ممکن ہے یہاں عددِ ستر کسی معین عدد کے بجائے کثرت کی طرف اشارہ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ کام عام انسانوں کی قدرت سے باہر ہے۔

ایک دینی عالم کو اہلِ بیتؑ کی روایات سے نہایت وسیع واقفیت اور معرفت کے مختلف میدانوں میں ان کی تعلیمات کے بنیادی اصولوں سے گہری آشنائی درکار ہے، تب کہیں جا کر وہ ان معانی اور جہات میں سے بعض کو اخذ اور سمجھنے کی صلاحیت حاصل کر سکتا ہے۔

اسی وجہ سے ائمہؑ نے اپنی روایات میں **تفقّہ** اور گہری فہم پر بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے۔ ان کی اصطلاح میں حقیقتاً **فقیہ** کہلانے کا مستحق وہی ہے جو ان کی تعلیمات کی گہری معرفت رکھتا ہو۔

اور ایسا فقہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان ائمہؑ کے کلام میں ان معانی سے بھی آگاہ نہ ہو جو صراحت کے بجائے اشارے اور کنائے میں بیان ہوئے ہیں۔

گزشتہ حدیث کے آغاز میں فرمایا گیا ہے:

حَديثٌ تَدريهِ خَيرٌ مِن اَلفٍ تَرويهِ. وَ لا يَكُونُ الرَّجُلُ مِنكُم فَقيهاً حَتّى يَعرِفَ مَعاريضَ كَلامِنا.

”ایک حدیث جسے تم گہرائی سے سمجھتے ہو، ان ہزار احادیث سے بہتر ہے جنہیں تم محض روایت کرتے ہو۔ اور تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک ہمارے کلام کے **معاریض** کو نہ پہچانے۔“

لفظ **مَعاریض**، **معرِاض** کی جمع ہے، اور اس سے مراد کلام کے وہ پہلو اور معانی ہیں جو براہِ راست اور صراحت کے ساتھ بیان نہ کیے گئے ہوں، بلکہ اشارے، کنائے یا ضمنی دلالت کے ذریعے مقصود ہوں۔

جو معنی الفاظ کے ذریعے صراحت سے بیان کیا جائے وہ **مصرَّح** معنی ہے، جبکہ جو معنی بالواسطہ اور ضمنی طور پر مقصود ہو اسے **معرِاض** کہا جاتا ہے۔

ممکن ہے ایک کلام کا ایک صریح مفہوم ہو اور ساتھ ہی ایک یا کئی ضمنی و اشاراتی معانی بھی ہوں، اور متکلم نے ان سب کو ارادہ کیا ہو۔

عام لوگ عموماً کلام کے صرف صریح اور ظاہری معنی کو سمجھتے ہیں۔ لیکن جو شخص متکلم کے فکری منہج سے واقف ہو اور اس کے کلام کے لفظی اور مقامی قرائن کو جانتا ہو، وہ اپنی واقفیت کی گہرائی کے مطابق اس کے ضمنی، اشاراتی اور کنائی معانی کو بھی سمجھ سکتا ہے۔

اہلِ بیتؑ کی روایات کے بارے میں بھی یہی اصول جاری ہے۔

جو لوگ مختلف میدانوں میں ان کی تعلیمات سے گہری واقفیت نہیں رکھتے، وہ عموماً روایات کے صرف ظاہری معنی تک پہنچتے ہیں۔

لیکن اہلِ بیتؑ کے فکری منہج اور طرزِ بیان سے گہری آشنائی، ان مختلف حالات کی معرفت جن میں انہوں نے کلام فرمایا—مثلاً **تقیہ** اور اسی نوع کے دوسرے حالات—نیز ان کے اصحاب اور راویوں کی کیفیت سے واقفیت؛ جن میں سے بعض کبھی بعض حقائق کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور جن کے سامنے امامؑ نے کبھی **توریہ** سے کام لیا ہو سکتا تھا—یہ تمام امور ائمہؑ کے کلام کے ضمنی معانی سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

ائمہؑ کی اصطلاح میں **فقیہ** وہ شخص ہے جو ان تمام عوامل سے واقف ہو جو ان کے کلام کو سمجھنے میں اثرانداز ہوتے ہیں۔

ایسا شخص ائمہؑ کے کلام کو گہرائی سے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر انسان صرف ظاہری معانی اخذ کرتا ہے، اور یہ وہ **فقہ** نہیں جسے ائمہؑ نے مطلوب قرار دیا ہے۔

فقہ کا مطلب گہری سمجھ ہے۔ جو شخص کلام کی سطح اور اس کے ظاہری مفہوم ہی تک پہنچے، اس نے ابھی حقیقی فقہ حاصل نہیں کی۔

حدیث کے بارے میں ایک فقیہ کا طرزِ عمل

لہٰذا ہمیں اہلِ بیتؑ کی روایات کے ساتھ نہایت احتیاط سے پیش آنا چاہیے۔

ممکن ہے کوئی حدیث ہمیں صرف ایک یا چند معانی کی حامل دکھائی دے اور ان کے علاوہ کوئی اور احتمال ہمارے ذہن میں نہ آئے۔ اگر وہ تمام ممکنہ معانی بھی عقل کے بدیہی حقائق سے متعارض دکھائی دیں، تب بھی ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ فوراً اس حدیث کو کنارے لگا دیں یا اس کا انکار کر دیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے معصومؑ متکلم نے اس سے کوئی اور معنی — بلکہ کئی دوسرے معانی — مراد لیے ہوں جو کبھی ہمارے ذہن میں آئے ہی نہ ہوں۔

ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جو معانی حقیقتاً مستقلاتِ عقلیہ کے قطعی احکام سے متعارض ہوں، وہ حدیث کی مراد نہیں ہو سکتے۔

لیکن آیا اس حدیث سے کوئی دوسرا معنی اخذ کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ عموماً ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام ایسے فقیہ کا ہے جو ائمہؑ کے کلام کے **معاریض** اور اس کے گہرے پہلوؤں سے واقف ہو۔

امامِ عصرؑ کی غیبت کے زمانے میں اہلِ بیتؑ کے علوم و معارف کے تمام شعبوں پر محیط اس درجے کا جامع تفقّہ بہت کم پایا جاتا ہے۔

اس کے باوجود بزرگ شیعہ علماء میں بہت سے ایسے گزرے ہیں جو عملی احکام اور رائج فقہ کے مختلف ابواب میں اہلِ بیتؑ کے منہج اور طرزِ بیان، ان کے کلام کے حالات و ظروف اور متعلقہ قرائن سے گہری واقفیت رکھتے تھے، اور ان کی تعلیمات کے بہت سے ضمنی پہلوؤں کو سمجھتے تھے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عملی احکام کے میدان میں علماء نے عموماً احادیث کے سامنے دینی تسلیم کا زیادہ اہتمام کیا ہے۔ فقہی روایات کے بارے میں **تسلیم** کی ذمہ داری کو بزرگ شیعہ فقہاء نے مجموعی طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

افسوس کہ عملی فقہ کے دائرے سے باہر — بالخصوص عقائد کے مسائل میں، جو عملی احکام سے بھی زیادہ اہم ہیں، اسی طرح قرآنِ کریم کی غیر فقہی آیات کی تفسیر میں، اور پھر اخلاق اور قلبی احکام کے میدان میں — ایسے علماء کی تعداد نسبتاً بہت کم رہی ہے جنہوں نے اہلِ بیتؑ کی روایات کے سامنے کامل تسلیم کا راستہ اختیار کیا ہو اور ہر مسئلے میں سب سے پہلے یہ جاننا اپنی ذمہ داری سمجھا ہو کہ اس بارے میں اہلِ بیتؑ کا عقیدہ اور تعلیم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف ایسے ہی لوگ پورے طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اہلِ بیتؑ کے کلام کو قبول کرنا ان کے باطن کے لیے گراں نہیں۔

علماء اور اہلِ فکر اس سلسلے میں مختلف درجات رکھتے ہیں۔ انسان کی تسلیم جتنی زیادہ ہو گی، وہ ائمہؑ کے پسندیدہ تفقّہ کے اتنا ہی قریب ہو گا۔

اگر یہ تسلیم موجود نہ ہو تو احادیث کی طرف رجوع بھی محض اپنی یا دوسروں کی آراء کے لیے مؤید اور شاہد تلاش کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اللہ اور اہلِ بیتؑ کی بارگاہ میں ایسے طرزِ عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

بہت سے لوگ اپنے نظریات بیان کرتے ہوئے روایات کا حوالہ دیتے ہیں۔ محض یہ بات اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ ائمہؑ کے سامنے تسلیم ہیں۔

بارہا دیکھا جاتا ہے کہ ایک یا چند **متشابہ روایات** کو کسی اعتقادی نظریے کی بنیاد بنا لیا جاتا ہے، جبکہ بہت سی واضح اور محکم روایات کو مختلف بہانوں سے کنارے کر دیا جاتا ہے؛ مثلاً یہ کہ ان کی سند ضعیف ہے، یا ائمہؑ کے مخاطبین کی فکری سطح محدود تھی، یا اسی نوع کی دوسری توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔

یہ اہلِ بیتؑ کے سامنے تسلیم نہیں ہے۔

جو شخص ـــ خواہ دانستہ ہو یا نادانستہ ـــ انسانی فکر کو اپنے عقائد کی بنیاد بنائے، پھر دستیاب روایات میں سے صرف انہی کو پیش کرے جو اس کے فکری موقف کی تائید کرتی ہوں، اور باقی روایات کو نظر انداز کر دے یا انہیں اپنے فکری سانچے کے مطابق تاویل کرے، وہ حقیقتاً اہلِ بیتؑ کے سامنے تسلیم نہیں۔

ممکن ہے ایسا شخص ائمہؑ کی ولایت و امامت کے بارے میں بہت گفتگو کرے، اور قول و عمل سے ان کے لیے بڑی محبت و عقیدت کا اظہار بھی کرے، لیکن یہ سب کچھ ان کی تعلیمات اور مکتب کی مخلصانہ اور کامل پیروی سے الگ چیز ہے۔

اسی طرح صرف اس وجہ سے کہ کوئی شخص اپنی تقریر یا تحریر میں چند روایات نقل کرتا ہے یا ائمہؑ سے وابستگی کا اعلان کرتا ہے، یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ وہ حقیقی تسلیم کے مقام تک پہنچ چکا ہے۔

اس صفت کی تشخیص آسان نہیں اور نہ ہر شخص اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ خود انسان متعلقہ علمی میدان میں مہارت رکھتا ہو، اہلِ بیتؑ کے منہج اور طرزِ تعلیم کو پہچاننے کے لیے ضروری علمی مبانی سے واقف ہو، اور اس موضوع سے متعلق روایات کا کافی مطالعہ اور تحقیق کر چکا ہو۔

بہر حال اس میدان میں داخل ہونا اور ائمہؑ کے پسندیدہ تفقّہ کی طرف بڑھنا نہایت دشوار کام ہے۔ صرف عربی ادب، منطق، فقہ، اصول اور اسی نوع کے دوسرے علوم پڑھ لینے سے یہ مقام حاصل نہیں ہوتا۔

ان میں سے اکثر علوم مفید اور ضروری ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ اعتقادی مسائل میں اہلِ بیتؑ کے معارف کو حاصل کرنا بھی ناگزیر ہے۔

اس کے باوجود یہ تمام امور حقیقی تفقّہ کے لیے **شرائطِ لازم ہیں، شرائطِ کافی نہیں۔**

ایک اور ناگزیر شرط یہ ہے کہ خود اہلِ بیتؑ کی عنایت کے دامن میں پناہ لی جائے اور ان سے مدد و رہنمائی طلب کی جائے۔

ہر راستے پر ہر حرکت بالآخر فضل و عنایتِ الٰہی کی محتاج ہے، لیکن دینی علم و معرفت کے حصول میں یہ احتیاج دوسرے علوم کے مقابلے میں کہیں زیادہ سنجیدہ اور بنیادی ہے۔

دینی علماءاور اہلِ فکر بعض پہلوؤں سے دوسروں کے مقابلے میں انحراف اور خطا کے خطرات سے زیادہ دوچار ہوتے ہیں۔ علماءاور دینی مفکرین کے راستے میں شیطان کی مداخلت زیادہ عمیق اور خطرناک ہوسکتی ہے۔

اسی لیے تمام معصومینؑ، بالخصوص امامِ غائب حضرت امام مہدیؑ (عجّل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) سے ان کا توسل دوسروں سے کہیں زیادہ اور مسلسل ہونا چاہیے۔

احادیثِ اہلِ بیتؑ کے تحمل کے لیے ائمہؑ کی خاص عنایت کی ضرورت

اس توجہ اور توسل کی ضرورت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ جان لیں کہ خود ائمہؑ کی خاص عنایت و لطف کے بغیر کوئی شخص حقیقتاً اُن کے علوم کا تحمل نہیں کر سکتا۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ حَدیثَنا صَعبٌ مُستَصعَبٌ ... لا یَحتَمِلُهُ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَ لا نَبِیٌّ مُرسَلٌ وَ لا مُؤمِنٌ مُمتَحَنٌ.

”بے شک ہماری حدیث دشوار اور گراں ہے... اسے نہ کوئی مقرّب فرشتہ، نہ کوئی رسولِ مرسل اور نہ کوئی ایسا مؤمن جس کے ایمان کو آزمایا گیا ہو، برداشت کر سکتا ہے۔“[1]

[1] اس روایت اور اس جیسی دوسری روایات میں **حدیثُنا**—**”ہماری حدیث“** سے کیا مراد ہے، اس کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ اس سے اہلِ بیتؑ کی تمام تعلیمات اور ارشادات مراد ہوں۔ متن میں موجود بحث اسی مفہوم پر قائم ہے۔ دوسرے احتمال کے لیے، جسے مکیال المکارم کے مؤلف نے ترجیح دی ہے، ج2، ص463–466 ملاحظہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں معانی بیک وقت صحیح ہوں اور ہر ایک امامؑ کی مراد کے ایک الگ پہلو کو بیان کرتا ہو۔

حدیث کے راوی ابو صامت کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

فَمَن یَحتَمِلُه جُعِلتُ فِداکَ؟

”میں آپؑ پر قربان! پھر اسے کون برداشت کر سکتا ہے؟“

امامؑ نے فرمایا:

مَن شِئنا یا اَبَاالصّامِتِ!

''اے ابوصامت! جسے ہم چاہیں۔''

)بحارالانوار، ج2، ص192، حدیث34، بحوالۂ بصائرالدرجات۔(

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہلِ بیتؑ کی روایات پڑھنے یا سننے والے شخص کو اگر امامؑ کی خاص توجہ اور عنایت حاصل نہ ہو تو وہ حقیقتاًاُن کے مفہوم کو سمجھ نہیں سکتا۔

کسی حدیث کا **تحمل** محض اسے پڑھ لینے یا یاد کر لینے کا نام نہیں۔ تحمل کا مطلب یہ ہے کہ حدیث انسان کے قلب میں جگہ پائے اور وہ باطناًاسے قبول کر سکے۔

اور یہ امامؑ کی خاص عنایت کا محتاج ہے۔

لہٰذا دینی علم کا ہر طالب، جب ائمہؑ کی روایات کی طرف رجوع کرتا ہے، تو ہر اس حدیث کے بارے میں جسے وہ حقیقتاً سمجھتا اور دل سے قبول کرتا ہے، امامؑ کی توجہ و عنایت کا محتاج ہوتا ہے۔ اس عنایت کے بغیر وہ ان کے علم میں سے کسی چیز کا حقیقی تحمل نہیں کر سکتا۔

امام صادقؑ نے مطلق طور پر ہر مقرّب فرشتے، ہر رسولِ مرسل اور ہر آزمودہ مؤمن کی احادیث کے تحمل کی صلاحیت کی نفی نہیں فرمائی۔

یعنی امامؑ کا مقصود یہ نہیں کہ ان تینوں گروہوں میں سے کوئی بھی فرد ان کی تعلیمات کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بلکہ نفی ان افراد کی صلاحیت کی ہے جنہیں امامؑ کی مخصوص عنایت اور مشیت حاصل نہ ہو۔

پس ان تینوں گروہوں میں سے جس شخص کو بھی یہ نعمت حاصل ہوتی ہے، وہ امامؑ کی مشیت، لطف اور عنایت ہی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد امامِ عصرؑ سے دائمی توسل اور ان اسباب کو اختیار کرنے کی ضرورت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے جو آپؑ کی توجہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں—— بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو اہلِ بیتؑ کے علوم و معارف کے طالب ہیں۔

استعجال، تسلیم کے منافی ہے

زمانۂ غیبت میں مؤمنین کی تسلیم کا ایک اہم امتحان **غیبت کے طولانی ہو جانے** کے بارے میں ان کا رویہ ہے۔

ہمارے ائمہؑ نے غیبت کے آغاز سے پہلے ہی اس کے طویل ہونے کی خبر دے دی تھی۔ اس کے باوجود حقیقی مؤمنین کے لیے اس غیبت کو برداشت کرنا نہایت دشوار اور دردناک ہے۔

جو لوگ حقیقتاً امامؑ کی جدائی کا درد محسوس کرتے ہیں، ان کے لیے ظہور میں تاخیر کا ہر دن اور ہر ساعت اس مصیبت کو شدید تر بنا دیتی ہے اور اسے برداشت کرنا مزید دشوار ہوتا جاتا ہے۔

اور مصیبت جتنی بڑی ہو، اتنے ہی زیادہ صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

لہٰذا مؤمنین کو چاہیے کہ امامؑ کی غیبت کی مصیبت برداشت کرنے میں اپنا صبر نہ کھو بیٹھیں اور اس کے لیے اللہ سے مدد طلب کریں۔

ایسے صبر کی دعا کی ایک مثال اس دعا میں ملتی ہے جو امامِ عصرؑ کے پہلے نائب، عثمان بن سعید عمری سے ہم تک پہنچی ہے:

اَللّٰهُمَّ ... ثَبِّتنی عَلی طاعَةِ وَلِیِّ اَمرِکَ الَّذی سَتَرتَهُ عَن خَلقِکَ فَبِاِذنِکَ غابَ عَن بَرِیَّتِکَ وَ اَمرِکَ یَنتَظِرُ. وَ اَنتَ العالِمُ غَیرُ المُعَلَّمِ بِالوَقتِ الَّذی فیهِ صَلاحُ اَمرِ وَلِیِّکَ فِی الاِذنِ لَهُ بِاِظهارِ اَمرِهِ وَ کَشفِ سِترِهِ. فَصَبِّرنی عَلی ذلِکَ حَتّی لا اُحِبَّ تَعجیلَ مَا اَخَّرتَ وَ لا تَأخیرَ ما عَجَّلتَ وَ لا اَکشِفَ عَمّا سَتَرتَهُ وَ لا اَبحَثَ عَمّا کَتَمتَهُ وَ لا اُنازِعَکَ فی تَدبیرِکَ وَ لا اَقُولَ: لِمَ وَ کَیفَ وَ ما بالُ وَلِیِّ الاَمرِ لا یَظهَرُ وَ قَدِ امتَلَاتِ الاَرضُ مِنَ الجَورِ؟! وَ اُفَوِّضَ اُمُوری کُلَّها اِلَیکَ.

”اے اللہ!... مجھے اپنے ولیِ امر کی اطاعت پر ثابت قدم رکھ، جسے تو نے اپنی مخلوق سے پوشیدہ رکھا ہے۔ تیرے ہی اذن سے وہ تیرے بندوں سے غائب ہیں اور تیرے حکم کے منتظر ہیں۔

اور تو وہ جاننے والا ہے جسے کسی نے علم نہیں سکھایا؛ تو اس وقت کو جانتا ہے جس میں تیرے ولیؑ کے امر کی مصلحت ہے کہ انہیں اپنے امر کے اظہار اور پردۂ غیبت اٹھانے کی اجازت دے۔

پس مجھے اس معاملے میں ایسا صبر عطا فرما کہ جس چیز کو تو نے مؤخر کیا ہے میں اس کی جلدی نہ چاہوں، اور جس چیز کو تو نے مقدم کیا ہے اسے مؤخر نہ چاہوں؛ جسے تو نے پوشیدہ رکھا ہے اسے آشکار کرنے کی کوشش نہ کروں، اور جسے تو نے مخفی رکھا ہے اس کی جستجو نہ کروں؛ تیری تدبیر میں تجھ سے نزاع نہ کروں اور یہ نہ کہوں: 'کیوں؟ کیسے؟ ولیِ امرؑ کیوں ظاہر نہیں ہوتے، جبکہ زمین ظلم و جور سے بھر چکی ہے؟'!

بلکہ اپنے تمام معاملات تیرے سپرد کر دوں۔''

(کمال الدین، باب 45، حدیث 43۔)

سختیوں اور مصیبتوں میں انسان کے ایمان کو سب سے بڑا خطرہ اس وقت لاحق ہوتا ہے جب وہ صبر کھو بیٹھتا ہے اور قضائے الٰہی اور تقدیر سے ناراضی اس کے دل میں پیدا ہونے لگتی ہے۔

مؤمن کو ہر حال میں اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے اور اللہ نے اس کے لیے جو چاہا ہے، اس پر ناراضی نہیں ہونی چاہیے۔ البتہ بعض سختیاں اور مصیبتیں خود انسان کے گناہوں کے سبب پیش آتی ہیں۔ ممکن ہے اللہ اسے دنیا ہی میں اس کے گناہ کی سزا دینا چاہے اور اسی لیے اسے کسی مصیبت میں مبتلا کرے۔

ایسی صورت میں انسان کو اپنے **گناہ سے ناراض ہونا چاہیے** جو ممکن ہے نزولِ بلا کے ذریعے عذابِ الٰہی اور دنیوی سزا کا سبب بنا ہو؛ لیکن اسے اللہ کے فعل سے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ کے سامنے تسلیم کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کا دل اس کی مشیت پر راضی رہے، جو ایسی صورت میں اس کے عدل کا مظہر ہے۔

امامِ عصرؑ کی غیبت بھی اہلِ ایمان کے لیے ایک عظیم مصیبت ہے۔ اگرچہ اس کا بنیادی سبب ظہور سے پہلے پوری طرح واضح نہیں ہوگا، لیکن گزشتہ بحث کے آغاز میں جو کچھ بیان ہوا، اس کے مطابق یہ عدلِ الٰہی کا نتیجہ ہے؛ خود لوگوں کے گناہوں نے انہیں اپنے مہربان پروردگار کی ناراضی کا مستحق بنا دیا ہے۔

پس ہمیں اپنی اور دوسروں کی کوتاہیوں اور ناشکریوں سے ناراض ہونا چاہیے، لیکن ساتھ ہی غیبتِ امامؑ اور اس کے طولانی ہونے پر ــــ جہاں تک یہ عدلِ الٰہی کا تقاضا ہے ــــ راضی رہنا چاہیے۔

غیبت کے طولانی ہونے پر اس اعتبار سے راضی رہنا، حقیقت میں **فعلِ خدا پر راضی رہنا** ہے۔

ایمان کی شرط یہ ہے کہ انسان اپنے بارے میں اللہ کے ہر فعل سے قلباً راضی رہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِعلَموا اَنَّهُ لَن یُؤمِنَ عَبدٌ مَن عَبیدِهِ حَتّی یَرضی عَنِ اللهِ فیما صَنَعَ اللهُ اِلَیهِ وَ صَنَعَ بِهِ علی ما اَحَبَّ وَ کَرِهَ.

"جان لو! اللہ کے بندوں میں سے کوئی بندہ اس وقت تک حقیقی ایمان نہیں لا سکتا جب تک اللہ نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس پر اللہ سے راضی نہ ہو ــــ خواہ وہ چیز اسے پسند ہو یا ناپسند۔"

(بحار الانوار، ج 78، ص 217، حدیث 93، بحوالہ روضۃ الکافی)

پس مؤمن وہ ہے جو پسندیدہ اور ناپسندیدہ، دونوں حالات میں اللہ سے راضی رہے۔

لہٰذا اگرچہ امامِ عصرؑ کی غیبت مؤمنین کے لیے نہایت دردناک اور غم انگیز امر ہے، لیکن وہ اس کی تمام تلخیوں کو برداشت کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی مشیت پر اعتراض نہیں کرتے۔

زمانۂ غیبت میں مؤمنین کے ایمان کو لاحق خطرات میں سے ایک یہی ہے کہ وہ غیبت کے طولانی ہونے پر صبر و تحمل کھو بیٹھیں اور دل میں ناراضی پیدا ہو جائے۔

اس کیفیت کی ایک علامت ظہورِ امامؑ کے بارے میں **استعجال**، یعنی بے صبری کے ساتھ جلدی چاہنا ہے، جسے ہماری روایات میں **استعجال** کہا گیا ہے۔

استعجال کے بھی مختلف درجات ہیں۔انسان کی تسلیم جتنی کمزور ہو گی،اس کا استعجال اتنا ہی شدید ہو گا۔اور اپنی انتہائی صورت میں یہ کیفیت انسان کو وعدۂ الٰہی کے انکار تک بھی پہنچا سکتی ہے۔

ظہور کے بارے میں استعجال انسان کے ایمان کو تباہ کر کے اسے ہلاکت تک پہنچا سکتا ہے۔

امام جوادؑ نے فرمایا:

یَهلِکُ فیهَا المَستَعجِلُونَ. وَ یَنجُو فیهَا المَسَلِّمُونَ.

''اس [غیبتِ کبریٰ] میں جلدی کرنے والے ہلاک ہوں گے اور تسلیم رہنے والے نجات پائیں گے۔''

)کمال الدین، باب 36، حدیث 3۔(

پس زمانۂ غیبت میں تسلیم کا ایک مظہر یہ ہے کہ انسان ظہور میں تاخیر کی وجہ سے اپنا صبر نہ کھوئے اور اس معاملے میں اللہ کی مشیت پر قلباً راضی رہے۔

تعجیلِ فرج کی دعا، تسلیم کے عین مطابق ہے

امامِ عصرؑ کے فرج میں تعجیل کے لیے دعا کرنا، غیبت کے طولانی ہونے کے بارے میں تسلیم کے کسی طرح منافی نہیں، اور نہ ایسی دعا **استعجال** کا مصداق ہے۔

اس حقیقت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے دعا کے بارے میں دو بنیادی نکات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

دعا اللہ کو محبوب ہے

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندے کی دعا کو عبادت کے بلند ترین مظاہر میں قرار دیا ہے اور اسے ان بہترین وسائل میں سے بنایا ہے جن کے ذریعے اس کی عنایت بندوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

امیر المؤمنینؑ نے امام حسنؑ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

اِعلَم اَنَّ الَّذی بِیَدِهِ خَزائِنُ السَّمواتِ وَ الاَرضِ قَد اَذِنَ لَکَ فِی الدُّعاءِ وَ تَکَفَّلَ لَکَ بِالاِجابَةِ وَ اَمَرَکَ اَن تَسالَهُ لِیُعطِیَکَ وَ تَسترَحِمَهُ لِیَرحَمَکَ وَ لَم یَجعَل بَینَکَ وَ بَینَهُ مَن یَحجُبُهُ عَنکَ.

”جان لو کہ وہ ذات جس کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں، اس نے تمہیں دعا کرنے کی اجازت دی ہے اور تمہاری دعا قبول کرنے کا ذمہ لیا ہے۔ اس نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اس سے مانگو تاکہ وہ تمہیں عطا کرے، اور اس سے رحمت طلب کرو تاکہ وہ تم پر رحم کرے۔ اور اس نے تمہارے اور اپنے درمیان کوئی ایسا حجاب نہیں رکھا جو اسے تم سے پوشیدہ کر دے۔“

)نہج البلاغہ، فیض الاسلام، مکتوب 31۔(

دعا کا مطلب اللہ کو پکارنا ہے، جبکہ **سوال کا مطلب** اس سے کوئی چیز مانگنا ہے۔

ممکن ہے دعا کے ساتھ کوئی درخواست ہو اور ممکن ہے نہ ہو۔ کبھی انسان اللہ کو پکارتا ہے لیکن کسی خاص چیز کا سوال نہیں کرتا، اور کبھی اسے پکارتا بھی ہے اور اس سے اپنی حاجت بھی طلب کرتا ہے۔

دونوں چیزیں اللہ کو محبوب ہیں اور ان اعمال میں سے ہیں جنہیں اس نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔

بلکہ اللہ کو یہ بھی پسند ہے کہ بندہ اس سے بار بار اور اصرار کے ساتھ مانگے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ کَرِهَ اِلحاحَ النِاسِ بَعضِهِم عَلی بَعضٍ فِی المَسالَةِ وَ اَحَبَّ ذلِکَ لِنَفسِهِ.

”اللہ عزوجل اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے اصرار کے ساتھ مانگتے رہیں، لیکن وہ اپنے بارے میں اسی اصرار کو پسند کرتا ہے۔“

)اصول الکافی، ج2، ص475، کتاب الدعاء، باب الالحاح فی الدعاء، حدیث 4۔(

پس دعا اور اللہ سے مانگنا ہی اسے محبوب نہیں، بلکہ اللہ اس بات کو بھی پسند کرتا ہے کہ بندہ اس سے اصرار کے ساتھ طلب کرے۔[1]

[1] البتہ دنیاوی امور میں، جہاں انسان نہیں جانتا کہ جس چیز کا وہ طالب ہے وہ حقیقتاً اللہ کی رضا کے مطابق اور اس کے حق میں خیر ہے یا نہیں، وہاں اصرار اس کے حق میں بہتر نہ بھی ہو؛ مگر یہ کہ دعا کو اس شرط کے ساتھ کرے کہ وہ چیز اسی صورت میں عطا ہو جب اللہ کے علم میں اس کے لیے خیر ہو۔

دعا کا قضا و تقدیرِ الٰہی کی تبدیلی میں اثر

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ نے بندے کی دعا کو قضا و تقدیر میں تبدیلی کا ایک مؤثر سبب قرار دیا ہے۔

یہ اللہ کے اپنے بندوں پر کمالِ لطف و کرم کا ایک مظہر ہے کہ وہ دعا کے ذریعے اس تقدیر میں تبدیلی کی امید رکھ سکتے ہیں جو ان کے لیے مقرر کی گئی ہو۔

ساتویں امام، حضرت موسیٰ کاظمؑ سے روایت ہے:

عَلَیکُم بِالدُّعاءِ. فَاِنَّ الدُّعاءَ لِلّهِ وَ الطَّلَبَ اِلَی اللهِ یَرُدُّ البَلاءَ وَ قَد قُدِّرَ وَ قُضِیَ وَ لَم یَبقَ اِلّا اِمضاؤُهُ.

"تم پر دعا لازم ہے، کیونکہ اللہ سے دعا اور اسی سے طلب کرنا اس بلا کو بھی پلٹا دیتا ہے جس کی تقدیر ہو چکی ہو اور جس کا فیصلہ بھی ہو چکا ہو، اور صرف اس کا نافذ ہونا باقی رہ گیا ہو۔"

(اصول الکافی، ج4، ص470، کتاب الدعاء، باب اَنَّ الدعاء یرد البلاء والقضاء، حدیث 8۔)

تقدیر کا مطلب کسی امر کی خصوصیات اور حدود کو معین کرنا ہے، اور کسی واقعے کے وقوع کا وقت بھی اس کی تقدیر میں شامل ہوتا ہے۔

قضا سے مراد اللہ کا اپنے کارگزاروں، مثلاً فرشتوں، کو کسی امر کے اجرا کا حکم دینا ہے۔

اور **امضاء** وہ مرحلہ ہے جب وہ امر خارج میں بالفعل واقع ہو جاتا ہے۔

پس جب تک کسی مقدر امر کا آخری نفاذ نہ ہوا ہو، دعا کے ذریعے تقدیر اور قضا میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔

اس طرح اللہ سے دعا اور سوال، بذاتِ خود عبادت و بندگی ہونے کے ساتھ ساتھ، دعا کرنے والے اور دوسروں کی تقدیر پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

دعا، قضائے الٰہی پر رضا کے منافی نہیں

دعا کی قدر و منزلت اور تقدیرِ الٰہی پر اس کے اثر کے یہ دونوں نکات واضح ہو جائیں تو یہ حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ اللہ سے کسی چیز کا سوال کرنا، اس کی قضا پر راضی رہنے کے منافی نہیں۔

خود اللہ نے اپنے بندوں کے لیے دعا اور سؤال کا دروازہ کھولا ہے۔ وہ پسند کرتا ہے کہ بندے اسی دروازے سے اس کی طرف آئیں اور اپنی مصیبتوں اور سختیوں کے دور ہونے کی دعا کریں۔

بلکہ اس نے اسی سؤال کو عبادت کے بلند ترین مظاہر میں سے قرار دیا ہے۔

لہٰذا مصیبت کے دور ہونے کی دعا اور اللہ سے اس کا سوال کرنا خود اس کی **قضائے تشریعی** کے سامنے تسلیم کا ایک عمل ہے۔[1]

[1] **قضائے تشریعی**، قضائے تکوینی کے برخلاف، بندوں کے اختیاری اعمال سے متعلق ہے اور اللہ کے اوامر و نواہی کو بیان کرتی ہے۔ جس چیز سے اللہ کی قضائے تکوینی متعلق ہو جائے، وہ لازماً واقع ہوتی ہے؛ لیکن قضائے تشریعی ـــ یعنی اللہ کے امر و نہی ـــ کا متعلق انسان کے اختیار کی بنا پر واقع بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ یہاں اللہ نے چاہا ہے کہ بندے اپنے اختیار سے اس سے دعا کریں اور مصیبتوں کے دور ہونے کا سوال کریں، تاکہ وہ ان سے بلا کو دفع فرمائے۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اس کی قضائے تشریعی کے سامنے تسلیم کرتے ہیں، اور اگر نہیں کرتے تو اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

بندے کی حقیقی تسلیم کی علامت یہ ہے کہ اللہ اس کی درخواست کو اس وقت پورا کرے جس وقت وہ چاہتا تھا یا اس وقت پورا نہ کرے، دونوں صورتوں میں بندہ اللہ کے انتخاب پر راضی رہے اور قضا و تقدیرِ الٰہی کے بارے میں اپنے دل میں کوئی اعتراض نہ رکھے۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امامِ عصرؑ کے فرج میں تعجیل کے لیے دعا کرنا، غیبت کے طولانی ہونے کے بارے میں تسلیم کے بالکل منافی نہیں۔

امامؑ کی غیبت ہمارے لیے سب سے بڑی بلا اور مصیبت ہے۔

اللہ نے مقرر فرمایا ہے کہ لوگ اپنے زمانے کے امامؑ کی غیبت کی مصیبت میں مبتلا رہیں، یہاں تک کہ اس بلا کا دردان کے پورے وجود میں اتر جائے، وہ ہر ایک اور ہر چیز سے ناامید ہو جائیں، اور پھر دلِ سوختہ اور اضطرار کی حالت میں اللہ کی بارگاہ میں گریہ وزاری کریں اور اپنے مولا کے فرج میں تعجیل طلب کریں۔

امامؑ کی جدائی کے درد میں یہی گریہ اور ان کے فرج میں تعجیل کی دعا بذاتِ خود اللہ کی عبادت اور بندگی ہے۔

اور اسی کے ساتھ یہ دعا ظہور کے وقت کو قریب لانے میں بھی مؤثر ہو سکتی ہے۔

مصیبت کی مدت کم ہونے اور دعا کے تعلق کے بارے میں امام موسیٰ بن جعفرؑ سے روایت ہے:

ما مِن بَلاءٍ یَنزِلُ عَلی عَبدٍ مُؤمِنٍ فَیُلهِمُهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ الدُّعاءَ اِلّا کانَ کَشفُ ذلِکَ البَلاءِ وَشیکاً. وَ ما مِن بَلاءٍ یَنزِلُ عَلی عَبدٍ مُؤمِنٍ فَیُمسِکُ عَنِ الدُّعاءِ اِلّا کانَ ذلِکَ البَلاءُ طویلاً. فَاِذا نَزَلَ البَلاءُ فَعَلَیکُم بالدُّعاءِ وَ التَضَرُّعِ اِلَی اللهِ عَزَّوَجَلَّ.

"کوئی بلا کسی مؤمن بندے پر نازل نہیں ہوتی اور اللہ عزوجل اسے اس کے بارے میں دعا کی توفیق عطا فرماتا ہے، مگر یہ کہ اس بلا کا دور ہونا قریب ہو جاتا ہے۔

اور کوئی بلا کسی مؤمن بندے پر نازل نہیں ہوتی اور وہ دعا سے رک جاتا ہے، مگر یہ کہ وہ بلا طولانی ہو جاتی ہے۔

پس جب بلا نازل ہو تو تم پر لازم ہے کہ اللہ عزوجل سے دعا کرو اور اس کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرو۔"

(اصول الکافی، ج2، ص471، کتاب الدعاء، باب الہام الدعاء، حدیث 2۔)

اس حدیث میں **دعا کا الہام** اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اور یہ تعبیر ایک نہایت اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے:

مصیبت کے وقت اگر کسی شخص کا دل دعا کی طرف مائل ہو تو اسے سمجھنا چاہیے کہ اللہ کی ایک خاص عنایت اس کے شاملِ حال ہوئی ہے۔

ہر شخص کو مصیبت کے وقت اپنے پروردگار کی طرف دعا کے ساتھ رجوع کرنے کی توفیق نہیں ملتی۔

پس خود حالتِ بلا میں دعا کی توفیق ملنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان فضل ورحمتِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوا ہے، اور یہ بذاتِ خود نہایت قابلِ قدر نعمت ہے۔

مزید یہ کہ اگر انسان کو دعا کی توفیق مل جائے تو وہ امید رکھ سکتا ہے کہ اس مصیبت کا خاتمہ قریب ہے اور اللہ نے دعا کی توفیق دے کر اس کے لیے نجات کا ایک وسیلہ مہیا کر دیا ہے—بشرطیکہ وہ اس نعمتِ الٰہی کی قدر کرے اور اس سے پورا فائدہ اٹھائے۔

تعجیلِ فرج کی دعا کا ظہور کو قریب لانے میں اثر

اس بحث سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ امامِ عصرؑ کے فرج میں تعجیل کی دعا، فرج کے تحقق اور وقتِ ظہور کو قریب لانے میں اثر رکھ سکتی ہے۔

ایسی تقدیم کی ایک مثال بنی اسرائیل کے واقعے میں ملتی ہے۔

امام صادقؑ سے منقول روایت کے مطابق اللہ نے مقرر فرمایا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ سارہ کی نسل، یعنی بنی اسرائیل، چار سو سال بعد حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے ذریعے فرعون کے ظلم سے نجات پائیں گے۔

لیکن اللہ کی بارگاہ میں ان کے گریہ اور تضرع کے نتیجے میں بنی اسرائیل نے اس وعدۂ نجات کو ایک سو ستر سال پہلے حاصل کر لیا۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

فَلَمّا طالَ عَلی بَنی اِسرائیلَ العَذابُ، ضَجُّوا وَ بَکَوا اِلَی اللهِ اَربَعینَ صَباحاً. فَاَوحَی اللهُ اِلی مُوسی وَ هارَونَ یُخَلِّصُهُم مِن فِرعَونَ، فَحَطَّ عَنهُم سَبعینَ وَ مِائَةَ سَنَةٍ.

”جب بنی اسرائیل پر عذاب کی مدت طولانی ہو گئی تو انہوں نے چالیس صبح اللہ کی بارگاہ میں گریہ و فریاد کی۔ تب اللہ نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کی طرف وحی فرمائی کہ انہیں فرعون سے نجات دیں، اور یوں ان سے ایک سو ستر سال کم کر دیئے۔“

اس کے بعد امام صادقؑ نے فرمایا:

هکَذا اَنتُم لَو فَعَلتُم لَفَرَّجَ اللهُ عَنّا. فَاَمّا اِذ لَم تَکُونُوا فَاِنَّ الاَمرَ یَنتَهی اِلی مُنتَهاهُ.

”تمہارے لیے بھی یہی صورت ہے۔ اگر تم ایسا کرو تو اللہ **ہمارے فرج** کو پہنچادے گا؛ لیکن اگر تم ایسا نہ کرو تو یہ امر اپنی مقررہ انتہا تک پہنچے گا۔“

)بحار الانوار، ج52، ص131، حدیث34، بحوالۂ تفسیر عیاشی۔(

یہ زمانۂ غیبت کے مؤمنین کے لیے نہایت قابلِ توجہ تنبیہ ہے۔

اگر وہ حقیقتاً اللہ سے اپنے ائمہؑ کے فرج کے طالب ہیں تو انہیں اس راستے کو پہچاننا اور سنجیدگی سے اختیار کرنا ہوگا جو خود ائمہؑ نے ان کے سامنے رکھا ہے، اور پوری کوشش کے ساتھ اس پر عمل کرنا ہوگا۔

اس حدیثِ شریف میں ایک نہایت لطیف نکتہ اور تعجیلِ فرج کی دعا کرنے والوں کے لیے ایک اہم درس، امامؑ کے اس لفظ میں پوشیدہ ہے:

عَنّا—”ہم سے/ہمارے لیے“۔

یعنی شیعوں کی دعا، گریہ اور تضرع **خود اہلِ بیتؑ کے فرج** کو قریب لا سکتے ہیں۔

لہٰذا جو شخص تعجیلِ فرج کے لیے دعا کرتا ہے، اسے ہر چیز سے پہلے اور ہر چیز سے بڑھ کر اپنے مولا، اپنے پیشوا اور اپنے محبوب کے فرج کی دعا کرنی چاہیے۔

باب سوم: اہلِ بیتؑ سے محبت

محبت—کمالِ ایمان کی علامت

اہلِ بیتؑ سے **محبت**، معرفتِ امامؑ رکھنے والوں کی ایک اور علامت ہے، بالخصوص زمانۂ غیبت میں۔

اس محبت کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

لِكُلِّ شَيءٍ اَساسٌ. وَ اَساسُ الاِسلامِ حُبُّنا اَهلَ البَيتِ.

”ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے، اور اسلام کی بنیاد ہم اہلِ بیتؑ کی محبت ہے۔“

)اصول الکافی، ج2، ص46، کتاب الایمان والکفر، باب نسبۃ الاسلام، حدیث 2۔(

اسی بناپر ہماری روایات میں اہلِ بیتؑ کی محبت کو عبادت کی بلند ترین اور افضل ترین صورت قرار دیا گیا ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ فَوقَ کُلِّ عِبادَۃٍ عِبادَۃً. وَ حُبُّنا اَھلَ البَیتِ اَفضَلُ عِبادَۃٍ.

''ہر عبادت سے بالاتر ایک اور عبادت ہے، اور ہم اہلِ بیتؑ کی محبت افضل ترین عبادت ہے۔''

)بحار الانوار، ج27، ص91، حدیث 48، بحوالۂ المحاسن، برقی۔(

رسولِ اکرمؐ سے منقول ایک حدیث میں، جس میں آپؐ نے تمام ائمہؑ کا تعارف فرمایا، امامِ عصرؑ کی ولایت قبول کرنے کے بارے میں خصوصاً فرمایا گیا:

مَن اَحَبَّ اَن یَلقَی اللہَ وَ قَد کَمُلَ ایمانُہُ وَ حَسُنَ اِسلامُہُ، فَلیَتَوَلَّ الحُجَّۃَ صاحِبَ الزَّمانِ المُنتَظَرَ.

''جو شخص چاہتا ہے کہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اس کا ایمان کامل اور اس کا اسلام نیک و درست ہو، اسے حجتِ خدا، صاحب الزمانِ منتظرؑ کی ولایت اختیار کرنی چاہیے۔''

حدیث کے آخر میں رسولِ خداؐ نے فرمایا:

فَھؤُلاءِ مَصابیحُ الدَّجی وَ اَئِمَّۃُ الھُدی وَ اَعلامُ التُّقی. مَن اَحَبَّھُم وَ تَوَلّاھُم، کُنتُ ضامِناً لَہُ عَلَی اللہِ تَعالی بِالجَنَّۃِ.

''یہ تاریکیوں کے چراغ، ہدایت کے امام اور تقویٰ کی نشانیاں ہیں۔ جو ان سے محبت کرے اور ان کی ولایت قبول کرے، میں اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔''

)بحار الانوار، ج36، ص296، حدیث 125، بحوالۂ فضائل، شاذان بن جبرئیل۔(

ایمان کا آغاز رسولِ خداؐ کی ولایت اور محبت سے ہوتا ہے اور حضرت حجتؑ کی ولایت اور محبت کے ذریعے اپنے کمال تک پہنچتا ہے۔

لہٰذا امامِ غائبؑ کی محبت کے بغیر ایمان کا کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایمان کا درجہ جتنا بلند ہو گا، امامؑ سے محبت اتنی ہی زیادہ ہو گی؛ اور اس کے برعکس، امامؑ سے محبت جتنی بڑھتی جائے گی، انسان کا ایمان بھی اتنا ہی کامل ہوتا جائے گا۔

پس امامِ عصرؑ سے محبت کی شدت، انسان کے ایمان کے کمال کی ایک اہم علامت ہے۔

تسلیم کے ذریعے محبت کا حصول

اہلِ بیتؑ کی محبت کوئی ایسی نعمت نہیں جسے اللہ ہر شخص کو بلا سبب عطا کر دے۔

جس طرح اللہ، رسولؐ اور امامؑ کی اصل معرفت پروردگار کی عطا اور فضل ہے، اسی طرح امامؑ کی محبت اس سے بھی بڑی نعمتِ الٰہی ہے جو اہلِ معرفت کو عطا ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں فضل و عنایتِ الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا بہترین وسیلہ **اہلِ بیتؑ کے سامنے کامل تسلیم** ہے۔

امام باقرؑ نے ابو خالد کابلی سے فرمایا:

وَ اللهِ – یا اَبا خالِدٍ – لا یُحِبُّنا عَبدٌ وَ یَتَولّانا حَتّی یُطَهِّرَ اللهُ قَلبَهُ. وَ لا یُطَهِّرُ اللهُ قَلبَ عَبدٍ حَتّی یُسَلِّمَ لَنا وَ یَکونَ سِلماً لَنا. فَاِذا کانَ سِلماً لَنا، سَلَّمَهُ اللهُ مِن شَدیدِ الحِسابِ وَ آمَنَهُ مِن فَزَعِ یَومِ القِیامَةِ الاَکبَرِ.

"اللہ کی قسم، اے ابو خالد! کوئی بندہ ہم سے محبت اور ہماری ولایت اس وقت تک اختیار نہیں کر سکتا جب تک اللہ اس کے قلب کو پاک نہ کر دے؛ اور اللہ کسی بندے کے قلب کو اس وقت تک پاک نہیں کرتا جب تک وہ ہمارے سامنے تسلیم نہ ہو جائے اور ہمارے ساتھ سراپا **سلم** ـــــ یعنی مکمل امن، ہم آہنگی اور تسلیم ـــــ کی حالت میں نہ آ جائے۔

پس جب وہ ہمارے ساتھ سلم کی حالت میں آ جائے تو اللہ اسے سخت حساب سے محفوظ رکھتا ہے اور قیامت کے سب سے بڑے خوف سے اسے امن عطا فرماتا ہے۔"

(اصول الکافی، ج 1، ص 194، کتاب الحجۃ، باب اَنَّ الائمۃؑ نور...، حدیث 1۔)

اگر قلب پاک نہ ہو تو اہلِ بیتؑ کی محبت اور ولایت حقیقتاً اس میں قرار نہیں پا سکتی۔

اور قلب کی پاکیزگی اہلِ بیتؑ کے ساتھ سلم ـــــ یعنی کامل موافقت، امن اور تسلیم ـــــ کی حالت اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

لہٰذا جو شخص امامؑ کی محبت میں اضافہ چاہتا ہے، اسے اپنے اندر اس حالتِ سلم کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا چاہیے۔

تسلیم کا درجہ جتنا بلند ہوگا، قلب اتنا ہی پاک ہوگا؛ اور قلب جتنا پاک ہوگا، امامؑ کی محبت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

شدتِ محبت کے نتیجے میں امامؑ پر گریہ

محبت قلب کا معاملہ ہے، اور اس کی شدت محبوب کی معرفت اور ولایت کی گہرائی کے مطابق ہوتی ہے۔

معرفت جتنی زیادہ ہوگی، محبت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

شدید محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ محبوب کا محض ذکر، اس کی جدائی کا خیال، یا اس پر گزرنے والی سختیوں اور مصائب کی یاد ہی عاشق کے دل کو بے قرار کر دے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔

اللہ نے اپنے فضل و کرم سے انہی آنسوؤں کو عاشق کے قلب کی پاکیزگی اور گناہوں کے داغ مٹانے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

امام صادقؑ نے فضیل بن یسار سے فرمایا:

يا فُضَيلُ، مِن ذَكَرَنا، اَو ذُكِرنا عِندَهُ، فَخَرَجَ مِن عَينِهِ مِثلُ جَناحِ الذُّبابِ، غَفَرَ اللهُ لَهُ ذُنُوبَهُ وَ لَو كانَت اَكثَرَ مِن زَبَدِ البَحرِ.

"اے فضیل! جو شخص ہمیں یاد کرے، یا اس کے سامنے ہمارا ذکر کیا جائے، اور اس کی آنکھ سے مکھی کے پَر کے برابر بھی آنسو نکل آئے تو اللہ اس کے گناہوں کو بخش دے گا، خواہ وہ سمندر کے جھاگ سے بھی زیادہ ہوں۔"

(بحار الانوار، ج44، ص282، حدیث 14، بحوالۂ قرب الاسناد۔)

یہ عظیم اجر امامؑ کے مقام کی عظمت اور ان سے محبت کی قدر و منزلت کے سبب ہے؛ یہ رونے والے کی ذاتی قابلیت اور استحقاق پر موقوف نہیں۔

لہٰذا گریہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس نے اپنی طرف سے ایسا اجر کمایا یا اس کا مستحق بنا ہو۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے جو اہلِ بیتؑ سے محبت کرنے والے کے شاملِ حال ہوتا ہے۔

زمانۂ غیبت میں امامِ عصرؑ کی جدائی کا سوز، ان کی حضوری سے محرومی کا درد، اور ان کی ذاتِ مقدس پر گزرنے والی سختیوں اور غموں کی یاد اہلِ معرفت کی آنکھوں میں آنسو لانے والے اہم اسباب میں سے ہے۔

اس سے پہلے امام صادقؑ کا یہ ارشاد نقل ہو چکا ہے:

اَما وَ اللهِ لَيَغيبَنَّ اِمامُكُم سَنيناً مِن دَهرِكُم ... . وَ لَتَدمَعَنَّ عَلَيهِ عُيُونُ المُؤمِنينَ.

"آگاہ رہو! اللہ کی قسم، تمہارا امامؑ تمہاری زندگی کے کئی برسوں تک ضرور غیبت میں رہے گا... اور مؤمنین کی آنکھیں یقیناً ان کے لیے اشک بار ہوں گی۔"

(کمال الدین، باب 33، حدیث 35۔)

پس کتنے قیمتی ہیں وہ دل جو امامؑ کے لیے جلتے ہیں، وہ آنکھیں جو ان کے لیے اشک بار ہوتی ہیں، اور وہ آہیں اور گریے جو ان کی جدائی میں بلند ہوتے ہیں — خصوصاً جب خود امام صادقؑ نے ایسے لوگوں کے لیے دعا فرمائی ہے۔

معاویہ بن وہب کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ کو سجدے کی حالت میں سید الشہداء امام حسینؑ کی قبر کی زیارت کرنے والوں کے لیے دعا کرتے ہوئے سنا۔ آپؑ فرما رہے تھے:

...اِرحَم تِلكَ الاَعيُنَ الَّتى جَرَت دُمُوعُها رَحمَةً لَنا. وَ ارحَم تِلكَ القُلُوبَ الَّتى جَزَعَت وَ احتَرَقَت لَنا. وَ ارحَمِ الصَّرخَةَ الَّتى كانَت لَنا...

..."اے اللہ! ان آنکھوں پر رحم فرما جن کے آنسو ہماری محبت و ہمدردی میں جاری ہوئے۔ ان دلوں پر رحم فرما جو ہمارے لیے بے قرار ہوئے اور جل اٹھے۔ اور ان آہ و فریاد پر رحم فرما جو ہمارے لیے بلند ہوئی"...

(کامل الزیارات، ص 117۔)

یہی بے قراری اور فریاد زمانۂ غیبت میں امامِ عصرؑ کی جدائی کے درد سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

اسی لیے یہ بات بے سبب نہیں کہ **دعائے ندبہ** مسلمانوں کی چار عظیم خوشی کے دنوں کے لیے وارد ہوئی ہے : **عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، عیدالغدیر اور روزِ جمعہ۔**

یہ چاروں دن ان بہترین مواقع میں سے ہیں جنہیں اللہ نے مؤمنین پر اپنی رحمت کے نزول کے لیے مقرر فرمایا ہے، اور ان سب کا وجودِ مقدس حضرت امام مہدیؑ سے ایک خاص تعلق ہے۔

جمعہ، عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دن نماز اور خطبۂ عید کی امامت امامؑ کا حق ہے، جبکہ عیدِ غدیر کے دن مسلمان اللہ کی طرف سے مقرر کردہ امامؑ کے ساتھ اپنی بیعت و وفاداری کی تجدید کرتے ہیں۔

پس جب ان ایام کے حقیقی صاحب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوں تو مؤمنین کو اپنے محبوب کی جدائی میں گریہ و فریاد کرتے ہوئے پکارنا چاہیے:

اَینَ الطّالِبُ بِدَمِ المَقتُولِ بِکَربَلاءَ؟

''کہاں ہیں وہ جو کربلا میں شہید کیے جانے والے کے خون کا مطالبہ کریں گے؟''

اَینَ المُضطَرُّ الَّذی یُجابُ اِذا دَعا؟

''کہاں ہیں وہ مضطر کہ جب دعا کریں تو ان کی دعا قبول کی جائے؟''

اسی دعا میں امامؑ سے محبت کرنے والے اپنے محبوب کے حضور دل کا درد یوں بیان کرتے ہیں:

یَابنَ طه وَ المُحکَماتِ، یَابنَ یس وَ الذّارِیاتِ، یَابنَ الطُّورِ وَ العادِیاتِ ... .لَیتَ شِعری اَینَ استَقَرَّت بِکَ النَّوی! ... .عَزیزٌ عَلَیَّ اَن اَرَی الخَلقَ وَ لا تَری وَ لا اَسمَعَ لَکَ حَسیساً وَ لا نَجوی! ... .عَزیزٌ عَلَیَّ اَن اَبکِیَکَ وَ یُخذُلَکَ الوَری. ... !

''اے طٰہٰ اور آیاتِ محکمات کے فرزند! اے یٰس اور ذاریات کے فرزند! اے طور اور عادیات کے فرزند!... کاش میں جانتا کہ آپؑ کی منزل کہاں ہے اور کس مقام پر آپؑ نے قیام فرمایا ہے...!

میرے لیے یہ کتنا دشوار ہے کہ میں تمام مخلوق کو دیکھوں لیکن آپؑ دکھائی نہ دیں، اور نہ آپؑ کی کوئی آواز سن سکوں، نہ کوئی سرگوشی...!

میرے لیے یہ کتنا دشوار ہے کہ میں آپؑ پر گریہ کروں اور لوگ آپؑ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں"...!

پھر وہ اپنے غم اور گریے میں کسی شریک کو تلاش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

هَل مِن مُعينٍ فَأُطيلَ مَعَهُ العَويلَ وَ البُكاءَ؟! هَل مِن جَزُوعٍ فَأُساعِدَ جَزَعَهُ اِذا خَلا؟! هَل قَذِيَت عَينٌ فَساعَدَتها عَينى عَلَى القَذى؟!

"کیا کوئی مددگار ہے کہ میں اس کے ساتھ مل کر اپنی آہ وزاری اور گریے کو طول دوں؟

کیا کوئی ایسا غم زدہ ہے کہ جب وہ تنہائی میں بے قرار ہو تو میں بھی اس کے غم و بے قراری میں شریک ہو جاؤں؟

کیا کوئی ایسی آنکھ ہے جو غم سے زخمی ہو، تاکہ میری آنکھ بھی اس کے درد میں اس کا ساتھ دے؟"

(اقبال الاعمال، ص 297–298۔)

جب عید اور خوشی کے دنوں میں یہ کلمات امامؑ سے محبت کرنے والوں کے سوز و گداز سے بھرے دلوں سے نکلتے ہیں تو یہ ان کے امامِ غائبؑ سے گہری اور شدید محبت کی ایک روشن علامت ہوتے ہیں۔

دوستانِ امامؑ سے دوستی اور دشمنانِ امامؑ سے براءت

امامؑ سے محبت کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان امامؑ کے دوستوں سے دوستی رکھے اور ان کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھے۔

خصوصاً زمانۂ غیبت میں اس امر پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ رسولِ خداؐ نے فرمایا:

طُوبى لِمَن اَدرَکَ قائِمَ اَهلِ بَيتى وَ هُوَ يأتَمُّ بِهِ فى غَيبَتِهِ قَبلَ قِيامِهِ وَ يَتَوَلّى اَولِياءَهُ وَ يُعادى اَعداءَهُ. ذلِکَ مِن رُفَقائى وَ ذَوى مَوَدَّتى وَ اَكرَمِ اُمَّتى عَلَىَّ يَومَ القِيامَةِ.

"خوش نصیب ہے وہ شخص جو میرے اہلِ بیتؑ کے قائمؑ کے زمانے کو پائے اور ان کے قیام سے پہلے، زمانۂ غیبت میں، ان کی پیروی کرے، ان کے دوستوں سے دوستی رکھے اور ان کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھے۔ ایسا شخص میرے رفقا اور میرے محبوب لوگوں میں سے ہوگا، اور قیامت کے دن میری امت کے معزز ترین افراد میں شمار ہوگا۔"

کمال الدین، باب 25، حدیث 2۔

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ امامؑ کے دوستوں سے دوستی اور ان کے دشمنوں سے دشمنی، امامؑ کی ولایت اور امامت کو قبول کرنے سے کوئی الگ حقیقت نہیں، بلکہ یہ سب ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔

اسی سلسلے میں امام موسیٰ کاظمؑ سے ایک اور عظیم بشارت منقول ہے:

طُوبی لِشیعَتِنَا المُتَمَسِّکینَ بِحَبلِنا فی غَیبَةِ قائِمِنَا الثّابِتینَ عَلی مُوالاتِنا وَ البَراءَةِ مِن اَعدائِنا. اُولئِکَ مِنّا. وَ نَحنُ مِنهُم. قَد رَضُوا بِنا اَئِمَّةً وَ رَضینا بِهِم شیعَةً. فَطُوبی لَهُم. ثُمَّ طُوبی لَهُم. هُم وَاللهِ مَعَنا فی دَرَجاتِنا یَومَ القِیامَةِ.

''طوبیٰ ہے ہمارے ان شیعوں کے لیے جو ہمارے قائمؑ کی غیبت میں ہماری رسی [ولایت] کو مضبوطی سے تھامے رہیں، ہماری دوستی پر ثابت قدم رہیں اور ہمارے دشمنوں سے براءت اختیار کریں۔ وہ ہم میں سے ہیں اور ہم ان میں سے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اپنے اماموں کی حیثیت سے پسند کیا اور ہم نے انہیں اپنے شیعوں کی حیثیت سے پسند کیا۔ پس طوبیٰ ہے ان کے لیے، پھر طوبیٰ ہے ان کے لیے! خدا کی قسم! قیامت کے دن وہ ہمارے ساتھ ہمارے درجات میں ہوں گے۔''

کمال الدین، باب 34، حدیث 5۔

طوبیٰ کے معنی کے بارے میں ابو بصیر امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے پہلے فرمایا:

طُوبی لِمَن تَمَسَّکَ بِاَمرِنا فی غَیبَةِ قائِمِنا فَلَم یَزِغ قَلبُهُ بَعدَ الهِدایَةِ.

''طوبیٰ ہے اس شخص کے لیے جو ہمارے قائمؑ کی غیبت میں ہمارے امر سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہے اور ہدایت پانے کے بعد اس کا دل منحرف نہ ہو۔''

ابو بصیر نے عرض کیا: ''میں آپ پر قربان جاؤں! طوبیٰ کیا ہے؟'' امامؑ نے فرمایا:

شَجَرَةٌ فِی الجَنَّةِ اَصلُها فی دارِ عَلِیِّ بنِ اَبی طالِبٍ علیه السّلام وَ لَیسَ مِن مُؤمِنٍ اِلّا وَ فی دارِهِ غُصنٌ مِن اَغصانِها. وَ ذلِکَ قَولُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: «طوبی لَهُم وَ حُسنُ مَآبٍ».

''[طوبیٰ] جنت میں ایک درخت ہے جس کی جڑ علی بن ابی طالبؑ کے گھر میں ہے، اور کوئی مؤمن ایسا نہیں جس کے گھر میں اس درخت کی شاخوں میں سے ایک شاخ نہ ہو۔ یہی اللہ عزوجل کے اس فرمان کا مفہوم ہے' : **طوبیٰ ہے ان کے لیے اور**

بہترین انجام۔‘‘‘

)قرآن 13:29(

کمال الدین، باب 33، حدیث 55۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ بیتؑ کے دوستوں سے دوستی اور ان کے دشمنوں سے براءت، معرفتِ امامؑ کے اہم ترین تقاضوں میں سے ہے۔

اس دوستی کا پہلا مقام **دل** ہے۔ اگر کوئی شخص اہلِ بیتؑ سے محبت کرنے والوں میں سے ہے تو مؤمن کو چاہیے کہ دل سے اس سے محبت رکھے اور اس کے لیے دل میں بغض نہ رکھے۔ ممکن ہے وہ شخص بعض گناہوں یا ناپسندیدہ اعمال کا مرتکب ہو۔ ایسی صورت میں اس کے غلط عمل کو برا سمجھنا چاہیے، اس سے بیزاری ہونی چاہیے اور جہاں مناسب ہو اسے برائی سے روکنا بھی چاہیے؛ لیکن جب تک وہ اہلِ بیتؑ کا محب ہے، خود اس شخص سے محبت باقی رہنی چاہیے۔[1] ذاتی مفادات یا باہمی اختلافات ہمیں اس کا دشمن نہ بنا دیں۔ اہلِ بیتؑ سے اس کی محبت کو ہمیشہ ہمارے ذاتی نفع و نقصان پر مقدم رہنا چاہیے۔

بلکہ ایسے شخص کو اس فرد پر ترجیح دی جانی چاہیے جو بظاہر اچھے اخلاق کا حامل ہو، لیکن اہلِ بیتؑ کے محبین میں شامل نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں، اس دوستی کا بنیادی معیار **محبتِ اہلِ بیتؑ** ہونا چاہیے۔ اہلِ معرفت کے لیے یہ بھی ایک الٰہی امتحان ہے جس کے ذریعے اہلِ بیتؑ سے ان کی محبت کے اخلاص کو آزمایا جاتا ہے۔

[1] امام رضاؑ نے فرمایا:

كُن مُحِبّاً لِآلِ مُحَمَّدٍ وَ اِن كُنتَ فاسِقاً وَ مُحِبّاً لِمُحِبّيهِم وَ اِن كانُوا فاسِقينَ.

’’آلِ محمدؐ سے محبت رکھو، خواہ تم گناہ گار ہی کیوں نہ ہو، اور ان سے محبت کرنے والوں سے بھی محبت رکھو، خواہ وہ بھی گناہ گار ہوں۔‘‘

بحار الانوار، ج 69، ص 253، ح 33، بحوالہ دعواتِ راوندی۔

پہلے مرحلے یعنی قلبی محبت کے بعد عمل کا مرحلہ آتا ہے، اور وہ ہے اہلِ ولایت کے حقوق کی رعایت اور ان کی ادائیگی۔ انسان ان حقوق کو ادا کرنے میں جتنا زیادہ سنجیدہ اور حساس ہوگا، اہلِ بیتؑ سے اس کی محبت اتنی ہی گہری اور راسخ ہوگی۔ اور جتنا وہ ان حقوق سے غفلت برتے گا، اتنی ہی اس کی محبت کمزور اور غیر مستحکم ہوگی۔

روایات میں اہلِ محبت وولایت کو **مؤمن** کہا گیا ہے۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

ما عُبِدَاللهُ بِشَیءٍ اَفضَلَ مِن اَداءِ حَقِّ المُؤمِنِ.

''اللہ کی عبادت کسی ایسی چیز کے ذریعے نہیں کی گئی جو مؤمن کا حق ادا کرنے سے افضل ہو۔''

اصول کافی، ج2، ص170، کتاب الایمان والکفر، باب حق المؤمن علی اخیہ، ح4۔

ایک اور موقع پر معلّیٰ بن خنیس نے امام صادقؑ سے مؤمن کے حقوق کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا:

سَبعُونَ حَقّاً لا اُخبِرُکَ اِلّا بِسَبعَةٍ. فَاِنّی عَلَیکَ مُشفِقٌ اَخشی اِلّا تَحتَمِلَ.

''اس کے ستر حقوق ہیں۔ میں تمہیں ان میں سے صرف سات بتاتا ہوں، کیونکہ مجھے تمہاری فکر ہے اور ڈرتا ہوں کہ کہیں تم ان کی ذمہ داری برداشت نہ کر سکو۔''

پھر آپؑ نے ان سات حقوق کو یوں بیان فرمایا:

لا تَشبَعُ وَ یَجُوعُ. وَ لا تَکتَسی وَ یَعری. وَ تَکُونُ دَلیلَهُ وَ قَمیصَهُ الَّذی یَلبَسُهُ وَ لِسانَهُ الَّذی یَتَکَلَّمُ بِهِ. وَ تُحِبُّ لَهُ ما تُحِبَّ لِنَفسِکَ. وَ اِن کانَت لَکَ جارِیَةٌ بَعَثتَها لِتُمَهِّدَ فِراشَهُ. وَ تَسعی فی حَوائِجِهِ بِاللَّیلِ وَ النَّهارِ. فَاِذا فَعَلتَ ذلِکَ، وَصَلتَ وِلایَتَکَ بِوِلایَتِنا وَ وِلایَتِنا بِوِلایَةِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ.

''تم خود سیر نہ ہو جبکہ وہ بھوکا ہو، اور تم خود لباس پہنے ہوئے نہ ہو جبکہ وہ بے لباس ہو۔ تم اس کے رہنما بنو، اس کی وہ قمیص بنو جسے وہ پہنتا ہے، اور اس کی وہ زبان بنو جس سے وہ بولتا ہے۔ جو کچھ اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی اس کے لیے بھی پسند کرو۔ اگر تمہارے پاس کوئی خادمہ ہو تو اسے بھیجو کہ اس کے لیے بستر تیار کرے۔ رات دن اس کی حاجتیں پوری کرنے کی

کوشش کرتے رہو۔ جب تم ایسا کرو گے تو اپنی ولایت کو ہماری ولایت سے جوڑ دو گے، اور ہماری ولایت اللہ عزوجل کی ولایت سے متصل ہے۔"

اصول کافی، ج2، ص174، کتاب الایمان والکفر، باب حق المؤمن علی اخیہ، ح14۔

اس روایت کے الفاظ نہایت واضح اور معنی خیز ہیں۔ مؤمن کو اپنے ایمانی بھائی کے لیے **لباس اور زبان** کی مانند ہونا چاہیے۔ جس طرح لباس انسان کے جسم کو بے پردگی اور نقصان سے محفوظ رکھتا اور اسے ایک باوقار صورت دیتا ہے، اسی طرح مؤمن کو اپنے بھائی کو خطرات، ذلت اور رسوائی سے محفوظ رکھنا چاہیے۔

اسی طرح زبان وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنی حاجت بیان کرتا اور دوسروں سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ مؤمن کو بھی ایسا ہونا چاہیے کہ دوسرے اہلِ ایمان اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس سے اور اس کے پاس موجود وسائل سے فائدہ اٹھا سکیں۔

خادمہ اپنے مالک کی خدمت کرتی ہے۔ اسی طرح اگر مؤمن کے پاس کوئی ایسا وسیلہ ہو جس کے ذریعے وہ اپنے ایمانی بھائی کی خدمت کر سکتا ہو تو اسے روکنا نہیں چاہیے۔ یہ وسیلہ مال اور مادی امکانات بھی ہو سکتے ہیں اور اس کی عزت، سماجی حیثیت یا پیشہ ورانہ مقام بھی۔ یہ تمام وسائل اہلِ ایمان کی خدمت میں استعمال ہونے چاہییں۔ اگر کسی مؤمن کی حاجت پوری کرنے کے لیے رات کا کچھ حصہ، جو عموماً آرام کا وقت ہے، صرف کرنا پڑے تو اسے اپنی نیند کو اپنے بھائی کی مدد پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔

یہ تو ان حقوق میں سے صرف چند ہیں جو اہلِ ایمان ایک دوسرے پر رکھتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص حقیقتاً **دوستانِ اہلِ بیتؑ کا دوست** بننا چاہتا ہے، اسے ان حقوق کی ادائیگی کو بہت سنجیدگی سے لینا چاہیے۔

دوستانِ امامؑ کی مشکلات دور کرنا

مؤمن کے حقوق کی ادائیگی اس وقت اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے جب وہ خود اپنی کسی حاجت یا مشکل کے لیے اپنے ایمانی بھائی سے رجوع کرے۔ عام طور پر جب تک کوئی ہم سے مدد مانگنے نہیں آیا، ہماری ذمہ داری اس قدر براہِ راست نہیں ہوتی؛

لیکن جب کوئی مؤمن اپنی حاجت لے کر ہمارے پاس آتا ہے تو یہ خود ایک الٰہی امتحان ہے۔ جو شخص خود کو مؤمن اور محبِ اہلِ بیتؑ سمجھتا ہے، اسے اپنے ایمانی بھائی کے اس رجوع کو اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی ایک رحمت سمجھنا چاہیے۔

امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا:

مَن اَتاهُ اَخُوهُ المُؤمِنُ فی حاجَةٍ، فَاِنَّما هِیَ رَحمَةٌ مِنَ اللهِ تَبارَکَ وَ تَعالی ساقَها اِلَیهِ. فَاِن قَبِلَ ذلِکَ فَقَد وَصَلَهُ بِوِلایَتِنا وَ هُوَ مَوصُولٌ بِوِلایَةِ اللهِ. وَ اِن رَدَّهُ عَن حاجَتِهِ وَ هُوَ یَقدِرُ عَلی قَضائِها، سَلَّطَ اللهُ عَلَیهِ شُجاعاً مِن نارٍ یَنهَشُهُ فی قَبرِهِ اِلی یَومِ القِیامَةِ، مَغفُوراً لَهُ اَو مُعَذَّباً. فَاِن عَذَرَهُ الطّالِبُ، کانَ اَسوَأَ حالاً.

''جس شخص کے پاس اس کا مؤمن بھائی اپنی کسی حاجت کے لیے آئے تو یہ درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے جسے اللہ نے اس کی طرف روانہ کیا ہے۔ اگر وہ اسے قبول کرے [اور اس کی حاجت پوری کرنے کی کوشش کرے] تو اس نے اسے ہماری ولایت سے جوڑ دیا، اور ہماری ولایت اللہ کی ولایت سے متصل ہے۔ لیکن اگر وہ اس کی حاجت پوری کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود اسے واپس لوٹا دے تو اللہ اس پر آگ کا ایک اژدہا مسلط کرے گا جو قیامت تک قبر میں اسے کاٹتا رہے گا، خواہ آخر کار اسے بخش دیا جائے یا عذاب دیا جائے۔ اور اگر حاجت مند اسے معذور بھی سمجھے تو اس کی حالت اور زیادہ خراب ہو گی۔''

اصول کافی، ج2، ص196، کتاب الایمان والکفر، باب قضاء حاجۃ المؤمن، ح13۔

جو شخص اپنی حاجت پوری کرانے کے لیے کسی دوسرے کے پاس آتا ہے، گویا ایک اعتبار سے اپنی عزت اور آبرو اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔ چونکہ مؤمن اللہ کے نزدیک بڑی عزت رکھتا ہے، اس لیے اللہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اسے ذلیل یا بے وقعت سمجھا جائے۔ اسی بنا پر جو شخص قدرت رکھنے کے باوجود اس کی حاجت پوری کرنے سے انکار کر دے، اسے عذابِ قبر کی وعید دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ بالآخر اہلِ نجات میں سے ہو، تب بھی اسے قیامت تک اس عذاب سے گزرنا پڑ سکتا ہے۔ اس روایت کا ایک نہایت اہم نکتہ یہ ہے کہ ائمہؑ نے مؤمن کی حاجت پوری کرنے کو اپنی ولایت سے مربوط قرار دیا ہے۔ لہٰذا جو ان سے محبت کرتا ہے، اسے اسی محبت کی بنا پر مؤمن کی مدد کو ولایتِ ائمہؑ کا ایک عملی تقاضا سمجھنا چاہیے اور اس خدمت میں یہ نیت رکھنی چاہیے کہ وہ اپنے فریضے کو ادا اور ولایتِ معصومینؑ کے حق کی تعظیم کر رہا ہے۔

روایت کے آخری جملے—"اگر حاجت مند اسے معذور سمجھے تو اس کی حالت اور بھی خراب ہو گی"—کے بارے میں مرحوم علامہ مجلسیؒ نے یہ احتمال بیان کیا ہے[1] کہ حاجت مند کا اسے معذور سمجھنا اس مؤمن کی شرافت اور حسنِ اخلاق کی علامت ہے۔ ایسا مؤمن ایمان کے بلند تر مرتبے کا حامل ہے، اس لیے اپنے ایمانی بھائی پر اس کا حق بھی زیادہ ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو واپس لوٹانا اس فرد کو واپس لوٹانے سے زیادہ قبیح ہے جو اس درجۂ حسنِ اخلاق و بزرگواری کا حامل نہ ہو۔ اسی وجہ سے اس کے رد کرنے کا عذاب بھی زیادہ سخت ہو گا۔

[1] بحار الانوار، ج74، ص330۔

بہر حال، کسی مؤمن کو خالی ہاتھ واپس کر دینا کسی طرح بھی اللہ کو پسند نہیں۔ انسان کو اپنے ایمانی بھائی کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کی کوشش بالآخر کامیاب ہو یا نہ ہو۔ اگر وہ مسئلہ حل نہ بھی کر سکے تو خلوص کے ساتھ کوشش کرنے پر بھی اس کے لیے غیر معمولی اجر ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

مَن مَشی فی حاجَةِ اَخیهِ المُؤمِنِ یَطلُبُ بِذلِکَ ما عِندَاللهِ حَتّی تَقضی لَهُ، کَتَبَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ لَهُ بِذلِکَ مِثلَ اَجرِ حِجَّةٍ وَ عُمرَةٍ مَبرُورَتَینِ وَ صَومِ شَهرَینِ مِن اَشهُرِ الحُرُمِ وَ اعتِکافِهِما فِی المَسجِدِ الحَرامِ. وَ مَن مَشی فیها بِنِیَّةٍ وَ لَم تُقضَ، کَتَبَ اللهُ لَهُ بِذلِکَ مِثلَ حَجَّةٍ مَبرُورَةٍ. فَارغَبُوا فِی الخَیرِ.

"جو شخص اپنے مؤمن بھائی کی حاجت پوری کرنے کی کوشش کرے اور اس کے ذریعے اللہ کے پاس موجود اجر کا طالب ہو، یہاں تک کہ اس کی حاجت پوری ہو جائے، اللہ عزوجل اس کے لیے دو مقبول حج و عمرے، دو ماہِ حرام کے روزوں اور ان دونوں مہینوں میں مسجد الحرام میں اعتکاف کے برابر اجر لکھتا ہے۔ اور جو شخص نیتِ خیر سے اس کی حاجت پوری کرنے کی کوشش کرے لیکن وہ حاجت پوری نہ ہو سکے، اللہ اس کے لیے ایک مقبول حج کے برابر ثواب لکھتا ہے۔ پس نیکی کے کاموں میں رغبت کرو۔"

اصول کافی، ج2، ص194، کتاب الایمان والکفر، باب قضاء حاجۃ المؤمن، ح9۔

پس اللہ مؤمنین کی حاجات پوری کرنے کے لیے کی جانے والی **کوشش** کو بھی محبوب رکھتا ہے اور اس پر اجر عطا فرماتا ہے۔ کوشش کامیاب ہو جائے تو اجر زیادہ ہے، لیکن اگر کامیاب نہ ہو تب بھی مخلصانہ کوشش کرنے والا اپنے اجر سے محروم نہیں رہتا۔

ایک اور صورت یہ ہے کہ انسان جانتا ہو کہ اس کے پاس اپنے ایمانی بھائی کی حاجت پوری کرنے کے وسائل موجود نہیں، لیکن جب وہ اس کے پاس آئے تو اس کا دل حقیقتاً اُس کی پریشانی سے متاثر ہو اور وہ سچے دل سے چاہے کہ کاش میں اس کی مدد کر سکتا۔ اگر وسائل ہوتے تو وہ ضرور انہیں اس مقصد کے لیے استعمال کرتا۔ ایسا شخص عملاً کچھ نہ کر سکنے کے باوجود محض اپنے دل کی اس مخلصانہ کیفیت کے سبب غیر معمولی اجر پاتا ہے۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

اِنَّ المُؤمِنَ لَتَرِدُ عَلَیهِ الحاجَةُ لِاَخیهِ فَلا تَکُونُ عِندَهُ فَیَهتَمُّ بِها قَلبُهُ، فَیُدخِلُهُ اللهُ تَبارَکَ وَ تَعالی بِهَمِّهِ الجَنَّةَ.

"کسی مؤمن کے پاس اس کے بھائی کی کوئی حاجت پیش کی جاتی ہے، لیکن اس کے پاس اسے پورا کرنے کا وسیلہ نہیں ہوتا؛ پھر بھی اس کا دل اس حاجت کی فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اسی قلبی فکر کے سبب اسے جنت میں داخل فرماتا ہے۔"

اصول کافی، ج2، ص196، کتاب الایمان والکفر، باب قضاء حاجۃ المؤمن، ح14۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس بات سے بھی زیادہ اہم کہ مؤمنین عملاً ایک دوسرے کے لیے کیا کچھ کر پاتے ہیں، یہ ہے کہ ان کے دل ایک دوسرے کے لیے کس کیفیت کے حامل ہیں۔ اہلِ بیتؑ کے محبین کے درمیان ایسی محبت، اخلاص، ہمدردی اور قربت ہونی چاہیے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں ولایت و محبتِ اہلِ بیتؑ کی حقیقی قدر و قیمت نمایاں ہو جائے۔

معرفتِ امامؑ کا ایک اور اثر اور علامت یہ ہے کہ انسان مختلف مواقع پر——بلکہ مسلسل اور دائمی طور پر——امامؑ کو یاد رکھے۔ یہ کیفیت خود محبت کا نتیجہ ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے، اپنی محبت کی شدت کے مطابق اسے یاد رکھتا ہے۔ کبھی دل کا تعلق اس قدر گہرا ہو جاتا ہے کہ انسان کے لیے محبوب کو فراموش کرنا ہی ممکن نہیں رہتا۔

چنانچہ زمانۂ غیبت میں اہلِ معرفت اگرچہ ظاہری طور پر امامؑ کی زیارت سے محروم ہیں، لیکن اپنے دلوں سے ان کی یاد کبھی محو نہیں ہونے دیتے۔

ایک شخص نے امام موسیٰ کاظمؑ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا:

وَ اَسبَغَ عَلَیکُم نِعَمَهُ ظاهِرَةً وَ باطِنَةً

''اور اس نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر تمام کر دیں۔''

(قرآن 31:20)

امامؑ نے فرمایا:

اَلنِّعمَةُ الظاهِرَةُ الاِمامُ الظاهِرُ. وَ الباطِنَةُ الاِمامُ الغائِبُ.

''ظاہری نعمت، ظاہر امامؑ ہیں اور باطنی نعمت، غائب امامؑ ہیں۔''

راوی نے پوچھا: ''کیا ائمہؑ میں سے کوئی امام غیبت اختیار کرے گا؟'' آپؑ نے فرمایا:

نَعَم؛ یَغیبُ مِن اَبصارِ النّاسِ شَخصُهُ، وَ لا یَغیبُ عَن قُلُوبِ المُؤمِنینَ ذِکرُهُ. وَ هُوَ الثّانی عَشَرَ مِنّا.

''ہاں! ان کی ذات لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گی، لیکن مؤمنین کے دلوں سے ان کی یاد کبھی غائب نہیں ہو گی۔ اور وہ ہم میں سے بارہویں ہیں۔''

کمال الدین، باب 34، حدیث 6۔

بے ایمان لوگ انہیں فراموش کر سکتے ہیں، کیونکہ انہوں نے حقیقتاً اُن کی معرفت حاصل نہیں کی؛ لیکن جو شخص امامؑ کو پہچانتا ہو، ان کی معرفت اور ولایت رکھتا ہو، وہ انہیں کیسے بھول سکتا ہے؟ زمانۂ غیبت میں مؤمن کا اپنے امامؑ کے ساتھ تعلق اس قدر مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ کبھی ان کی یاد سے غافل نہ ہو اور کوئی چیز اسے اپنے محبوب کی یاد سے بے خبر نہ کر سکے۔

یادِ امامؑ کے درجات

مرحوم آیت اللہ سید محمد تقی موسوی اصفہانی، مؤلفِ گرانقدر کتاب مکیال المکارم فی فوائد الدعاء للقائمؑ کے مطابق مؤمنین اپنے ایمان، معرفت اور یقین کے درجات کے لحاظ سے اپنے مولاؑ کی یاد میں بھی مختلف مراتب رکھتے ہیں۔ بعض کی کیفیت اس شعر کے مصداق ہوتی ہے:

اَللّٰہُ یَعلَمُ اَنّی لَستُ اَذکُرُکُم

فَکَیفَ اَذکُرُکُم اِذ لَستَ اَنساکُم

''اللہ جانتا ہے کہ میں تمہیں یاد نہیں کرتا؛

کیونکہ جب میں تمہیں کبھی بھولتا ہی نہیں تو پھر 'یاد' کیسے کروں؟''

مکیال المکارم، ج2، ص308۔

مؤلفِ مکیال المکارم پھر چند ایسی باتوں کی یاد دہانی کراتے ہیں جن کے ذریعے انسان شب و روز امامِ عصرؑ کی یاد کو اپنے دل میں زندہ رکھ سکتا ہے۔ ان کے کلام کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

''جب صبح ہو تو جان لو کہ اللہ نے جو زندگی تمہیں عطا فرمائی ہے، وہ اس بزرگوار امامؑ کی برکت سے ہے۔ لہٰذا ان کا شکر ادا کرو اور اللہ تعالیٰ کا بھی اس نعمت پر شکر بجالاؤ جو اس نے تمہیں عطا کی ہے۔ اپنے آپ کی پوری حفاظت کرو کہ کہیں اس نعمت کو ایسے کام میں استعمال نہ کرو جو امامؑ کو پسند نہ ہو، کیونکہ ایسا کرنا تمہارے لیے بدبختی اور ایک بھاری بوجھ کا سبب بن جائے گا۔

''اگر اپنے آپ کو کسی گناہ کے سامنے پاؤ تو یاد کرو کہ تمہارے مولاؑ تمہیں اس بری حالت اور ناپسندیدہ کیفیت میں دیکھ رہے ہیں۔ ان کے احترام میں اس گناہ کو ترک کر دو۔

''اور اگر کوئی نیک عمل انجام دینے کا موقع ملے تو فوراً اس کی طرف بڑھو۔ جان لو کہ یہ ایک الٰہی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مولاؑ کی برکت سے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ اس پر اللہ کا شکر کرو اور اس عمل کو اپنے مولا اور امامِ زمانہؑ کی خدمت میں ہدیہ کرو، اور دل و زبان سے کہو:

یا اَیُّھَا العَزِیزُ مَسَّنا وَ اَھلَنَا الضُرَّ وَ جِئنا بِبِضاعَۃٍ مُزجاۃٍ فَاَوفِ لَنَا الکَیلَ وَ تَصَدَّق عَلَینا اِنَّ اللّٰہَ یَجزِی المُتَصَدِّقِینَ.

''اے صاحبِ عزت! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو سختی نے آلیا ہے اور ہم ایک حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں، پس ہمیں پورا پیمانہ عطا کیجیے اور ہم پر کرم فرمایئے؛ بے شک اللہ صدقہ دینے والوں کو جزا دیتا ہے۔''

(قرآن 12:88)

''ہر حال میں عاجزی اور تسلیم کے ساتھ رہو، جیسے ایک حقیر بندہ اپنے آقا کی خدمت میں فرمانبردار کھڑا ہو۔ ہر صبح و شام امامؑ کی خدمت میں سلام پیش کرو؛ ایسا سلام جو اپنے مولا کی زیارت کا مشتاق بندہ پیش کرتا ہے، جو فراق کے درد میں جل رہا ہو؛ ایک ایسے مخلص محب کا سلام جس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے ہوں اور جو خود کو اپنے مولا کی بارگاہ میں حاضر سمجھتا ہو۔

''جب نماز کا وقت آئے تو اپنے مولاؑ کی اس حالت کو یاد کرو جب وہ اللہ جلّ جلالہٗ کے حضور کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے حضورِ قلب، جسمانی خشوع اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے توجہ ہٹا کر نماز ادا کرو۔

''جان لو کہ اس عبادت کی توفیق بھی تمہارے مولاؑ کی برکت سے ہے، اور تمہاری یہ عبادت تم سے قبول نہ ہو گی مگر ان کی ولایت، اطاعت اور معرفت کے ذریعے۔ جتنی تمہاری اطاعت، معرفت اور تسلیم ان کے لیے بڑھے گی، اللہ تعالیٰ تمہارے مرتبے، اجر، عزت اور فضیلت میں اتنا ہی اضافہ فرمائے گا۔

''نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس بزرگوار امامؑ کو اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ اور شفیع قرار دو تاکہ تمہاری نماز قبول ہو۔ اور دوسری دعائیں مانگنے سے پہلے امامؑ کے لیے دعا سے آغاز کرو، کیونکہ تم پر ان کا حق عظیم اور ان کے احسانات بے شمار ہیں۔

”جب بھی تمہیں کوئی حاجت پیش آئے یا کوئی بڑی مشکل در پیش ہو تو اسے امامؑ کی خدمت میں پیش کرو اور ان سے التجا کرو کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہاری مشکل دور ہونے کے لیے شفاعت فرمائیں؛ کیونکہ وہ اللہ عزوجل کی طرف جانے کا وسیلہ اور اللہ کا وہ باب ہیں جس کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے۔ اللہ جلّ جلالہٗ نے فرمایا ہے:

وَ أتُوا البُيُوتَ مِن اَبوابِها

”اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو۔“

(قرآن 2:189)

ترجمۂ مکیال المکارم، ج2، ص443–444۔

اگر انسان امامؑ کے مقام کی صحیح معرفت رکھتا ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ خود یہ یاد بھی عظیم ترین عبادات میں سے ہے۔ اسی اہمیت کے سبب ہمیں اللہ سے یہ دعا مانگنا سکھایا گیا ہے:

...وَ لا تُنسِنا ذِكرَهُ.

”[اے اللہ!]... ہمیں ان کی یاد فراموش نہ ہونے دینا۔“

کمال الدین، باب 45، حدیث 43۔

یادِ امامؑ کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ انسان اپنے دل میں امامؑ کو یاد رکھے، اور دوسرا یہ کہ زبان و عمل کے ذریعے دوسروں کے درمیان بھی ان کا ذکر کرے۔ پہلا قلبی عمل ہے اور دوسرا ظاہری۔ پہلے کا فائدہ خود انسان کو پہنچتا ہے، جبکہ دوسرے سے خود اسے بھی فائدہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ انسان ایسے اسباب پیدا کر سکتا ہے—اور اسے کرنا بھی چاہیے—جن کے ذریعے خود اس کے دل میں اور دوسروں کے درمیان امامؑ کی یاد زندہ رہے، تاکہ نہ وہ خود امامؑ سے غافل ہو اور نہ دوسروں کو غفلت میں رہنے دے۔

مجالسِ ذکرِ اہلِ بیتؑ میں شرکت

ہمارے ائمہؑ نے ان مجالس کے قیام اور ان میں شرکت کی بہت تاکید فرمائی ہے جن میں اہلِ بیتؑ کا ذکر کیا جاتا ہو۔

امام صادقؑ نے داؤد بن سرحان سے فرمایا:

یا داوُودُ، اَبلِغ مَوالِیَّ عَنّی السَّلامَ وَ اَنّی اَقُولُ: رَحِمَ اللهُ عَبداً اجتَمَعَ مَعَ آخَرَ فَتَذاکَرَ اَمرَنا. فَاِنَّ ثالِثَهُما مَلَکٌ یَستَغفِرُ لَهُما. وَ مَا اجتَمَعَ اثنانِ عَلی ذِکرِنا اِلّا باهَی اللهُ تَعالی بِهِمَا المَلائِکَةَ. فَاِذا اجتَمَعتُم فَاشتَغِلُوا بِالذِّکرِ. فَاِنَّ فی اجتِماعِکُم وَ مُذاکَرَتِکُم اِحیاءَنا. وَ خَیرُ النّاسِ مِن بَعدِنا مَن ذاکَرَ بِاَمرِنا وَ دَعا اِلی ذِکرِنا.

''اے داؤد! میرے موالی تک میرا اسلام پہنچاؤ اور ان سے کہو کہ میں کہتا ہوں: اللہ اس بندے پر رحمت فرمائے جو کسی دوسرے کے ساتھ بیٹھے اور دونوں ہمارے امر کا ذکر کریں۔ ان دونوں کا تیسرا ساتھی ایک فرشتہ ہوتا ہے جو ان کے لیے استغفار کرتا ہے۔ کوئی دو افراد ہمارے ذکر کے لیے جمع نہیں ہوتے مگر اللہ تعالیٰ ان پر فرشتوں کے سامنے فخر فرماتا ہے۔ ''پس جب تم جمع ہو تو ذکر میں مشغول رہو، کیونکہ تمہارا اجتماع اور تمہارا باہمی تذکرہ ہمارے امر کو زندہ کرتا ہے۔ اور ہمارے بعد بہترین لوگ وہ ہیں جو ہمارے امر کا تذکرہ کرتے اور دوسروں کو ہمارے ذکر کی طرف بلاتے ہیں۔''

بحار الانوار، ج 1، ص 200، ح 8، بحوالہ امالی شیخ طوسی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجالسِ ذکرِ اہلِ بیتؑ میں کتنی عظیم برکتیں اور فوائد پوشیدہ ہیں۔ یہاں تک کہ اگر لوگ کسی مجلس میں جمع ہوں لیکن غفلت کے باعث وہاں ائمہؑ کا ذکر نہ کریں تو یہی مجلس قیامت کے دن ان کے لیے حسرت کا سبب بنے گی۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

مَا اجتَمَعَ فی مَجلِسٍ قَومٌ لَم یَذکُرُوا اللهَ عَزَّوَجَلَّ وَ لَم یَذکُرُونا اِلّا کانَ ذلِکَ المَجلِسُ حَسرَةً عَلَیهِم یَومَ القِیامَةِ.

''کوئی قوم ایسی مجلس میں جمع نہیں ہوتی جس میں نہ اللہ عزوجل کو یاد کیا جائے اور نہ ہمارا ذکر ہو، مگر وہ مجلس قیامت کے دن ان کے لیے حسرت بن جائے گی۔''

اصول کافی، ج 2، ص 496، کتاب الدعاء، باب مایجب من ذکر اللہ عزوجل فی کل مجلس، ح 2۔

ائمہؑ کی یاد ان کے فضائل و مصائب کے ذکر، ان کی احادیث بیان کرنے اور ان کی سیرت یاد کرنے سے زندہ رہتی ہے۔ اسی بناپر مؤمنین کو ایک دوسرے سے ملاقات کی بہت تاکید کی گئی ہے، اور اس ملاقات کے اہم مقاصد میں ائمہؑ کی احادیث، فضائل اور مصائب کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

تَزاوَرُوا. فَاِنَّ فی زِیارَتِکُم اِحیاءً لِقُلُوبِکُم وَ ذِکراً لِاَحادیثِنا. وَ اَحادیثُنا تُعَطِّفُ بَعضَکُم عَلی بَعضٍ. فَاِن اَخَذتُم بِها رَشَدتُم وَ نَجَوتُم. وَ اِن تَرَکتُمُوها ضَلَلتُم وَ هَلَکتُم. فَخُذُوا بِها وَ اَنَا بِنَجاتِکُم زَعیمٌ.

''ایک دوسرے سے ملاقات کیا کرو، کیونکہ تمہاری ملاقاتیں تمہارے دلوں کو زندہ کرتی ہیں اور ہماری احادیث کو یاد رکھنے کا سبب بنتی ہیں۔ ہماری احادیث تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کرتی ہیں۔ اگر تم انہیں اختیار کروگے تو ہدایت پاؤگے اور نجات حاصل کروگے، اور اگر انہیں چھوڑ دوگے تو گمراہ اور ہلاک ہو جاؤگے۔ پس انہیں مضبوطی سے تھامے رکھو؛ میں تمہاری نجات کا ضامن ہوں۔''

اصول کافی، ج2، ص186، کتاب الایمان والکفر، باب تذاکر الاخوان، ح2۔

حقیقی ہدایت اور سعادت کا کوئی راستہ ائمہؑ سے منقول تعلیمات پر عمل کے بغیر نہیں۔ لہٰذا ان کے محبین کی مجالس میں اہلِ بیتؑ کی احادیث کا تذکرہ ہونا چاہیے تاکہ حاضرین اہلِ سعادت اور اہلِ نجات بن سکیں۔

وسیع تر مفہوم میں، ائمہؑ کا ذکر مؤمن کے قلب و روح کی غذا ہے۔ اللہ نے ان کی ولایت اور محبت کو دلوں کی زندگی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ جو شخص زندہ دل چاہتا ہے اسے اپنے قلب میں ان کی ولایت کے امر کو زندہ رکھنا چاہیے۔

امام صادقؑ نے فضیل سے پوچھا:

تَجلِسُونَ وَ تُحَدِّثُونَ؟

''کیا تم لوگ آپس میں بیٹھتے اور ایک دوسرے سے احادیث بیان کرتے ہو؟''

فضیل نے عرض کیا: ''جی ہاں۔''

امامؑ نے فرمایا:

اِنَّ تِلکَ المَجالِسَ اُحِبُّها. فَاَحیُوا اَمرَنا یا فُضَیلُ. فَرَحِمَ اللّٰہُ مَن اَحیا اَمرَنا.

''میں ایسی مجالس کو پسند کرتا ہوں۔ پس اے فضیل! ہمارے امر کو زندہ رکھو۔ اللہ اس شخص پر رحمت فرمائے جو ہمارے امر کو زندہ کرے۔''

پھر فرمایا:

یا فُضَیلُ مِن ذَکَرَنا، اَو ذُکِرنا عِندَہُ، فَخَرَجَ مِن عَینِہِ مِثلُ جَناحِ الذُّبابِ، غَفَرَ اللّٰہُ لَہُ ذُنُوبَہُ وَ لَو کانَت اَکثَرَ مِن زَبَدِ البَحرِ.

''اے فضیل! جو شخص ہمیں یاد کرے یا اس کے سامنے ہمارا ذکر کیا جائے اور اس کی آنکھ سے مکھی کے پر کے برابر بھی آنسو نکل آئے تو اللہ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے، خواہ وہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں۔''

بحار الانوار، ج44، ص282، ح14، بحوالۂ قرب الاسناد۔

یہ آنسو ائمہؑ کے مصائب یاد کر کے ان پر دل سوز ہونے کے سبب بھی آ سکتے ہیں، امامِ غائبؑ کے فراق کی تپش سے بھی، اور اہلِ بیتؑ سے شدید محبت و ولایت کے باعث بھی۔ سبب جو بھی ہو، ایسے آنسو دل کو پاک اور انسان کے گناہوں کو دھو دیتے ہیں۔

امام رضاؑ نے فرمایا:

مَن ذُکِّرَ بِمُصابِنا فَبَکی وَ اَبکی لَم تَبکِ عَینُہُ یَومَ تَبکِی العُیُونُ ... . مَن جَلَسَ مَجلِساً یُحیی فیہِ اَمرُنا، لَم یَمُت قَلبُہُ یَومَ تَمُوتُ القُلُوبُ.

''جسے ہمارے مصائب یاد دلائے جائیں اور وہ روئے اور دوسروں کو رلائے، اس دن اس کی آنکھ نہیں روئے گی جس دن آنکھیں روئیں گی... اور جو ایسی مجلس میں بیٹھے جس میں ہمارے امر کو زندہ کیا جاتا ہو، اس دن اس کا دل نہیں مرے گا جس دن دل مر جائیں گے۔''

بحار الانوار، ج44، ص278، ح1، بحوالۂ امالی شیخ صدوق۔

اہلِ بیتؑ کے مصائب پر آنسو بہانا ان مقدس ہستیوں کے ساتھ قلبی وابستگی کی علامت ہے؛ ایسی وابستگی کہ ان کا غم محب کے دل کو بھی دردمند کر دیتا ہے۔ یہی قلبی تعلق انسان کو لطف و عنایتِ الٰہی کی طرف کھینچتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہوں، تب بھی دل کی نرمی اور سوز و گداز مغفرت کا وسیلہ بن سکتا ہے۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

اَما اَنَّهُ لَیسَ مِن عَبدٍ یُذکَرُ عِندَهُ اَهلُ البَیتِ فَیَرِقُّ لِذِکرِنا اِلّا مَسَحَتِ المَلائِکَةُ ظَهرَهُ وَ غَفَرَ لَهُ ذُنُوبُهُ کُلُّها اِلّا اَن یَجیءَ بِذَنبٍ یُخرِجُهُ مِنَ الایمانِ.

"جان لو! کوئی بندہ ایسا نہیں جس کے سامنے اہلِ بیتؑ کا ذکر کیا جائے اور ہمارے ذکر سے اس کا دل نرم ہو جائے، مگر فرشتے اس کی پشت پر دستِ شفقت پھیرتے ہیں اور اس کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں، سوائے اس کے کہ وہ ایسا گناہ لے آئے جو اسے ایمان سے خارج کر دے۔"

روضۃ الکافی، ص 101، ح 72۔

اس روایت کا آخری حصہ تمام مؤمنین کے لیے ایک تنبیہ ہے: اگر محبتِ اہلِ بیتؑ کی برکت سے ان کی آنکھیں اشک بار اور دل سوزاں ہوں، تب بھی انہیں اپنے گناہوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کون سا گناہ اسے ناراضیِ الٰہی کے معرض میں لے آئے۔[1] لہٰذا ہر وہ گناہ جو مؤمن کو اللہ کی ناراضی سے دوچار کر سکتا ہے—اگر اللہ اسے معاف نہ فرمائے—ممکن ہے بالآخر اس کے ایمان کے سلب ہونے کا سبب بن جائے۔ ایمانِ مستودع اور اس کی علامات کے بارے میں گزشتہ بحث[2] کی روشنی میں مؤمن کو اپنے ہر گناہ کے بارے میں خوف اور احتیاط کی حالت میں رہنا چاہیے، مبادا کوئی ایک گناہ اسے امام باقرؑ کی بیان کردہ اس بشارت سے محروم کر دے۔

[1] امیر المؤمنینؑ کی اس روایت کے مطابق جو اس کتاب کے ص 266 پر گزر چکی ہے، اللہ نے اپنی ناراضی کو نافرمانیوں کے درمیان پوشیدہ رکھا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو اسی کتاب کا ص 256۔

باب پنجم ـــ علومِ ائمہؑ کو سیکھنا اور سکھانا

ہم اہلِ بیتؑ کے امر کو زندہ رکھنے کی فضیلت دیکھ چکے ہیں۔ اب مناسب ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے بہترین طریقوں میں سے ایک پر غور کیا جائے ـــ وہ طریقہ جسے خود ائمہؑ نے بیان فرمایا ہے۔ خصوصاً زمانۂ غیبت میں یہ معرفتِ امامؑ کے اہم ترین آثار اور تقاضوں میں سے ہے۔

امام رضاؑ نے فرمایا:

رَحِمَ اللّٰهُ عَبداً اَحیا اَمرَنا.

''اللہ اس بندے پر رحمت فرمائے جو ہمارے امر کو زندہ کرے۔''

راویِ حدیث ہروی نے عرض کیا:

وَکَیفَ یُحیی اَمرَکُم؟

''آپ کے امر کو کیسے زندہ کیا جائے؟''

امامؑ نے فرمایا:

یَتَعَلَّمُ عُلُومَنا وَ یُعَلِّمُهَا النّاسَ. فَاِنَّ النّاسَ لَو عَلِمُوا مَحاسِنَ کَلامِنا لَاتَّبَعُونا.

''وہ ہمارے علوم کو سیکھے اور لوگوں کو سکھائے؛ کیونکہ اگر لوگ ہمارے کلام کی خوبصورتیوں کو جان لیں تو یقیناً ہماری پیروی کریں گے۔''

بحار الانوار، ج2، ص30، ح13، بحوالۂ معانی الاخبار اور عیون اخبار الرضاؑ۔

یہاں تاکید اہلِ بیتؑ کے علوم کو حاصل کرنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے پر ہے، اور اس کا بنیادی راستہ خود ان کی روایات کی طرف رجوع اور انہیں نقل کرنا ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

تَلاقَوا وَ تَحادَثُوا العِلمَ. فَاِنَّ بِالحَدیثِ تُجلَی القُلُوبُ الرّانِئَةُ. وَ بِالحَدیثِ اِحیاءُ اَمرِنا. فَرَحِمَ اللّٰهُ مَن اَحیا اَمرَنا.

''ایک دوسرے سے ملاقات کرو اور علم کا باہمی تذکرہ کرو؛ کیونکہ حدیث کے ذریعے زنگ آلود دل صیقل ہوتے ہیں، اور حدیث ہی کے ذریعے ہمارے امر کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ اللہ اس شخص پر رحمت فرمائے جو ہمارے امر کو زندہ کرے۔''

عوالی اللآلی، ج 4، ص 67۔

اہلِ بیتؑ کے علوم ـــ جو حقیقی اور صحیح علم ہیں ـــ کو سیکھنا انسان کو پاکیزہ کرتا اور حقیقی سعادت کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ دلوں کو اہلِ بیتؑ کی طرف متوجہ کرنے کا بہترین ذریعہ بھی یہی ہے کہ ان کے علوم کو عام کیا جائے اور ان کی تعلیمات لوگوں تک پہنچائی جائیں۔ جب یہ تعلیمات صحیح طریقے سے پیش ہوں تو لوگ خود دیکھیں گے کہ کسی دوسرے کلام میں ائمہؑ کے کلام جیسی تازگی اور حسن نہیں؛ کوئی دوسری بات اس طرح دل میں اترتی، فطرتِ انسانی سے اس قدر ہم آہنگ ہوتی، عقلِ سلیم کی تائید پاتی اور وجدان کی تصدیق حاصل کرتی نظر نہیں آتی۔

کتنا بہتر ہے کہ لوگوں کو اہلِ بیتؑ کی طرف خود انہی کی تعلیمات کے ذریعے دعوت دی جائے، تاکہ اہلِ بیتؑ خود اپنے مکتب کی حقانیت کی دلیل بنیں۔

لہٰذا مؤمن کو چاہیے کہ پہلے خود اہلِ بیتؑ کا علم حاصل کرے اور پھر دوسروں کو بھی اس کی طرف دعوت دے۔ خصوصاً زمانۂ غیبت میں یہ ایک نہایت سنگین ذمہ داری ہے۔ اگر لوگ اس ذمہ داری سے بے اعتنا ہو جائیں تو بے دینی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور کوئی بھی محفوظ نہ رہے گا۔

امام ہادیؑ نے فرمایا:

لَولا مَن یَبقی بَعدَ غَیبَةِ قائِمِنا مِنَ العُلَماءِ الدّاعینَ اِلَیهِ وَ الدّالّینَ عَلَیهِ وَ الذّابّینَ عَن دینِهِ بِحُجَجِ اللهِ وَ المُنقِذینَ لِضُعَفاءِ عِبادِ اللهِ مِن شِباکِ اِبلیسَ وَ مَرَدَتِهِ وَ مِن فِخاخِ النَّواصِبِ، لَما بَقِیَ اَحَدٌ اِلّا ارتَدَّ عَن دینِ اللهِ، وَ لکِنَّهُمُ الَّذینَ یُمسِکُونَ اَزِمَّةَ قُلُوبِ ضُعَفاءِ الشّیعَةِ کَما یُمسِکُ صاحِبُ السَّفینَةِ سُکّانَها. اُولئِکَ هُمُ الاَفضَلُونَ عِندَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ.

''اگر ہمارے قائمؑ کی غیبت کے بعد ایسے علماء باقی نہ رہتے جو لوگوں کو ان کی طرف بلائیں، ان کی راہ دکھائیں، اللہ کی حجتوں کے ذریعے ان کے دین کا دفاع کریں، اور اللہ کے کمزور بندوں کو ابلیس اور اس کے سرکش پیروکاروں کے جالوں اور دشمنانِ ائمہؑ کے پھندوں سے نجات دیں، تو کوئی شخص باقی نہ رہتا مگر یہ کہ دینِ خدا سے مرتد ہو جاتا۔

''لیکن یہی علماء کمزور شیعوں کے دلوں کی باگیں اس طرح تھامے رکھتے ہیں جیسے کشتی کا ناخدا اس کے سکان کو تھامتا ہے۔ یہی لوگ اللہ عزوجل کے نزدیک سب سے افضل ہیں۔''

بحار الانوار، ج2، ص6، ح12، بحوالہ احتجاجِ طبرسی اور تفسیر امام حسن عسکریؑ۔

اس روایت میں امامؑ نے زمانۂ غیبت میں علماء کی ذمہ داری نہایت واضح طور پر بیان فرمائی ہے۔ سب سے بڑھ کر انہیں لوگوں کو امامِ غائبؑ کی طرف دعوت دینی اور ان کی طرف رہنمائی کرنی چاہیے:

الدّاعینَ اِلَیهِ وَ الدّالّینَ عَلَیهِ

''ان کی طرف بلانے والے اور ان کی طرف رہنمائی کرنے والے۔''

یہ کام امامؑ کی یاد زندہ رکھنے، ان کے فضائل و مناقب بیان کرنے اور امامِ عصرؑ کے بارے میں اہلِ بیتؑ کی روایات لوگوں تک پہنچانے کے ذریعے انجام پا سکتا ہے۔

اسی طرح اہلِ بیتؑ کی تعلیمات کو سیکھنا اور سکھانا بھی لوگوں کو امامؑ کی طرف دعوت دینے کے بہترین ذرائع میں سے ہے، اور علماء کو اس ذمہ داری سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔

زمانۂ غیبت میں عالمِ دین کا کام یہ نہیں کہ لوگوں کو اپنی طرف بلائے یا انہیں اپنی شخصیت کا گرویدہ بنائے۔ اسے ایک ایسے **پل** کی مانند ہونا چاہیے جس سے گزر کر محبانِ امامؑ اپنی حقیقی منزل یعنی **ولایت و معرفتِ امامؑ** تک پہنچیں۔

امامِ عصرؑ کے ساتھ تعلق اور رابطے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص خود کو لوگوں اور امامؑ کے درمیان واسطے کے طور پر پیش کرے، اسی عنوان سے لوگوں کو اپنی طرف بلائے اور اپنے غیر معمولی مشاہدات یا کرامات ان کے سامنے بیان کرتا پھرے۔

عالمِ دین کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں امامِ عصرؑ کی محبت وولایت کا چراغ روشن کرے جو اپنے حقیقی محسن سے غافل ہو چکے ہیں اور حیران وسرگرداں ایک پناہ گاہ سے دوسری پناہ گاہ کی تلاش میں ہیں۔ امامؑ کی یاد اور ان کی تعلیمات کا بیان ان کے دلوں میں یہ چراغ روشن کر دیتا ہے؛ اس کے بعد وہ خود امامؑ کی کشش سے کھنچتے ہوئے اس راستے پر آگے بڑھتے ہیں۔

شبہات کو دور کرنا اور راستے کی رکاوٹیں ہٹانا علماء کی ذمہ داری ہے؛ لیکن حقیقی تعلق قائم کرنا اور دلوں کو اپنی طرف جذب کرنا خود امامؑ کا کام ہے۔ حقیقی علماءِ دین کو انہی اوصاف کا حامل ہونا چاہیے اور اسی پر فخر کرنا چاہیے۔ جب وہ ایسے ہوں تو حقیقتاً اللہ کے نزدیک بہترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

باب ششم——امامِ عصرؑ کے فرج کا انتظار

معرفتِ امامِ عصرؑ کے اہم ترین آثار اور تقاضوں میں سے ایک **ان کے فرج کا انتظار** ہے۔ ہماری روایات میں انتظارِ فرج کو عظیم ترین عبادت قرار دیا گیا ہے۔

رسولِ خداؐ نے فرمایا:

اَفضَلُ العِبادَةِ اِنتِظارُ الفَرَجِ.

"افضل ترین عبادت، فرج کا انتظار ہے۔"

منتخب الاثر، حصہ 10، باب 2، حدیث 16۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر قسم کی کشادگی اور نجات کے انتظار کو بلند ترین عبادات میں شمار کیا گیا ہے۔[1] لیکن جب یہی انتظار ائمہؑ کے فرج کا ہو، خصوصاً ان کے زمانۂ غیبت میں، تو اس کے مخصوص فضائل ہیں جن کا ذکر روایات میں آیا ہے۔

یہاں چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

[1] اس موضوع کی تفصیلی وضاحت مؤلف کی کتاب سلوکِ منتظران میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

مَن ماتَ مِنکُم وَ هُوَ مُنتَظِرٌ لِهذَا الاَمرِ کَمَن هُوَ مَعَ القائِمِ فی فُسطاطِهِ.

''تم میں سے جو شخص اس امر [ظہورِ امامؑ] کا انتظار کرتے ہوئے دنیا سے جائے، وہ اس شخص کی مانند ہے جو قائمؑ کے خیمے میں ان کے ساتھ ہو۔''

پھر امامؑ کچھ دیر خاموش رہے اور فرمایا:

لا، بَل کَمَن قارَعَ مَعَهُ بِسَیفِهِ.

''نہیں، بلکہ وہ اس شخص کی مانند ہے جو ان کے ساتھ تلوار لے کر جہاد کرے۔''

پھر فرمایا:

لا وَاللهِ اِلّا کَمَنِ استُشهِدَ مَعَ رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلّم.

''نہیں، خدا کی قسم! بلکہ وہ اس شخص کی مانند ہے جو رسولِ خداؐ کے ساتھ شہید ہوا ہو۔''

بحار الانوار، ج52، ص126، ح18، بحوالہ محاسنِ برقی۔

لیکن یہ مقام ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہ عظیم نعمت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو امامؑ اور ان کی غیبت کے بارے میں گہری معرفت اور کامل فہم رکھتے ہوں اور دوسروں کی طرح سطحی یا صرف ظاہری امور تک محدود نہ ہوں۔ ایسے لوگ ہر زمانے کے لوگوں سے افضل ہوں گے۔

امام زین العابدینؑ نے فرمایا:

یا اَبا خالِدٍ، اِنَّ اَهلَ زَمانِ غَیبَتِهِ القائِلینَ بِإمامَتِهِ وَ المُنتَظِرینَ لِظُهُورِهِ، اَفضَلُ مِن اَهلِ کُلِّ زَمانٍ. لِاَنَّ اللهَ تَبارَکَ وَ تَعالی اَعطاهُم مِنَ العُقُولِ وَ الاَفهامِ وَ المَعرِفَةِ ما صارَت بِهِ الغَیبَةُ عِندَهُم بِمَنزِلَةِ المُشاهَدَةِ وَ جَعَلَهُم فی ذلِکَ الزَّمانِ بِمَنزِلَةِ المُجاهِدینَ بَینَ یَدَی رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلّم بِالسَّیفِ. اُولئِکَ المُخلِصُونَ حَقّاً وَ شیعَتُنا صِدقاً وَ الدُّعاةُ اِلی دینِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ سِرّاً وَ جَهراً.

''اے ابو خالد! ان کی غیبت کے زمانے کے وہ لوگ جو ان کی امامت کے قائل ہوں اور ان کے ظہور کے منتظر رہیں، ہر زمانے کے لوگوں سے افضل ہیں؛ کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں ایسی عقلیں، ایسا فہم اور ایسی معرفت عطا کی ہے کہ ان کے نزدیک غیبت مشاہدے کی مانند ہو جاتی ہے۔

''اللہ نے انہیں اس زمانے میں ان مجاہدین کے مرتبے پر قرار دیا ہے جو رسولِ خداؐ کے سامنے تلوار کے ساتھ جہاد کرتے تھے۔ یہی حقیقتاً مخلص لوگ، ہمارے سچے شیعہ اور اللہ عزوجل کے دین کی طرف پوشیدہ اور علانیہ دعوت دینے والے ہیں۔''

کمال الدین، باب 31، حدیث 2۔

ہر زمانے کے لوگوں سے افضل قرار دیے جانے والوں میں دو صفات بیان ہوئی ہیں : **امامِ عصرؑ کی امامت پر ایمان اور ان کے ظہور کا انتظار۔** یہی دو صفات انہیں حقیقی شیعہ اور علانیہ و پوشیدہ طور پر دینِ خدا کی طرف دعوت دینے والے بناتی ہیں۔

دینِ خدا کی حقیقت، امامِ زمانہؑ کی معرفت ہے۔ لہٰذا لوگوں کو دینِ خدا کی طرف دعوت دینے کا مطلب انہیں امامِ غائبؑ کی معرفت اور ان کے ساتھ تعلق کی طرف دعوت دینا بھی ہے۔ زمانۂ غیبت میں حقیقی انتظار کی ایک علامت یہی ہے کہ انسان دوسروں کو پوشیدہ اور علانیہ طور پر امامِ عصرؑ کی طرف متوجہ کرے۔

ظہور کو قریب سمجھنا

انتظار بنیادی طور پر **دل کی ایک کیفیت** ہے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان امامؑ کے ظہور سے کبھی ناامید نہ ہو اور اسے دور نہ سمجھے۔

زمانۂ غیبت میں حقیقی منتظر ہر صبح و شام اپنے امامؑ کے ظہور کا چشم براہ رہتا ہے۔ وہ اسے کبھی دور نہیں سمجھتا۔ غیبت کے زمانے میں دل کی یہ کیفیت اللہ کو پسند ہے اور نجات کا سبب ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اَقرَبُ ما یَکُونُ العَبدُ اِلَی اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَ اَرضی ما یَکُونُ عَنهُ اِذَا افتَقَدُوا حُجَّةَ اللهِ فَلَم یَظهَر لَهُم وَ حُجِبَ عَنهُم فَلَم یَعلَمُوا بِمَکانِهِ، وَ هُم فی ذلِکَ یَعلَمُونَ اَنَّهُ لا تَبطُلُ حُجَجُ اللهِ وَ لا بَیِّناتُهُ. فَعِندَها فَلیَتَوَقَّعُوا الفَرَجَ صَباحاً وَ مَساءً.

''بندہ اللہ عزوجل سے سب سے زیادہ قریب اور اللہ اس سے سب سے زیادہ راضی اس وقت ہوتا ہے جب لوگ حجتِ خدا کو نہ پائیں، وہ ان کے سامنے ظاہر نہ ہوں، ان سے پوشیدہ ہوں اور لوگ ان کے مقام سے بھی واقف نہ ہوں؛ لیکن اس کے باوجود انہیں یقین ہو کہ اللہ کی حجتیں اور اس کی روشن نشانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ ایسے وقت میں انہیں صبح و شام فرج کی توقع رکھنی چاہیے۔''

کمال الدین، باب 33، حدیث 17۔

ظہور کو قریب سمجھنا ایک قلبی کیفیت ہے۔ یہ امامِ عصرؑ کے وعدۂ ظہور پر انسان کے یقین اور پختہ ایمان کی علامت ہے۔ چونکہ ظہور کے لیے کوئی معین وقت بیان نہیں کیا گیا، اس لیے ہر صبح اور ہر شام اس کے وقوع کا امکان موجود ہے۔[1]

[1] اس نکتے کی مفصل اور مستند وضاحت سلوکِ منتظران میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

ظہور کو قریب سمجھنا **استعجال** سے مختلف ہے۔ استعجال یعنی بے صبری کے ساتھ ظہور کو جلد طلب کرنا، جو تسلیم کے منافی ہے۔ حقیقت میں استعجال اس بات کی علامت ہے کہ انسان ظہور کے وقت کے بارے میں اللہ کے فیصلے پر پوری طرح راضی نہیں۔ اس کے برخلاف ظہور کو قریب سمجھنا خود تسلیم کا مظہر ہے، کیونکہ اللہ اس کیفیت سے راضی ہے اور ائمہؑ نے اپنے شیعوں کو اس کی تعلیم دی ہے۔

بلکہ اس کیفیت کا نہ ہونا ــــ یعنی کسی محدود مدت کے لیے بھی ظہور سے ناامید ہو جانا یا اسے دور سمجھنا ــــ سنگین خطرات میں شمار ہوا ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

هَلَكَتِ المَحاضيرُ.

''محاضیر ہلاک ہو گئے۔''

راوی نے پوچھا: ''محاضیر کون ہیں؟''

آپؑ نے فرمایا:

اَلمُستَعجِلُونَ.

''وہ لوگ جو استعجال کرتے ہیں۔''

پھر فرمایا:

وَ نَجَا الْمُقَرَّبُونَ.

''اور وہ لوگ نجات پا گئے جو اسے قریب سمجھتے ہیں۔''

غیبت نعمانی، باب 11، حدیث 5۔

محاضیر، مِحضَر کی جمع ہے، یعنی بہت تیزی اور عجلت سے دوڑنے والا۔ ایسی بے صبری بالآخر انسان کو انحراف اور ایمان کے زوال تک پہنچا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ مسلسل ظہور کو قریب سمجھتے ہیں وہ اہلِ نجات ہیں۔

دعائے عہد میں ہم پڑھتے ہیں:

اِنَّهُم يَرَونَهُ بَعيداً وَ نَراهُ قَريباً.

''وہ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھتے ہیں۔''

بحار الانوار، ج 102، ص 112، امام صادقؑ سے منقول، بحوالہ مصباح الزائر۔

البتہ ظہور کو قریب سمجھنے کا مطلب اس کے لیے کوئی تاریخ مقرر کرنا نہیں۔ وقتِ ظہور کی پیش گوئی کرنا بھی اسی طرح رضائے الٰہی اور سیرۂ ائمہؑ سے دور ہے جس طرح استعجال۔ ہمارے ائمہؑ نے وقت مقرر کرنے والوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا اور انہیں جھوٹا قرار دیا ہے۔

ایک شخص نے امام صادقؑ سے عرض کیا:

جُعِلتُ فِداکَ؛ اَخبِرنی عَن هذَا الاَمرِ الَّذی نَنتَظِرُهُ مَتی هُوَ؟

''میں آپ پر قربان جاؤں! مجھے بتایئے، یہ امر [ظہور] جس کا ہم انتظار کر رہے ہیں کب ہو گا؟''

امامؑ نے فرمایا:

كَذَبَ الوَقّاتُونَ. وَ هَلَکَ الْمُستَعجِلُونَ. وَ نَجَا الْمُسَلِّمُونَ.

''وقت مقرر کرنے والے جھوٹے ہیں، استعجال کرنے والے ہلاک ہوں گے، اور تسلیم کرنے والے نجات پائیں گے۔''

غیبت نعمانی، باب 16، حدیث 11۔

لہٰذا جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس طرح لوگوں کو امامِ زمانہؑ سے قریب کریں گے یا ظہور کے لیے زمین ہموار کریں گے، کسی مخصوص وقت میں ظہور کی یقینی خبر دیتے ہیں، وہ خود بھی گمراہی کا شکار ہو سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر سکتے ہیں۔

منتظر کا فریضہ یہ ہے کہ وقتِ ظہور کے بارے میں اللہ کے فیصلے کے سامنے حالتِ تسلیم میں رہے۔ اسے کسی صبح یا شام امامِ غائبؑ کے ظہور سے ناامید نہیں ہونا چاہیے، لیکن اسی کے ساتھ اسے بے صبری اور استعجال سے بھی بچنا چاہیے اور ظہور کے قریب ہونے کے بارے میں قیاس آرائیوں سے نہ خود کو دھوکا دینا چاہیے اور نہ دوسروں کو۔

پس **ظہور کو قریب سمجھنا** اور **ظہور کا وقت مقرر کرنا** دو بالکل مختلف امور ہیں: پہلا پسندیدہ اور دوسرا مذموم ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے: اگر ہر دن اور رات ـــ بلکہ ہر لمحے ـــ ظہور کا انتظار کیا جا سکتا ہے تو پھر روایات میں بیان ہونے والی **علاماتِ ظہور** کا کیا فائدہ ہے؟

معرفتِ ظہور، علامات پر موقوف نہیں

اس سوال کے جواب کے لیے پہلے ایک بنیادی نکتہ سمجھنا ضروری ہے:

روایات میں امامِ عصرؑ کے ظہور کی جو علامات بیان ہوئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی وقوع کے اعتبار سے اس معنی میں مطلقاً ناگزیر نہیں کہ اس میں کسی تبدیلی کا امکان ہی نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں، ممکن ہے امامؑ کا ظہور ان علامات میں سے کسی کے وقوع کے بغیر ہی ہو جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام علامات **بداء** کے دائرے میں آتی ہیں۔ جب تک وہ خارج میں واقع نہ ہو جائیں، ان میں تبدیلی یا ان کے نہ ہونے کا امکان بالکل ختم نہیں ہوتا۔

کسی علامت کے بارے میں یا تو ابھی اس کے وقوع کا معین وقت طے نہیں ہوا ـــ اصطلاحاً وہ **تقدیر** کے مرحلے تک نہیں پہنچی ـــ یا اگر اس کا وقت مقرر ہو چکا ہے تو ابھی اللہ کی طرف سے اس کے وقوع کا **قضاء** نہیں ہوا۔

حتیٰ کہ جب اللہ اس کے وقوع کا فیصلہ فرمادے، تب بھی جب تک وہ خارج میں واقع نہ ہو جائے، اللہ اس کے بارے میں بداء فرما سکتا ہے۔ اسی قسم میں وہ علامات بھی شامل ہیں جنہیں روایات میں صراحتاً **حتمی** کہا گیا ہے، مثلاً خروجِ سفیانی، جسے علاماتِ حتمیہ میں شمار کیا گیا ہے۔[1]

[1] غیبت نعمانی، باب 18، حدیث 4۔

ان علامات کو ''حتمی'' کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بداء سے خارج ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے بارے میں تقدیر کے علاوہ اللہ کا **قضاء** بھی متعلق ہو چکا ہے؛ یعنی ان کے وقوع کا مضبوط فیصلہ ہو چکا ہے۔ تاہم جب تک وہ خارج میں واقع نہ ہو جائیں، بداء کا امکان باقی رہتا ہے۔

وہ مرحلہ جس پر یہ امکان ختم ہو جاتا ہے، روایات میں **امضاء** یعنی فیصلے کے آخری نفاذ سے تعبیر کیا گیا ہے:

فَاِذا وَقَعَ القَضاءُ بِالاِمضاءِ فَلابَداءَ.

''جب قضاء امضاء کے مرحلے تک پہنچ جائے تو پھر بداء نہیں ہوتا۔''

اصول کافی، ج 1، ص 149، کتاب التوحید، باب البداء، ح 16۔

امضاءِ قضاء سے مراد اس امر کا خارج میں عملاً واقع ہو جانا ہے۔ اس مرحلے سے پہلے الٰہی مقدرات میں اصولاً بداء کا امکان باقی رہتا ہے۔

مثلاً اللہ کسی شخص کے لیے ایک خاص عمر مقرر کرے اور قبضِ روح پر مامور فرشتے کو حکم دے کہ فلاں وقت اس کی روح قبض کی جائے۔ یہ اطلاع **قضاءِ الٰہی** کے مرحلے کی نمائندگی کرتی ہے، اور اس اصطلاح کے مطابق اس شخص کی موت ایک حتمی امر شمار ہو گی۔ لیکن ممکن ہے وہ شخص کوئی نیک عمل، مثلاً صدقہ یا صلۂ رحم، انجام دے اور اللہ اس قضاء میں بداء فرما کر اس کی عمر بڑھا دے۔ چونکہ قضاء ابھی امضاء کے مرحلے تک نہیں پہنچی تھی، اس لیے اس میں بداء کا امکان موجود تھا۔

یہی حکم خروجِ سفیانی کے بارے میں بھی ہے۔ اگرچہ اسے حتمی کہا گیا ہے، لیکن روایات میں صراحت ہے کہ اس میں بھی بداء ہو سکتا ہے۔

ابوہاشم جعفری نے امام جوادؑ سے عرض کیا: جب خروجِ سفیانی کو روایات میں حتمی قرار دیا گیا ہے تو کیا کسی حتمی امر میں بھی اللہ کے لیے بداء ہو سکتا ہے؟

هَل يَبدو للهِ فِي المَحتوم؟

امامؑ نے فرمایا:

نَعَم.

''ہاں۔''

ابوہاشم نے عرض کیا: ''پھر تو ہمیں یہ خوف ہے کہ خود قائمؑ کے قیام میں بھی بداء ہو جائے''!

امامؑ نے فرمایا:

اِنَّ القائِمَ مِنَ الميعادِ. وَ اللهُ لا يُخلِفُ الميعادَ.

''قائمؑ کا قیام وعدۂ الٰہی میں سے ہے، اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔''

غیبت نعمانی، باب 18، حدیث 10۔

پس خود ظہور بداء کے دائرے میں نہیں، اگرچہ اس کی نام نہاد حتمی علامات بھی بداء کے دائرے میں ہو سکتی ہیں، اور باقی علامات کے بارے میں تو یہ امکان بدرجۂ اولیٰ موجود ہے۔ البتہ **ظہور کا وقت** بداء کے دائرے میں ہے اور جب تک ظہور واقع نہ ہو جائے، اس کے مقدم یا مؤخر ہونے کا امکان باقی رہتا ہے۔[1]

[1] اس موضوع کی مفصل بحث اور مزید دلائل سلوکِ منتظران میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

لہٰذا روایات میں بیان شدہ علامات کو ایسا قطعی اور ناگزیر سلسلہ نہیں سمجھنا چاہیے جس کے بغیر ظہور ممکن ہی نہ ہو۔ انہیں ممکن الوقوع امور کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے بعض علامات مؤمنین کو خبردار اور ظہور کے لیے زیادہ تیار کرنے کے لیے بیان ہوئی ہوں، یا ان کے بیان میں دوسری حکمتیں ہوں جن سے ہم واقف نہیں۔

البتہ ایک بات یقینی ہے کہ امام مہدیؑ کے حقیقی ظہور کو پہچاننا ان علامات کے مشاہدے پر موقوف نہیں۔ آپؑ کا قیام خود نہایت روشن اور آشکار ہوگا۔ بعض روایات میں آپؑ کے امر کو سورج کی روشنی سے تشبیہ دی گئی ہے، جس سے زیادہ روشن محسوسات کی دنیا میں کوئی چیز نہیں۔

امام باقرؑ نے فرمایا:

اِنَّ اَمرَکُم لَیسَ بِهِ خِفاءٌ. اَلا اِنَّها آیَةٌ مِنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ لَیسَت مِنَ النّاسِ. اَلا اِنَّها اَضوَأُ مِنَ الشَّمسِ لاتَخفی عَلی بِرٍّ وَ لا فاجِرٍ. اَتَعرِفُونَ الصُّبحَ؟! فَاِنَّها کَالصُّبحِ لَیسَ بِهِ خَفاءٌ.

''تمہارے اس امر [ظہور و فرج] میں کوئی پوشیدگی نہیں ہوگی۔ جان لو! یہ اللہ عزوجل کی ایک نشانی ہے، لوگوں کی بنائی ہوئی چیز نہیں۔ آگاہ رہو! یہ سورج سے بھی زیادہ روشن ہوگا؛ نہ کسی نیک شخص سے پوشیدہ رہے گا اور نہ بدکار سے۔ کیا تم صبح کو پہچانتے ہو؟ یہ صبح کی مانند ہوگا، جس میں کوئی پوشیدگی نہیں۔''

غیبت نعمانی، باب 11، حدیث 17۔

جب امامؑ کا ظہور سورج سے زیادہ روشن ہوگا اور کسی سے پوشیدہ نہیں رہے گا تو اسے پہچاننے کے لیے علاماتِ ظہور کا علم ضروری نہیں۔

لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ علامات سے ناواقفیت انسان کے حقیقی انتظار کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ البتہ اس بات سے ہوشیار رہنا چاہیے کہ علاماتِ ظہور کی بحث میں حد سے زیادہ مشغولیت ـــ جو عموماً سننے اور بیان کرنے میں دلچسپ محسوس ہوتی ہے ـــ کہیں ہمیں امامِ غائبؑ کے بارے میں اپنی **موجودہ ذمہ داریوں** سے غافل نہ کر دے اور ان فرائض کو پسِ پشت نہ ڈال دے جو آج ہم پر عائد ہیں۔

منتظر کی امامؑ کی نصرت کی نیت

جو شخص ظہور کا منتظر ہے، وہ اپنے آپ کو اس بات کے لیے تیار رکھتا ہے کہ امامؑ ظاہر ہوں تو ان کی نصرت کرے۔ زمانۂ غیبت میں یہ آمادگی ایک پختہ عزم اور مخلصانہ نیت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

نیک عمل کی نیت کی قدر و قیمت کے بارے میں رسولِ خداؐ نے فرمایا:

نِیَّۃُ المُؤمِنِ خَیرٌ مِن عَمَلِہِ.

''مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔''

اصول کافی، ج2، ص84، کتاب الایمان والکفر، باب النیۃ، ح2۔

مؤمن بہت سے نیک اعمال کی نیت کرتا ہے جنہیں انجام دینے کا موقع شاید اسے کبھی نہ ملے۔ اس کے علاوہ بعض اعمال کو عملاً انجام دیتے وقت ممکن ہے وہ ریا میں مبتلا ہو جائے اور وہ اخلاص کھو بیٹھے جو محض نیت کے مرحلے میں موجود تھا۔ شاید یہی ان اسباب میں سے ایک ہو جس کی بنا پر نیک عمل کی نیت کو خود عمل سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔

اللہ اپنے فضل و کرم سے مؤمن کو اس کی سچی نیت پر بھی اجر عطا فرماتا ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ العَبدَ المُؤمِنَ الفَقیرَ لَیَقُولُ: یا رَبِّ ارزُقنی حَتّی اَفعَلَ کَذا وَ کَذا مِنَ البِرِّ وَ وُجُوہِ الخَیرِ. فَاِذا عَلِمَ اللہُ عَزَّوَجَلَّ ذلِکَ مِنہُ بِصِدقِ نِیَّۃٍ، کَتَبَ اللہُ لَہُ مِنَ الاَجرِ مِثلَ ما یَکتُبُ لَہُ لَو عَمِلَہُ. اِنَّ اللہَ واسِعٌ کَرِیمٌ.

''ایک غریب مؤمن بندہ کہتا ہے: اے میرے رب! مجھے رزق عطا فرما تاکہ میں فلاں فلاں نیکی اور خیر کے کام انجام دوں۔ جب اللہ عزوجل جانتا ہے کہ اس کی نیت سچی ہے تو اس کے لیے اتنا ہی اجر لکھ دیتا ہے جتنا اس عمل کو حقیقتاً انجام دینے پر لکھتا۔ بے شک اللہ بڑی وسعت والا اور کریم ہے۔''

اصول کافی، ج2، ص85، کتاب الایمان والکفر، باب النیۃ، ح3۔

اسی بنا پر مؤمن کے لیے اپنی نیت کی اصلاح اور اسے خالص بنانا غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی نیت اللہ اور امامؑ کے لیے خالص ہونی چاہیے۔

اسی اصول کی بنا پر امام صادقؑ نے اپنے آپ کو شہدائے کربلا سے الگ نہیں سمجھا اور اپنے لیے روزِ عاشورا کے شہداء کے اجر میں شرکت بیان فرمائی:

اِنّی لا اُخرِجُ نَفسی مِن شُهَداءِ الطُّفُوفِ وَ لا اَعُدَّ ثَوابی اَقَلَّ مِنهُم. لِاَنَّ مِن نَیَّتِی النَّصرَةَ لَو شَهِدتُ ذلِکَ الیَومَ. وَ کَذلِکَ شیعَتُنا هُمُ الشُّهَداءُ وَ اِن ماتُوا عَلی فُرُشِهِم.

''میں اپنے آپ کو شہدائے طف سے خارج نہیں سمجھتا اور نہ اپنے اجر کو ان سے کم شمار کرتا ہوں؛ کیونکہ میری نیت یہ ہے کہ اگر میں اس دن موجود ہوتا تو [امام حسینؑ کی] نصرت کرتا۔ اسی طرح ہمارے شیعہ بھی شہید ہیں، خواہ اپنے بستروں پر ہی وفات پائیں۔''

مکیال المکارم، ج2، ص228، بحوالۂ شرحِ صحیفۂ سجادیہ، سید نعمت اللہ جزائری۔

لہٰذا جو شخص امامِ عصرؑ کے ظہور کے انتظار میں دن ـــــ بلکہ لمحے ـــــ گنتا ہو، اگر وہ مخلص ہو اور خالصتاً امامؑ کی خاطر ان کی نصرت کا سچا ارادہ رکھتا ہو تو اگر اسے زمانۂ ظہور دیکھنا نصیب نہ بھی ہو، وہ کچھ نہیں کھوتا۔ زمانۂ غیبت ہی میں اسے ظہور پانے اور امامؑ کے ساتھ جدوجہد کرنے کا اجر عطا ہو سکتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ نصرتِ امامؑ کے سلسلے میں جو چیز اس کے اختیار میں تھی، وہ یہی **قلبی آمادگی اور پختہ ارادہ** تھا۔ اس نصرت کا خارجی طور پر واقع ہونا ان حالات پر موقوف ہے جو اس کے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ لہٰذا اگر اللہ اسے جسمانی طور پر اس موقع پر حاضر ہونے کی توفیق نہ دے تو اپنے فضل و کرم سے اسے نصرتِ امامؑ کے اجر سے محروم نہیں فرماتا۔

امامِ عصرؑ کے ظہور کے منتظرین میں ایک شخص عبدالحمید واسطی تھے، جو امام باقرؑ کے زمانۂ امامت میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی کیفیتِ انتظار بیان کرنے اور قائمِ آلِ محمدؑ کے بارے میں امامؑ سے گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے عرض کیا:

فَاِن مِتُّ قَبلَ اَن اَدرِکَ القائِمَ علیه السّلام؟

''اگر میں قائمؑ کو پانے سے پہلے مر جاؤں تو؟''

امامؑ نے فرمایا:

اِنَّ القائِلَ مِنکُم اَذا قالَ: اِن اَدرَکتُ قائِمَ آلِ مُحَمَّدٍ صلی الله علیه و آله و سلّم نَصَرتُهُ، کَالمُقارِعِ مَعَهُ بِسَیفِهِ.

''تم میں سے جو شخص سچے دل سے یہ کہے: اگر میں قائمِ آلِ محمدؐ کو پالوں تو ان کی نصرت کروں گا، وہ اس شخص کی مانند ہے جو ان کے ساتھ تلوار لے کر جہاد کرے۔''

روضۃ الکافی، ص 81، ح 37۔

انسان کے اندر ایسا یقین اور ایسی نیت پیدا ہونا، اللہ، رسولؐ اور امامؑ کی صحیح معرفت اور ان کے حقوق کی شناخت کا نتیجہ ہے۔

امیر المؤمنینؑ نے فرمایا:

اِلزَمُوا الاَرضَ. وَ اصبِرُوا عَلَی البَلاءِ. وَ لا تُحَرِّکُوا بِاَیدیکُم وَ سُیُوفِکُم فی هوی اَلسِنَتِکُم. وَ لا تَستَعجِلُوا بِما لَم یُعَجِّلهُ اللهُ لَکُم. فَاِنَّهُ مَن ماتَ مِنکُم عَلی فِراشِهِ وَ هُوَ عَلی مَعرِفَةِ حَقِّ رَبِّهِ وَ حَقِّ رَسُولِهِ وَ اَهلِ بَیتِهِ، ماتَ شَهیداً وَ رَفَعَ اَجرَهُ عَلَی اللهِ وَ استَوجَبَ ثَوابَ مانَوی مِن صالِحِ عَمَلِهِ وَ قامَتِ النِیَّةُ مَقامَ اِصلاتِهِ بِسَیفِهِ. وَ اِنَّ لِکُلِّ شَیءٍ مُدَّةً وَ اَجلاً.

''اپنی جگہ ثابت قدم رہو اور آزمائشوں پر صبر کرو۔ اپنی زبانوں کی خواہش کے مطابق اپنے ہاتھ اور تلواریں حرکت میں نہ لاؤ، اور جس چیز کو اللہ نے تمہارے لیے جلدی نہیں کیا اسے تم بھی جلدی طلب نہ کرو۔

''تم میں سے جو شخص اپنے بستر پر اس حال میں دنیا سے جائے کہ اپنے رب کے حق، اس کے رسولؐ کے حق اور ان کے اہلِ بیتؑ کے حق کی معرفت رکھتا ہو، وہ شہید مرا۔ اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور جس نیک عمل کی اس نے نیت کی تھی، اس کے ثواب کا مستحق ہو گا۔ اس کی نیت، اس کی تلوار کھینچنے کے قائم مقام ہو گی۔ اور بے شک ہر چیز کی ایک مدت اور ایک مقررہ وقت ہے۔''

نہج البلاغہ، نسخۂ صبحی صالح، خطبہ 190۔

اس نورانی کلام کا ایک نہایت اہم نکتہ **اللہ، رسولؐ اور امامؑ کے حقوق کی معرفت** ہے، اور یہ معرفت خود ان کی صحیح معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی معرفت جتنی زیادہ ہو گی، وہ ان کے حقوق کو اتنا ہی بہتر سمجھے گا اور اپنے فرائض کو زیادہ واضح طور پر پہچانے گا۔ یہاں اس کتاب کے حصہ دوم میں بیان ہونے والی معرفتِ امامؑ کی بحث کی اہمیت مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔

پس زمانۂ غیبت کا حقیقی منتظر وہ ہے جو زبان سے بھی اور دل سے بھی کہتا ہو:

نُصرَتی مُعَدَّۃٌ لَکُم.

''اے اہلِ بیتؑ! میری نصرت آپ کے لیے تیار ہے۔''

احتجاجِ طبرسی، ج2، ص317، بحوالۂ زیارت آلِ یٰسین۔

اگر امامِ عصرؑ کے تمام پیروکار زمانۂ غیبت میں اس کیفیت کے حامل ہو جائیں تو خود امامؑ کے وعدے کے مطابق وہ آپؑ کی زیارت سے محروم نہ رہیں اور ان کے لیے غیبت کی کیفیت حضور میں تبدیل ہو جائے۔

امام مہدیؑ نے مرحوم شیخ مفیدؒ کے نام اپنے توقیع میں فرمایا:

لَو اَنَّ اَشیاعَنا – وَفَّقَهُمُ اللّٰهُ لِطاعَتِهِ – عَلَی اجتِماعٍ مِنَ القُلُوبِ فِی الوَفاءِ بِالعَهدِ عَلَیهِم. لَما تَأَخَّرَ عَنهُمُ الیُمنُ بِلِقائِنا وَ لَتَعَجَّلَت لَهُمُ السَّعادَةُ بِمُشاهَدَتِنا عَلی حَقِّ المَعرِفَةِ وَ صِدقِها مِنهُم بِنا.

''اگر ہمارے شیعہ ــــ اللہ انہیں اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرمائے ــــ اس عہد کو وفا کرنے میں، جو ان پر عائد ہے، دلوں کے اتحاد کے ساتھ جمع ہو جاتے تو ہماری ملاقات کی برکت ان سے مؤخر نہ ہوتی، اور ہماری صحیح اور سچی معرفت کی بنا پر ہماری زیارت کی سعادت ان کے لیے جلد میسر آ جاتی۔''

احتجاجِ طبرسی، ج2، ص325۔

تجدیدِ بیعت کے ذریعے نصرت کے عزم کا اظہار

امامؑ کی نصرت کے ارادے کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے یہ نہایت مفید ہے کہ انسان اپنے اس قلبی ارادے کو زبان سے بھی ظاہر کرے اور اللہ سے عہد و پیمان باندھے کہ وہ اس عہد کو پورا کرنے میں کبھی کوتاہی اور غفلت نہیں کرے گا۔ اسی مقصد کے تحت زمانۂ غیبت میں امامِ عصرؑ سے **بیعت** کا مفہوم سامنے آتا ہے۔

درحقیقت، **بیعت** امامؑ کی اطاعت اور نصرت کے قلبی ارادے کا زبانی اظہار ہے۔ مختلف مواقع پر اس بیعت کو دہرایا جاتا ہے اور یوں عہد کی **تجدید** ہوتی رہتی ہے، یعنی اسے از سرِ نو تازہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر **دعائے عہد** میں، جسے ہر صبح پڑھا جاتا ہے، امامؑ سے بیعت کی تجدید ان الفاظ میں کی جاتی ہے:

اللّهُمَّ اِنّی اُجَدِّدُ لَهُ فی صَبیحَةِ یَومی هذا وَ ما عِشتُ مِن اَیّامی عَهداً وَ عَقداً وَ بَیعَةً لَهُ فی عُنُقی لا اَحُولُ عَنها وَ لا اَزُولُ اَبداً. اللّهُمَّ اجعَلنی مِن اَنصارِهِ وَ اَعوانِهِ وَ الذّابّینَ عَنهُ وَ المُسارِعینَ اِلَیهِ فی قَضاءِ حَوائِجِهِ وَ المُمتَثِلینَ لِاَوامِرِهِ وَ المُحامینَ عَنهُ وَ السّابِقینَ اِلی اِرادَتِهِ وَ المُستَشهَدینَ بَینَ یَدیهِ(1) .

''اے اللہ! میں آج کی اس صبح اور اپنی زندگی کے ہر آنے والے دن میں ان کے لیے اس عہد، پیمان اور بیعت کی تجدید کرتا ہوں جو میری گردن پر ہے؛ میں اس سے کبھی نہ پھروں گا اور نہ کبھی اس سے دست بردار ہوں گا۔ اے اللہ! مجھے ان کے انصار و اعوان میں، ان کا دفاع کرنے والوں میں، ان کی حاجات پوری کرنے کے لیے ان کی طرف سبقت کرنے والوں میں، ان کے احکام کی تعمیل کرنے والوں میں، ان کی حمایت کرنے والوں میں، ان کی خواہش و ارادے کی تکمیل میں پیش قدمی کرنے والوں میں، اور ان کے سامنے شہادت پانے والوں میں قرار دے۔''

(1) بحار الانوار، ج102، ص111، بحوالہ مصباح الزائر۔

ایسا عہد، جو ان تمام آرزوؤں کو اپنے اندر سمیٹ لے اور منتظر کے دل کی ان تمناؤں کو اس کی زبان پر جاری کر دے، حقیقتاً انسان کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ وہ ہر روز جب اپنی بیعت کی تجدید کرتا ہے تو اس کا عزم اور ارادہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے اور وہ اپنے عہد پر وفادار رہنے کے لیے خود کو پہلے سے زیادہ آمادہ پاتا ہے۔

جو شخص اپنی پوری زندگی اسی کیفیت میں گزارے، جب وہ دیکھتا ہے کہ موت قریب آ رہی ہے لیکن اس کے مولا کا ظہور ابھی تک نہیں ہوا، تو اس کے وجود کی گہرائیوں میں حسرت و اشتیاق کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ آلِ محمدؐ کی خوشی و مسرت کے دن کو دیکھنے کی آرزو میں آنسو بہاتا ہے اور اس بات پر غمگیں ہوتا ہے کہ ایک عمر انتظار میں گزارنے کے بعد اب وہ اپنی محبوب آرزو پوری ہوئے بغیر اور اپنے مولا کی نصرت کا موقع پائے بغیر دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔

ایک عمر کے انتظار کا انجام

اب دیکھتے ہیں کہ ائمہؑ ایسے لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک فرماتے تھے جنہوں نے اپنی زندگی اسی کیفیت میں گزاری۔

مسعدہ روایت کرتے ہیں:

میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک نہایت ضعیف العمر شخص، جو بڑھاپے کے سبب جھکا ہوا تھا اور عصا کے سہارے چل رہا تھا، داخل ہوا اور سلام عرض کیا۔ امامؑ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس بوڑھے شخص نے عرض کیا:

''اے فرزندِ رسولِ خداؐ! اپنا دستِ مبارک مجھے عنایت فرمایئے تاکہ میں اسے بوسہ دوں۔'' امامؑ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، اس نے بوسہ دیا اور پھر رونے لگا۔

امامؑ نے فرمایا: ''اے شیخ! کیوں رو رہے ہو؟''

اس نے عرض کیا: ''میں آپ پر قربان! سو برس سے آپ کے قائمؑ کے انتظار میں ثابت قدم ہوں۔ ہر بار کہتا ہوں: شاید اسی مہینے، شاید اسی سال! لیکن اب عمر ڈھل چکی ہے، ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور موت قریب آ گئی ہے، مگر ابھی تک میں نے آپ کے بارے میں وہ منظر نہیں دیکھا جس سے محبت کرتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کو قتل کیا جاتا ہے، آپ کو اپنے گھروں سے بے دخل کیا جاتا ہے، جبکہ آپ کے دشمن اپنے پروں کے ساتھ بلندیوں میں اڑ رہے ہیں۔ پھر میں کیسے نہ روؤں؟''!

یہ سن کر امام صادقؑ کی مبارک آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں اور آپؑ نے فرمایا:

یا شَیخَ، اِن اَبقاکَ اللهُ حَتّی تَری قائِمَنا، کُنتَ فِی السَّنامِ الاَعلی. وَ اِن حَلَّت بِکَ المَنِیَّةُ، جِئتَ یَومَ القِیامَةِ مَعَ ثَقَلِ مُحَمَّدٍ صلی الله علیه و آله و سلُم؛ وَ نَحنُ ثَقَلُهُ. فَقالَ صلی الله علیه و آله و سلّم: اَنّی مُخَلِّفٌ فیکُمُ الثَّقَلَینِ فَتَمَسَّکُوا بِهِما لَن تَضِلُّوا: کِتابَ اللهِ وَ عِترَتی اَهلَ بَیتی.

''اے شیخ! اگر اللہ نے تمہیں اتنی زندگی دی کہ تم ہمارے قائمؑ کو دیکھ سکو تو تم بلند ترین مقام پر ہو گے، اور اگر اس سے پہلے تمہیں موت آ گئی تو روزِ قیامت تم محمدؐ کے ثقل کے ساتھ آؤ گے، اور ہم ہی ان کا ثقل ہیں۔ کیونکہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں؛ ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھنا، ہرگز گمراہ نہ ہو گے: اللہ کی کتاب اور میری عترت، میرے اہلِ بیتؑ۔''

اس بوڑھے شخص نے عرض کیا: ''اس بشارت کے بعد اب مجھے کوئی پریشانی نہیں، میرا دل مطمئن ہو گیا۔''

اس بوڑھے شخص کو یہ معلوم نہ تھا کہ اہلِ بیتؑ کا قائم کون ہو گا۔ چنانچہ امام صادقؑ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ قائمؑ، امام حسن عسکریؑ کے فرزند ہوں گے، امام ہادیؑ کی نسل سے ہوں گے، اور اسی طرح سلسلۂ نسب بیان کرتے ہوئے امام صادقؑ کی اولاد میں سے ہوں گے۔ پھر آپؑ نے فرمایا:

یا شَیخُ، وَ اللهِ لَو لَم یَبقَ مِنَ الدُّنیا اِلّا یَومٌ واحِدٌ، لَطَوَّلَ اللهُ تَعالی ذِکرُهُ ذلِکَ الیَومَ حَتّی یَخرُجَ قائِمُنا اَهلَ البَیتِ. اِلّا اَن شیعَتَنا یَقَعُونَ فی فِتنَةٍ وَ حَیرةٍ فی غَیبَتِهِ. هُناکَ یُثَبِّتُ اللهُ عَلی هُداهُ المُخلِصینَ. اللّهُمَّ اَعِنهُم عَلی ذلِکَ(1) .

''اے شیخ! اللہ کی قسم! اگر دنیا کی عمر میں صرف ایک دن بھی باقی رہ جائے تو اللہ، جس کا ذکر بلند ہے، اس دن کو اتنا طول دے گا کہ ہم اہلِ بیتؑ کے قائمؑ ظہور فرمائیں۔ آگاہ رہو کہ ان کی غیبت کے زمانے میں ہمارے شیعہ آزمائش اور حیرت میں مبتلا ہوں گے۔ اس وقت اللہ مخلص لوگوں کو اپنی ہدایت پر ثابت قدم رکھے گا۔ اے اللہ! اس امر میں ان کی مدد فرما۔''

(1) بحار الانوار، ج36، ص407، ح17، بحوالہ کفایۃ الاثر۔

اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ امام باقرؑ کے زمانے میں ایک دوسرے بوڑھے شخص کے ساتھ پیش آیا۔ حکم بن عتیبہ، جو اس واقعے کے گواہ تھے، روایت کرتے ہیں:

میں امام باقرؑ کی خدمت میں حاضر تھا اور گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک بوڑھا شخص اپنے عصا کے سہارے اندر آیا۔ دروازے پر کھڑا ہو کر اس نے عرض کیا: ''اے فرزندِ رسولِ خداؐ! آپ پر سلام، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔'' امامؑ نے فرمایا: ''اور تم پر بھی سلام، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔''

پھر اس نے حاضرین کو سلام کیا اور انہوں نے جواب دیا۔ اس کے بعد امام باقرؑ کی طرف متوجہ ہو کر عرض کیا:

»یَابنَ رَسُولِ اللهِ، اَدنِنی مِنکَ جَعَلَنی فِداکَ. فَوَ اللهِ اَنّی لِاُحِبُّکُم وَ اُحِبُّ مَن یُحِبُّکُم. وَ وَاللهِ ما اُحَبُّکُم وَ اُحِبُّ مَن یُحِبُّکُم لِطَمَعٍ فی دُنیا. وَ اِنّی لَاُبغِضُ عَدُوَّکُم وَ اَبرَأُ مِنهُ. وَ وَاللهِ ما اُبغِضُهُ وَ اَبرَأُ مِنهُ لِوَترٍ کانَ بَینی وَ بَینَهُ. وَ اللهِ اِنّی لِاُحِلُّ حَلالَکُم وَ اُحَرِّمُ حَرامَکُم وَ اَنتَظِرُ اَمرَکُم. فَهَل تَرجُو لی جَعَلَنِیَ اللهُ فِداکَ؟«

''اے فرزندِ رسولِ خداؐ! مجھے اپنے قریب کر لیجیے، میں آپ پر قربان۔ اللہ کی قسم! میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور ان لوگوں سے بھی محبت کرتا ہوں جو آپ سے محبت کرتے ہیں۔ اور اللہ کی قسم! آپ سے اور آپ کے محبّوں سے میری محبت کسی دنیوی طمع کی وجہ سے نہیں ہے۔ میں آپ کے دشمن سے بغض رکھتا ہوں اور اس سے براءت اختیار کرتا ہوں، اور اللہ کی قسم! میرا اس سے بغض اور براءت کسی ذاتی رنجش یا انتقام کی وجہ سے نہیں ہے۔ اللہ کی قسم! جسے آپ نے حلال قرار دیا ہے، میں اسے حلال سمجھتا ہوں اور جسے آپ نے حرام قرار دیا ہے، اسے حرام سمجھتا ہوں، اور آپ کے امر کا منتظر ہوں۔ پس، میں آپ پر قربان، کیا میرے لیے امید ہے؟''

امام باقرؑ نے فرمایا» :اِلَیَّ.اِلَیَّ'' — «. میرے قریب آؤ، میرے قریب آؤ۔'' یہاں تک کہ آپؑ نے اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا۔

پھر فرمایا: ''اے شیخ! ایک شخص میرے والد علی بن الحسینؑ کی خدمت میں آیا تھا اور اس نے بھی یہی سوال کیا تھا۔ میرے والدؑ نے اس سے فرمایا تھا:

اِن تَمُت، تَرِدُ عَلی رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلّم وَ عَلی عَلِیٍّ وَ الحَسَنِ وَ الحُسَینِ وَ عَلِیِّ بنِ الحُسَینِ وَ یَثلُجُ قَلبُکَ وَ یَبرُدُ فُؤادُکَ وَ تَقَرُّ عَینُکَ وَ تَستَقبَلُ بِالرُّوحِ وَ الرَّیحانِ مَعَ الکِرامِ الکاتِبینَ لَو قَد بَلَغَت نَفسُکَ هاهُنا – وَ اَهوی بِیَدِهِ اِلی حَلقِهِ. وَ اِن تَعِش، تَری ما یُقِرُّ اللهُ بِهِ عَینَکَ وَ تَکُونُ مَعَنا فِی السَّنامِ الاَعلی.

''اگر تم مر جاؤ تو رسولِ خداؐ، علیؑ، حسنؑ، حسینؑ اور علی بن الحسینؑ کی خدمت میں پہنچو گے۔ تمہارا دل ٹھنڈا ہو گا، تمہارے باطن کو سکون ملے گا اور تمہاری آنکھیں روشن ہوں گی۔ جب تمہاری جان یہاں تک پہنچے گی''— اور امامؑ نے اپنے حلق کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا— ''تو تمہیں عزت والے کاتب فرشتوں کے ساتھ راحت و ریحان کے ذریعے خوش آمدید کہا جائے گا۔ اور اگر زندہ رہے تو وہ چیز دیکھو گے جس سے اللہ تمہاری آنکھیں روشن کر دے گا، اور تم ہمارے ساتھ بلند ترین مقام پر ہو گے۔''

یہ سن کر بوڑھے شخص نے عرض کیا: ''اے ابو جعفرؑ! آپ نے کیا فرمایا؟''

امامؑ نے اپنے والد کے وہی کلمات دوبارہ ارشاد فرمائے۔

بوڑھے نے بے اختیار کہا: ''اللہ اکبر! اگر میں مر گیا تو رسولِ خداؐ، علیؑ، حسنؑ، حسینؑ اور علی بن الحسینؑ کی خدمت میں پہنچوں گا؛ میری آنکھیں روشن ہوں گی، میرے دل کو سکون ملے گا اور جب میری جان یہاں تک پہنچے گی تو عزت والے کاتب فرشتوں کے ساتھ راحت و ریحان سے میرا استقبال ہو گا؟ اور اگر زندہ رہا تو وہ منظر دیکھوں گا جس سے میری آنکھیں روشن ہوں گی اور میں آپ کے ساتھ بلند ترین مقام پر ہوں گا؟''!

پھر وہ اس شدت سے رونے لگا کہ زمین پر گر پڑا۔ حاضرین نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو وہ بھی گریہ وزاری کرنے لگے۔ امام باقرؑ نے اپنی مبارک انگلیوں سے اس بوڑھے شخص کے آنسو پونچھے۔

اس نے سر اٹھایا اور عرض کیا: ''اے فرزندِ رسولِ خداؐ! اللہ مجھے آپ پر قربان کرے، اپنا دستِ مبارک مجھے عنایت فرمایئے۔''

امامؑ نے اپنا ہاتھ اسے دیا۔ اس نے ہاتھ کو بوسہ دیا، اپنی آنکھوں اور رخسار سے لگایا، پھر اپنے سینے اور شکم سے لباس ہٹا کر امامؑ کا ہاتھ وہاں رکھا۔

اس کے بعد وہ اٹھا، سلامِ وداع کیا اور چلا گیا۔ امام باقرؑ مسلسل اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا:

مَن اَحَبَّ اَن یَنظُرَ اِلی رَجُلٍ مِن اَهلِ الجَنَّةِ فَلیَنظُر اِلی هذا.

''جو شخص اہلِ جنت میں سے کسی شخص کو دیکھنا چاہتا ہو، وہ اس شخص کو دیکھ لے۔''

حکم بن عتیبہ کہتے ہیں: ''میں نے اس مجلس جیسی گریہ وماتم کی مجلس کبھی نہیں دیکھی''، کیونکہ سب لوگ شدت سے رو رہے تھے۔ (1) (1) روضۃ الکافی، ص76، ح30۔

واقعی، یہی اس شخص کی ایک عمر کے انتظار کا ثمرہ ہے جو اپنی پوری زندگی اہلِ بیتؑ اور ان کے محبّوں سے محبت کرتے ہوئے، ان کے دشمنوں سے بیزاری رکھتے ہوئے، ائمہؑ کے حلال کو حلال اور ان کے حرام کو حرام مانتے ہوئے، اور اہلِ بیتؑ کے امر کے انتظار میں تڑپتے ہوئے گزار دے۔

انتظارِ فرج کی فضیلت پر اس گفتگو کے اختتام پر اب ہم امام صادقؑ کے ابو بصیر سے ارشاد کا ایک پہلو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

ابو بصیر نے عرض کیا:

»جُعِلتُ فِداکَ؛ مَتَی الفَرَجُ؟«

''میں آپ پر قربان! فرج کب ہو گا؟''

امامؑ نے فرمایا:

یا اَبابَصیرٍ، اَنتَ مِمَّن یُریدُ الدُّنیا؟!

''اے ابو بصیر! کیا تم ان لوگوں میں سے ہو جو دنیا چاہتے ہیں؟''!

پھر فرمایا:

مَن عَرَفَ هذَا الاَمرَ فَقَد فُرِّجَ عَنهُ بِانتِظارِهِ(1) .

''جو اس امر کی معرفت رکھتا ہے، اس کے لیے اسی امر کا انتظار خود اس کا فرج بن جاتا ہے۔''

(1) غیبت نعمانی، باب 25، ح 3۔

اس سے بڑھ کر فرج اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان کا انجام بخیر ہو اور بالآخر اسے اہلِ بیتؑ کی معیت میں جنت نصیب ہو؟ البتہ اس فرجِ الٰہی کے اور بھی پہلو ہیں جن سے منتظرینِ ظہور اسی دنیا میں بہرہ مند ہو سکتے ہیں، مگر ان کی تفصیلی بحث کا مقام کہیں اور ہے۔(2)

(2) تفصیل کے خواہش مند حضرات کتاب سلوکِ منتظران کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

پس آیئے اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں کبھی اس محبوب اور غائب امامؑ کے انتظار سے محروم نہ فرمائے:

...وَ لا تُنسِنا ذِکرَهُ وَ انتِظارَهُ(3) .

”اے اللہ! ہمیں ان کے ذکر اور ان کے انتظار کو فراموش نہ ہونے دے۔“

(3) کمال الدین، باب 45، ح 43۔

یہ جملہ اس دعا کا حصہ ہے جو امامِ عصرؑ کے نائبِ اوّل کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، اور جسے منتظرینِ ظہور زمانۂ غیبت میں جمعہ کے دن نمازِ عصر کے بعد پڑھتے ہیں۔

باب ہفتم

امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا

جو شخص حضرت ولیِ عصرؑ کے ظہور کا منتظر ہو، اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو اپنے امامِ منتظرؑ کا فرج اور کشائش ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا غم وہ رنج، تکلیف اور مصیبت ہے جو زمانۂ غیبت میں اس کے امامِ زمانہؑ کو پہنچتی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے آپ کو اس بات کا پابند سمجھتا ہے کہ امامؑ کے غم، اندوہ اور مصائب کو دور کرنے کے لیے اپنی استطاعت بھر کوشش کرے اور اس راہ میں کسی ایسے کام سے غفلت نہ برتے جو اس کے بس میں ہو۔

اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیے کہ امامِ عصرؑ کے لیے سب سے بڑا اور اہم ترین فرج، اللہ کی جانب سے آپؑ کے ظہور کی اجازت ہے۔ یہی امامؑ کا فرج ہے اور یہی تمام انبیاء اور اولیائے الٰہی کا بھی فرج ہے۔

اس مقصد کے حصول کا سب سے مؤثر ذریعہ امامؑ کے **تعجیلِ فرج کے لیے دعا** ہے۔ زمانۂ غیبت میں معرفتِ امامؑ کا یہ بھی ایک لازمی تقاضا اور نمایاں اثر ہے۔ اس دعا کی اہمیت اس قدر ہے کہ اگر کوئی شخص امامؑ کی معرفت و ولایت کا دعویٰ کرے، مگر ان کے فرج کے لیے دعا نہ کرے، تو اس کا یہ دعویٰ حد سے بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے ائمہؑ کی دعائیں

خود امامِ عصرؑ نے اپنی ولادت کے ابتدائی لمحات ہی سے اپنے تمام محبّوں کو اس مبارک عمل کی تعلیم دی۔

آپؑ کی محترم پھوپھی حکیمہ خاتون نے ولادت کے بعد آپؑ کو دیکھا کہ آپؑ اپنا چہرہ زمین پر رکھے سجدے میں ہیں، انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے ہیں اور فرما رہے ہیں:

»اَشهَدُ اَن لا اِلهَ اِلّا اللهُ وَحدَهُ لا شَریکَ لَهُ وَ اَنَّ جَدّی رَسُولُ اللهِ وَ اَنَّ اَبی اَمیرُالمُؤمِنینَ«. ...

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں؛ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ میرے جد رسولِ خداؐ ہیں اور میرے والد امیر المؤمنینؑ ہیں''...

اس کے بعد آپؑ نے باقی ائمہؑ کے نام ذکر فرمائے، یہاں تک کہ اپنے ذکر تک پہنچے۔ پھر اللہ کی بارگاہ میں دعا کی:

اللّهُمَّ اَنجِز لی وَعدی. وَ اَتمِم لی اَمری. وَ ثَبِّت وَطاَتی. وَ اَملِ الاَرضَ بی عَدلاً وَ قِسطاً(1) .

''اے اللہ! میرے بارے میں اپنے وعدے کو پورا فرما، میرے امر کو تکمیل تک پہنچا، میرے قدموں کو استوار فرما اور میرے ذریعے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے۔''

(1) بحار الانوار، ج 51، ص 13، ح 14، بحوالہ کمال الدین۔

امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا کرنا گزشتہ ائمہؑ کی بھی نہایت تاکید کے ساتھ جاری سنت تھی۔ مثال کے طور پر ماہِ مبارک رمضان کی اکیسویں صبح، نمازِ فجر کے بعد امام صادقؑ سجدے میں گئے۔ ایک نسبتاً طویل دعا کے آخر میں آپؑ نے عرض کیا:

...اَسالُکَ بِجَمیعِ ما سَاَلتُکَ وَ ما لَم اَسالُکَ مِن عَظیمِ جَلالِکَ ما لَو عَلِمتُهُ لَسَالتُکَ بِهِ، اَن تُصَلّیَ عَلی مُحَمَّدٍ صلی الله علیه و آله و سلّم وَ اَهلِ بَیتِهِ وَ اَن تَأذَنَ لِفَرَجٍ مِن بِفَرَجِهِ فَرَجُ اَولیائِکَ وَ اَصفِیائِکَ مِن خَلقِکَ وَ بِهِ تُبیدُ الظّالِمینَ وَ تُهلِکُهُم. عَجِّل ذلِکَ یا رَبَّ العالَمینَ.

''اے اللہ! میں تجھ سے ان تمام چیزوں کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جن کے ذریعے میں نے تجھ سے سوال کیا، اور تیری عظیم شان و جلال کے ان پہلوؤں کے واسطے سے بھی جن کے ذریعے میں نے تجھ سے سوال نہیں کیا؛ کہ اگر میں انہیں جانتا تو ان کے وسیلے سے بھی تجھ سے سوال کرتا۔ محمدؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ پر درود نازل فرما اور اس ہستی کے فرج کی اجازت عطا فرما

جس کے فرج میں تیرے اولیاءاور تیری مخلوق میں سے تیرے بر گزیدہ بندوں کا فرج ہے،اور جس کے ذریعے تو ظالموں کو نیست ونابود کرے گا۔اے پروردگارِ عالم! اسے جلد واقع فرما۔''

راوی کہتے ہیں کہ جب امامؑ نے سجدے سے سر اٹھایا تو میں نے عرض کیا: ''میں آپ پر قربان! میں نے آپ کو اس ہستی کے فرج کے لیے دعا کرتے سنا جس کے فرج میں اللہ کے بر گزیدہ بندوں اور اولیاء کا فرج ہے۔کیا وہ ہستی آپ نہیں ہیں؟''

امامؑ نے فرمایا:

»لا. ذاک قائم آل محمد صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم«.

''نہیں،وہ آلِ محمدؐ کے قائمؑ ہیں۔''

پھر قائمؑ کے قیام سے متعلق بعض علامات کا ذکر کرنے کے بعد امامؑ نے فرمایا:

تَوَقَّع اَمرَ صاحِبِکَ لَیلَکَ وَ نَهارَکَ. فَاِنَّ اللهَ کُلَّ یَومٍ فی شَأنٍ. لا یَشغُلُهُ شَأنٌ عَن شَأنٍ. ذلِکَ اللهُ رَبُّ العالَمینَ(1) .

''اپنے مولا کے امر کا شب و روز انتظار کرو، کیونکہ اللہ ہر روز ایک شان میں ہے؛ کوئی ایک امر اسے دوسرے امر سے غافل نہیں کرتا۔یہی اللہ، پروردگارِ عالم ہے۔ (1) ''بحار الانوار، ج98، ص158-159، بحوالہ اقبال الاعمال۔

روایت کا آخری جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ظہور کا وقت ان امور میں سے ہے جن میں **بداء** واقع ہو سکتا ہے۔یعنی کسی بھی لمحے اللہ اس کے بارے میں ایسا فیصلہ فرما سکتا ہے جو اس سے پہلے اس صورت میں مقدر نہ ہوا ہو۔اسی بنا پر امامؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا، وقتِ ظہور پر حقیقی اور فیصلہ کن اثر رکھ سکتی ہے۔

اس حدیث کا ایک نہایت اہم نکتہ وہی ہے جس کے بارے میں راوی نے امامؑ سے سوال کیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا در حقیقت اللہ کے تمام بر گزیدہ بندوں کے فرج کی دعا ہے—اشرفِ مخلوقات، خاتم الانبیاء رسولِ خداؐ سے لے کر انبیاء کے اوصیاء اور ملائکہ تک—جو سب امام مہدیؑ کے ظہور کے منتظر ہیں۔

دعائے عہد میں ہم اللہ سے عرض کرتے ہیں:

اللّٰهُمَّ وَ سُرَّ نَبِیَّکَ مُحَمَّداً صلی اللہ علیہ و آلہ و سلّم بِرُؤیَتِهِ وَ مَن تَبِعَهُ عَلی دَعوَتِهِ(2) .

''اے اللہ! اپنے نبی محمدؐ کو ان کے دیدار سے مسرور فرما، اور ان تمام لوگوں کو بھی جو آپؐ کی دعوت کی پیروی کرتے رہے۔''

(2) بحار الانوار، ج 102، ص 112، بحوالہ مصباح الزائر۔

لہٰذا جب ہم تعجیلِ فرج کی دعا کریں تو ہماری توجہ صرف اپنی آسائش اور اپنی مشکلات کے خاتمے تک محدود نہیں ہونی چاہیے کہ حقیقت میں ہم صرف اپنے ہی فرج کے لیے دعا کر رہے ہوں۔ بلکہ ہماری اصل نیت خود امامؑ کے فرج کی ہونی چاہیے، اگرچہ یقیناً ان کے فرج کے ذریعے تمام مؤمنین کو بھی کشائش نصیب ہو گی۔

تعجیلِ فرج کی دعا — ہلاکت سے نجات کا ذریعہ

امام زمانہؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ جب یہ دعا آپؑ کی امامت پر ایمان کے ساتھ ہو تو زمانۂ غیبت میں انسان کو اپنے دین کی ہلاکت سے محفوظ رکھتی ہے۔

امام حسن عسکریؑ نے احمد بن اسحاق سے فرمایا:

یا اَحمَدَ بنَ اِسحاقَ، مَثَلُهُ فی هذِهِ الأُمَّةِ مِثلُ الخِضرِ وَ مَثَلُهُ مَثَلُ ذِی القَرنَینِ. وَ اللهِ لَیَغیبَنَّ غَیبَةً لا یَنجُو فیها مِنَ الهَلَکَةِ اِلّا مَن ثَبَّتَهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَی القَولِ بِإمامَتِهِ وَ وَفَّقَهُ فیها لِلدُّعاءِ بِتَعجیلِ فَرَجِهِ.

''اے احمد بن اسحاق! اس امت میں ان کی مثال خضرؑ اور ذوالقرنین کی مانند ہے۔ اللہ کی قسم! وہ ایسی غیبت اختیار کریں گے کہ اس دوران ہلاکت سے صرف وہی شخص نجات پائے گا جسے اللہ عزوجل ان کی امامت کے عقیدے پر ثابت قدم رکھے اور اس زمانے میں ان کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا کی توفیق عطا فرمائے۔''

اگلے دن احمد بن اسحاق دوبارہ امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

»**فَمَا السُّنَّةُ الجارِیَةُ فیهِ مِنَ الخِضرِ وَ ذِی القَرنَینِ؟**«

''ان کے بارے میں خضرؑ اور ذوالقرنین کی کون سی سنت جاری ہو گی؟''

امامؑ نے فرمایا:

»**طُولُ الغَیبَةِ یا اَحمَدُ**«.

''اے احمد! طولانی غیبت۔''

احمد بن اسحاق نے عرض کیا:

»یَابنَ رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله و سلّم وَ اِن غَیبَتَهُ لَتَطُولُ؟«

''اے فرزندِ رسولِ خداؐ! کیا ان کی غیبت واقعی بہت طویل ہو گی؟''

امامؑ نے فرمایا:

ای وَ رَبّی حَتّی یَرجِعَ عَن هذَا الاَمرِ اَکثَرُ القائِلینَ بِهِ وَ لا یَبقی اِلّا مَن اَخَذَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ عَهدَهُ لِوِلایَتِنا وَ کَتَبَ فی قَلبِهِ الایمانَ وَ اَیَّدَهُ بِرُوحٍ مِنهُ(1) .

''ہاں، میرے رب کی قسم! یہ غیبت اس قدر طولانی ہو گی کہ اس امر کا اقرار کرنے والوں میں سے اکثر اس سے پلٹ جائیں گے، اور صرف وہی لوگ باقی رہیں گے جن سے اللہ عزوجل نے ہماری ولایت کا عہد لیا ہے، جن کے دلوں میں ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی جانب سے ایک روح کے ذریعے ان کی تائید فرمائی ہے۔ (1) ''کمال الدین، باب 38، ح 1۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اسے آپؑ کی امامت کے عقیدے ـــ جو ایمان کی بنیاد اور محور ہے ـــ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مل کر زمانۂ غیبت میں انسان کے دین کی حفاظت اور اسے ہلاکت سے بچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ دونوں بنیادیں ـــ امامت پر ایمان اور امامؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا ـــ **توفیقِ الٰہی** پر منحصر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ کسی شخص کو زمانۂ غیبت میں دین کھو دینے کے خطرے سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو اسے امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ جو لوگ اس لطف و عنایتِ الٰہی سے محروم ہو جائیں، وہ لغزش کا شکار ہو کر صراطِ مستقیم سے دور ہو سکتے ہیں۔

اسی لیے انسان کو ہمیشہ اللہ سے ہدایت اور توفیق مانگنی چاہیے اور کبھی اپنے آپ پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اللہ کسی انسان کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دے تو وہ نجات کے بنیادی وسائل ـــ یعنی امامت اور ولایت کے ایمان ـــ سے بھی محروم ہو سکتا ہے۔ خود روایت کے آخر میں تنبیہ کی گئی ہے کہ امامت کا اقرار کرنے والوں میں سے اکثر اس عقیدے سے پلٹ جائیں گے۔

زمانۂ غیبت میں امامت سے روگردانی

امامت کے عقیدے سے روگردانی بہت آسانی سے واقع ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ خود انسان کو اس کا احساس بھی نہ ہو۔ ضروری نہیں کہ کوئی شخص کھلے طور پر ائمہؑ کی امامت کا انکار کرے یا ان کے خلاف زبان کھولے۔ ممکن ہے وہ ''امامت'' اور ''ائمہؑ'' کی اصطلاحات تو بدستور استعمال کرتا رہے، لیکن انہی ناموں کے تحت امامت و ولایت کی ایسی غلط اور منحرف تفسیر اختیار کر لے جسے وحی کے سرچشمے اور خود ائمہؑ کی تعلیمات سے اخذ نہ کیا گیا ہو۔

ایسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ خود اس بات سے بے خبر ہو، مگر حقیقت میں امامت کی روح اور ولایت کے حقیقی مفہوم کا انکار کر رہا ہو۔

معیار صرف ''امامت'' اور ''ائمہؑ'' کے الفاظ کا استعمال نہیں ہے۔ انسان کو بے دینی سے محفوظ رکھنے کے لیے ان اصطلاحات کا مفہوم اور حقیقت **کتاب و سنت** کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ دین سے بہت سی انحرافی صورتیں امامت کے بارے میں انہی غلط عقائد سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ معاملہ نہایت باریک اور انتہائی ہوشیاری کا متقاضی ہے۔

معرفت کی پہلی شرط، یعنی معرفت کا **صحیح اور سالم ہونا**، جس پر ہم نے پہلے تاکید کی تھی، اسی پوشیدہ خطرے سے بچانے کے لیے ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے عقائد کو ہمیشہ کتاب و سنت کے معیار پر درست کرتا رہے اور دینی معرفت کے باب میں قرآنِ کریم کی آیات اور ائمۂ طاہرینؑ سے منقول احادیث کے علاوہ کسی اور چیز کو اصل بنیاد نہ بنائے۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ کوئی غلط فکر یا منحرف عقیدہ انسان کے ذہن میں اس قدر گہرا اتر جائے کہ وہ خود اس کا احساس کیے بغیر قرآن اور روایات کی تفسیر بھی اسی پہلے سے قائم شدہ غلط فکر کے زیرِ اثر کرنے لگے۔ نتیجتاً ظاہر وہ اپنے موقف کی دلیل میں احادیث پیش کر رہا ہو گا، لیکن اس کے عقیدے کی اصل روح اور بنیاد ائمہؑ سے حاصل نہیں ہوئی ہو گی؛ بلکہ کہیں اور سے لی گئی ہو گی اور بعد میں اسے روایات کا ظاہری لباس پہنا دیا گیا ہو گا۔

یہ وہ صحیح معرفت نہیں ہے جس کا انسان سے مطالبہ کیا گیا ہے۔ امامت کے عقیدے سے روگردانی اسی صورت میں بھی واقع ہو سکتی ہے۔

لہٰذا سب سے مؤثر حفاظت یہ ہے کہ اللہ انسان کو اس کے اپنے حال پر نہ چھوڑے، اور انسان اپنی طرف سے اہلِ بیتؑ کے در کے سوا کسی دوسرے در کی طرف رخ نہ کرے اور کسی اور جگہ اپنا اعتماد نہ رکھے۔ اس طرح وہ امامت و ولایت کے عقیدے پر ثابت قدم رہ سکتا ہے اور اس ثبات کو امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کی دعا کے ساتھ ملا کر زمانۂ غیبت کی ہلاکت سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اسی لیے "تعجیلِ فرج کے لیے دعا کرو" کے حکم کو انتہائی سنجیدگی اور اہمیت کے ساتھ لینا چاہیے۔ امام زمانہؑ کی ہدایت کے مطابق اس دعا کی کثرت کرنی چاہیے:

اَکثِرُوا الدُّعاءَ بِتَعجیلِ الفَرَجِ. فَاِنَّ ذلِکَ فَرَجُکُم(1) .

"تعجیلِ فرج کے لیے کثرت سے دعا کرو، کیونکہ اسی میں تمہارا فرج ہے۔"

(1) کمال الدین، باب 45، ح 4۔

دعا کرنے والے کا فرج سب سے پہلے اس بات میں ہے کہ اسے **حسنِ عاقبت** نصیب ہو اور ایسے زمانے میں اس کا دین صحیح و سالم باقی رہے جب امامت کا اقرار کرنے والوں میں سے اکثر اس سے روگرداں ہو جائیں گے۔ اس کے بعد وہ روحانی اور مادی کشائشیں ہیں جو اللہ تعالیٰ امام زمانہؑ کے فرج کے لیے دعا کی برکت سے اسے عطا فرماتا ہے۔

باب ہشتم

امامِ عصرؑ کی نصرت

اللہ کی نصرت

قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

»**اِن تَنصُرُوا اللهَ یَنصُرکُم وَ یُثَبِّت اَقدامَکُم**(1) .«

"اگر تم اللہ کی نصرت کرو گے تو وہ تمہاری نصرت کرے گا اور تمہارے قدموں کو ثابت رکھے گا۔"

(1) سورۂ محمد (47):7۔

اور فرمایا:

»وَ لَيَنصُرَنَّ اللهَ مَن يَنصُرُهُ(2) .«

''اور یقیناً اللہ اس شخص کی نصرت کرے گا جو اس کی نصرت کرے۔''

(2)سورۂ حج(22):40۔

اللہ کی نصرت کیسے کی جاسکتی ہے؟ اللہ کی مدد اور نصرت کرنے کا آخر کیا مفہوم ہے؟

اس سوال کا جواب حصہ دوم کے باب سوم کے آخر میں نقل کی گئی حدیث سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں امام صادقؑ نے اللہ کی رضا و ناراضی، اللہ سے جنگ، اللہ کی اطاعت، اللہ کو رنج پہنچانے، اللہ سے بیعت کرنے اور اسی نوع کے دوسرے تعبیرات کا مفہوم بیان فرمایا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام امور اللہ کے اولیاء اور اس کے برگزیدہ بندوں سے متعلق ہوتے ہیں، لیکن اللہ نے انہیں اپنی طرف نسبت دی ہے۔ اللہ کی اطاعت اس کے ولی کی اطاعت کے ذریعے متحقق ہوتی ہے؛ اللہ سے بیعت، اس کے ولی سے بیعت ہے؛ اللہ سے جنگ، اس کے ولی سے جنگ ہے، اور اسی طرح دوسرے موارد بھی ہیں۔ عمومی اصول یہ ہے کہ جو صفات اور افعال حقیقتاً مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہیں ان کے ظاہری اور مخلوقاتی معنی میں اللہ کی طرف نسبت نہیں دی جاسکتی، انہیں اسی اصول کی روشنی میں سمجھا جائے گا۔

اسی کلی اصول کے تحت کہا جاسکتا ہے کہ **اللہ کی نصرت سے مراد اس کے اولیاء کی نصرت ہے۔** حقیقت میں جو شخص ائمہؑ کی نصرت کرتا ہے، اس نے اللہ کی نصرت کی۔ لہٰذا نصرت کا وہ وعدۂ الٰہی بھی ان لوگوں کے شاملِ حال ہوتا ہے جو اپنے ائمہؑ کی نصرت کرتے ہیں۔

یہ بھی اہلِ معرفت کے فرائض میں سے ایک اور معرفتِ امامؑ کے اہم ترین آثار میں سے ہے۔

البتہ زمانۂ غیبت میں امامؑ کی نصرت کی صورت، زمانۂ حضور میں ممکن نصرت سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی لیے انتظار کی بحث میں ہم نے ''**امامؑ کی نصرت کا ارادہ**'' بیان کیا تھا۔ روایات سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگر کوئی شخص اپنے امامؑ کی غیبت کے

زمانے میں یہ سچی اور پختہ نیت و عزم رکھتا ہو کہ ظہور کے وقت وہ ان کی نصرت کرے گا تو اللہ اسے حقیقی نصرت کرنے والوں کا اجر عطا فرماتا ہے۔

لیکن نصرت کے ارادے اور پختہ عزم کے علاوہ—جو اپنی جگہ نہایت اہم اور ضروری ہیں—منتظرِ ظہور کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زمانۂ غیبت ہی میں امامؑ کی نصرت کے لیے جو کچھ اس کی استطاعت میں ہے، اسے انجام دے۔

زمانۂ غیبت میں امامؑ کی نصرت

زمانۂ غیبت میں بھی امامؑ کی نصرت کرنا ممکن ہے۔ امام حسینؑ نے فرمایا:

فَقَد اَخبَرَنی جَدّی اَنَّ وَلَدِیَ الحُسَینَ یُقتَلُ بِطَفِّ کَربَلاءَ غَریباً وَحیداً عَطشاناً. فَمَن نَصَرَهُ فَقَد نَصَرَنی وَ نَصَرَ وَلَدَهُ القائِمَ. وَ مَن نَصَرَنا بِلِسانِهِ، فَاِنَّهُ فی حِزبِنا یَومَ القِیامَةِ(1) .

"میرے جدّ نے مجھے خبر دی ہے کہ میرا فرزند حسینؑ سرزمینِ کربلا میں غریب، تنہا اور پیاسا شہید کیا جائے گا۔ پس جس نے ان کی نصرت کی، اس نے میری نصرت کی اور ان کی نسل سے آنے والے قائمؑ کی بھی نصرت کی۔ اور جس نے اپنی زبان سے ہماری نصرت کی، وہ روزِ قیامت ہمارے گروہ میں ہوگا۔"

(1) مکیال المکارم، ج 1، ص 507، بحوالہ معالی السبطین۔

سید الشہداء امام حسینؑ نے یہ کلمات شبِ عاشورا اپنے اصحاب سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمائے۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص اپنی استطاعت اور اپنے پاس موجود وسائل کے مطابق اپنے امام اور پیشوا کی نصرت کرے۔

امامؑ کی غیبت کے زمانے میں اس نصرت کو ایک خاص فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ ساتویں امامؑ نے اس سلسلے میں فرمایا:

اَما عَلِمتَ اَنَّ اَفضَلَ الشُّهَداءِ دَرَجَةً یَومَ القِیامَةِ مَن نَصَرَ اللهَ وَ رَسُولَهُ صلی الله علیه و آله و سلّم بِظَهرِ الغَیبِ وَ رَدَّ عَنِ اللهِ وَ رَسُولِهِ صلی الله علیه و آله و سلّم(1) .

"کیا تم نہیں جانتے کہ روزِ قیامت بلند ترین درجے کے شہداء میں وہ شخص بھی ہوگا جو غائبانہ طور پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی نصرت کرے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا دفاع کرے؟"

(1) بحار الانوار، ج 25، ص 313، ح 77، بحوالہ کشی۔

پس اللہ کے رسولؐ یا امامؑ کی ظاہری و جسمانی موجودگی ان کی نصرت اور دفاع کے لیے شرط نہیں ہے۔ زمانۂ غیبت میں بھی امامؑ کی نصرت کی جاسکتی ہے۔

زبان کے ذریعے امامؑ کی نصرت

زمانۂ غیبت میں امامؑ کی نصرت کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔(2) ان میں سے ایک **زبان کے ذریعے نصرت** ہے۔ عمومی طور پر جو شخص اپنی زبان اور گفتار کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو اہلِ بیتؑ کی طرف متوجہ کرے اور ان کے ذکر کو زندہ رکھے، وہ ان کی نصرت کر رہا ہے۔ یہ نصرت مرثیہ خوانی کے ذریعے ہو سکتی ہے، ان کی شان میں اشعار کہنے کے ذریعے، ان کے فضائل بیان کرنے کے ذریعے، یا ان کی احادیث نقل کر کے اور ان کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے علوم و معارف کی تعلیم و ترویج کے ذریعے۔ یہ سب زبان کے ذریعے اہلِ بیتؑ کی نصرت کے مصادیق ہیں اور زمانۂ غیبت میں بھی ان سب پر عمل ممکن ہے۔

(2) امامِ عصرؑ کی نصرت کی مختلف صورتیں ـــ دل، زبان اور عمل کے ذریعے ـــ کتاب آفتاب در غربت کے حصہ چہارم میں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

دعبل خزاعی اہلِ بیتؑ سے وابستہ شعراء اور مرثیہ خوانوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ ایامِ عاشورا میں وہ امام رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امامؑ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا:

مَرحَباً بِکَ یا دِعبِلُ! مَرحَباً بِناصِرِنا بِیَدِهِ وَ لِسانِهِ!

"خوش آمدید اے دعبل! خوش آمدید اس شخص کو جو اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے ہماری نصرت کرتا ہے"!

پھر امامؑ نے دعبل کے لیے اپنے پہلو میں جگہ بنائی اور انہیں وہاں بٹھایا۔ اس کے بعد اپنے مظلوم و غریب جدّ امام حسینؑ کے مصائب میں اشعار پڑھنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

یا دِعبِلُ، اِرثِ الحُسَینَ علیه السّلام. فَاَنتَ ناصِرُنا وَ مادِحُنا ما دُمتَ حَیّاً. فَلاتَقصُر عَن نَصرِنا مَااستَطَعتَ(1) .

''اے دعبل! حسینؑ کا مرثیہ پڑھو۔ جب تک زندہ ہو، تم ہمارے ناصر اور ہماری مدح کرنے والے ہو۔ پس جہاں تک تمہاری استطاعت ہو، ہماری نصرت میں کوتاہی نہ کرنا۔''

(1) بحارالانوار، ج45، ص257، ح15۔

آٹھویں امامؑ کی یہ ہدایت زمانۂ غیبت کے مؤمنین کے لیے بھی ہے کہ وہ جس طریقے سے اور جس حد تک ان کے لیے ممکن ہو، اپنے امامؑ کی نصرت کریں۔

عمومی طور پر ائمہؑ کے نام اور ذکر کو بلند و زندہ رکھنے، اور ان کے علوم و معارف کو عام کرنے کے لیے کی جانے والی ہر کوشش ان کی نصرت کا ایک مصداق ہے۔ لہٰذا اللہ کی نصرت کا وعدہ ان تمام لوگوں کو شامل ہوتا ہے جو اس راہ میں کوشش کرتے ہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی نصرت فرمائے گا اور ان کے قدموں کو ثابت رکھے گا۔

یہ زمانۂ غیبت میں امامؑ کے محبّوں کے لیے عظیم ترین بشارتوں میں سے ایک ہے، کیونکہ اس دور میں دین کے چھن جانے اور صراطِ مستقیم سے لغزش کا خطرہ دوسرے ادوار سے کہیں زیادہ ان کے سامنے رہتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ کے اس عظیم فضل سے بہرہ مند ہونا اور اپنے آپ کو نصرت و حمایتِ الٰہی کے حصار میں قرار دینا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنی استطاعت بھر اور ہر ممکن ذریعے سے اہلِ بیتؑ کی نصرت کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے اسی نصرت کی برکت سے اللہ اسے زمانۂ غیبت کے خطرات سے محفوظ رکھے اور ان نازک لمحات میں اس کی مدد فرمائے جب اس کے قدموں کے پھسلنے کا اندیشہ ہو۔

امام زمانہؑ کا مقدس وجود اللہ کے فضل و رحمت کا مظہر ہے۔ جو شخص کسی بھی طریقے سے آپؑ کی نصرت کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو امامؑ کی عنایت و توجہ کا مستحق بناتا ہے اور یوں رحمتِ الٰہی کی شعاعوں میں قرار پاتا ہے۔

زبان کے ذریعے امامؑ کی نصرت کی ایک صورت، جو آپؑ کے لیے خوشی اور مسرت کا باعث ہے، **آپؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا کرنا** ہے۔ امامؑ اسے دعا کرنے والے کی طرف سے اپنے حق میں ایک نیکی اور احسان شمار فرماتے ہیں، اور ایسی نیکی کو بے جواب نہیں چھوڑتے۔ جو شخص امامؑ کے لیے دعا کرتا ہے، وہ خود امامؑ کی مبارک دعا اور عنایت کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور آپؑ کے لطف و کرم سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

عباسی خلیفہ متوکل کے زمانے میں اصفہان میں عبدالرحمن نامی ایک شخص رہتا تھا جو بعد میں شیعہ ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا: ''تم علی نقیؑ کی امامت کے قائل کیسے ہوئے؟''

اس نے جواب دیا:

''میں نے ایک ایسا واقعہ دیکھا جس کی وجہ سے میں شیعہ ہو گیا۔ میں ایک غریب آدمی تھا، البتہ زبان آور اور گفتگو میں بے باک تھا۔ ایک سال اصفہان کے لوگوں نے مجھے چند دوسرے افراد کے ساتھ متوکل کے دربار میں اپنی ایک شکایت پیش کرنے کے لیے بھیجا۔

جب ہم دربار کے دروازے پر پہنچے تو متوکل کی طرف سے حکم آیا کہ علی بن محمد الرضاؑ کو حاضر کیا جائے۔ میں نے وہاں موجود ایک شخص سے پوچھا: یہ کون ہیں جنہیں یہاں بلانے کا حکم دیا گیا ہے؟

اس نے کہا: یہ علویوں میں سے ایک شخص ہیں جنہیں رافضی اپنا امام مانتے ہیں۔ پھر اس نے کہا: میرا خیال ہے کہ متوکل نے انہیں قتل کرنے کے لیے بلایا ہے۔

میں نے کہا: میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک اس شخص کو دیکھ نہ لوں اور یہ نہ جان لوں کہ وہ کیسے انسان ہیں۔''

عبدالرحمن کہتے ہیں:

''وہ گھوڑے پر سوار تشریف لائے۔ لوگ آپؑ کے دائیں اور بائیں صفیں بنائے کھڑے تھے اور آپؑ کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی میری نظر آپؑ پر پڑی، میرے دل میں آپؑ کی محبت پیدا ہو گئی۔ میں خاموشی سے آپؑ کے لیے دعا کرنے لگا کہ اللہ آپؑ کو متوکل کے شر سے محفوظ رکھے۔

آپؑ لوگوں کے درمیان سے گزر رہے تھے، نگاہ اپنے گھوڑے کی ایال پر رکھے ہوئے تھے اور نہ دائیں طرف دیکھتے تھے نہ بائیں طرف، جبکہ میں دل ہی دل میں مسلسل آپؑ کے لیے دعا کر رہا تھا۔

جب آپؑ عین میرے سامنے پہنچے تو میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

اِستَجابَ اللهُ دَعاءَکَ. وَ طَوَّلَ عُمرَکَ. وَ کَثَّرَ مالَکَ وَ وَلَدَکَ.

''اللہ تمہاری دعا قبول فرمائے، تمہاری عمر دراز کرے اور تمہارے مال اور اولاد میں کثرت عطا فرمائے۔''

یہ سن کر آپؑ کی ہیبت سے میرے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور میں اپنے ساتھیوں کے درمیان گر پڑا۔ انہوں نے پوچھا: تمہیں کیا ہوا؟ میں نے کہا: کچھ نہیں، اور جو کچھ پیش آیا تھا انہیں نہیں بتایا۔

اس واقعے کے بعد ہم اصفہان واپس آ گئے۔ آپؑ کی دعا کی برکت سے اللہ نے میرے لیے مال کمانے کے راستے کھول دیے، یہاں تک کہ آج صرف میرے گھر کے اندر موجود املاک کی قیمت دس لاکھ درہم ہے، اس مال کے علاوہ جو گھر سے باہر میرے پاس ہے۔ اللہ نے مجھے دس اولادیں بھی عطا کیں اور اب میری عمر ستر برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ اور میں اس ہستی کی امامت پر ایمان رکھتا ہوں جس نے میرے دل کی بات جان لی اور جس کی میرے حق میں دعا اللہ نے قبول فرمائی۔(1) ''

(1) قطب راوندی، الخرائج، ج 1، ص 392-393۔

یہ امامؑ کے لطف و کرم کی صرف ایک مختصر مثال ہے، اس شخص کے حق میں جس نے امامؑ کے لیے دعا کی، حالانکہ اس وقت تک وہ آپؑ کی امامت کا معتقد بھی نہیں تھا۔

پھر اس شخص کا کیا مقام ہو گا جو حقیقتاً امامت و ولایت پر ایمان رکھتا ہو اور اپنے زمانے کے امامؑ کے لیے اس چیز کی دعا کرے جو ہر چیز سے بڑھ کر ان کی خوشی کا باعث ہے، یعنی **تعجیلِ فرج**؟ کیا ممکن ہے کہ اس کا یہ احسان امامؑ کی نگاہ سے پوشیدہ رہ جائے؟ اور کیا یہ ہو سکتا ہے کہ امامؑ اپنے لیے دعا کرنے والے کی طرف کوئی توجہ اور عنایت نہ فرمائیں؟ ہر گز نہیں۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ جو اس کی نصرت کرے گا، اللہ اس کی نصرت فرمائے گا—اور یہ نصرت امامؑ کے ذریعے اس تک پہنچتی ہے۔

باب نہم

امامِ عصرؑ کی موجودگی کا شعور

مؤمنین کی طرف امامِ عصرؑ کی توجہ

شیعہ عقیدے اور منقول دلائل کی بناپر امامؑ اللہ کی تمام مخلوقات کے اعمال اور حالات سے آگاہ ہوتے ہیں، خواہ وہ زمین پر ہوں، آسمانوں میں ہوں، عالمِ ملکوت میں ہوں یا کسی اور مقام پر۔ البتہ ان سب کے درمیان اہلِ ایمان کی طرف امامؑ کی ایک خاص توجہ اور عنایت ہوتی ہے۔

اس حقیقت کی ایک مثال درج ذیل حدیث میں دیکھی جاسکتی ہے۔

رُمیلہ روایت کرتے ہیں:

امیر المؤمنینؑ کے زمانے میں میں سخت بیمار ہوگیا۔ جمعہ کے دن طبیعت میں کچھ افاقہ محسوس ہوا تو میں نے دل میں کہا: اس سے بہتر کیا ہوگا کہ اپنے اوپر کچھ پانی ڈال کر غسل کروں اور امیر المؤمنینؑ کے پیچھے نماز ادا کرنے جاؤں۔

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور مسجد چلا گیا۔

جب امامؑ منبر پر تشریف لے گئے تو اچانک میری بیماری دوبارہ شدت اختیار کر گئی۔ نماز کے بعد امیر المؤمنینؑ مسجد سے نکل کر ''قصر'' نامی مقام میں داخل ہوئے تو میں بھی آپؑ کے ساتھ اندر چلا گیا۔

آپؑ نے مجھ سے فرمایا: ''اے رُمیلہ! میں نے تمہیں درد سے تڑپتے ہوئے دیکھا''!

میں نے عرض کیا: ''جی ہاں۔'' پھر میں نے اپنی بیماری اور نماز میں حاضر ہونے کا سبب آپؑ کی خدمت میں بیان کیا۔

آپؑ نے فرمایا:

یا رَمیلَةُ، لَیسَ مِن مُؤمِنٍ یَمرَضُ اِلّا مَرِضنا بِمَرَضِهِ. وَ لا یَحزَنُ اِلّا حَزِنّا بِحُزنِهِ. وَ لا یَدعُو اِلّا اَمَّنَا لِدُعائِهِ. وَ لا یَسکُتُ اِلّا دَعَونا لَهُ.

''اے رُمیلہ! کوئی مؤمن بیمار نہیں ہوتا مگر ہم بھی اس کی بیماری سے متاثر ہوتے ہیں؛ وہ غمگیں نہیں ہوتا مگر ہم بھی اس کے غم میں غمگیں ہوتے ہیں؛ وہ دعا نہیں کرتا مگر ہم اس کی دعا پر آمین کہتے ہیں، اور جب وہ خاموش رہتا ہے تو ہم اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔''

میں نے عرض کیا: ''اے امیر المؤمنینؑ! میں آپ پر قربان! جو لوگ یہاں قصر میں آپ کے ساتھ موجود ہیں، ان کے بارے میں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن زمین کے دور دراز علاقوں میں رہنے والوں کا کیا؟''

آپؑ نے فرمایا:

یا رَمیلَهُ، لَیسَ یَغیبُ عَنّا مُؤمِنٌ فی شَرقِ الاَرضِ وَ لا فی غَربِها(1) .

''اے رُمیلہ! زمین کے مشرق یا مغرب میں کوئی مؤمن ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔''

(1) بصائر الدرجات، حصہ 5، باب 16، ح 1۔

جب امامِ عصرؑ اہلِ ایمان کی طرف ایسی توجہ اور عنایت رکھتے ہیں تو انسان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی حاجات کی تکمیل کو امامؑ کے سپرد کرتے ہوئے، سب سے بڑھ کر خود امامؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے دعا کرے؟

امامؑ کی شانِ کرم اس سے کہیں بلند ہے کہ کوئی انہیں یاد کرے اور وہ اسے فراموش کر دیں۔ خود آپؑ نے شیخ مفیدؒ کے نام اپنے مبارک **توقیع** میں فرمایا:

فَاِنّا نُحیطُ عِلماً بِاَنبائِکُم. وَ لا یَعزُبُ عَنّا شَیءٌ مِن اَخبارِکُم... . اِنّا غَیرُ مُهمِلینَ لِمُراعاتِکُم وَ لا ناسینَ لِذِکرِکُم(2) .

''ہم تمہارے حالات و اخبار سے پوری طرح باخبر ہیں اور تمہاری کوئی بات ہم سے پوشیدہ نہیں... ہم تمہاری نگہداشت سے غافل نہیں ہیں اور نہ تمہاری یاد کو فراموش کرتے ہیں۔''

(2) طبرسی، الاحتجاج، ج 2، ص 323۔

پس یہ حقیقت واضح ہے کہ اگرچہ امامِ عصرؑ زمانۂ غیبت میں لوگوں کی ظاہری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، لیکن مشرق و مغربِ عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے باخبر ہیں اور اہلِ ایمان کی طرف خصوصی توجہ اور عنایت رکھتے ہیں۔

آپؑ کا جسمِ مبارک عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے، لیکن اس کے باوجود آپؑ کی ولایت اور علم کا احاطہ ان کے ظاہر و باطن تک وسیع ہے؛ ان کے ظاہری اور باطنی حالات میں سے کوئی چیز آپؑ کی نافذ نگاہ سے پوشیدہ نہیں اور کوئی شخص آپؑ کی ولایت کے دائرے سے باہر نہیں۔

جس ہستی کو ہم جمعہ کی زیارت میں ان الفاظ سے سلام کرتے ہیں:

»اَلسَّلامُ عَلَیکَ یا عَینَ اللهِ فی خَلقِهِ(1) «.

''آپ پر سلام ہو، اے اللہ کی مخلوق میں اس کی عین''!

(1) بحار الانوار، ج102، ص215، بحوالہ جمال الاسبوع،

اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے بندوں کے حالات و کیفیات سے بے خبر ہیں یا ان کی توجہ و نگرانی ان تک محیط نہیں ہے۔

اسی طرح زمانۂ غیبت میں ہم آپؑ کو ان الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں:

»اَلسَّلامُ عَلَیکَ یا حُجَّةَ اللهِ الَّتی لاتَخفی(2) «.

''آپ پر سلام ہو، اے اللہ کی وہ حجت جو پوشیدہ نہیں ہے''!

(2) بحار الانوار، ج102، ص117، بحوالہ مزار الشہید اور المزار الکبیر۔

امامؑ کو ''پوشیدہ نہ ہونے والی حجت'' قرار دینا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عالمِ وجود میں آپؑ کا علم اور آگاہی ایک وسیع احاطہ رکھتی ہے۔

زمانۂ غیبت میں امامؑ کی موجودگی کا شعور

اہم بات یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کو اپنے باطن میں پالے اور امامؑ کی اس ہمہ گیر موجودگی کا اپنے پورے وجود کے ساتھ شعور پیدا کرے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو غیبت اس کے لیے **مشاہدے کے مانند** ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ خود کو اپنے امامِ زمانہؑ کی بارگاہ میں حاضر محسوس کرتا ہے۔

ایسی حالت میں وہ کسی بناوٹ اور تصنع کے بغیر، فطری طور پر اس مقدس ہستی کے حضور کے آداب اور احترام کو پوری سنجیدگی سے ملحوظ رکھے گا۔ اسی کے ذریعے زمانۂ غیبت میں **قوتِ یقین** حاصل کرنے کی راہ بھی اس کے لیے آسان ہو جائے گی۔

غائب امامؑ کی موجودگی کا یہ شعور حاصل کرنے کا ایک راستہ ہے، جس کی طرف بعض احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

امام سجادؑ نے ابو خالد کابلی سے فرمایا:

یا اَبا خالِدٍ، اِنَّ اَهلَ زَمانِ غَیبَتِهِ القائِلینَ بِإمامَتِهِ وَ المُنتَظِرینَ لِظُهُورِهِ، اَفضَلُ مِن اَهلِ کُلِّ زَمانٍ. لِاَنَّ اللهَ تَبارَکَ وَ تَعالی اَعطاهُم مِنَ العُقُولِ وَ الاَفهامِ وَ المَعرِفَةِ ما صارَت بِهِ الغَیبَةُ عِندَهُم بِمَنزِلَةِ المُشاهَدَةِ . ... (3)

''اے ابو خالد! ان کی غیبت کے زمانے میں رہنے والے وہ لوگ جو ان کی امامت کے قائل اور ان کے ظہور کے منتظر ہوں گے، ہر زمانے کے لوگوں سے افضل ہوں گے؛ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں ایسی عقلیں، ایسی فہم اور ایسی معرفت عطا فرمائے گا کہ غیبت ان کے لیے مشاہدے کے مانند ہو جائے گی''...

(3) کمال الدین، باب 31، ح2۔

بلاشبہ یہ مقام دین کے تمام بنیادی معارف میں زیادہ گہری اور کامل معرفت کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ہر معرفت کی اصل اور بنیاد **معرفتِ خدا** ہے، اور ضروری ہے کہ یہ معرفت انسان کے باطن میں ایک زندہ اور شعوری حقیقت بن جائے۔ اگر اللہ کی معرفت، جس طرح اہلِ بیتؑ کی احادیث میں تعلیم دی گئی ہے، انسان کے اندر ایک حقیقی باطنی شعور کی صورت اختیار کرلے تو فطری طور پر اس کا کردار اور اس کے اعمال رضائے الٰہی کے مطابق ہونے لگیں گے۔

یہی بات معرفتِ رسولؐ اور معرفتِ امامؑ کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔ یہ تمام معارف صحیح وسالم ہونے چاہئیں، یعنی ان کی بنیاد اسی تعلیم پر ہو جو کتاب وسنت میں آئی ہے اور ان میں انسانی ساختہ افکار کی آمیزش نہ ہو۔ ان تمام معارف میں **معرفتِ امامؑ** کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، جس کی تفصیلی بحث اس کتاب کے حصہ دوم میں گزر چکی ہے۔

اس کیفیت، یعنی امامؑ کی موجودگی کے شعور، کے حصول میں ایک اور مؤثر عامل ان فرائض پر عمل کرنا ہے جن کا ذکر اس حصے میں کیا گیا ہے۔ یہ فرائض معرفتِ امامؑ کے تقاضے اور آثار ہیں۔ اگر انسان انہیں سنجیدگی سے انجام دے تو رفتہ رفتہ اس کے اور اس کے امامِ زمانہؑ کے درمیان ایک **روحانی سنخیت اور قلبی تعلق** بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہی معنوی قربت انسان کو غائب امامؑ کی موجودگی کے باطنی ادراک اور مشاہدے کے لیے زیادہ آمادہ کرتی ہے۔

بعض اوقات ائمہؑ اپنے شیعوں کے لیے ایسی حقیقتوں کو محسوس و ملموس بنانے کی غرض سے کچھ پردے اٹھا دیتے تھے اور انہیں وہ حقائق دکھا دیتے تھے جو عام حالات میں ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے تھے۔

ابو بصیر روایت کرتے ہیں:

میں امام باقرؑ کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ امامؑ نے مجھ سے فرمایا: ''لوگوں سے پوچھو کہ کیا وہ مجھے دیکھ رہے ہیں؟''

جو شخص بھی میرے پاس سے گزرتا، میں اس سے پوچھتا: ''کیا تم نے ابو جعفرؑ کو دیکھا؟''

وہ جواب دیتا: ''نہیں۔'' حالانکہ امامؑ میرے بالکل پاس کھڑے تھے۔

پھر ابو ہارون مکفوف آئے، جو نابینا تھے۔ امامؑ نے فرمایا: ''اس شخص سے پوچھو۔''

میں نے ان سے پوچھا: ''کیا تم نے ابو جعفرؑ کو دیکھا؟''

انہوں نے کہا: ''کیا وہ یہیں کھڑے نہیں ہیں؟''

میں نے پوچھا: ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

انہوں نے جواب دیا: ''میں کیسے نہ جانوں، جبکہ وہ ایک درخشاں اور روشن نور ہیں؟''!

ابو بصیر کہتے ہیں:

پھر میں نے امامؑ کو افریقہ سے آئے ہوئے ایک شخص سے گفتگو کرتے سنا۔ آپؑ نے اس سے پوچھا: ''رشید کا کیا حال ہے؟''

اس نے عرض کیا: ''جب میں اسے چھوڑ کر آیا تو وہ زندہ تھا اور صحیح عقیدے پر ثابت قدم تھا، اور اس نے آپؑ کو سلام بھیجا ہے۔''

امامؑ نے فرمایا: ''اللہ اس پر رحمت فرمائے۔''

اس شخص نے پوچھا: ''کیا وہ وفات پا گیا؟''

امامؑ نے فرمایا: ''ہاں۔''

اس نے پوچھا: ''کب؟''

فرمایا: ''تمہارے وہاں سے نکلنے کے دو دن بعد۔''

اس شخص نے کہا: ''اللہ کی قسم! وہ نہ بیمار تھا اور نہ اسے کوئی تکلیف تھی''—— کیونکہ عام طور پر انسان کسی بیماری یا عارضے ہی کے نتیجے میں وفات پاتا ہے۔

میں، ابو بصیر، نے عرض کیا: ''وہ شخص کون تھا؟''

امامؑ نے فرمایا: ''وہ ہماری ولایت کے ماننے والوں اور ہم سے محبت کرنے والوں میں سے تھا۔''

پھر امامؑ نے فرمایا:

اَ تَرَونَ اَن لَیسَ لَنا مَعَکُم اَعیُنٌ ناظِرَةٌ وَ اَسماعٌ سامِعَةٌ؟! بِئسَ ما رَاَیتُم! وَ اللهِ لا یَخفی عَلَینا شَیءٌ مِن اَعمالِکُم. فَاَحضِرُونا جَمیعاً وَ عَوِّدُوا اَنفُسَکُمُ الخَیرَ وَ کُونُوا مِن اَهلِهِ تُعرَفُوا. فَاِنّی بِهذا آمُرُ وُلدی وَ شیعَتی(1) .

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے بارے میں ہماری کوئی دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان نہیں ہیں؟! تم نے کیسا برا گمان کیا ہے! اللہ کی قسم! تمہارے اعمال میں سے کوئی چیز ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پس تم سب ہمیں اپنے پاس حاضر سمجھو،(2) اپنے آپ کو نیکی کا عادی بناؤ اور اہلِ خیر میں سے ہو جاؤ، یہاں تک کہ اسی خوبی سے پہچانے جاؤ۔ میں اپنی اولاد اور اپنے شیعوں کو اسی بات کا حکم دیتا ہوں۔''

(1) بحار الانوار، ج46، ص243، ح31، بحوالہ الخرائج والجرائح۔

(2)بظاہر اس جملے کا مفہوم یہ ہے: ''ہمیں اپنے پاس حاضر سمجھو اور اپنے آپ کو ہماری موجودگی میں جانو۔''
واقعی یہ ممکن ہے کہ ایک ظاہری طور پر نابینا شخص اپنے زمانے کے امامؑ کی موجودگی کو محسوس کر لے، جبکہ ظاہری آنکھیں رکھنے والے لوگ انہیں دیکھ نہ سکیں۔

امامؑ ایک درخشاں اور تابناک نور ہیں، اور ان کا ادراک صرف ظاہری آنکھوں پر موقوف نہیں۔ اگر **دل کی آنکھ** بینا ہو جائے تو وہ امامؑ کو پہچانتی اور ان کی موجودگی کا شعور حاصل کرتی ہے۔

اصل اہمیت اس روحانی سنخیت اور قلبی تعلق کی ہے جو انسان کو اس مقدس ہستی سے جوڑتا ہے۔ امامؑ کی ہمیں یہی ہدایت ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے آپ کو ائمہؑ کی بارگاہ میں حاضر سمجھیں، اپنے نفس کو نیکی کا اس قدر عادی بنائیں کہ خیر و نیکی ہماری طبیعتِ ثانیہ بن جائے، اور اہلِ خیر میں اس طرح راسخ ہو جائیں کہ ہماری پہچان ہی نیکی سے ہونے لگے۔

باب دہم

امامِ عصرؑ کے دوستوں کا ورع

زمانۂ غیبت میں ائمہؑ کے طریقوں کی پابندی

جو شخص اپنے آپ کو اپنے امامِ زمانہؑ کی بارگاہ میں حاضر سمجھتا ہے، وہ امامؑ کی جس قدر معرفت رکھتا ہوگا، اسی قدر کوشش کرے گا کہ ان کی رضا کے راستے سے باہر نہ جائے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جو ان کی ناراضی کا باعث بنے۔ زمانۂ غیبت میں اہلِ معرفت کی یہ ایک نمایاں ترین علامت ہے۔

امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں:

اللّٰهُمَّ لابُدَّ لکَ مِن حُجَجٍ فی اَرضِکَ حُجَّةٍ بَعدَ حُجَّةٍ عَلی خَلقِکَ یَهدُونَهُم اِلی دینِکَ وَ یُعَلِّمُونَهُم عِلمَکَ لِکَیلا یَتَفَرَّقَ اَتباعُ اَولِیائِکَ؛ ظاهِرٌ غَیرُ مُطاعٍ، اَو مُکتَتِمٌ خائِفٌ یَترَقَّبُ، اِن غابَ عَنِ النّاسِ شَخصُهُم فی حالِ هُدنَتِهِم فی دَولَةِ الباطِلِ، فَلَن یَغیبَ عَنهُم مَبثُوثُ عِلمِهِم وَ اَدآبُهُم فی قُلُوبِ المُؤمِنینَ مُثبَتَةٌ وَ هُم بِها عامِلُونَ(1) .

''اے اللہ! تیری زمین پر تیری حجتوں کا ہونا ضروری ہے، ایک حجت کے بعد دوسری حجت، جو تیری مخلوق پر حجت ہوں؛ انہیں تیرے دین کی طرف ہدایت کریں اور تیرا علم انہیں سکھائیں، تاکہ تیرے اولیاء کے پیروکار منتشر نہ ہو جائیں۔ ان حجتوں میں کوئی ظاہر ہوتا ہے مگر اس کی اطاعت نہیں کی جاتی، اور کوئی خوف کی حالت میں پوشیدہ رہ کر انتظار کرتا ہے۔ اگر دولتِ باطل کے زمانے میں، حالتِ تقیہ وامن کے دوران، ان کی شخصیت لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جائے تو بھی ان کا پھیلایا ہوا علم لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہوتا، اور ان کے طریقے مؤمنین کے دلوں میں مضبوطی سے ثبت رہتے ہیں اور وہ ان پر عمل کرتے ہیں۔''

(1) غیبت نعمانی، باب 8، ح 2۔

اس نورانی حدیث میں دو امور کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ پہلا یہ کہ ائمہؑ کے علوم و معارف کی طرف رجوع کیا جائے، اور دوسرا یہ کہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں ان کے طریقوں اور سیرت پر عمل کیا جائے۔

یہ دونوں امور زمانۂ غیبت میں بھی ممکن ہیں، اگرچہ امامؑ کی ظاہری موجودگی کے زمانے کی نسبت ان پر عمل آسان نہیں۔ لہٰذا امامؑ تک معمول کے مطابق براہِ راست رسائی نہ ہونا ان دونوں ذمہ داریوں کو ترک کرنے کا عذر نہیں بن سکتا۔

اہلِ بیتؑ کی احادیث کی طرف رجوع کی ضرورت، جن میں ان کے علوم و معارف محفوظ ہیں، پہلے بیان ہو چکی ہے۔ یہاں ہم دوسری ذمہ داری کی کسی قدر وضاحت کریں گے۔

لفظ **آداب**، **دأب** کی جمع ہے۔ دأب کے معنی کسی شخص کے طریقے، عادت اور معمول کے ہیں،(1) جسے ہم نے یہاں ''طریقے'' یا ''روش'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس مقام پر مراد وہ اوصاف، عادات اور طریقے ہیں جو ائمہؑ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ ہماری ذمہ داری صرف ان پر اعتقاد رکھنا نہیں، بلکہ ان کے مطابق عمل کرنا بھی ہے۔

(1) المعجم الوسیط، ص 267۔

ان باتوں کو ماننا اور دل سے قبول کرنا ایک مرحلہ ہے، جبکہ دوسرا مرحلہ ان پر عمل کرنا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ بھی پہلے ہی کی طرح ضروری ہے۔ اسی بنا پر ہماری احادیث میں **اجتہاد** اور **ورع** پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، یہاں تک کہ انہیں دین کے بنیادی ارکان میں شمار کیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ کے زمانے میں ایک نابینا شخص آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ''اے فرزندِ رسولِ خداؐ! کیا آپ میرے دل میں اپنی محبت، عقیدت اور آپ کی ولایت سے وابستگی کو جانتے ہیں؟''

امامؑ نے فرمایا: ''ہاں۔''

اس شخص نے عرض کیا: ''میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ میں نابینا ہوں، زیادہ سفر نہیں کر سکتا اور ہمیشہ آپؑ کی خدمت میں حاضر ہونا میرے لیے ممکن نہیں، اس لیے چاہتا ہوں کہ آپ میرے سوال کا ایسا جواب عطا فرمائیں جس سے میری دینی ذمہ داری میرے لیے واضح ہو جائے۔''

امامؑ نے فرمایا: ''اپنی حاجت بیان کرو۔''

اس نے عرض کیا: ''مجھے وہ دین بتادیجیے جس کے ذریعے آپؑ اور آپ کے اہلِ بیتؑ اللہ کی عبادت کرتے ہیں، تاکہ میں بھی اسی دین کے مطابق اللہ عزوجل کی عبادت کروں۔''

امامؑ نے فرمایا:

اِن کُنتَ اَقصَرتَ الخُطبَةَ فَقَد اَعظَمتَ المَسالَةَ. وَ اللهِ لَأُعطِیَنَّکَ دینی وَ دینَ آبائِیَ الَّذی نَدینُ اللهَ عَزَّوَجَلَّ بِهِ: شَهادَةُ اَن لا اِلهَ اِلّا اللهُ، وَ اَنَّ مُحَمَّداً صلی الله علیه و آله و سلّم رَسُولُ اللهِ، وَ الاِقرارُ بِما جاءَ بِهِ مِن عِندِاللهِ، وَ الوِلایَةُ لِوَلِیِّنا، وَ البَراءَةُ مِن عَدُوِّنا، وَ التَّسلیمُ لِاَمرِنا، وَ انتِظارُ قائِمِنا، وَ الاِجتِهادُ، وَ الوَرَعُ(1) .

''تم نے بات مختصر کی ہے، لیکن سوال بہت عظیم کیا ہے۔ اللہ کی قسم! میں ضرور تمہیں اپنا دین اور اپنے آباءؑ کا وہ دین بتاؤں گا جس کے ذریعے ہم اللہ عزوجل کی بندگی کرتے ہیں: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں؛ جو کچھ آپؐ اللہ کی طرف سے لائے ہیں اس کا اقرار کرنا؛ ہمارے ولی سے ولایت رکھنا؛ ہمارے دشمن سے براءت اختیار کرنا؛ ہمارے امر کے سامنے تسلیم ہونا؛ ہمارے قائمؑ کا انتظار کرنا؛ کوشش وجدوجہد کرنا؛ اور ورع اختیار کرنا۔''

(1) اصول کافی، ج2، ص22، کتاب الایمان والکفر، باب دعائم الاسلام، ح10۔

رسولِ خداؐ اللہ کی طرف سے جو کچھ لائے ہیں اسے قبول کرنا اور اس کے سامنے تسلیم ہونا بنیادی طور پر ایک قلبی امر ہے، اور اس میں سب سے بڑھ کر ائمہؑ کی امامت وولایت پر ایمان شامل ہے۔

اسی طرح **اجتہاد** اور **ورع** کی بنیاد بھی انسان کے باطن میں ہوتی ہے، لیکن ان دونوں کے عملی اور ظاہری آثار بھی نہایت اہم ہیں۔

یہاں **اجتہاد**، جُہد سے ماخوذ ہے، یعنی کوشش اور محنت۔ اس سے مراد شریعت کے حلال وحرام کی رعایت میں پوری سنجیدگی سے کوشش کرنا اور احکامِ شرعی پر عمل کرنے میں غفلت نہ برتنا ہے۔

شریعت کے عملی احکام کی پابندی سے بے پروائی، بندگی اور دینداری کے ساتھ سازگار نہیں؛ کیونکہ یہ دونوں اللہ، رسولِ خداؐ اور امامؑ کی ولایت کو قبول کرنے اور ان کے سامنے تسلیم ہونے کے لازمی تقاضے ہیں۔

لہٰذا ایک مؤمن اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور ان کی مقررہ حدود کی رعایت میں جس قدر زیادہ پابند ہوگا، اسی قدر اللہ اور اہلِ بیتؑ کے سامنے اس کی تسلیم و اطاعت کامل ہوگی اور اسی نسبت سے اس کی دینداری بھی مضبوط ہوگی۔ اس کے برعکس، جس قدر وہ ان امور میں سستی اور لاپروائی کرے گا، اسی قدر اس کی تسلیم میں نقص ہوگا۔

دینداری میں ورع کا کردار

ورع سے مراد ''اپنے دین کی حفاظت اور نگہبانی'' کی وہ کیفیت ہے جس میں انسان اپنے دین کو عملی طور پر محفوظ رکھنے کو انتہائی اہم سمجھتا ہے۔

اگر کسی شخص کے سپرد کوئی نہایت قیمتی چیز کر دی جائے اور وہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لے تو وہ اس کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرے گا؟ ظاہر ہے کہ اسے ایسی جگہ رکھے گا جہاں اسے اطمینان ہو کہ نہ اسے کوئی نقصان پہنچے گا اور نہ کوئی خطرہ لاحق ہوگا۔ اگر کسی جگہ کے بارے میں اسے یقین نہ بھی ہو، صرف یہ اندیشہ ہو کہ وہاں اس قیمتی چیز کو نقصان پہنچ سکتا ہے، تب بھی وہ اسے وہاں نہیں رکھے گا۔

جو شخص اپنے دین کے بارے میں — جو اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے — یہی طرزِ فکر اختیار کرتا ہے، وہ **اہلِ ورع** میں سے ہے۔

لہٰذا **وَرِع** وہ شخص ہے جو صرف یقینی حرام سے ہی نہیں بچتا، بلکہ مشتبہ امور سے بھی کنارہ کشی اختیار کرتا ہے؛ کیونکہ اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر وہ شبہات سے نہ بچا تو رفتہ رفتہ حرام میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

وہ اپنی زندگی اس طرح گزارنا چاہتا ہے کہ اسے اطمینان رہے کہ اس کا دین محفوظ ہے۔ اسی لیے مشتبہ حالات میں احتیاط سے کام لیتا ہے اور بے پروائی کے ساتھ ان میں داخل نہیں ہوتا۔

اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو ایک خوفناک کھائی کے کنارے چل رہا ہو۔ اگر وہ بالکل کنارے کے ساتھ ساتھ چلے تو اسے اطمینان نہیں ہو سکتا کہ وہ گرے گا نہیں۔ اس لیے احتیاطاً کنارے سے کچھ فاصلے پر چلتا ہے تاکہ معمولی سی لغزش بھی اسے کھائی کی گہرائی میں نہ گرادے۔

اس اعتبار سے **ورع تسبیح کے اس دھاگے کی مانند ہے جو تمام دانوں کو ایک ساتھ جوڑے رکھتا ہے، جبکہ عبادات اس تسبیح کے دانوں کی مانند ہیں۔** جب تک دھاگا سلامت ہے، تمام دانے اپنی جگہ منظم رہتے ہیں؛ لیکن جب دھاگا ٹوٹ جائے تو دانے بکھر جاتے ہیں اور تسبیح کی شیرازہ بندی باقی نہیں رہتی۔

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں:

اَلوَرَعُ نِظامُ العِبادَةِ. فَاِذَا انقَطَعَ الوَرَعُ، ذَهَبَتِ الدِّيانَةُ. كَما اَنَّهُ اِذَا انقَطَعَ السِّلكُ اتَّبَعَهُ النِّظامُ(1) .

''ورع عبادت کو منظم اور مربوط رکھنے والا رشتہ ہے۔ جب ورع منقطع ہو جائے تو دینداری بھی جاتی رہتی ہے، جس طرح جب تسبیح کا دھاگا ٹوٹ جائے تو اس کا نظام بھی بکھر جاتا ہے۔''

(1) بحار الانوار، ج 70، ص 37، بحوالہ امالی شیخ طوسی۔

پس واجبات کی پابندی اور محرمات سے اجتناب — جس کے لیے سنجیدہ کوشش کو یہاں **اجتہاد** کہا گیا ہے — اگر انسان کے دین کی حفاظت کا ذریعہ بننا ہے تو اس کے ساتھ ورع کا ہونا بھی ضروری ہے۔

اسی بنا پر امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ ورع کے بغیر اجتہاد سود مند نہیں:

اِعلَم اَنَّهُ لا يَنفَعُ اجتِهادٌ لا وَرَعَ فيهِ(1) .

''جان لو کہ ایسی کوشش جس میں ورع نہ ہو، کوئی فائدہ نہیں دیتی اور ثمر بخش نہیں ہوتی۔''

(1) اصول کافی، ج 2، ص 76، کتاب الایمان والکفر، باب الورع، ح 1۔

بظاہر وہ فائدہ جو محض اجتہاد سے حاصل نہیں ہو سکتا، **دین کی حفاظت اور بقا** ہے، اور یہ مقصد ورع کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

ایک شخص نے امام صادقؑ سے پوچھا:

مَا الَّذی يُثبِتُ الايمانَ فِی العَبدِ؟

''وہ کون سی چیز ہے جو بندے کے اندر ایمان کو مستحکم کرتی ہے؟''

امامؑ نے فرمایا:

اَلَّذی یُثبِتُهُ فیهِ الوَرَعُ(2) .

''جو چیز اس کے اندر ایمان کو مستحکم کرتی ہے، وہ ورع ہے۔''

(2) بحار الانوار، ج70، ص304، ح19، بحوالہ الخصال۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ **اجتہاد اور ورع دو الگ حقیقتیں ہیں، لیکن دونوں کا ایک ساتھ پایا جانا ضروری ہے۔** البتہ ورع، اجتہاد سے بلند تر درجہ رکھتا ہے۔

اجتہاد کی بلند ترین حد گناہوں کو ترک کرنا ہے، جبکہ ورع کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ انسان مشتبہ امور کے سامنے رک جائے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اَورَعُ النّاسِ مَن وَقَفَ عِندَ الشَّبهَةِ ... . اَشَدُّ النّاسِ اجتِهاداً مَن تَرَکَ الذُّنُوبَ(3) .

''لوگوں میں سب سے زیادہ صاحبِ ورع وہ ہے جو شبہے کے مقام پر رک جائے... اور لوگوں میں سب سے زیادہ کوشش کرنے والا وہ ہے جو گناہوں کو ترک کر دے۔''

(3) بحار الانوار، ج70، ص305، ح25، بحوالہ الخصال۔

ورع کے ذریعے اہلِ بیتؑ کی نصرت

ورع کی اس بحث کے اختتام پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ، جیسا کہ کتاب کے حصہ دوم میں بیان ہو چکا ہے، دین کی بنیاد اہلِ بیتؑ کی امامت و ولایت پر ایمان اور ان کے سامنے تسلیم ہونا ہے۔ یہی اسلام اور ایمان کی حقیقی روح ہے۔

البتہ اس بنیاد کو فساد اور تباہی سے محفوظ رکھنے والی چیز یہ ہے کہ انسان احکامِ الٰہی کی رعایت کے ذریعے اپنے دین کی نگہبانی اور حفاظت کرے۔ یہی **ورع** ہے۔

اسی لیے ائمہؑ نے، جو اللہ کے حکم سے اپنے دوستوں کی سرپرستی اور ان کی نجات کی ذمہ داری رکھتے ہیں، ورع پر بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ورع کی پابندی کو ایک ایسی نصرت قرار دیا ہے جو اہلِ بیتؑ کے محبّ اپنے ائمہؑ کی کرتے ہیں۔

امام صادقؑ نے اپنے ایک پیروکار سے فرمایا:

وَاللهِ اِنَّكُم لَعَلى دينِ اللهِ وَ مَلائِكَتِهِ. فَاَعينُونا عَلى ذلِكَ بِوَرَعٍ وَ اجتِهادٍ(1) .

''اللہ کی قسم! تم اللہ اور اس کے فرشتوں کے دین پر ہو؛ پس ورع اور کوشش کے ذریعے اس امر میں ہماری مدد کرو۔''

(1) بحار الانوار، ج70، ص306، ح27، بحوالہ امالی شیخ طوسی اور امالی شیخ مفید۔

گویا امامؑ فرمارہے ہیں:

''اپنے دین کی حفاظت میں ہماری مدد کرو۔''

اگرچہ ظاہری طور پر ہمارے دین کی حفاظت کا تعلق خود ہم سے ہے، لیکن ائمہؑ اپنے پیروکاروں کی حسنِ عاقبت سے محبت اور ان کی ولایت و سرپرستی کی بنا پر ان کے دین کی حفاظت سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ ولایت کو خطرناک مقامات پر گرنے سے بچانے اور ان کے دین و ایمان کو محفوظ رکھنے کے لیے ائمہؑ کا لطف و کرم ان کی مدد کو آتا ہے۔

ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ **اپنے ورع اور کوشش کے ذریعے، ہمیں نجات دینے میں ان کی مدد کریں اور اپنے گناہوں کے نتائج کا بوجھ ان پر نہ ڈالیں۔**

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

عَلَيكُم بِالوَرَعِ. فَاِنَّهُ الدّينُ الَّذى نُلازِمُهُ وَ نَدينُ اللهَ بِهِ وَ نُريدُهُ مِمَّن يُوالينا. لا تُتعِبُونا بِالشَّفاعَةِ(2) .

''تم پر ورع لازم ہے، کیونکہ یہی وہ دین ہے جس کی ہم پابندی کرتے ہیں اور جس کے ذریعے اللہ کی بندگی کرتے ہیں، اور اپنے اہلِ ولایت سے بھی یہی چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنی شفاعت کے لیے مشقت میں نہ ڈالو''!

(2) بحار الانوار، ج70، ص306، ح29، بحوالہ امالی شیخ طوسی۔

آخر کار آخرت میں انسان کی نجات اور سعادت کا اہم وسیلہ اہلِ بیتؑ کی شفاعت ہے۔ جب اللہ کے مقرب فرشتے، اس کے بھیجے ہوئے انبیاءؑ اور آزمودہ مؤمنین بھی ان کی شفاعت کے محتاج ہوں تو ہم جیسے گناہگار بندوں کی حالت بالکل واضح ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں:

اِذا کانَت لکَ حاجَةٌ اِلَی اللهِ فَقُل: اَللّٰهُمَّ اِنّی اَسالُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ عَلِیٍّ ... فَاِنَّهُ اِذا کانَ یَومُ القِیامَةِ لَم یَبقَ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَ لا نَبِیٌّ مُرسَلٌ وَ لامُؤمِنٌ مُمتَحِنٌ اِلّا وَ هُوَ یَحتاجُ اِلَیهُما فی ذلِکَ الیَومِ(1) .

''جب تمہیں اللہ سے کوئی حاجت ہو تو کہو: اے اللہ! میں تجھ سے محمدؐ اور علیؑ کے حق کے واسطے سے سوال کرتا ہوں... کیونکہ جب قیامت کا دن آئے گا تو کوئی مقرب فرشتہ، کوئی رسولِ مرسل اور کوئی آزمودہ مؤمن ایسا نہ ہوگا جو اس دن ان دونوں کا محتاج نہ ہو۔''

(1) بحار الانوار، ج8، ص59، ح81، بحوالہ دعوات راوندی۔

البتہ معصوم ہستیوں، انبیاءؑ اور فرشتوں کی اہلِ بیتؑ سے یہ حاجت عذابِ الٰہی سے نجات حاصل کرنے کے معنی میں نہیں ہے؛ بلکہ رسولِ خداؐ اور امیر المؤمنینؑ کی عنایت ان کے درجات اور مقامات کی مزید بلندی کا باعث بنتی ہے۔

بہر حال روزِ قیامت کوئی بھی رسولِ خداؐ کی شفاعت سے بے نیاز نہیں ہوگا۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

ما اَحَدٌ مِنَ الاَوَّلینَ وَ الآخِرینَ اِلّا وَ هُوَ یَحتاجُ اِلی شَفاعَةِ مُحَمَّدٍ صلی الله علیه و آله و سلّم یَومَ القِیامَةِ(2) .

''اولین و آخرین میں کوئی ایسا نہیں جو روزِ قیامت محمدؐ کی شفاعت کا محتاج نہ ہو۔''

(2) بحار الانوار، ج8، ص42، ح31، بحوالہ المحاسن، برقی۔

اور ظاہر ہے کہ اہلِ بیتؑ کی شفاعت، رسولِ خداؐ کی شفاعت سے جدا نہیں ہے۔ جس شخص کی اہلِ بیتؑ شفاعت فرمائیں، گویا خود رسولِ خداؐ نے اس کی شفاعت فرمائی۔

چونکہ حسنِ عاقبت اور آخرت کی سعادت کے لیے ہماری تمام امید اہلِ بیتؑ کی نصرت، عنایت اور شفاعت سے وابستہ ہے، اس لیے ہمیں ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے ہماری شفاعت ان کے لیے باعثِ زحمت بنے۔

اسی لیے انہوں نے ہمیں ورع اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، تاکہ ورع کی رعایت کے ذریعے ہم ان کی شفاعت سے بہرہ مند ہوں اور اپنے پیشواؤں کو ہماری شفاعت میں ایسی زحمت نہ اٹھانی پڑے—**ان شاءاللہ تعالیٰ۔**

زمانۂ غیبت میں شیعوں کی اہم ترین ذمہ داریوں کا خلاصہ

اس حصے کے اختتام پر مناسب ہے کہ زیرِ بحث موضوعات کو مختصراً ایک مرتبہ پھر جمع کر دیا جائے، تاکہ زمانۂ غیبت میں ائمہؑ کے محبّوں کی اہم ترین ذمہ داریاں ہمارے سامنے تازہ ہو جائیں اور ہم ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں:

1. ایسے صحیح اور سالم عقائد رکھنا جو کتاب و سنت کے مطابق ہوں۔
2. ائمہؑ کی احادیث کے ذریعے ہم تک پہنچنے والی تمام تعلیمات کے سامنے مکمل طور پر تسلیم ہونا۔
3. اہلِ بیتؑ کے معارف کو سمجھنے اور عملی زندگی میں ان کی رعایت کی توفیق کے لیے مسلسل اہلِ بیتؑ سے توسل رکھنا۔
4. ہر ممکن طریقے سے اہلِ بیتؑ سے اپنی محبت کا اظہار کرنا۔
5. اہلِ ایمان سے محبت رکھنا اور ان کے حقوق کی ادائیگی کو سنجیدگی سے اہمیت دینا۔
6. امامؑ کے دوستوں کی مشکلات اور پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا۔
7. اہلِ بیتؑ کے مخالفین سے براءت اور ان کی مخالفت کو برقرار رکھنا۔
8. امامؑ کو فراموش نہ کرنا، خصوصاً زمانۂ غیبت میں۔
9. اہلِ بیتؑ کے مصائب پر گریہ کرنا، اور اس کے ساتھ گناہوں سے پرہیز اور تقویٰ کی پابندی کرنا۔
10. ائمہؑ کے علوم و معارف حاصل کرنا اور انہیں دوسروں تک پہنچانا۔
11. امام زمانہؑ کے فرج کا انتظار کرنا۔

12. ظہور کے لیے کوئی معین وقت مقرر کیے بغیر، اس کے وقت کو قریب سمجھنا۔

13. ظہور کے وقت امامؑ کی نصرت کا پختہ اور سنجیدہ ارادہ رکھنا۔

14. مختلف مواقع پر امام مہدیؑ کے ساتھ اپنی بیعت اور عہد کی تجدید کرنا۔

15. امامِ عصرؑ کے تعجیلِ فرج کے لیے نہایت اہتمام اور کثرت کے ساتھ دعا کرنا۔

16. ہر ممکن ذریعے سے اہلِ بیتؑ کی نصرت کرنا۔

17. ہمیشہ اس حقیقت کا شعور رکھنا کہ ہم امامِ غائبؑ کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔

18. اپنے آپ کو نیک اعمال کا اس قدر عادی بنانا کہ خیر و نیکی ہماری عادت بن جائے۔

19. احکامِ دین پر عمل کرنے میں پوری کوشش اور سنجیدگی ـــ **اجتہاد** ـــ اختیار کرنا۔

20. **ورع** کے ذریعے اپنے دین کی حفاظت اور نگہبانی کرنا۔

یہ وہ اہم ترین اوصاف ہیں جو زمانۂ غیبت میں ائمہؑ کی معرفت و ولایت رکھنے والوں میں پائے جانے چاہئیں۔ اگر وہ ان اوصاف کے ساتھ امامؑ کے ظہور سے پہلے اس دنیا سے چلے جائیں تو ان کی موت جاہلیت کی موت نہیں ہو گی، اور امامِ عصرؑ کی ظاہری موجودگی کے زمانے کو نہ پا سکنا ان کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں ہو گا۔

ان ذمہ داریوں کی مزید تفصیل، نیز امامِ غائبؑ کے سلسلے میں بندوں کی دوسری ذمہ داریاں، کتاب مکیال المکارم فی فوائد الدعاء للقائمؑ کے باب ہشتم میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

اختتامی دعا

اس بحث کا اختتام ہم اس دعا کے چند حصوں پر کرتے ہیں جو امام زمانہؑ کے نائبِ اول، ابو عمرو عثمان بن سعید عمریؒ نے املا فرمائی اور حکم دیا کہ زمانۂ غیبت میں اسے پڑھا جائے۔

مرحوم سید ابن طاؤوسؒ نے اس دعا کو جمعہ کے مستحب اعمال میں، نمازِ عصر کے بعد پڑھی جانے والی دعاؤں کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ اس دعا کے مضامین بڑی حد تک منتظرینِ ظہور کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ وَ لا تَسلُبنَا اليَقينَ لِطُولِ الاَمَدِ فی غَيبَتِهِ وَ انقِطاعِ خَبَرِهِ عَنّا. وَ لا تُنسِنا ذِكرَهُ وَ انتِظارَهُ وَ الايمانَ بِهِ وَ قُوَّةَ اليَقينِ فی ظُهُورِهِ وَ الدُّعاءَ لَهُ وَ الصَّلاةَ عَلَيهِ حَتّی لا يُقَنِّطَنا طُولُ غَيبَتِهِ مِن قِيامِهِ وَ يَكُونَ يَقينِنا فی ذلِکَ كَيَقينِنا فی قِيامِ رَسُولِ اللهِ صلی الله عليه و آله وَ ما جاءَ بِهِ مِن وَحيِکَ وَ تَنزيلِکَ. وَ قَوِّ قُلُوبَنا عَلَی الايمانِ بِهِ حَتّی تَسلُکَ بِنا عَلی يَدَيهِ مِنهاجَ الهُدی وَ المَحَجَّةَ العُظمی وَ الطَّرِيقَةَ الوُسطی. وَ قَوِّنا عَلی طاعَتِهِ وَ ثَبِّتنا عَلی مُتابَعَتِهِ. وَ اجعَلنا فی حِزبِهِ وَ اَعوانِهِ وَ اَنصارِهِ وَ الرَّاضينَ بِفِعلِهِ. وَ لا تَسلُبنا ذلِکَ فی حَياتِنا وَ لا عِندَ وَفاتِنا حَتّی تَتَوَفّانا وَ نَحنُ عَلی ذلِکَ لا شاكّينَ وَ لا ناكِثينَ وَ لا مُرتابينَ وَ لا مُكَذِّبينَ(1) .

''اے اللہ! ان کی غیبت کی مدت طویل ہو جانے اور ان کی خبریں ہم تک نہ پہنچنے کی وجہ سے ہم سے یقین کی نعمت سلب نہ فرما۔ ہمیں ان کی یاد، ان کے انتظار، ان پر ایمان، ان کے ظہور پر مضبوط یقین، ان کے لیے دعا اور ان پر درود و صلوات بھیجنے سے غافل نہ فرما؛ تاکہ ان کی طویل غیبت ہمیں ان کے قیام سے مایوس نہ کر دے۔

اور ان کے قیام کے بارے میں ہمارا یقین ایسا ہی قرار دے جیسا رسولِ خداؐ کی بعثت اور اس وحی و کتاب کے بارے میں ہمارا یقین ہے جو آپؐ تیری طرف سے لے کر آئے۔

اے اللہ! ان پر ایمان کے لیے ہمارے دلوں کو قوت عطا فرما، یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں ہمیں راہِ ہدایت، روشن و عظیم شاہراہ اور سیدھے و معتدل راستے پر گامزن فرما۔

ان کی اطاعت پر ہمیں قوت عطا فرما اور ان کی پیروی پر ہمیں ثابت قدم رکھ۔ ہمیں ان کے گروہ، ان کے مددگاروں، ان کے ناصروں اور ان کے افعال پر راضی رہنے والوں میں قرار دے۔

ہماری زندگی میں بھی یہ نعمت ہم سے سلب نہ فرما اور موت کے وقت بھی نہیں، یہاں تک کہ ہمیں اسی حالت میں دنیا سے اٹھائے کہ نہ ہم شک کرنے والے ہوں، نہ عہد توڑنے والے، نہ تردّد کرنے والے اور نہ جھٹلانے والے۔''

(1) جمال الاسبوع، باب 47، ص316؛ کمال الدین، باب 45، ح43۔

آمین یارب العالمین۔

کتابیات

1. الاحتجاج، ابو منصور احمد بن علی بن ابی طالب طبرسی، نجف اشرف: دار النعمان، 1386ھ۔
2. احقاق الحق وازھاق الباطل، نور اللہ الحسینی المرعشی التستری، حواشی: سید شہاب الدین الحسینی المرعشی النجفی، قم: کتابخانۂ آیت اللہ مرعشی نجفی، 1377ھ۔
3. اقبال الاعمال، سید ابن طاؤوس، تہران: دار الکتب الاسلامیہ، 1367ش۔
4. الامالی، شیخ صدوق، تہران: انتشارات کتابخانۂ اسلامیہ، 1362ش۔
5. الامامۃ والسیاسۃ، ابن قتیبہ دینوری، بیروت: دار الضوء، 1410ھ۔
6. بحار الانوار، محمد باقر مجلسی، تہران: المکتبۃ الاسلامیۃ، 1397ھ۔
7. البرھان فی تفسیر القرآن، سید ہاشم الحسینی البحرانی، قم: دار الکتب العلمیہ، 1334ش۔
8. بصائر الدرجات، ابو جعفر محمد بن حسن الصفار، بیروت: مؤسسۃ النعمان، 1412ھ۔
9. تحف العقول، ابو محمد حسن بن علی بن حسین بن شعبہ حرانی، تہران: کتابفروشی اسلامیہ، 1354ش۔
10. ترجمۂ فارسی مکیال المکارم، مہدی حائری قزوینی، تہران: بدر، 1372ش۔
11. التفسیر، ابو النضر محمد بن مسعود بن عیاش سمرقندی، تہران: المکتبۃ العلمیۃ الاسلامیۃ، 1380ھ۔
12. تفسیر فرات الکوفی، ابو القاسم فرات بن ابراہیم بن فرات کوفی، بیروت: مؤسسۃ النعمان، 1412ھ۔
13. تفسیر القمی، ابو الحسن علی بن ابراہیم قمی، بیروت: مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، 1412ھ۔
14. تفسیر کنز الدقائق وبحر الغرائب، شیخ محمد بن محمد رضا قمی مشہدی، تہران: وزارتِ فرہنگ وارشاد اسلامی، 1367ش۔
15. تفسیر نور الثقلین، عبد علی بن جمعہ عروسی حویزی، قم: المطبعۃ العلمیۃ، 1382ھ۔
16. التوحید، شیخ صدوق، بیروت: دار المعرفۃ۔

17. التھذیب، شیخ طوسی، تہران: دارالکتب الاسلامیہ، 1362ش۔
18. ثواب الاعمال وعقاب الاعمال، شیخ صدوق، قم: انتشارات اخلاق، 1377ش۔
19. الجامع الصحیح، محمد بن اسماعیل بخاری، بیروت: دارالمعرفۃ، 1978ء۔
20. جمال الاسبوع، سید ابن طاؤوس، تہران: آفاق، 1371ش۔
21. الخرائج والجرائح، قطب الدین راوندی، قم: مؤسسۃ الامام المہدیؑ، 1409ھ۔
22. الخصال، شیخ صدوق، قم: جامعۂ مدرسین حوزۂ علمیہ، 1414ھ۔
23. خلوتگاہِ راز، حبیب چایچیان، تہران: انتشارات علمیہ اسلامیہ، 1365ش۔
24. عوالی اللآلی، ابن ابی جمہور احسائی، قم: انتشارات سید الشہداءؑ، 1405ھ۔
25. عیون اخبار الرضاؑ، شیخ صدوق، تہران: انتشارات جہان۔
26. الغدیر، علامہ امینی، بیروت: دارالکتاب العربی، 1387ھ۔
27. غرر الحکم ودرر الکلم، عبدالواحد بن محمد تمیمی آمدی، قم: دفتر تبلیغات اسلامی، 1366ش۔
28. الغیبۃ، ابن ابی زینب محمد بن ابراہیم نعمانی، تہران: مکتبۃ الصدوق۔
29. فضائل الخمسۃ، سید مرتضی الحسینی فیروزآبادی، بیروت: مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، 1402ھ۔
30. الکافی، محمد بن یعقوب کلینی، تہران: دارالکتب الاسلامیہ، 1348ش۔
31. کامل الزیارات، جعفر بن محمد بن قولویہ قمی، قم: نشر الفقاہۃ، 1417ھ۔
32. من لایحضرہ الفقیہ، شیخ صدوق، قم: جامعۂ مدرسین حوزۂ علمیہ، 1413ھ۔
33. کمال الدین وتمام النعمۃ، شیخ صدوق، تہران: دارالکتب الاسلامیہ، 1395ھ۔
34. لسان العرب، ابن منظور، بیروت: دار صادر، 2000ء۔
35. مجمع البیان فی تفسیر القرآن، فضل بن حسن طبرسی، تہران: اسلامیہ، 1373ھ۔

.36 مجموعۂ مقالات، نعمت اللہ صالحہ نجف آبادی، تہران: امید فردا، 1382ش۔

.37 مرآۃ العقول، محمد باقر مجلسی، تہران: دار الکتب الاسلامیہ، 1369ش۔

.38 مردگان باما سخن می گویند، سید محمد رضی رضوی، تہران: منیر، 1380ش۔

.39 معادشناسی، سید محمد حسین حسینی تہران، تہران: حکمت، 1402ھ۔

.40 معانی الاخبار، شیخ صدوق، بیروت: دار المعرفۃ، 1399ھ۔

.41 المعجم الوسیط، ابراہیم مصطفیٰ و دیگران، استنبول: المکتبۃ الاسلامیۃ، 1392ھ۔

.42 مکیال المکارم، سید محمد تقی موسوی اصفہانی، قم: المطبعۃ العلمیۃ، 1397ھ۔

.43 منتخب الاثر فی الامام الثانی عشر، لطف اللہ صافی گلپایگانی، تہران: صدر، 1373ھ۔

.44 منہج الدعوات، سید ابن طاؤوس، تہران: کتابخانۂ سنائی، 1323ھ۔

.45 نہج البلاغہ، ترجمہ و شرح: فیض الاسلام، تہران، 1351ش۔

.46 نہج البلاغہ، نسخۂ صبحی صالح، بیروت، 1387ھ۔

.47 وسائل الشیعۃ الی تحصیل مسائل الشریعۃ، بیروت: دار احیاء التراث العربی، 1389ھ۔